مُنتخبات

نظامُ الفتاویٰ

جلد اوّل

حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی
(سابق صدر مُفتی دارُالعُلوم دیوبند)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ

(جلد اول)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

اجمالی فہرست

فہرست

باب التیمم

باب الغسل

باب الامامة ۲۷۷

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی بھلائی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کو اس امت کا مقصد وجود قرار دیا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰) اس حکم کی مخاطب پوری امت ہے؛ لیکن امت کے مختلف طبقات اپنی اپنی صلاحیت اور قدرت کے لحاظ سے اس کام کے مکلّف ہیں، دین کی طرف عمومی دعوت ہر مسلمان کا فریضہ ہے، طاقت کے ذریعہ معروف کو نافذ کرنا اور منکر سے روکنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور کچھ ذمہ داریاں وہ ہیں جو علماءِ شریعت سے متعلق ہیں، اگر اسلامی حکومت ہو تو بعض اوقات اس کو حکومت کی مدد سے بھی انجام دیا جاتا ہے، اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو انہیں اپنے طور پر انجام دینا واجب ہے، —— قضا اور افتاء 'امر بالمعروف' کی ایسی ہی صورتیں ہیں، قاضی کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور جہاں حکومت نہ ہو اور امارت شرعی کا نظام بھی نہ ہو، وہاں عام مسلمانوں کے انتخاب سے قاضی مقرر ہوتا ہے: " ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين " (الفتاوی الہندیہ ۱/۱۴۶، ردالمحتار، باب الجمعۃ) افتاء کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے نہ تقرری ضروری ہے اور نہ مسلمانوں کی طرف سے انتخاب؛ بلکہ کسی بھی صاحب علم سے جب حکم شرعی دریافت کیا جائے اور وہ اس مسئلہ کے حکم سے واقف ہو تو ضروری ہے کہ وہ دریافت کرنے والے کی رہنمائی کرے، جیسے نہ جاننے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ جاننے والوں سے پوچھیں: ﴿فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۴۳، الانبیاء: ۷) اسی طرح جاننے والے کا فریضہ ہے کہ وہ سوال کا جواب دے؛ ورنہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی:

" من كتم علما مما ينفع الله به في أمر الناس أو أمر الدين ألجمه الله يوم القيامة بلجام من النار" (سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن علم فکتمہ، حدیث نمبر: ۲۶۱)۔

غرض کہ افتاء اور قضاء امر بالمعروف کی ایسی صورتیں ہیں، جو علماء ہی کے ذریعہ انجام پاسکتی ہیں، افتاء اخبارِ حکم

شرعی' کا نام ہے، یعنی مفتی حکم شرعی کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، قضا، الزامِ حکم سے عبارت ہے، یعنی قاضی اس کے سامنے پیش ہونے والے واقعہ کی تحقیق کر کے فریقین پر حکم کو لازم کرتا ہے، افتاء کا دائرہ وسیع ہے، اعتقادات اور عبادات کے بشمول دین کے تمام شعبوں کے بارے میں مفتی رہنمائی کرتا ہے، قضا کا دائرہ اس لحاظ سے محدود ہے، قاضی صرف معاملات اور دو افراد کے درمیان پیش آنے والے مخاصمات کو حل کرتا ہے، مفتی کی ذمہ داری تحقیق مسئلہ ہے یعنی کسی بات کے بارے میں حکم شرعی بیان کرنا اور قاضی کا کام ہے تحقیقِ واقعہ؛ اسی لئے مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ احکام شریعت کا علم رکھتا ہو اور قاضی کے لئے اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر وہ خود احکام شریعت سے پوری طرح واقف نہ ہو تو مفتی کی مدد سے فیصلہ کرے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مفتی کی ذمہ داری کتنی اہم اور کتنی نازک ہے؛ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ مفتی احکام شریعت کو بیان کرنے میں اللہ کا نائب ہوتا ہے اور وہ جو فتوی دیتا ہے، اللہ کی طرف اس کی نسبت کرتا ہے؛ اسی لئے سلف صالحین فتوی دینے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں: "**المفتي موقع عن الله تعالیٰ**" (شرح المہذب: ۱/۴۰) اور علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ مفتی کو اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ فتوی دینے میں کس کی نیابت کر رہا ہے: "**وليعلم المفتي عمن ينوب في فتواه**" (اعلام الموقعین: ۱/۱۱) خود ائمہ مجتہدین کی احتیاط کا حال یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ اگر علم کے ضائع ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو فتوی نہیں دیتا، امام مالکؒ کا حال یہ تھا کہ مسجد نبوی میں ان سے ۴۸ر مسائل پوچھے گئے اور ۳۲ر سوالات پر انہوں نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم، امام احمدؒ بھی بہت سے مسائل میں اپنی لا علمی کا اظہار فرماتے تھے (شرح المہذب: ۱/۴۱)۔

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو شریعت بھیجی ہے، وہ قیامت تک کے لئے ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوں، فقہاء اور ارباب افتاء ان کا حل پیش کریں، یہ رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے لوازم میں سے ہے، زمانہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، سماجی اور اخلاقی قدروں میں انحطاط، نئے معاشی نظام کی تشکیل، سیاسی حالات میں اتار چڑھاؤ، جدید آلات و وسائل کی پیدائش اور صنعتی ترقی، یہ وہ اسباب ہیں، جن کی وجہ سے ہر دور میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں قرآن وحدیث میں اس کا صریح اور واضح حکم نہیں مل سکتا؛ کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہوائی جہاز اور انٹرنیٹ کے مسائل کا ذکر فرمایا ہوتا تو وہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتا اور یہ بات "**کلموا الناس علی قدر عقولهم**" کے مغائر ہوتی؛ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ نصوص تو چند ہیں اور پیش آنے والے مسائل بے شمار: "**النصوص معدودة والحوادث ممدودة**" (المحصول لابن العربی: ۱/۱۲۵، المحیط البرہانی: ۸/۲۰۱، ط: دار احیاء التراث العربی)؛ البتہ قرآن وحدیث میں اصول ومبادی واضح کر دئے گئے ہیں

اور شریعت کے مقاصد و مصالح کو بیان کر دیا گیا ہے، ان بنیادی تعلیمات اور اصولی ہدایات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف شریعت کے مآخذ یعنی کتاب و سنت میں بصیرت حاصل ہو، دوسری طرف سلف صالحین کے اجتہادات اور آراء وافکار سے بھی آگاہ ہو؛ تا کہ وہ مسائل شرعیہ میں غور وفکر کے منہج کو سمجھ سکے، تیسرے: وہ اپنے عہد کے تقاضوں، ضرورتوں، مصلحتوں اور لوگوں کے عرف و عادت سے اچھی طرح باخبر ہو؛ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: " من لم يعرف أهل زمانه فهو جاهل "نیز علم کی ان جہتوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا سینہ خشیت الٰہی سے معمور ہو اور جب وہ افتاء کی ذمہ داری انجام دیتا ہو تو محسوس کرتا ہو:

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گر چہ از حلقوم عبداللہ بود

ایسے ارباب افتاء ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بعد کے ادوار میں بہت زیادہ نہیں رہی ہے، ایسی ہی مغتنم شخصیات میں ایک استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی صاحبؒ (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) تھے، مفتی صاحب نے لاکھ سے زیادہ ہی فتاوی لکھے ہوں گے؛ لیکن جو چیز ان کو معاصر علماء سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے جدید مسائل پر توجہ اور حکم لگانے میں اعتدال، اس حقیر کے تتبع کے مطابق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے بعد فتاوئی میں احوال کی رعایت اور شریعت کی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے امت کے مسائل میں تیسیر وسہولت کا پہلو سب سے زیادہ آپ کے یہاں پایا جاتا ہے؛ بلکہ تقاضۂ احوال کے تحت پہلے دونوں بزرگوں سے بھی بڑھ کر، اسی طرح جدید مسائل پر توجہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بعد آپ کے یہاں ملتی ہے؛ بلکہ آپ کے یہاں ان حضرات سے زیادہ نوازل سے متعلق فتاوی ہیں؛ کیوں کہ موجودہ دور میں نئے مسائل کے پیدا ہونے کی رفتار بہت تیز ہے، باخبر حضرات اس بات سے واقف ہیں کہ استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے پاس بھی جب نئے مسائل سے متعلق سوالات آتے تو اکثر و بیشتر آپ کے پاس بھیج دیتے تھے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے فتاوی میں جدید مسائل کا ذخیرہ غالباً علماء ہند کی تمام کتب فتاوی سے بڑھ کر ہے، خود (منتخبات نظام الفتاوی) سے قارئین اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مفتی صاحب کے اعتدال کا اندازہ ان فتاوی سے کیا جاسکتا ہے، جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے متعلق ہیں، جیسے شیعوں کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”سنیوں پر خود ضروری ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کی اذان کا انتظام کر کے
ان کو اس کا موقع ہی نہ دیں؛ البتہ کافر کہنے میں چوں کہ انتہائی احتیاط کا حکم ہے؛
اس لئے جب تک دلیل شرع سے ثابت نہ ہو جائے کہ اس شیعہ کا عقیدہ یہ بھی
ہے کہ نعوذ باللہ حضرت جبرئیل سے غلطی ہوئی کہ وحی لے کر حضور کے پاس چلے
گئے اور اسی قسم کا اور کوئی کفریہ عقیدہ ثابت نہ ہو جائے، کافر نہ کہا جائے گا، مثلا
اگر قرآن پاک میں کسی تحریف کا عقیدہ ان کا ثابت ہو جائے، جیسے یہ عقیدہ ہو کہ
قرآن چالیس پارے تھا، دس پارہ سنیوں نے چھپا دیا وغیرہ، تو یہ بھی کفریہ عقیدہ
ہے، ایسے عقیدہ والوں کے بھی کفر میں شبہ نہ ہوگا“

اسی طرح کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”جو لوگ مذہبی اعتبار سے بھی کمیونسٹ ہو چکے ہیں، دین اسلام سے منحرف
ہو چکے ہیں، ان کا یہ حکم ہے، اور جو لوگ مذہبا کمیونسٹ نہیں ہوئے؛ بلکہ خدا اور
رسول کے قائل ہیں، نماز، روزہ کو حق سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں، محض سیاسی پارٹی
کے طور پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے سیاسی اتفاق رکھتے ہیں، ان کا یہ حکم
نہیں ہے، نہ وہ اسلام سے خارج ہیں اور نہ ان کی بیوی نکاح سے خارج ہے“

غیر مقلد حضرات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”عام غیر مقلدین جو ظاہر احادیث پر عمل کرتے ہیں، ان کا حکم اصحاب ظواہر جیسا
ہے، ان کو گمراہ نہیں کہا جائے گا؛ البتہ اگر ان میں سے کوئی شخص تعصب برتتا ہے،
تقلید کو شرک جانتا ہے یا ائمہ اربعہ کی تنقیص کرتا ہے تو وہ یقیناً گمراہ ہے“

بریلوی حضرات اور منکرین حدیث سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”احادیث کا منکر فرقہ گمراہ ہے، اہل بدعت اور تمام گمراہ فرقے جیسے معتزلہ،
خوارج، روافض، نیچری یہ سب فرقے اسی قسم کے ہیں، یہ لوگ فاسق اور اہل
معاصی کہلاتے ہیں اور جب دلیل شرعی سے اس میں سے کسی کا کفر متیقن ہو
جاوے تو اس کو کافر بھی کہہ سکتے ہیں؛ لیکن عام طور پر سب کو کافر نہیں کہہ سکتے اور

نہ ایسا کہنا جائز ہے، احتیاط کے بھی خلاف ہے''۔

مفتی صاحب کی یہ آرا ءفرقوں اور جماعتوں سے متعلق ہیں؛ لیکن یہی رنگ معاملات سے متعلق فتاوی میں بھی موجود ہے، چوں کہ خود اِس کتاب میں، بہت سے فتاوی میں قارئین اس کو دیکھ سکیں گے؛ اس لئے ان کو خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

نئے مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہوئے صرف کتب فقہ کی عبارتیں سامنے ہوں تو امت کی مشکلات کو حل کرنا دشوار ہوگا، یہ ضروری ہے کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اس کے مقاصد و مصالح مفتی کے سامنے رہیں، مفتی صاحب کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا، دارالاسلام اور دارالکفر سے متعلق آپ کی گفتگو، پراویڈنٹ فنڈ کے متعلق آپ کی رائے، سود کے مصارف، قبرستان میں مسجد کی توسیع، سودی قرض لینے کی جائز اور ناجائز صورتیں، لائف انشورنس سے حاصل ہونے والی رقم سے غیر شرعی ٹیکس کی ادائیگی، اعانت علی المعصیت کی بعض صورتیں، بعض مغربی ملکوں میں نماز کے اوقات، بیرونی ممالک سے امپورٹ کئے جانے والے گوشت، مشینی ذبیحہ اور کتنے ہی مسائل ہیں، جن میں مفتی صاحب کا یہ مزاج واضح طور پر کارفرما ہے۔

مفتی صاحبؒ 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے سرپرستوں میں تھے، اگرچہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعف و بیماری کی وجہ سے کبھی سیمینار میں شریک نہ ہو سکے؛ لیکن آپ کی زندگی میں جتنے سیمینار ہوئے، تقریباً ہر سیمینار کے لئے آپ مفصل یا مختصر جواب ضرور لکھایا کرتے تھے اور آپ کے مختصر جوابات بھی شرکاء سیمینار کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے تھے، نیز اکثر اوقات بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ آپ کا جواب خود پڑھ کر سناتے تھے، اس کی تشریح فرماتے تھے اور اس میں جو تعمق ہے اس کی طرف اشارہ بھی کرتے جاتے تھے، قاضی صاحب آپ کے شاگردوں میں تھے اور استاذ و شاگرد دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت رکھتے تھے، اس حقیر کے لئے بھی سرمایہ سعادت ہے کہ اسے حضرت مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، طالب علمی کے زمانہ میں زیادہ تعلق نہیں رہا؛ لیکن بعد میں جب بھی دیوبند جاتا، ضرور ملاقات کے لئے حاضر ہوتا، مفتی صاحب بے حد خورد نوازی کا معاملہ فرماتے، دعائیہ کلمات کہتے اور حالیہ عرصہ میں جو مفصل فتوی یا نئے مسائل سے متعلق کوئی فتوی ان کے قلم سے جاری ہوتا، طلبہ سے منگا منگا کر ان سے استفادہ کا موقع دیتے، آخری ملاقات وفات سے دو تین ماہ پہلے ہوئی، جس میں ضیافت کا بھی خصوصی اہتمام فرمایا اور خواتین کی نماز سے متعلق ایک تفصیلی فتوی منگوا کر دکھایا اور میری خواہش پر اسے نقل کرا کر عنایت فرمایا، یہ فتوی بھی تفقہ و اعتدال کا شاہکار ہے، میں نے اسے حیدرآباد کے بعض رسائل میں بھی شائع کرایا۔

حضرت مفتی صاحبؒ ہندوستان کے مردم خیز خطہ مئو کے قریبی قصبہ 'اوندرا' میں ذوقعدہ ۱۳۲۸ھ مطابق نومبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، آپ کے خاندان کے لوگ عام طور پر انگریزی تعلیم یافتہ تھے؛ لیکن آپ نے اپنی خواہش سے دینی تعلیم حاصل کی، یہاں مولانا نعمت اللہ اور مولانا شکر اللہ صاحبان کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ سے کسب فیض فرمایا، پھر متوسطات کی تعلیم مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں حاصل کی اور ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، پھر مختلف مدارس کے علاوہ تقریباً ۲۵ رسال دارالعلوم مئو میں تدریس و افتاء کے فرائض انجام دئے، ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دیوبند تشریف لائے اور تادم آخریں دارالعلوم میں درس حدیث، تربیت افتاء اور فتاوی نویسی کے فرائض انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۲۱ر ذوقعدہ ۱۴۲۰ھ کو آپ کی وفات ہوئی، مئو کے زمانہ تدریس ہی میں حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے آپ کو راہِ سلوک میں خلافت بھی حاصل ہوئی۔

فتاوی میں چوں کہ سوال کے لحاظ سے بکثرت تکرار بھی ہوا کرتی ہے؛ اس لئے آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے منتخب فتاوی شائع کئے جائیں؛ چنانچہ مفتی صاحب نے منتخب فتاوی کا یہ مجموعہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی خواہش پر ان کے سپرد فرمایا، اس کی پہلی دو جلدیں ان کی زندگی میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور قاضی پبلیشر ز دہلی سے شائع ہوئیں، اگر قدیم طریقہ پر کتابت کرائی جاتی تو مزید دو جلدیں ہو جاتیں؛ لیکن اب اس کا نیا ایڈیشن عمدہ کمپوزنگ کے ذریعہ منظر عام پر آرہا ہے، اس طرح چار جلدوں کا مسودہ تین جلدوں میں مکمل ہو گیا۔

تاہم 'منتخبات نظام الفتاوی' کے اس نئے ایڈیشن کو زیادہ مفید، استفادہ میں آسان اور ترتیب میں بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اولاً تو مسودہ کی ہر جلد میں طہارت سے فرائض تک کے احکام شامل تھے، اب ایک باب کے تمام مسائل ایک جگہ کر دئے گئے ہیں، نیز تیسری اور چوتھی جلد میں فتاوی پر عنوانات نہیں تھے، یہ لگا دئے گئے ہیں، یہ دونوں کام بڑی محنت اور خوش اسلوبی کے ساتھ محبّ عزیز مفتی سعید الرحمٰن قاسمی (دارالافتاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ) نے انجام دیئے ہیں، دوسرا کام حوالہ جات سے مراجعت، جہاں حوالہ جات مذکور نہیں تھے، وہ تلاش کر کے ان کو ذکر کرنے کا تھا، اس کام کو مسودہ کے تیسری اور چوتھی جلد میں محترمان مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (شیخ الحدیث دارالعلوم مئو) اور مولانا خورشید احمد اعظمی (مئو) نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے، پہلی جلد میں حوالہ جات کی مراجعت اور کہیں کہیں حسب ضرورت حواشی کا اضافہ مولانا محمد سراج الدین قاسمی (رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) نے اور دوسری جلد میں تصحیح و مراجعت کا کام عزیزی مولانا احمد نادر القاسمی (رفیق شعبۂ علمی) کے ہاتھوں پورا ہوا ہے، اس طرح مختلف مخلصین اور اکیڈمی کے محبین کی محنت نے اس نئے ایڈیشن کو زیادہ سہل الاستفادہ بنا دیا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو ان خدمات کا بہتر

سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

اکیڈمی کے لئے نہایت مسرت کا مقام ہے کہ آج اکیڈمی کے اولین سرپرستوں میں سے ایک یعنی صاحب فتاوی کی ایک خواہش کی تکمیل ہو رہی ہے اور ربانی اکیڈمی کا منشأ بھی پورا ہو رہا ہے، امید ہے کہ اس منتخب مجموعہ کی طباعت ان دونوں بزرگوں کی روح کے لئے سکون و قرار کا باعث بنے گی اور تمام مسلمان خاص کر علماء اور ارباب افتاء تک ایک عظیم علمی و فقہی امانت پہنچے گی، دعا ہے کہ اللہ تعالی اکیڈمی کی اس سعی کو قبول فرمائے اور حضرت الاستاذؒ کے لئے اس کو صدقہ جاریہ بنا دے۔

۱۶ / ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ
۲۸ فروری ۲۰۱۳ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف چند

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ☆

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور ضابطہ زندگی ہے، زندگی کے ہر ہر گوشہ پر محیط اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات وحوادث اور مسائل سے متعلق رہنمائی فراہم کرنا ہی نظام اسلامی کا طرہ امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار، مختلف فکری رویوں، فلسفیانہ رجحانات اور حیرت انگیز اور ذہن انسانی کو دنگ کردینے والی تبدیلیاں بھی مسلم معاشرہ کو اس کی اسلامی راہ سے نہ مٹا سکیں، اور صدہا نئے تجربات کے مقابلہ میں مسلم معاشرہ اپنے اسلام اور اس کی پیش کردہ شریعت پر قائم رہا، لیکن کیا اسلامی شریعت میں ساری تفصیلات موجود تھیں؟ نہیں، ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا، نصوص قرآن واحادیث محدود ہیں جبکہ زمانہ کی تبدیلیاں، انسانی معاشرہ کے سوابق اور لواحق اور مسائل وحوادث لامحدود ہیں، اور اس تیز رفتار دنیا میں ہر آن ایسے نئے مسائل پیش آتے ہیں جن کا تصور بھی ماضی میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ایسی صورت میں نصوص واردہ میں آئے ہوئے اشارات اور اس کی حکمتوں کو ہی بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، اس کام کے لئے کس قدر دقت نظر اور فقیہانہ بصیرت کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے، فقہاء نے اپنی پوری پوری زندگی اسی کام کی نذر کردی ہے، تب جاکر انہوں نے امت کی رہنمائی کی ہے، آج کے دور میں بھی ایسی کوششیں جاری ہیں اور خدا کے فضل وکرم سے مفتیان دین نے اس میدان میں گرانقدر کام کیا ہے اور فقہ وفتاوی کے دفاتر ظہور پذیر ہوئے ہیں، لیکن موجودہ زمانہ اور صورتحال میں جن مسائل سے ہم دوچار ہیں ان میں فتاوی کا وہ مجموعہ جو اپنی مختلف النوع خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے نمایاں ہے، اس کا انتخاب ہم نے کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ''منتخبات نظام الفتاوی'' کی تین جلد کی اشاعت کا ہم نے فیصلہ کیا ہے اور اس وقت جلد اول پیش

☆ بانی وسابق سکریٹری جنرل، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

کرتے ہوئے اکیڈمی کو بڑی مسرت ہورہی ہے۔

ویسے تو اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل علم لگائیں گے، البتہ اتنا عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مصنف کی علمی زندگی کا نچوڑ اور کشید ہے جو مسائل شرعیہ کے عقدہ کشا کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئی ہے، اس میں قرآن شریف اور احادیث شریفہ، اجماع سلف، صحابہ و تابعین اور مجتہدین امت کے اقوال اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں نئے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں پیش آنے والے تقریباً اکثر و بیشتر مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کا جواب دیا گیا ہے، موجودہ حالات میں جہاں دین سے عدم واقفیت کی بنا پر مسلم معاشرہ میں برائیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کا طوفان سا آگیا ہے، وہیں ایسے علماء بھی بہت کم ہی ملتے ہیں جو مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں رکھ کر علم و بصیرت کو بنیاد بنا کر ان کا حق ادا کرسکیں اور مسلم معاشرہ کو صحیح راہ پر لے جانے میں مطلوبہ کردار ادا کرسکیں، مسائل کے حل میں جہاں علم و واقفیت کی کمی سبب ہے وہیں دوسرے اور بھی ایسے بہت سے اسباب ہیں جن کا ذکر بھی ناخوشگوار ہے۔ایسی صورت میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت کس قدر بڑھ جاتی ہے اس کا احساس ہر باشعور اور دین پسند شخص کو بہت زیادہ ہے، کتاب اپنی سلاستِ زبان، دقتِ بیان اور معرفتِ زمان و مکان میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے، اس کتاب کے ذریعہ مسائل کے جاننے میں اتنی آسانی ہوگی جس کی نظیر فتاوی کی عام کتابوں میں جو ابھی تک منظر عام پر آچکی ہیں، ملنی مشکل ہے، انہی افادی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جو کہ روح دین اور روح عصر دونوں کی حامل ہے، نظام الفتاوی کا انتخاب کیا اور مصنف سے درخواست کی کہ اسے اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائیں، مصنف کی کرم فرمائی اور اکیڈمی پر ان کی بیش بہا عنایات کے نتیجہ میں آج یہ کتاب اکیڈمی کی نگرانی میں اپنی شکلی و معنوی خوبیوں کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آرہی ہے۔

مولانا مفتی صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔آپ ایک طویل مدت سے دارالعلوم جیسے عظیم دینی ادارہ جس کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے فقہ و فتاوی کے میدان میں بلاشبہ قیادت کا مرتبہ حاصل ہے، مزید برآں اس ادارہ سے نکلنے والے علماء اور علمی تحقیقات کو سند اعتبار حاصل ہے، سے وابستگی رکھتے ہیں اور آپ نے مسلم معاشرہ کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرنے کا بڑا اچھا موقع پایا ہے، مسائل کے حل میں ان چیزوں کا پرتو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور کتاب کا ہر ہر لفظ مصنف کی وسعت علمی، طویل فقیہانہ تجربہ اور علمی و فقہی بصیرت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

پہلی جلد کے بعد عنقریب دوسری اور تیسری جلد بھی انشاء اللہ منظر عام پر آئے گی، جس سے فقہ و فتاوی کی دنیا میں واقع ایک خلا پر ہوگا، ہم رب العالمین سے دعا گو ہیں کہ وہ اس کتاب کی افادیت زیادہ سے زیادہ عام فرمائے اور روزمرہ کی زندگی کو شرعی ہدایات کی روشنی میں گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

تقریظ

از سند العلماء فقیہ العصر ومجاز حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا الحاج الشاہ مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہ العالی ☆

مفتی دارالعلوم دیوبند

حامداً ومصلیاً ومسلماً

نئے واقعات دنیا میں آئے دن پیش آتے ہی رہتے ہیں، جن کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے قوم پریشان رہتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دے حضرت الشاہ مفتی نظام الدین صاحب ناظم شعبہ افتاء دارالعلوم دیوبند کو کہ انہوں نے ایسے مسائل کے مجموعہ کو شرعی دلائل کے ساتھ حل کیا، عبارات نقل کیں، جس کی وجہ سے عوام اور اہل علم دونوں کے لئے یہ مجموعہ بہت کارآمد اور بصیرت افروز ہو گیا۔

دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور دارین کی ترقی سے نوازے۔ آمین

☆☆☆

☆ حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ کا وصال ۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ستمبر ۱۹۹۶ء کو ساؤتھ افریقہ میں ہوا، اور حضرت کی تدفین ہیزل دین سے ۳؍کلومیٹر کے فاصلہ پر ایلسبرگ ساؤتھ افریقہ کے قبرستان میں ہوئی، خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، اما بعد

اسلام ایک ابدی اور آفاقی مذہب ہے، وہ انسانی ذہن کی تسکین اور انسانی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت رکھتا ہے، اس کے اصولوں میں ہمہ گیری کی صفت پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے جب بھی انسانی ضرورتیں نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں اور نئی ایجادات جلوہ گر ہوتی ہیں، تو علماء اسلام آگے بڑھتے ہیں اور اصول اسلام کی تطبیق کا فریضہ انجام دیتے ہیں، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ کام کسی منزل پر جا کر رکا نہیں ہے، بلکہ حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے، اور انشاء اللہ یہ سلسلہ قیامت تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

یوں تو سبھی علماء اسلام نے اس سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، زمانے کی ضروریات سے کسی نے بھی صرف نظر نہیں کی، اور بقدر ہمت ہر مکتب فکر نے سعی بلیغ کی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہ، ان کے تلامذہ اور ان کے متبعین کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اور اسی وجہ سے امت نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو "اصحاب الرائے" کے معزز لقب سے نوازا ہے، اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ جدید مسائل اور الجھے ہوئے معاملات میں مختلف آراء میں سے قابل اعتنا رائے امام اعظم ہی کی ہے، یہی حضرات صائب الرائے ہیں، اگر چہ بعض بر خود غلط قسم کے لوگوں نے اس معزز لقب کو بدنما کرنے کی نہ صرف سعی کی ہے، بلکہ اس قدر پروپگنڈہ کیا ہے کہ اس کا صحیح مطلب عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا ہے، لیکن اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے ابن حجر شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انہوں نے "الخیرات الحسان" میں اس غلط پروپگنڈہ کا پردہ چاک کر دیا، اصابت رائے کا یہ خصوصی وصف مختلف زمانوں میں علماء احناف کے مختلف طبقات میں خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے، چنانچہ کبھی اہل عراق کو اس میں تفوق حاصل رہا تو کبھی علماء

ماوراءالنہر کو، ہمارے اس دور میں یہ خصوصی فضل علماء ہند کو عطا ہوا ہے، جس کا اعتراف متعدد علماء عرب نے بھی کیا ہے، پھر علماء ہند میں بھی اس کا حظ وافر علماء دیوبند کو حاصل رہا ہے، فقیہ النفس قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ، فقیہ بے مثال مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہ، رہنمائے قوم وملت حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ، مفتی اعظم مملکت پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ، اور فقیہ نکتہ رس حضرت علامہ مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری قدس سرہ وغیرہم کی مساعی جمیلہ سے کون ناواقف ہے، ان حضرات نے نہ صرف پچھلے مسائل کو نکھارا اور ان کی نوک پلک درست کی، بلکہ نئے مسائل اور معضلات عصر کی زلفوں کو بھی سنوارا، اللہ تعالی کے اس خصوصی فضل وکرم کا جس قدر شکر بجالایا جائے کم ہے۔

علماء دیوبند میں سب سے پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ نے حوادث الفتاوی کو علاحدہ مرتب فرمایا، آپ کے بعد آپ کے مسترشد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے اس سلسلے میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا، اب اسی مبارک سلسلے کے ہمارے بزرگ دارالعلوم دیوبند کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے ایک نہایت مفید کام انجام دیا ہے، آپ کے تحریر فرمودہ ہزاروں فتاوی میں سے منتخب کرکے نئے زمانے کی نئی ضرورتوں سے متعلق اہم فتاوی کا یہ مجموعہ امت مسلمہ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر دے اور امت مسلمہ کو اس مجموعہ سے زیادہ سے زیادہ منتفع فرمائے (آمین یارب العالمین)۔

حوادث الفتاوی کے سلسلے میں ایک خاص بات قابل لحاظ یہ ہے کہ چونکہ ان کا حل کتب فقہیہ میں صراحۃً نہیں پایا جاتا، بلکہ مفتی زمانہ اخذ واستنباط سے کام لے کر حل پیش کرتا ہے، اس لئے اس میں خطا (چوک) کا احتمال بہ نسبت دیگر جوابات کے زیادہ پایا جاتا ہے، ائمہ مجتہدین کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن جب بھی ان کے سامنے اپنی خطاء واضح ہوئی ہے تو ہمیشہ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع فرمالیا ہے، کبھی اپنی بات کی پیچ نہیں کی، حضرت تھانوی قدس سرہ کے یہاں تو ماہنامہ ''النور'' میں ترجیح الراجح، کا ایک مستقل عنوان تھا، ہمارے حضرت مفتی صاحب بھی اسی سلسلے سے وابستہ ہیں اس وجہ سے آپ کے دل میں بھی اتباع حق کا جذبہ موجزن ہے، جب بھی آپ کے سامنے اپنی کوئی خطا واضح ہوتی ہے آپ فوراً اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

''منتخبات نظام الفتاوی'' کی شکل میں جن مسائل کو پیش کیا جارہا ہے اس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ بالغ نظر علماء کرام انہیں ملاحظہ فرمائیں، اور کوئی قابل اصلاح بات پیش فرمائیں، تاکہ اس کی روشنی میں حوادث الفتاوی کے جوابات مزید نکھر کر امت کے سامنے آئیں، غرض علماء کرام سے امید ہے کہ وہ ضرور اس کتاب کو قابل اعتناء سمجھیں گے اور کوئی بات قابل

اصلاح محسوس فرمائیں تو اطلاع فرمائیں گے۔"فقد ورد فی الخبر عن النبی الصادق الابر صاحب القبر الاطهر صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال: الدین النصیحۃ قیل: لمن یا رسول اللہ؟ قال للہ ولرسولہ"

☆☆☆

تاثرات

جناب مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب
سابق ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب مدظلہ دار العلوم دیوبند کے فاضل قدیم اور صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت علامۃ العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی اس آخری تقریر میں بھی شریک تھے جو انہوں نے وسط ۱۹۳۳ء میں جامع مسجد دیوبند میں فرمائی تھی، اور اسی مہینہ میں وہ حضرت مرحوم کی نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شریک تھے، مفتی صاحب گذشتہ بیس سال سے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں ذمہ دارانہ حیثیت سے افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، نہ صرف جزئیات فقہ پر غائر نظر اور قرآن وحدیث سے مسائل کے استخراج پر کامل دسترس رکھتے ہیں، بلکہ وہ دقت نظر، وسعت مطالعہ اور شارع علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام واحکام کے مزاج اور روح تک پہنچنے کا بھی انہیں ذوق میسر ہے جو کسی مکتب و مدرسہ سے زیادہ قدرت کے ایک عطیہ، اولیاء کامل کے فیضان نظر اور اپنی ذہنی پرواز اور قلبی استعداد کے طور پر حاصل ہوتا ہے، مولانا تقوی و طہارت کی ایک قابل رشک زندگی کے مالک ہیں، عارف عصر حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دامن علم و فضل سے وابستہ رہے ہیں، ان کی زندگی اور ان کے اوقات ایسی خوبصورتی اور دلکشی لئے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب ہوکر دل ودماغ پر ان کی عظمت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔

مولانا نے افتاء کی خدمت عظیم کے سلسلہ میں خاص طور پر جدید مسائل و معاملات پر نظر رکھی ہے، مولانا ان پر پوری نظر رکھتے ہیں، رویت ہلال کا مسئلہ، بجلی کی مشینوں سے ذبیحہ کا مسئلہ، ایک جسم میں دوسرے جسم کی پیوندکاری، جس حصہ زمین پر سال کے نصف حصہ میں رات اور نصف حصہ میں دن رہتا ہے اس میں نماز کے اوقات کا تعین، بینکوں کی طرف سے مختلف النوع مالیاتی اسکیم سے حاصل ہونے والے انٹرسٹ کا مسئلہ، میڈیکل تعلیم کے سلسلہ میں انسانی لاشوں کی چیر پھاڑ کا

مسئلہ، اوراس طرح کے بیسیوں جدید مسائل جوعصر حاضر میں الجھی ہوئی حیثیت میں سامنے آئے اورانہوں نے دیندار طبقہ کے ذہن میں بڑی الجھن پیدا کردی ہے، مولانا نے نص قرآن وحدیث کے ساتھ ضروری اور مناسب اجتہادو اختراع کی روشنی میں ان پر کلام فرمایا ہے، اورانہیں ایسے صاف، شستہ اوردل نشیں دلائل کے ساتھ واضح کیا کہ الجھے ہوئے ذہن سلجھ گئے اور خلفشار میں گھرے ہوئے دماغوں نے سکون پایا۔

تفقہ دراصل دین کی سمجھ کا نام ہے اور سمجھ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے دینی اوامر ونواہی کوانسان پہچان سکتا ہے اوران کے دلائل کا احاطہ کرسکتا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کو دوسرے فقہاء کرام پر اسی سمجھ، تعمق نظر و دوراندیشی اور غیر معمولی ذہانت وذکاوت کی بنا پر امتیاز حاصل ہے، کہنے والوں نے توان کے سرمایہ علم وفضل کو قیاس کہہ کر بے وزن کرنا چاہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسائل ومعاملات میں ان کی یہی دقت نظر ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے، خود حدیث پاک سے بھی اسی مفہوم کا پتہ چلتا ہے: "قال علیه السلام: خیرکم فی الجاهلیة خیرکم فی الاسلام اذا فقهوا، او کما قال"، "ومن یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین" اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس تفقہ کی شہادت حضرت عبداللہ ابن مبارک اور حضرت امام شافعی رحمہم اللہ کے اقوال دیتے ہیں، مثلاً: "قال ابن المبارک: ابو حنیفة أفقه الناس، قال الإمام الشافعیؒ :الناس فی الفقه عیال علی أبی حنیفة"۔

مولانا کے ایسے فتاوی اور تحریریں میری نظر سے اس طرح گذریں کہ ادارہ رسالہ دارالعلوم دیوبند نے عوامی ضرورتوں کا لحاظ کر کے اکثر ان کی تحریریں ان سے لے کر رسالہ دارالعلوم میں شائع کیں، مجھے ان کے مطالعہ سے اس کا احساس ہوا کہ مولانا کا تفقہ، اور بصیرت علمی ایک محدود دائرہ کی چیز نہیں، بلکہ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ فلاں حکم شرعی کا مفہوم اور دائرہ کار کیا ہے؟ اس مفہوم میں کیا چیزیں آ سکتی ہیں اور کیا ان میں نہیں آ سکتیں، اس قوت فیصلہ کے بعد مولانا کی جس موضوع پر گفتگو ہے، اس میں منشاء شریعت کی پوری پاسداری کے ساتھ زمانہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ مولانا کی یہ تحریریں دیندار طبقہ میں مقبول ہوں گی اورالجھے ہوئے مسائل کا یہ حل دور تک اور دیر تک مسلمانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گا، واللہ الموفق وھو المعین۔

☆☆☆

چند باتیں

کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں

حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم القاسمی☆

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے جو بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک جدید دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا فقہی اور شرعی حل بھی ہے جو جدید ایجادات اور نئے معاملاتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے جارہے ہیں، مثلاً میڈیکل سائنس کے میدان میں ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل جیسے اعضاء کی پیوند کاری، مصنوعی طریقہ پر حمل وتولید، پوسٹ مارٹم، انیمیشن، انجکشن سے وضو اور روزہ کا مسئلہ، اسی طرح ٹرین اور ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا، ریڈیو، ٹیلی ویزن سے نماز کا مسئلہ، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹی وی، کی اطلاع پر رویت ہلال کا حکم، نیز پراویڈنٹ فنڈ، بینک اور انشورنس کا انٹرسٹ، اور بینک میں جمع شدہ مال پر زکوۃ کا مسئلہ، دکانوں اور مکانوں کی پگڑی، سودی قرض لینا، بینک کے سود کے مصارف اور بینک سے متعلق کاروبار کی مختلف صورتوں کا حکم وغیرہ وغیرہ۔

الغرض ان جیسے مسائل کی فہرست بڑھتی ہی جارہی ہے، ان مسائل کا حل فقہی نقطۂ نظر سے امت کے سامنے پیش کرنا ایک انتہائی مشکل اور دشوار کام ہے، اس لئے کہ قرآن وحدیث اور فقہ کے قدیم ذخیرہ میں ان مسائل کے نظائر اور ان سے قدیم ترین صورتیں تلاش کرنی ہوتی ہیں، احکام کی علتوں اور اسباب پر غور کرنا ہوتا ہے، اور اپنے زمانہ کے عرف اور رواج کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے ارشاد: "من لم یعرف أحوال زمانه لم یجز الفتیا" کی اہمیت ان مسائل کو دیکھ کر ہی سمجھ میں آتی ہے۔

احقر الوری کے ماوی وملجا سیدی ومرشدی شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب

☆ خادم ادارہ خادم القرآن متصل مسجد جنت الفردوس، چوراہا کریم نگر انصار بلاک ذاکر کالونی شہر میرٹھ۔

ادام اللہ ا قبالہم و عمت فیوضہم العلمیہ والعملیہ کو جدید مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں باری تعالیٰ نے جو غیر معمولی مہارت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ آئندہ صفحات سے ہوگا، موصوف چونکہ خاموش طبیعت، کم گو اور سادہ لوح مزاج کے حامل ہیں، اس لئے حالات بابرکات سے متعلق اختصاراً روشنی ڈالنا اور قارئین کو متعارف کرانا اولاً ضروری سمجھ رہا ہوں۔

ولادت باسعادت:

ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۱۰ء بمقام اوندرا ضلع اعظم گڑھ (مئو) عمل میں آئی، حضرت والا نے دس سال کی عمر میں پرائمری درجہ چار پاس کیا، اس سے قبل چند ماہ سخت علیل رہے، فرماتے ہیں کہ بیماری میں اکثر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کو دیکھتا کہ حضرتؒ مجھے بلا کر اپنے سامنے بٹھاتے اور کچھ دعائیں دیتے، دعائیں تو یاد نہیں کہ کیا دیتے اور کیا فرماتے صرف اتنا احساس ہے کہ ان کی طرف کشش بہت ہوتی اور جی چاہتا کہ ایسا ہی ہوجانا چاہئے، اسی طرح اکثر و بیشتر خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کو بھی دیکھتا وہ بھی اسی طرح شفقت فرماتے، اور حضرت اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو تو کبھی کبھی سبز رنگ کے تخت طاؤس پر جلوہ افروز دیکھتا وہ بھی سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔

اسی زمانہ میں حضرت والا کے سب سے چھوٹے ماموں حاجی عبدالقیوم صاحبؒ جو اس وقت انجمن اسلامیہ گورکھپور میں پڑھتے تھے، وہاں انجمن کے سالانہ جلسہ میں علماء دیوبند تشریف لاتے ان کے بیانات و واقعات ماموں صاحبؒ بیان کرتے اس سے بھی کشش ہوتی کہ ایسا ہی ہوجانا چاہئے۔

غالباً یہی سب باتیں باعث کشش بن گئیں کہ درجہ چار (پرائمری) پاس کرنے کے بعد حضرت والا نے طے کرلیا کہ اب عربی فارسی پڑھ کر عالم بننا چاہئے، والد مرحوم جناب مولانا محمد رفیع صاحبؒ نے بہت ترغیب دی کہ ایک مسلم موضع یوسف پور میں اپنی زمین داری اور چھاؤنی ہے تم وہیں جا کر اس کے قریب موضع فتح پور کے مڈل اسکول میں پڑھو، اور اپنی چھاؤنی میں رہو، اور فرمایا کہ اس موضع کی پوری آمدنی سے جتنا پڑھنا چاہو پڑھاؤں گا، ادھر حضرت والا کا پورا خاندان انگریزی داں تھا اور کم و بیش چھ پشت سے کوئی عربی داں نہیں تھا، البتہ شاہی دور میں خاندان کے لوگ مفتی، قاضی، قاضی القضاۃ، صدر الصدور وغیرہ ملتے ہیں، مگر انگریزی دور میں سب انگلش تعلیم میں منہمک ہوچکے تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ عربی تعلیم کہاں ہوتی ہے۔

مگر حضرت والا کے اس اصرار پر کہ عربی تعلیم ہی حاصل کروں گا والد مرحوم نے بنارس میں جہاں پر خاندانی ماموں کوتوال شہر تھے ان کے پاس لے جا کر اپنے فرزند ارجمند کی دلی خواہش اور نیک تمنا ظاہر کی، چنانچہ کوتوال محمد فاروق صاحب والد مرحوم اور موصوف کو لے کر وہاں کے تمام مدارس اسلامیہ میں گئے، ان مدرسوں میں سے کسی میں داخل کرنا سمجھ میں نہیں

آیا اور واپس لاکر انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے اصرار کیا، مگر حضرت والا برابر انکار فرماتے رہے، اسی حالت میں ایک سال ضائع ہوگیا۔

حسن اتفاق سے حضرت والا کے بڑے ماموں محمد متین صاحبؒ آگئے وہ گورکھپور میں رہتے تھے، کہنے لگے کہ وہاں انجمن اسلامیہ ہے ان کو وہاں اپنے پاس رکھوں گا، وہاں چھ ماہ قیام کے دوران ناظرہ کلام پاک پڑھ لیا، مگر ماموں صاحب کے دو بچے تھے وہ آپس میں گالی گلوچ کرتے تھے جس سے بے حد ضیق ہوتی، آخر تنگ آکر والد مرحوم کو لکھا کہ یہ صورت حال ہے، والد مرحوم نے ایک ملازم کو بھیجا اور یہ لکھا کہ یہ انہیں چند یوم کے لئے بھیج دیجئے، ماموں صاحب نے بھیج دیا، دو چار دن گذرنے کے بعد جب گورکھپور جانے کے لئے کہا تو والد مرحوم نے وہی خط دکھا کر جانے سے روک دیا اور اسی طرح کئی ماہ گذر گئے، اتفاق سے حضرت والا کی منجھلی خالہ جن کے کوئی اولاد نہیں تھی تشریف لے آئیں اور عربی پڑھنے کی خواہش دیکھ کر اپنے ہمراہ قصبہ مبارکپور اعظم گڑھ لے گئیں، بحمد اللہ و بفضلہٖ وہاں مدرسہ احیاء العلوم میں دار العلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ بہت علماء حضرات تھے، اب احیاء العلوم میں تعلیم کا آغاز ہوا، اردو بقدر ضرورت پڑھ کر فارسی پڑھی، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب قدس سرہ، العزیز ولی صفت اور واقعی اللہ کی نعمت تھے بڑی شفقت سے ایک دو ہی سال میں فارسی کا نصاب مکمل کرا کر عربی شروع کرا دی، مبارکپور تشریف لے جانا ۱۳۴۲ھ کا واقعہ ہے، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحبؒ اور مولانا شکر اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ احیاء العلوم اور دیگر اساتذہ بڑی شفقت و محبت رکھتے تھے اور بہت جلد ہی علم الصیغہ وغیرہ کتابیں شروع کرا دیں۔

اسی دوران حضرت والا کے شیخ و مرشد عارف باللہ حضرت مولانا الشاہ محمد وصی اللہ علیہ الرحمہ خلیفہ ارشاد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ احیاء العلوم میں مدرس ہو کر تشریف لائے، حضرت والا اپنے شیخ و ملجاء کی خدمت کو لازم پکڑ کر موصوف ہی کے پاس رہے اور ابتدائی تعلیم کے بعد تین سال بہار شریف کے مدرسہ عزیزیہ میں تعلیم حاصل کر کے دہلی مدرسہ عالیہ فتحپوری تشریف لے گئے، پھر وہاں سے ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں تشریف لاکر ۱۳۵۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اولاً مدرسہ جامع العلوم جین پور اعظم گڑھ میں تقریباً پانچ سال تدریسی خدمات انجام دیں، بعدہ مدرسہ جامع العلوم محلہ دھمال ضلع گورکھپور میں ۳ سال تک اپنے علوم بیکراں و بے پایاں سے طلبہ علوم نبوت کو مستفیض کیا، اس کے بعد پھر بحکم شیخ دار العلوم مئو ناتھ بھنجن میں تشریف آوری ہوئی اور تقریباً پچیس سال کے عرصہ دراز تک درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔

دار العلوم مئو کے قیام کے دوران ہی حضرت مولانا الشاہ محمد وصی اللہ صاحبؒ نے اجازت بیعت و تلقین سے بھی نوازا۔

حضرت والااور شاہ صاحب کا جانبین سے جو والہانہ اور عاشقانہ تعلق تھا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ،حضرت والا کا شمار شاہ صاحب کے اخص الخواص خدام میں ہوتا تھا، حتیٰ کہ گھریلو اور خانگی معاملات میں بھی شاہ صاحبؒ کے مشورہ اور حکم کے مطابق قدم اٹھاتے تھے، شاہ صاحب کی کرامت اور تعلق کا اندازہ ان واقعات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ فرمایا کہ ایک مرتبہ سیدی وشیدائی حضرت شاہ صاحبؒ احقر کے غریب خانہ پر تشریف لائے ،گھر کے پائیں باغ میں ایک آم کا درخت تھا وہ کبھی پھلتا نہیں تھا، میں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کا تذکرہ کیا، موصوف نے اس درخت کے قریب تشریف لے جا کر اس کو پکڑ کر فرمایا: ''یہ گھر والے تمہارے نہ پھلنے کے متعلق مجھ سے شکایت کررہے ہیں، تم پھلا کرو'' یہ بات اگر چہ تعجب خیز ہے، مگر اس کے بعد سے وہ درخت خوب پھلنے لگا۔

اسی طرح فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خانقاہ کے قریب ایک مرتبہ سیلاب آنے کی بنا پر پانی پہنچ گیا، شاہ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا گیا موصوف نے اس پانی کے قریب تشریف لا کر اس کو دھکیلتے ہوئے فرمایا کہ ''جاؤ جاؤ یہاں سے تم یہاں کیوں آ گئے'' اسی وقت سے سیلاب اترنا شروع ہوگیا۔

اتباع سنت کے سلسلے میں مجاہدات وعبرت آمیز واقعات:

یوں تو آپؒ (شاہ محمد وصی اللہ) بچپن ہی سے عجیب حالات خرق عادات وغیرہ کے رکھتے تھے، جیسا کہ آپ کی والدہ محترمہ سے معلوم ہوگا اور دیوبند کے قیام کے زمانہ کے اتباع سنت وخرق عادات کے سلسلے کے حالات میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ اور کچھ سید حکیم محفوظ علی محلہ خانقاہ دیوبند سے معلوم ہوئے ۔

پھر ۱۳۵۰ھ میں جب آپؒ مکان پر بیٹھ گئے تو آپ نے زمینداری کی کل آمدنی لینا بند کردیا، حتیٰ کہ کاشتکاری کا غلہ، اور تالاب کی مچھلی کی آمدنی بھی استعمال نہیں کرتے تھے اور شادی ایک متمول شخص کی لڑکی سے ہوئی، آپ تصور کیجئے کہ اس صورت میں عسرت میں مرکب زندگی کس طرح گذری، یہ حال تقریباً دس سال رہا۔

پھر آپؒ اسی موضع میں ایک زمین خرید کر اپنا مکان بنا کر منتقل ہو گئے، اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آپ نے اس زمانہ عسرت ومجاہدہ میں کیا کیا مشقتیں برداشت فرمائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے فراغت عطا فرمائی تو کہاں تک پہنچایا اس کو ساری دنیا جانتی ہے۔

آپ پر فنا اتنا طاری تھا کہ وصال سے چند ماہ پیشتر قیام ممبئی کے دور میں اپنی مجلسوں میں عام طور سے پڑھا کرتے تھے:

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی　　جان ٹھہری جانے والی جائے گی

پھول کیا ڈالوگے تربت پر مری　　خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

لوگ ان اشعار کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ ممبئی کے اہل بدعت پر نکیر فرمارہے ہیں، ان کی اصلاح کے لئے فرمارہے ہیں، لیکن حالات وفات جاننے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ اپنے انتقال کے حالات وواقعات بیان فرمارہے تھے، سفر حج میں بحر عرب میں پہنچ کر غریق فی الماء ہوگئے "**برد الله مضجعه وانار بفيضه اهل هذا العالم الناسوتي**" (بحکم حضرت الاستاذ جناب مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب دامت برکاتہم) (مرتب)۔

دارالعلوم مئو کے قیام کے بعد حضرت والا کی تشریف آوری ماہ رجب ۱۳۸۵ھ میں بحکم شیخ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند میں ہوئی اور فتاوی نویسی کے عہدہ پر فائز کئے گئے، اور اب تک اسی خدمت عظمی کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

تصانیف:

یوں تو حضرت والا کے تحریر کردہ فتاوی ہزاروں سے زائد رجسٹروں میں محفوظ ہیں، اسی کے ساتھ "**انوار السنة لروادالجنة المعروف به فتح الرحمن فی اثبات مذهب النعمان**" کی تبییض کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ یہ کتاب علم حدیث میں ایک عجیب انداز کی کتاب ہے، مشکوۃ شریف پڑھنے والوں کو عموما یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ احناف کے پاس سرمایہ حدیث نہیں ہے، اگر ہے تو بہت کمزور اور بہت کم ہے، اس کتاب سے یہ خلجان بالکلیہ رفع ہوجاتا ہے اور واضح ہوجاتا ہے کہ احناف کی تائید واثبات میں جس قدر احادیث صحیحہ ہیں کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں۔

یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کی آخری تصنیف ہے، کما لا یخفی علی من طالعہ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس کی وجہ تصنیف میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ جب میں "ہدایہ" پڑھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ احناف کے پاس سرمایہ حدیث نہیں ہے، اگر ہے تو بہت کمزور ہے، پھر جب مشکوۃ پڑھنے لگا تو معلوم ہونے لگا کہ واقعی مسلک احناف میں احادیث کا سرمایہ نہیں ہے، یہاں تک کہ میں نے طے کرلیا کہ شافعی بن جاؤں، یہ خیال اپنے استاذ شیخ عبد الوہاب متقیؒ سے بیان کردیا تو شیخ نے فرمایا کہ احناف کی تائید میں جتنا مضبوط اور کثیر سرمایہ حدیث ہے اتنا کسی کے پاس نہیں ہے، تم فلاں فلاں کتابیں دیکھ لو پھر مجھ سے کہنا۔

چنانچہ ان کتابوں کا مطالعہ کرلینے کے بعد میری یہ غلط فہمی رفع ہوگئی، پھر میں نے احناف کی شروح مشکوۃ دیکھنا شروع کیں تو مجھے کہیں یکجا سرمایہ ایسا نہیں ملا جس سے مشکوۃ پڑھنے سے پیدا شدہ خلجان رفع ہوجائے تو اسی وقت سے یہ خیال

تھا کہ ایک کتاب مشکوۃ ہی کے طرز پر ایسی ہونی چاہئے جس سے خود یہ خلجان ختم ہو جائے، چنانچہ مشکوۃ ہی کے طرز پر یہ کتاب حضرت دہلویؒ نے تالیف کی۔

واقعی یہ کتاب عجیب ہے، بالکل مشکوۃ کے طرز پر اور شرح حدیث بالحدیث ہے، اس کتاب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ بالکل مشکوۃ کے طرز پر ایک باب قائم کرتے ہیں پھر اس باب میں جتنے مذاہب معتبرہ وارد ہیں سب کو بیان کرتے ہیں، سب سے قوی مذہب پہلے بیان کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس سے کمزور مذہب، پھر اسی طرح اس سے کمزور مذہب، پھر اسی طرح سب سے کمزور مسلک سب سے اخیر میں نقل کرتے ہیں۔

نیز اولاً سب سے کمزور مسلک کی احادیث و روایات نقل کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس سے قوی مذہب کی احادیث اور سب سے اخیر میں سب سے قوی مذہب کی احادیث و روایات اس طرح جمع کرتے ہیں کہ بعد کی احادیث و روایات اپنے ماقبل کا خود جواب بنتی ہیں، اور شرح حدیث بالحدیث کا لطف بھی حاصل ہوتا رہتا ہے۔

اس لئے بھی شیخ کی یہ تالیف نوادرات روزگار میں سے ہے۔ اور اس درجہ میں ہے کہ ہدایہ و مشکوۃ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کو سبقاً سبقاً پڑھا جائے۔

یہ کتاب ''فتح الرحمٰن فی اثبات مذہب النعمان'' حضرت حکیم محمود صاحبؒ معروفی کے جو ایک علمی خاندان کے فرد تھے کتب خانہ کے مخطوطات سے جو نہایت بوسیدہ کرم خوردہ تھی، ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئوی محدث کبیر کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اور حضرت موصوف ہی کے ایماء و امر سے حضرت والا نے مسلسل ڈھائی سال کی محنت و کاوش کے بعد اس کی تبییض کی اس طرح یہ قابل اشاعت ہوئی، اس کا کوئی نسخہ مخطوطہ بھی نہیں ملتا تھا بڑی کاوش اور تلاش سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے مخطوطات کے گھر سے برآمد ہوئی اس کے ٹائٹل پر ''فتح الرحمٰن فی تائید مذہب النعمان'' لکھا ہوا ہے، بقیہ عبارتیں حرف بحرف یکساں ہیں اور اس نسخہ کا سراغ بھی خلیق نظامی کی کتاب سے جو کہ شیخ عبدالحقؒ کے حالات میں لکھی ہے اس سے ملا، حضرت والا نے مختصر تعلیقات کے ساتھ طبع کرا کر اس کو زندہ کر دیا ہے، دعا ہے کہ متن کتاب تو زندہ ہو گیا اب کوئی اللہ کا مخیرؒ بندہ ان احادیث کی سنداً لا کر اس کتاب کو مستند بنا دے، تاکہ ان احادیث متداولہ کی سندیں بھی واضح ہو جائیں اور اس کی افادیت مکمل ہو جائے۔

بقیہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اقسام الحدیث فی اصول التحدیث، عربی فوٹو آفسیٹ

۲۔اصول حدیث، مترجم بترجمہ اردو

۳-آسان علم صرف جزءاول معروف بہ اردو میزان

۴-آسان علم صرف جزدوم معروف بہ اردو منشب

۵-آسان علم نحو معروف بہ اردو نحو میر

۶-آسان علم نحو معروف بہ معلم سوادخوانی عربی

۷-رویت ہلال کی شرعی حیثیت

اس وقت فتاوی کا جو مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے حضرت والا ہی کے علوم بیکراں و بے پایاں کے بحر عمیق کا ایک حصہ ہے۔

جدید منتخبات نظام الفتاوی کی ترتیب کے سلسلے میں طریقہ کار یہ رہا کہ قدیم نظام الفتاوی میں جو فتاوی جدید مسائل سے متعلق تھے ان کو اخذ کیا، اور بقیہ فتاوی رجسٹر اور رکھے ہوئے مسودات سے نقل کئے، اور اس کا اہتمام کیا گیا کہ جدید مسائل سے متعلق فتاوی ہی کو اس جلد میں پیش کیا جائے، کیونکہ جدید مسائل کے حل کے لئے امت ہر وقت پریشان رہتی ہے اور نئی ایجادات نے ان کی اہمیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

اسی طرح حوالہ جات کا بھی اہتمام کیا، اور جملہ مسائل کو باب در باب اور فصل در فصل پیش کرنے کی سعی کی گئی بعض استفتا اور جوابات فارسی یا عربی میں تھے ان کا ترجمہ بھی کردیا گیا ہے، یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جہاں علماء دیوبند نے نحو، صرف، تاریخ اور تفسیر وغیرہ علوم وفنون پر بیشمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن سے ملک وبیرون ملک کی لائبریریاں مزین ہیں اسی طرح علم فقہ پر ایک ناقابل فراموش خدمت عظمی انجام دی ہے، خصوصا جدید فقہی مسائل پر۔

جدید مسائل کے حل اور ان پر بحث کی ابتداء علماء دیوبند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ سے ہوئی، یہی نہیں، بلکہ موصوف نے حوادث الفتاوی کے نام سے ان جیسے مسائل کو علاحدہ مرتب فرمایا۔

اور اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ جس طرح امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں قرآن وحدیث سے استنباط کردہ مسائل کی ترتیب کے لئے ایک جماعت اپنے تلامذہ ومسترشدین کی تیار کی اسی طرح آپ نے ایک ایسی جماعت ورثہ میں چھوڑی جس نے آپ کے بعد ان جیسے مسائل کو مزید بسط وتفصیل کے ساتھ امت مسلمہ کے سامنے پیش کر کے قابل قدر کارنامہ انجام دیا جن میں خصوصا مایہ ناز مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ مفتی اعظم پاکستان کی ذات گرامی قابل ذکر ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے جن مسائل پر بحث کی ہے ان میں سے بعض مسائل بنام جواہر الفقہ طبع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

جدید مسائل کے سلسلہ میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ چونکہ ان کا مدار نئی ایجادات پر ہے اور حالات کے تغیر سے مسائل میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے، مثلاً جب پہلے پہل چشمہ رائج ہوا تو جملہ مفتیان کرام نے فتوی دیا کہ اس کو لگا کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوتا ہے، اور ہر ایسی چیز مکروہ ہے کہ جس سے نماز میں خلل واقع ہو "**كما قال ويكره للمصلي ما يشغل البال ويخل بالخشوع**"(نورالایضاح ص ۸۸) لیکن کچھ دنوں بعد یہ فتوی دیا کہ نظر کے چشمہ کو لگا کر نماز پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ جس کی بینائی کمزور ہے اس کو بغیر چشمہ لگائے سکون و طمانیت حاصل ہی نہیں ہوگا، آج بھی "امدادالفتاوی" (جلداول ۴۳۹) میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

اسی طرح جب ہاتھ کی گھڑی کا رواج ہوا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اس کو باندھ کر مردوں کے لئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اور یہ دلیل دی گئی کہ عورتوں کی چوڑیوں کے مشابہ ہے، لہذا اس سے مشابہت بالنساء لازم آئے گی، اور فرمان نبوی علیہ السلام "**من تشبه بقوم فهو منهم**" کے خلاف ہوگا، مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہر مفتی کے پاس گھڑی ملتی ہے، اس کے بعد جب لاؤڈاسپیکر کی ایجاد ہوئی اور اس کے ذریعہ نماز کا مسئلہ چھڑا تو تمام مفتیان کرام نے مل کر یہ فتوی دیا کہ اس سے نماز جائز نہیں ہوگی اور دلیل اس کی فتاوی شافعی سے لائے کہ بازگشت آواز کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے، فتاوی دارالعلوم دیوبند قدیم (۱۷۵/۵) پر آج بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔

اس کے بعد جب ریل گاڑی چلی تو فتوی یہ دیا گیا کہ ریل گاڑی بھی چونکہ دابہ کے حکم میں ہے اور چوپائے پر صرف نفلی نماز ادا کی جاسکتی ہے، لہذا ریل گاڑی پر نفل نماز کے علاوہ کوئی نماز ادا کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن آج جملہ مفتیان کرام فتوی دیتے ہیں کہ تمام نمازیں ریل گاڑی میں ادا کرنا جائز ہے۔

اس کے بعد جب ہوائی جہاز کی ایجاد ہوئی تو فتوی دیا گیا کہ اس میں نماز ادا کرنے میں چونکہ سجدہ کا تحقق نہیں ہوتا، اس لئے کہ سجدہ کی تعریف ہے: "**وضع الجبهة على الارض**" اور وہ فضا میں اڑتا ہے، لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اس میں بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

لہذا ان جیسے مسائل میں اہل نظر کے درمیان اختلاف کا پایا جانا بعید بات نہیں بلکہ عین تقاضا فطرت ہے، اور ایسے مسائل کے جوابات کتب فقہیہ میں صراحۃً نہیں ملتے بلکہ مفتی عصر اجتہاد واستنباط سے کام لے کر جوابات دیتا ہے۔

رب ذوالجلال فتاوی کے اس مجموعہ کو نفع عوام وخواص کا ذریعہ بنائے اور حضرت والا کے فیوض وبرکات سے سب کو مستفید فرمائے، اللہم آمین۔

☆☆☆
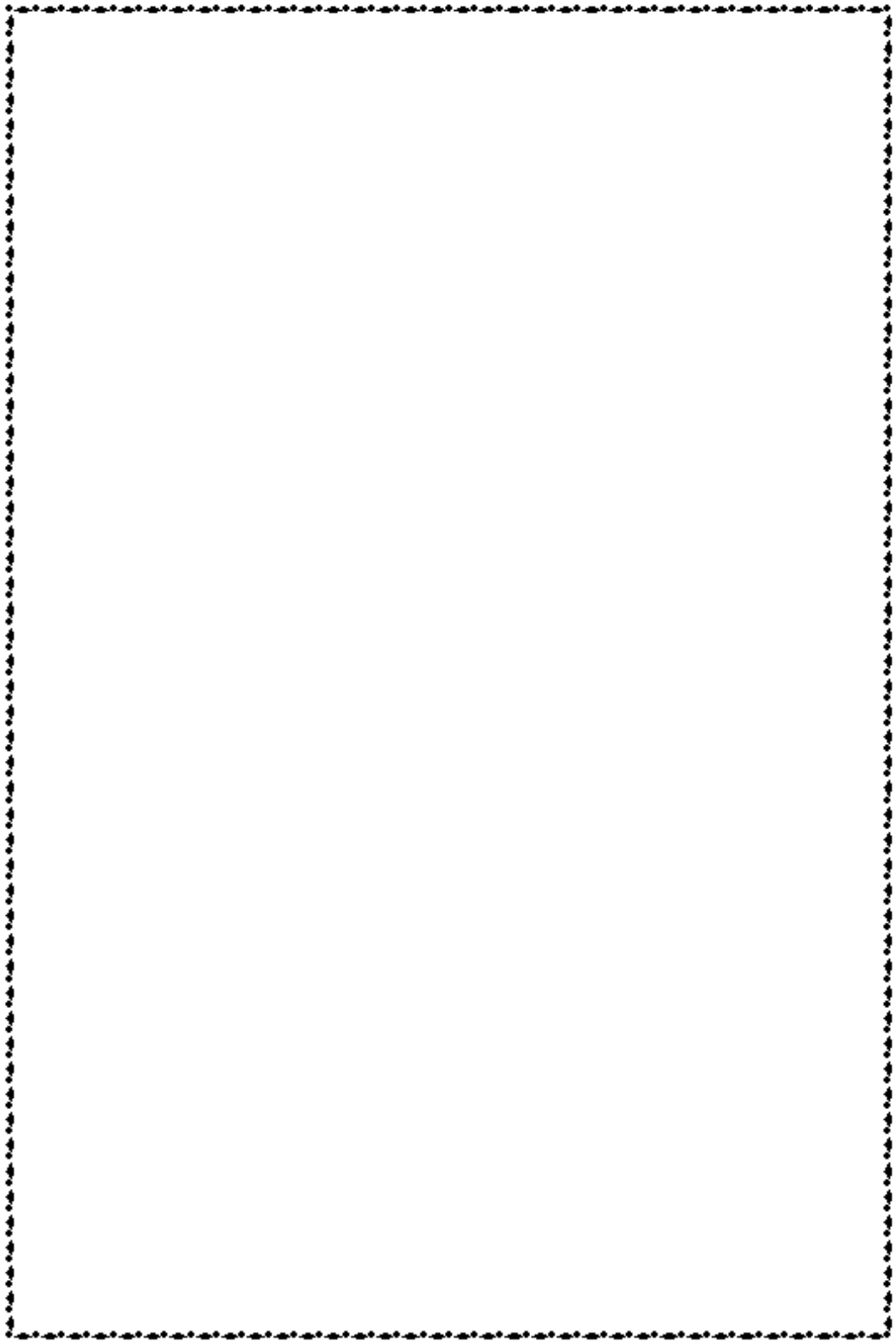
کتاب العقائد والشرک

کتاب العقائد والشرک

کلمہ طیبہ اور شہادت کی حقیقت:

اس سوال کے جواب میں جو خانقاہ حضرت شاہ ارزان قدس سرہ کی جامع مسجد میں ہوا۔

۱۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله

۲۔ أشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله۔

معزز حاضرین! السلام علیکم

ابھی ابھی میں نے دو کلمہ طیبہ کی تلاوت آپ حضرات کے سامنے کی ہے۔ دریافت طلب بات بھی دو میں ہے۔ اول کلمہ طیبہ میں نے کیوں تلاوت کیا اور کیوں تلاوت کرایا۔

معزز حاضرین کل شب خانقاہ شاہ ارزان میں مجلس میلاد النبی ہوئی تھی۔ جس کے مقرر جناب مولانا فضل کریم شاہ اور شاہ عزیز تھے دونوں حضرات نے خوب خوب نکات کی باتیں قرآن کے ماتحت اور گواہ اور گواہی پر بڑی صراحت کی گئی یعنی گواہ کیسا مستند ہوگا اور گواہی کیسی مستند ہوگی۔

اب آپ حضرات سے دریافت طلب بات دوسری یہ ہے کہ جس نے جو گواہی اللہ اور رسول پر دی وہ مستند ہے یا غیر مستند، جبکہ گواہی کے لئے شرط عینی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی بات کہ کلمہ طیبہ کی تلاوت کیوں کی اور کیوں کرائی ظاہر ہے، اس لئے کہ کلمہ طیبہ کے مفہوم کی تصدیق نصیب ہو اور ایمان میسر ہو اسی کلمہ طیبہ کی تصدیق اور اسی کے حق جاننے اور سمجھنے اور اسی پر اعتقاد رکھنے کا نام ایمان کی حقیقت ہے۔ کلمہ طیبہ کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ معبود برحق اور یکتا و بے مثل ہے۔ اور جناب محمد ﷺ اللہ کے برحق رسول و

نبی آخر الزماں ہیں۔

دوسری بات گواہی جو دی کیسی ہے۔جب دل سے حق جان کر دی تو وہ مستند اور صحیح ہے شرط عینی ان چیزوں کے لئے ہے جن کا وجود بھی عینی ہو، جیسے انسان کے موجود ہونے یا اس کے مرد ہونے یا عورت ہونے کی شہادت کہ ان چیزوں کا وجود بھی عینی ہے تو ان چیزوں کی شہادت کے لئے شرط عینی نہیں ہے، بلکہ اس کے وجود کا تحقق و یقین آثار و علامات سے ہو جانا شہادت دینے کے لئے کافی ہے جیسے خود انسان ہی کی عقل کا وجود کوئی دکھا نہیں سکتا ہے عینی مشاہدہ نہیں کرا سکتا ہے، مگر شہادتیں دیتا ہے کہ فلاں عقلمند اور بڑا عقل والا ہے اور محض اس بنا پر کہ عقل آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں، بلکہ عقل اپنے آثار و علامات سے ہی جانی پہچانی جاتی ہے۔

پس اس طرح اللہ وحدہ لاشریک کا وجود اس دنیا میں ان آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا ہے، بلکہ آثار و علامات اور اس کی قدرت ظاہرہ و باہرہ سے اس کے وجود پاک کا تحقق و یقین ہے شہادت دی جائے گی اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ کا وجود گرامی اگر چہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، لیکن آپ کی تعلیمات، نیز اور آثار و علامات و تواتر سے آپ کے وجود مبارک کا تحقق اور یقین موجود ہے شہادت ہے دی جائے گی۔

ایک عقل مند و سلیم الطبع کے سمجھنے کے واسطے اتنا کافی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود عفی عنہ

۱- اولیاء و شہداء کے زندہ ہونے کا صحیح مفہوم:

اللہ کے ولی، شہید قبروں میں زندہ ہیں اور ان کو اللہ کے ہاں سے کھانا ملتا ہے، ایسا ہی ایمان اللہ کے رسولوں کے ساتھ رکھنا درست نہیں ہے تو اس کے ثبوت میں دلیل دیجئے؟

۲- کیا اولیاء اور شہداء سے ہماری رہبری کا کام لیا جاتا ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ مذکورہ ہستیوں سے ہماری رہبری و رہنمائی کا کام لیتا ہے؟

۳- دعاء میں اولیاء کو سفارشی بنانا:

کیا مذکورہ ہستیوں کو ہماری دعاء خدا تک پہنچانے کے لیے سفارشی بنانا جائز ہے، جبکہ دنیا میں اللہ کے زندہ ولی

موجود ہیں اور ان سے یہ کام لیا جاتا رہا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

شہیدوں کے بارے میں قرآن پاک میں اس آیت کریمہ: "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل الله أموات بل أحیاء ولکن لا تشعرون" (۱) کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی جو ہم سب کے بڑے اور ہم سب کے معتمد ہیں اس طرح فرماتے ہیں:

(اور مت کہو اس کو جو مارا گیا ہو خدا تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے لڑکر، جو اس لڑائی میں دنیا کی، یا اپنی کچھ غرض نہ تھی، ان کو نہ کہو مردے ہیں، یعنی ان کو مردہ نہ کہو کہ مرے نہیں، بلکہ جیتے ہیں اسی جہاں میں، پر تم کو خبر نہیں، اور نہیں جانتے تم کہ ان کی زندگی کس طرح کی ہے تمہاری سمجھ میں نہیں آتی)۔

اسی طرح کی ایک اور آیت چوتھے پارہ میں آل عمران میں ہے: "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله أمواتاً، بل أحیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اٰتاھم الله من فضله" (۲)۔

اس کا ترجمہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

(اور نہ بوجھو اور نہ سمجھو ان لوگوں کو جو مارے گئے ہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں مردے، یعنی مردے نہیں بلکہ جیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے پاس روزی پاتے ہیں خوشی کرتے ہیں اس چیز سے جو دیا ہے ان کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے)۔

اور آیت کریمہ: "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله أمواتاً" (۳) کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے احادیث صحیحہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے شہداء غزوۂ احد کے سلسلے میں فرمایا ہے:

"(جعل الله أرواحھم فی جوف طیر خضر) ترد أنھار الجنة، تشرب من مائھا ولبنھا وعسلھا وشرابھا الطھور (تأکل من ثمارھا وتاویٰ) إلی قنادیل من ذھب معلقة فی ظل العرش، فلما وجدوا طیب ماکلھم ومشربھم ومقیلھم قالوا: من یبلغ إخواننا عنا أی عن قبلنا إنا أحیاء فی الجنة نرزق لئلا یزھدو ا فی الجهاد ولاینکلوا عند الحرب، فقال الله تعالیٰ: أنا أبلغھم عنکم، قال: وأنزل الله

۱- سورۂ بقرہ: ۱۵۴۔
۲- سورۂ آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰۔
۳- سورۂ آل عمران: ۱۶۹۔

عزوجل: "ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله أمواتاً" (۱)۔

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ جب شہید کی روح شہید کے جسد ناسوتی اور عنصری سے نکل جاتی ہے تو اس کو عرش کے نیچے سبز چڑیوں کے قالب میں کردیا جاتا ہے، جہاں وہ جنت کی سیر کرتی رہتی ہیں اور جنت کی نہروں سے اور جنت کے پھلوں اور نعمتوں سے کھاتی پیتی رہتی ہیں اور عرش کے نیچے جو سونے کی قندیلیں لٹکی ہوتی ہیں ان میں سیر کرتی ہیں اور خوش ومست رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ جو دنیا میں موجود ہیں ان کو کسی طرح خبر پہنچ جائے کہ دیکھو شہید ہونے کی برکت سے ہم اس نعمت اور خوشی میں ہیں، لہذا تم لوگ کبھی جہاد کرنے میں سستی نہ کرنا اور نہ لڑتے ہوئے منہ موڑنا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کی جانب سے دنیا والوں کو یہ خبر پہنچا دیتا ہوں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: **"ولا تحسبن الذين الخ"** (۲)، پس اس آیت کریمہ میں بھی یہ اشارہ ہوگیا کہ شہید دنیا میں نہیں آتے۔ اور پہلی آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ان کی زندگی ناسوتی وعنصری نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس ایسے رنگ کی ہے جس کی کیفیت تامہ ہم نہیں سمجھ سکتے، البتہ ان کے روحانی فیضان سے متمتع ہونا جائز نہیں ہوتا، اسی طرح ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبروں میں ان کا جسد عنصری کس طرح رہتا ہے اس کا علم ہونا ضروری نہیں، البتہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ان کے جسد عنصری کو نہیں کھاتی، نیز اس آیت کریمہ: **"أولئک الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئک رفيقا"** (۳)۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو انسان کفر وشرک وبدعت سے محفوظ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا سچا تابع اور دین دار ہوگا اس کے چار درجے ہیں، ان میں سب سے اونچا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، اس کے بعد صدیقین کا درجہ ہے، اس کے بعد شہیدوں کا درجہ ہے اور اس کے بعد صالحین کا درجہ ہے، اور صالحین کا مفہوم یہی ہے کہ وہ مومن صالح ہو، یعنی شرک وکفر وبدعت سے مبرا اور سنت رسول علیہ السلام کا سچا تابع ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شہیدوں سے دو درجہ بلند انبیاء علیہم السلام کا درجہ ہے اور ان میں بھی سب سے اونچا وبلند پایہ درجہ جناب نبی کریم ﷺ کا ہے۔ جو خاتم رسل اور خاتم انبیاء ہیں، لہذا ان کے درجہ بلندی وخصوصیات کا احاطہ امتی کے بس میں نہیں اور اسی وجہ سے یہ عقیدۂ ماثورہ ہے کہ جس حصۂ زمین سے جسد اطہر ملا ہوا ہے وہ حصہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عرش سے بھی زیادہ محبوب ہے، لہذا

۱- ابوداؤد شریف مع بذل المجهود کتاب الجهاد باب في فضل الشهادة ۱۲/ ۴ ط دار الکتب العلمیہ بیروت، مسلم کتاب الامارة باب بیان أن أرواح الشهداء في الجنة ۷/ ۳۷، رقم الحدیث: ۱۲۱ (۱۸۸۷)۔

۲- سورۂ آل عمران: ۱۶۹۔

۳- سورۂ نساء: ۶۹۔

انبیاء علیہم السلام کو شہیدوں وغیرہ پر قیاس کرنا قطعاً غلط ہے، بلکہ ان کا مرتبہ بے انتہا بلند ہے باقی ۲ و ۳ میں جو باتیں لکھی ہیں وہ شرعاً صحیح نہیں ہیں۔

اور زندہ ولیوں پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے اور کلام پاک میں جو وسیلہ کا کلمہ وارد ہے اس کا بھی یہ مفہوم نہیں ہے جس کا ذکر ان دو نمبروں میں ہے، ہاں روحانی فیض حدود شرع کے مطابق ثابت ہے، اسی طرح اتنی اور بھی گنجائش ہے کہ کسی مردہ بزرگ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح سے خود دعاء کر سکتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ ہمارے علم میں یہ آپ کے ولی ہیں، اپنے اولیاء سے آپ نے ہمیں محبت کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ محبت نیک کام ہے، پس اس نیک کام کو وسیلہ بنا کر ہم آپ سے دعاء کرتے ہیں کہ ہماری دعاء قبول فرمالیں اور بس۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

تقلید شخصی کی پابندی کس طرح ہوئی؟

۱-اجتہاد کی بندش کا فیصلہ کس سال اور کس مقام پر ہوا؟

۲-علماء یا فقہاء جنہوں نے اجماعِ امت کی رہنمائی اور اجتہاد کی بندش جاری کی ان بزرگوں کے اسمائے گرامی اور تعریف کیا ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سرخیل جماعت اہلِ حق حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو مقلدین وغیر مقلدین دونوں ہی کے نزدیک معتمد او معتبر ہیں، وہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "الانصاف" میں تحریر فرماتے ہیں: **"فالتمذهب للمجتهدين سر ألهمه الله تعالى العلماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون أو لا يشعرون"**۔

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ مذہب مجتہدین کی پابندی ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈالا اور ان کو اس پر مجتمع کر دیا خواہ وہ اس کو جانیں یا نہ جانیں (۱)۔

یعنی یہ اجماع عملی ہے اجماع قولی نہیں ہے کہ آپ کے دونوں سوالوں میں سے کوئی سوال اس پر متوجہ ہو، اور اجماع

۱- الانصاف مع الترجمہ ر ۶۲۔

عملی بڑھا ہوا ہوتا ہے اجماعِ قولی سے، اس لیے کہ اجماعِ قولی کا مآل بھی وہی اتحاد فی العمل ہوتا ہے، جو اجماعِ عملی میں بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔

نیز یہ اجماع اللہ تبارک وتعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ امت کی حفاظت اور گمراہی سے اس کو بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری صدی ہجری کے بعد ہی جبکہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کا زمانہ ختم ہونے والا تھا۔ علمائے حق کے قلب پر یہ الہام فرمادیا۔ اور سب علمائے اہلِ حق اس الہام پر مجتمع ومتحد ہو گئے۔

اور اہل ہویٰ او راہل ضلال جو ابھرنے والے ہی تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس اتحاد واجماع سے امت کو افراتفری وابتلاء فی الضلال سے بھی بچالیا۔ اورامتِ محمدیہ کی اسی حکمت (حفاظت وامن عن الضلالہ) کے ماتحت تقلید شخصی بھی ازخود وجود میں آگئی اور وہ بھی اسی الہام برحق سے ہم جنس ہے، اس کی جانب بھی حضرت شاہ صاحب نے اسی کتاب کے (صفحہ ۷۰) میں اشارہ فرمایا ہے۔ اور امت کے امن عن الضلال اور اس کی حفاظت وانتظام کی جانب اشارہ متعدد احادیث میں ہے، مثلاً یہ روایت: "عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل وملٰئكة بالنهار" (الیٰ آخر الحدیث)(۱)۔

اس حدیث کی شرح میں صاحب ''فتح القدیر'' فرماتے ہیں: "فيه الأخبار بما نحن فيه من ضبط أحوالنا الخ''۔ اور شارح مشکوٰۃ صاحب ''اشعۃ اللمعات'' اس حدیث پاک کے تحت اس طرح فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا آنا جانا برائے ضبط احوال و دربرداشتن احوال ایشاں ہے۔ اور ہمارے احوال واعمال کے ضبط وانتظام کا اعلیٰ فرد یہ ہے کہ اس امت کے دین حنیف کی پوری حفاظت کا انتظام ہے کہ بے راہ رووں کی بے راہ روی اور اہل ہویٰ وضلال اور ان کے فاسد حالات واعتقاد سے حفاظت رہے، اور اس کا پورا انتظام امت میں پیدا ہو جائے اور انہیں باتوں کا الہام اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری صدی کے بعد ہی میں جب زمانہ خیر القرون ختم ہونے کے قریب تھا علمائے حق کے قلب میں ڈال کر سب کو اس پر مجتمع فرمادیا کہ اب یہی چار ائمہ ہدیٰ جن کی فقہ واستنباط سب برحق ہیں اور ان کے اصول استنباط وفروع شائع ومکمل ہو چکی ہیں۔ انہی کی اتباع میں انحصار کردیا جائے اور اسی کا دوسرا نام تقلید ہے۔

نیز اسی الہام کی ایک کڑی اسی مذکورہ بالا بے راہ روی وغیرہ سے تحفظ کے لئے تقلید شخصی کا وروفی القلب ہے اور اسی کا نام اجماع عملی ہے۔ اور ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اجماع عملی بڑھا ہوتا ہے اجماع قولی سے۔

۱- رواہ البخاری ومسلم، مشکوٰۃ: ۶۲، باب فضائل الصلوٰۃ۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقلید شخصی پر من جانب اللہ اجماع عملی منعقد ہوگیا ہے۔"**فوضح الحق و طار الاشکال**"۔
(نوٹ) البتہ تتمیماً للفائدہ یہ لکھدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اجتہاد مطلق کے بارے میں تھی ـــــ باقی ضمنی اجتہاد جیسے اہل تخریج وغیرہ کرتے ہیں ممنوع نہیں، بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے جس امام کا مقلد ہو اس کے اصول استنباط کی موافقت واتباع کرتے ہوئے تخریج مسائل کرسکتا ہے، یہ ضمنی اجتہاد قیامت تک جاری رہے گا، اس ضمنی اجتہاد کی تفصیل وتشریح ائمہ اربعہ کے اصول وقواعد میں دیکھی جاسکتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۴/۱۴۱۱ھ

(قادیانیوں کے بارے میں) وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا حکم شرعی:

رسول اللہ ﷺ نے کبھی ذاتی انتقام نہیں لیا۔ رسول اللہ (ﷺ) نے صرف اور صرف اسلام کی بقاء کے لیے قتال کا حکم دیا، خلفائے راشدین بھی اسی سنت رسول ﷺ پر عمل کرتے رہے، قتل کی سزا اس شخص کو دی جاتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو آخری پیغمبر تسلیم نہ کرے، اور اپنی طرف سے کوئی متبادل پیغمبر تجویز کردے، لیکن وفاقی شرعی عدالت نے قادیانیوں کے لیے موت کی سزا تجویز نہیں کی ہے۔

مندرجہ بالا ٹھوس حقیقت کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت کا قادیانیوں کی تردید رسالت کے نا قابل معافی جرم کو نظر انداز کردینا، توہین سنت اور توہین خلفائے راشدین ہے، اگر ہم وفاقی شرعی عدالت کی اس توہین سنت اور توہین خلفائے راشدین کے فیصلہ کو چیلنج نہیں کرتے تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کو لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف جانا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

قادیانیوں کا تردید رسالت کا جرم نا قابل معافی جرم ہے، اس کو نظر انداز کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور ایسے مجرم کو شرعاً ثبوت جرم ہوجانے کے بعد سزائے موت دے دینا توہین خلفائے راشدین نہیں ہے۔ بلکہ سنت صدیق کے عین مطابق ہوگا، "**كما يظهر من هذه العبارة: "فقاتلهم أبوبكر ؓ، حتى قتل الله المسيلمة باليمامة و العنسي بصنعاء"** (۱)۔

۱- 　نووی شرح مسلم ۱/۳۸۔

اور اس سنتِ صدیق کی اور ان دونوں مجرموں کے کیفر کردار تک پہنچنے اور پہنچانے کی مزید کیفیت و تفصیل "البدایۃ والنہایۃ" کی جلد ششم کے (ص ۳۰۵، اور ۳۰۴) پر دیکھی جاسکتی ہے۔

لہذا شرعی ضابطہ سے قابو پانے کے بعد کوتاہی کرنا عند اللہ ناقابل معافی جرم ہوگا۔ اور آخرت میں جواب دہی بھاری ہوجائے گی۔ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کو منہ دکھانا بھی مشکل ہوجائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۳/۱۴۱۱ھ

شرعی حجت کیا کیا ہیں؟

فقہ حنفی کا مسئلہ ہے کہ اگر ایسے دیہات میں جہاں عید کی نماز نہ ہوتی ہو قربانی طلوع آفتاب کے بعد بغیر نماز عید پڑھے ہوئے کرلی جائے تو درست ہے، کیا حدیث شریف سے اس کا ثبوت ہے، یا آپ ﷺ کے زمانہ میں ایسا ہوا ہے، اگر ہوا ہے تو مع حوالۂ کتب جواب سے نوازیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

عبارت سوال اور اس کی پرواز سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کے نزدیک حجۃ شرعیہ صرف صراحۃً حدیث پاک یا آپ ﷺ کے زمانہ میں کسی واقعہ کا ہونا ہی ہے، ورنہ انہیں دو صورتوں میں حصر نہ فرماتے، بہر حال بعض چیزیں پیش خدمت ہیں ان کا حکم شرعی صرف انہیں دو اصولوں سے ارشاد فرمائیں، تاکہ انہیں کی روشنی میں رہ کر مسئلہ مجوث عنہا کا حکمِ شرعی ارسال کیا جاسکے، بعض چیزیں باعثِ خلجان بنی ہوئی ہیں جو درج ذیل ہیں، ان کا حکم شرعی مدلل و مکمل طور پر مع حوالہ کتب عنایت فرمائیں تاکہ باعث رفع خلجان ہوسکے:

۱- ایک شخص کسی کا گھر غصب کر کے سالہا سال اس میں رہا پھر کسی طرح سے واگذار کرالیا تو اتنے دنوں تک غاصب جو اس میں رہا اس کا عوض دلایا جائے گا یا نہیں اگر نہ دلایا جائے تو اس پر کیا صریح حدیث ہے اور اگر عوض دلایا جائے تو کیا دلایا جائے اور اس پر کیا صریح حدیث ہے؟

۲- کوئی آفاقی مواقیت سے باہر باہر آفاق ہی آفاق میں گذرتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے اگر جدہ سے احرام باندھے تو اس پر کیا صریح حدیث ہے اور اگر جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے اور اس پر کیا حدیث

ہے اور اگر بلا احرام باندھے مکہ مکرمہ چلا جائے تو اس پر کیا حدیث کا حکم ہے اور کس حدیث سے ہے؟

کم از کم ان سب صورتوں میں کوئی حدیث شریف جناب کے پاس ہو تو بیان فرمائیں ۔ پھر آنجناب کے اس مطلوبہ سوال کا جواب دیا جائے گا۔

اور اگر آنجناب کے نزدیک حجت شرعیہ اور بینۂ شرعیہ صرف احادیث صحیحہ ہی نہیں ہیں تو بیان فرمائیں کہ آپ کے نزدیک کیا کیا چیزیں حجت شرعیہ اور بینۂ شرعیہ ہیں اور کن دلائل سے ہیں؟

۳-یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ کسی آفاقی کو بغیر احرام میقات کے اندر چلا جانا جائز نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص مشرقی ممالک سے بغیر احرام باندھے ہوئے بذریعہ ہوائی جہاز سیدھا چل کر مواقیت کے اندر سے گزرتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر جائز ہوگا تو کس حدیث پاک سے؟ یا زمانہ رسالت کے کس عمل سے جائز ہوگا؟ اور اگر نا جائز ہوگا تو کس حدیث پاک سے یا زمانہ رسالت کے کس عمل سے؟ جبکہ اس زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا اور نہ اس سے سفر ہوتا تھا، ذہن میں رکھ کر اس پر کوئی حدیث پیش فرمائیں، امید کہ اپنے ان دونوں مذکورہ اصولوں سے ان مستفسرہ چیزوں کا حکم شرعی بتلا کر ممنون فرمائیں گے ۔ اور جب تک جناب کا ان ہی دونوں اصولوں کے تحت ان مستفسرہ چیزوں کا جواب نہ آئے گا احقر بھی کوئی جواب نہ دے گا، کیونکہ اس وقت جواب دینا وقت ضائع کرنے سے زائد کچھ نہیں ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

تقلید کے بارے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کا بیان:

ہمارے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا بھانجہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہو کر علیگڑھ میں ایک ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر بن گیا ۔ یہ ڈاکٹر صاحب جماعت اہل حدیث سے منسلک تھے اس نے اپنے کمپاؤنڈر کو بھی جماعت اہل حدیث میں شامل کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسلک کی کتابیں مطالعہ کرنے کی ترغیب دی، تین سال تک وہ اس مسلک کی کتابیں دیکھتا رہا، بالآخر غیر مقلد بن گیا، تین سال کے بعد حضرت مولاناؒ سے ملنے سہارن پور آیا ۔ اور آتے ہی صاف کہہ دیا کہ اب میں حنفی نہیں ہوں بلکہ اہل حدیث میں شامل ہو گیا ہوں، حضرت مولاناؒ کو بہت افسوس ہوا اور مدرسہ مظاہر علوم کے علماء سے فرمایا کہ اپنے اس شاگرد کو سمجھاؤ اور اس کے شبہات کا ازالہ کرو! تین دن وہ اساتذہ مظاہر علوم سے گفتگو کرتا رہا اور اپنے مسلک جدید پر جما رہا اتفاق سے اسی زمانے میں احقر بھی حضرتؒ سے ملنے کو تھانہ بھون سے سہارنپور پہنچ گیا، مجھے دیکھ کر

حضرتؒ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم بڑے اچھے موقع پر آئے۔ یہ تمہارا شاگرد حقیقت سے بیزار ہوکر جماعت اہلِ حدیث میں شامل ہوگیا ہے، تین دن سے علمائے مظاہر علوم اس کو سمجھا رہے ہیں مگر وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے، تم بھی اس کو سمجھاؤ یہ باتیں ہورہی تھیں کہ وہ مجھ سے ملنے آگیا، میں نے کہا انشاء اللہ تعالیٰ اس کالحاظ رکھوں گا آپ بھی دعا اور توجہ سے مدد فرمائیں، چنانچہ حسبِ قرارداد بعد عشاء کے وہ میرے پاس آیا، جبکہ میں بستر پر لیٹ گیا تھا وہ پاؤں دبانے لگا میں نے انکار نہ کیا آخر تو شاگرد تھا اب حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

ظفر: ہاں صاحبزادے! بتلاؤ اب تمہارا مسلک کیا ہے؟

شاگرد: جناب والا عمل بالقرآن تو سب سے پہلے ہے، اس کے بعد عمل بالحدیث الصحیح ہے۔

ظفر: اگر تمہارا یہ مسلک ہوتا تو پہلے عمل بالقرآن کو بیان کر کے پھر عمل بالحدیث کا نام لیتے۔

شاگرد: وہ تو ظاہر ہے، اس لیے بیان کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ظفر: یہ تم نے بات بنائی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اہل حدیث قرآن پر عمل نہیں کرتے، لیکن حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں پھر احادیث کو اور جس حدیث کو نصِ قرآن کے موافق پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور بعینہٖ احادیث کو اور جس حدیث کا اختلاف ہے ان کے لیے ہم نے اول قرآن کو دیکھا اور جن احادیث کو نصوص قرآنیہ کے موافق پایا ان کو ترجیح دی "قرأۃ فاتحہ خلف الامام" ہی کا مسئلہ لے لو! ہم نے اس کے لیے قرآن کو دیکھا سورۂ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون**" (۱)۔

ترجمہ: (جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ قرأۃ نہ کرنا چاہئے، بلکہ قرآن کو سننا اور خاموش رہنا چاہئے، امام احمد ابن حنبلؒ کا قول ہے کہ یہ آیت بالاتفاق قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد ہم نے حدیث کو دیکھا۔ تو یہ کسی بھی حدیث میں نہیں آیا: "**إذا قرأ الإمام فاقرؤا**" (جب امام قرأت کرے، تم بھی قرأت کرو) "**إذا كبر فكبروا، وإذا ركع فاركعوا، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: ربنا لك الحمد، وإذا سجد فاسجدوا**" (۲)، تو حدیث میں موجود ہے (کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب رکوع کرے تو رکوع کرو! اور جب وہ

۱- سورۂ اعراف: ۲۰۴۔

۲- مسلم مع النووی رقم الحدیث: ۶۲ (۴۰۴)، ۴/ ۳۵۳۔

"سمع الله لمن حمده" کہے تو تم "ربنا لک الحمد" کہو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو! مگر یہ کہیں نہیں کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی قرأت کرو، بلکہ اگر ہے تو "إذا قرأ فانصتوا" (۱) ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو، امام مسلم اور امام احمد نے اور بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حنفیہ نے اس کو ترجیح دی اور بقیہ کو اپنے محامل حسنہ پر محمول کیا، آمین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ نے اول کو دیکھا، چونکہ آمین دعا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے، اس لئے دعاء کے بارے میں قرآن کو دیکھا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملا: "ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة" (۲) (اپنے رب سے تضرع کے ساتھ آہستہ دعا کرو) تو ہم نے اس مسئلہ میں شعبہؓ کی روایت کو ترجیح دی۔ جس میں وارد ہے: "فقال آمین و خفض بها صوتهٗ" (آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ کے ختم پر آمین کہی اور آواز کو پست کیا، پس آہستہ سے آمین کہی) یہ حدیث ترمذی میں ہے، اس کے بعد رفع یدین کے بارے میں بھی ہم نے اول قرآن کو دیکھا تو حق تعالیٰ کا ارشاد: "قوموا لله قانتین" (۳) اور "الذین هم فی صلوتهم خاشعون" (۴)، پہلی آیت میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ کے سامنے سکوت اور سکون کے ساتھ کھڑے ہوں، دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نماز میں خشوع کرنے والے ہیں وہ کامیاب ہیں اور خشوع کے معنی بھی سکون ہی کے ہیں، اس کے بعد احادیث کو دیکھا تو صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ صحابہ نماز میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھا کر السلام علیٰ فلاں السلام علیٰ فلاں کہتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ما لی أری لکم رافعی أیدیکم کأنها أذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوٰة" (۵) (یہ کیا حرکت ہے کہ تم اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہو، جیسے گھوڑے دم اٹھاتے ہیں نماز میں سکون سے رہو)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام کے وقت بھی ہاتھ اٹھانا کیسے مناسب ہوگا کہ رکوع تو بالکل داخل صلوٰۃ ہے ہاں تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے کہ وہ داخلِ صلوٰۃ یعنی رکن نہیں ہے، بلکہ شرط صلوۃ ہے، اس لیے حنفیہ نے ان روایات کو ترجیح دی جن میں رکوع کے وقت ترکِ رفع یدین ہے، اسی پر اور مسائل کو قیاس کرو! کہ حنفیہ اول قرآن میں دیکھتے ہیں پھر احادیث میں سے جو نصِ قرآن کے موافق یا قریب ہوں ان کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱- مشکوۃ مع شرح الطیبی عن ابی ہریرۃ و قتادہ رقم الحدیث: ۸۲۷ باب القراءۃ فی الصلاۃ ۲/ ۳۱۱۔
۲- سورہ اعراف: ۵۵۔
۳- سورۂ بقرہ: ۲۳۸۔
۴- سورہ مومنون: ۲۔
۵- عن جابر بن سمرہ، صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: (۱۱۹)-(۴۳۰) کتاب الصلاۃ باب الامر بالسکون فی الصلاۃ (۲/ ۳۸۸) ط: دار ابی حیان ۱۹۹۵ء۔

شاگرد: واقعی میں نے ابتک اس نکتہ پر غور نہیں کیا تھا، مگر یہ شبہ اب بھی باقی ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف کرتے ہیں۔

ظفر: عزیز من پہلے تم صحیح حدیث کی تعریف تو بیان کرو! مگر دیکھو حدیث صحیح کی تعریف میں کسی کی تقلید نہ کرنا۔

شاگرد: (تقلید مت کرنا یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پسینہ پسینہ ہوگیا پھر کہنے لگا) میں سمجھ گیا واقعی بغیر تقلید کے کسی حدیث کو صحیح کہنا مشکل ہے، پھر بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید تو جائز ہو۔ اور امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی کی تقلید نا جائز ہو یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ اب میں مسلکِ اہلِ حدیث کو چھوڑتا ہوں اور مسلکِ حنفی اختیار کرتا ہوں۔

ظفر: تم بہت جلد سمجھ گئے اس سے دل خوش ہوا۔ مگر میں اس کی اچھی طرح وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ تقلید کا انکار کرتے ہیں اور تقلید کی مذمت کرتے ہیں وہ بھی کسی حدیث کو بغیر تقلید کے صحیح یا ضعیف یا حسن نہیں کہہ سکتے، رہا یہ عذر کہ حق تعالیٰ نے خبر صادق یا شہادتِ عادل کو حجۃ قرار دیا ہے تو یہ تقلید نہیں، بلکہ اتباعِ حجت ہے میں کہتا ہوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا محض خبر نہیں، بلکہ اس کا مدار محدث کے ظن واجتہاد پر ہے، بعض دفعہ سند کے راوی سب ثقہ ہوتے ہیں، مگر حدیث معلل ہوتی ہے اور علت کی معرفت حاذقین ہی کو ہوتی ہے، ہر محدث کو نہیں ہوتی، ابن ابی حاتمؒ نے ''کتاب العلل'' میں عبدالرحمٰن ابن مہدی کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی معرفت بھی الہام ہے، ابن نمیر نے کہا کہ واقعی سچ ہے اگر محدث سے پوچھو کہ تم نے کیسے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے یا معلل ہے تو اس کے پاس کچھ جواب نہ ہوگا۔ احمد ابن صالح فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت ایسی ہی ہے جیسے سونے اور پیتل کا پہچاننا کیونکہ جوہر کو جوہری ہی پہچانتا ہے پرکھنے والے سے اگر یہ پوچھا جائے کہ تم نے اس کو کھرا اور اس کو کھوٹا کیسے کہا تو وہ کوئی دلیل بیان نہیں کرسکے گا۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ ائمہ حدیث کا کسی حدیث کو صحیح یا معلل کہنا محض خبر نہیں، بلکہ ان کا یہ قول ان کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے تو اس باب میں ان کی بات پر اعتماد کرنا عین تقلید ہے، علامہ ابن قیم کا یہ فرمانا کہ احکام میں تقلید نہیں، اس لئے صحیح نہیں کہ حدیثِ صحیح پر عمل کرنا شرعاً واجب اور ضعیف پر عمل کرنا غیر واجب اور موضوع پر عمل کرنا حرام ہے، تو یہ تقلید احکام ہی میں تو ہے غیر احکام میں تو نہیں، اس لیے فقہاء نے بحث سنت کو اور اس کے قبول ورد کے قواعد کو اصولِ فقہ میں بھی بیان کیا، علامہ ابن القیم کا اس کو اتباع کہنا تقلید نہ کہنا لفظوں کا ہیر پھیر ہے، حقیقت ایک ہی ہے:

عبارا تنا شتیٰ و حسنک واحد　　　وکل الی ذلک الجمال یشیر

عزیز من! قرآن شریف کا پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ یقیناً واجب ہے اور غلط پڑھنا حرام ہے، اب تم بتلاؤ کیا بغیر

ائمہ قرأت کی تقلید کے تم قرآن صحیح پڑھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں اور یہ بھی تقلید فی الاحکام ہی ہے، اسی طرح حدیث کو پہچاننا اور صحیح کو ضعیف سے الگ کرنا بھی واجب ہے اور اس میں تقلید ائمہ کے بغیر چارہ نہیں۔

پھر جماعت اہل حدیث کس منہ سے تقلید کا انکار کرتی ہے، پھر تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ محدثین نے جو اصول حدیث کی صحت وضعف کے لیے مقرر کئے ہیں، ایسے ہی ہمارے فقہاء نے بھی صحت وضعف حدیث کے لیے کچھ اصول مقرر کیے ہیں جو اصولِ فقہ کی بحث السنہ میں مذکور ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث محدثین کے اصول پر صحیح اور ہمارے اصول پر ضعیف ہو تو اس میں نزاع کرنا غلط ہے۔ دلائل میں غور کرنا چاہئے کہ دلیل سے کس کے اصول قوی ہیں، آخر میں اتنا اور بتلادوں کہ حنفیہ سے زیادہ حدیث کا اتباع کوئی نہیں کرتا، حنفیہ تو قرونِ ثلاثہ میں مرسل اور منقطع کو بھی حجت مانتے ہیں۔ جس کو اہل حدیث رد کردیتے ہیں اور مراسیل ومقاطیع کا ذخیرہ احادیث مرفوعہ سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہے، تو یہ لوگ حدیث کے آدھے ذخیرہ کو چھوڑتے ہیں، پھر مرفوعات میں سے بھی یہ لوگ صحیح یا حسن ہی کو لیتے ہیں ضعیف کو رد کردیتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک حدیث ضعیف بھی قیاس سے مقدم ہے، بلکہ قول صحابی وقول تابعی کبیر بھی قیاس سے مقدم ہے، اب تم ہی بتلاؤ کہ عامل بالحدیث کون ہے اور تارکِ حدیث کون؟

رہا یہ کہ بعض مسائل میں حنفیہ حدیث صحیح کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ اس صورت میں جس حدیث پر حنفیہ نے عمل کیا ہے وہ ان کے اصول پر صحیح تھی، گو محدثین کے نزدیک ضعیف ہو، حنفیہ کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف سند پر نہیں اس کے لیے کچھ اور بھی شرائط ہیں۔ جو اصولِ فقہ میں مذکور ہیں، اور ہم نے مقدمہ "اعلاء السنن" میں بھی ان کو بیان کردیا ہے اور مقدمہ "اعلاء السنن" کے دوسرے حصہ میں تقلید واجتہاد پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ جو زیر طبع ہے۔

شاگرد: الحمدللہ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں اہلِ حدیث کے مغالطہ سے نکل گیا ہوں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- فقہ ائمہ اربعہ کی تقلید کے سلسلے میں مفصل بحث:

۱- ہمارے بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ فقہ اور دوسرے علوم صحیح نہیں ہیں۔ اور اگر صحیح وسچا علم ہے تو قرآن وحدیث ہے، باقی سب دین میں نئی چیز ہے جو بدعت ہے، اور جو چیز قرآن وحدیث میں نہ ہو وہ باطل ہے۔

۲-چارائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام مالکؒ ان میں کسی کی تقلید نہیں کرنا، کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی کسی کی تقلید کرتے تھے، یا حضور ﷺ اس کا حکم دیتے تھے۔

۲-انبیاء واولیاء کے وسیلہ سے دعاء مانگنا:

حضور ﷺ اور انبیائے کرام واولیاء اللہ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا کہاں تک درست ہے، یہ بندہ وسیلہ کا قائل نہیں ہے، وسیلہ جائز ہے تو حدیث کا حوالہ دیجئے۔

۳-حضور ﷺ کی ولادت کے موقع پر سیرت کا بیان:

حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ پر سیرۃ النبی بیان کرنا درست ہے یا نہیں۔

۴-حضور ﷺ غیب جانتے تھے؟

حضور ﷺ غیب کی بات جاننے والے تھے یا نہیں۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ غیب کی بات جانتے تھے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ ﷺ کے سچا اور راحج ہونے سے کسے انکار ہے یہ تو عین دین اور عین ایمان ہے۔ باقی ہر فقہ یا ہر اس چیز کو جو قرآن میں نہ ملے اس کو مطلقاً باطل کہہ دینا یا بدعت قرار دے دینا غلط ہے، بدعت تو نام ہے اس چیز کا جو کسی اعتبار سے دین نہ ہو، اس کو دین قرار دے دینا، یعنی "**من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر وخفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود**" (۱)، "وهو" مصداق ہے: "**من أحدث في أمرنا ما ليس منه فهو رد**" (۲) کا...............اور اگر کوئی لغوی اعتبار سے کہے تو بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سیئہ، دوم بدعت حسنہ، سوایسے علوم کا ایجاد کرنا اور ان کو رائج کرنا اور سیکھنا اور سکھانا حدیث: "**من سن سنة حسنة فعمل بها كان له أجرها ومثل أجر من عمل بها لا ينقص من أجورهم شيئاً، ومن سن سنة سيئة فعمل بها كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده لا ينقص من أوزارهم شيئاً**" (۳) (جو شخص دین میں کوئی اچھا طریقہ

۱- مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۱/ ۱۷۷۔
۲- سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۲، ۱/ ۶، مسلم کتاب الاقضیہ۔
۳- ابن ماجہ رقم الحدیث: (۱۹۱) عن المنذر بن جریر عن ابیہ ۱/ ۳۹-۴۰۔

ایجاد کرے اور اس کے چلائے ہوئے طریقہ پر کوئی عمل کرے تو ایجاد کرنے والے کو اس ایجاد کرنے کا بدلہ ہے اور جو شخص اس طریقہ پر عمل کر رہا ہے اس کا بدلہ اس ایجاد کرنے والے کو ملتا ہے اور اس عمل کرنے والے کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جاتا، اور جو شخص دین میں ایسا طریقہ ایجاد کرے جو شرعاً مذموم اور مقتضائے شرع کے خلاف ہو تو اس ایجاد کرنے والے پر اس کا بدلہ (وزر) ہے، اور جو شخص اس ایجاد کردہ طریقہ کو اپنا رہا ہے اس کا بھی بدلہ (وزر) ہے اور اس عمل کرنے والے کے وزر میں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا) کے تحت داخل ہوگا، اس لئے کہ اس حدیث سے دین میں اچھا طریقہ ایجاد کرنا مراد ہے جس کا ثبوت آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب سے نہ ملے اور وہ طریقہ مقتضائے شرع کے خلاف نہ ہو(۱)۔

لیکن مشاہدات نے ثابت کر دیا کہ ان علوم کا ایجاد ہونا دین کے لیے خیر اور برکت کا موجب رہا، مثلاً پہلی صدی کے اواخر میں اسلام جب ترقی کر کے عرب سے عجم تک پہنچا، لوگوں کے سامنے قرآن کریم اور آنحضور ﷺ کی احادیث پہنچیں اور ایک ہی شخص نے کئی کئی راویوں سے روایت کو سنا اور روایتیں راویوں کے اختلاف سے کہیں ان کی سمجھ کے مطابق متعارض معلوم ہوئیں تو ان کے ذہنوں میں ایک قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا کہ کیا دین ہے کہ اس کے مسائل میں خود تعارض ہے، حالانکہ دونوں راویوں کی روایتیں صحیح ہوتیں۔ ایک راوی نے کسی موقع پر آپ سے کچھ اور عمل اور قول کا مشاہدہ کیا دوسرے نے کچھ اور، فرق اتنا تھا کہ ایک راوی کو ناسخ و منسوخ کا علم نہ ہو سکا، اور انہوں نے منسوخ حکم کو روایت کر دیا، دوسرے راوی اس فرق کو سمجھ گئے۔ چنانچہ عوام کا جب یہ ذہنی الجھاؤ ان کے دلوں میں جگہ کر گیا تو اس نے بہت سے نئے فرق باطلہ کو جنم دیا، مثلاً قدریہ، مرجیہ، معتزلہ، جہمیہ وغیرہ جن سے اس وقت کے علماء مثلاً امام ابوحنیفہ نے مناظرہ بھی کیا جس سے علم کلام وجود میں آ گیا، ادھر دوسری جانب جب زمانہ گذرتا گیا نئی نئی ضرورتیں بڑھتی گئیں۔ پھر اسلامی حکومتوں کی وسعت سے نئے نئے مسائل پھیلتے گئے۔ اور مزاجوں میں بڑی تیزی سے انقلاب آ رہا تھا۔ سادہ دلی اور سادہ زندگی جو صحابہ کرام کا شیوۂ خاص تھا ختم ہوتا جا رہا تھا۔ طبیعتوں میں سہل پسندی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے حالات کا تقاضا ہوا کہ کتاب وسنت کی تعلیمات اس انداز سے مرتب ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے تمام احوال تلاش کیے جائیں۔ اور دین کا سارا ذخیرہ سامنے رکھ کر ایسے جاذب اور سہل انداز میں بیان ہو کہ جسے عالم و جاہل، ذہین و غبی، عربی و عجمی ہر ایک بآسانی سمجھ لے، اور جو مسائل صراحۃً کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کرامؓ میں موجود نہیں وہ علماء کے باہمی فکر و نظر و بحث و تمحیص سے کتاب وسنت سے اس طرح مستنبط ہوں کہ آنے والی نسلیں پریشانی سے دو چار نہ ہونے پائیں، اور ساتھ ہی ان کی عجلت پسند اور سہل طلب طبیعتیں غلطی سے محفوظ رہیں، غرض

۱- قواعد الفقہ / ۲۰۴۔

اس طرح اس فن کو مرتب کر کے ان ائمہ مجتہدین نے امت کو ایک عظیم فتنہ سے بچا لیا۔ پھر اس کو غلط یا بدعت کہنا کیوں کر صحیح ہوگا، بلکہ بعض باتیں یا بعض علوم جو نوایجاد معلوم ہوں، لیکن وہ کتاب وسنت کے مخالف نہ ہوں، بلکہ ان سے کتاب وسنت کی تسہیل وتشریح ہوتی ہو، یا کسی فتنہ کی روک تھام اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ اس کا ایجاد کرنا مباح یا مستحب ہوگا، بلکہ فرض بھی ہو سکے گا۔ صورت مسئولہ عنہا میں جب کہ علم فقہ سراسر علوم قرآن واحادیث صحیح کی تشریح اور آسان تفسیر ہے اور یہ علوم ان کے خلاف نہیں، بلکہ موافق ہیں، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ جن کو تدوین فقہ میں خاص اہمیت حاصل ہے ان کے بہت سے اقوال ایسے ملیں گے جن میں تصریح ہے کہ اگر میرے قول کے خلاف کتاب وسنت سے کوئی دلیل مل جائے تو اسی کو اختیار کرو، اور میری بات کو ترک کردو، چنانچہ ''عقود رسم المفتی'' میں ہے: **"فاعلم أن أباحنيفةؒ من شدة احتياطه وعلمه بأن الاختلاف من آثار الرحمة، قال لأصحابه: إن توجه لكم دليل فقولوا به" (۱)۔**

اسی طرح ''کتاب المیزان'' میں مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے: **"وقد روى الشيخ محي الدين في الفتوحات المكية عن الإمام أبي حنيفة رضي الله تعالىٰ أنه كان يقول: إياكم والقول في دين الله تعالى بالرأي وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل" (۲)** (شیخ محی الدین ابن عربی نے ''فتوحات مکیہ'' میں امام صاحب کی طرف منسوب کر کے ایک قول نقل کیا ہے کہ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے دین میں محض رائے کی بنیاد پر حکم کرنے سے بچو، اور اپنے اوپر سنت کی پیروی ضروری کرلو، اس لیے کہ جو اس سے خارج ہوگیا، گمراہ ہوگیا)۔

اسی طرح ''عقد الجید'' میں مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے: **"سئل أبو حنيفة إذا قلت قولا وكتاب الله يخالفه قال: اتركوا قولي بكتاب الله، فقيل: إذا كان خبر الرسول ﷺ يخالفه؟ قال: اتركوا قولي بخبر رسول الله ﷺ، فقيل: إذا كان قول الصحابةؓ يخالفه؟ قال: اتركوا قولي بقول الصحابة" (۳)۔**

(امام صاحبؒ سے پوچھا گیا کہ آپؒ کے قول کی کتاب اللہ سے مخالفت ہوتی ہو تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟ آپؒ نے فرمایا کتاب اللہ کے مقابلہ میں میرا قول ترک کردو۔ کہا گیا اگر حدیث رسول اللہ ﷺ سے اس کی مخالفت ہوتی ہو تو؟ فرمایا آنحضرت ﷺ کے قول کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو۔ کہا گیا کہ ایسا ہی قول صحابہؓ اس کے خلاف ہو تو؟ فرمایا قول صحابہؓ کے مقابلہ میرا قول ترک کردو)۔ یعنی میرے قول کی وقعت اس صورت میں قطعاً نہیں، جب وہ ان میں سے کسی

۱- عقود رسم المفتی ۶۵-۶۶ مطبوعہ سہارنپور۔

۲- ۵۱/۱/۱/۱۲۔

۳- عقد الجید للشاہ ولی اللہ ۲۶۔

کے بھی خلاف ثابت ہو۔غرض ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ استنباط مسائل میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا ادنیٰ شائبہ بھی ان کی نظر میں کس قدر کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پھر استنباط مسائل میں اول کتاب اللہ کو ترجیح ہوتی اگر اس میں نہ مل پاتا تو سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرتے، اگر اس میں نہ ملتا، اقوال صحابہؓ اختیار کرتے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا بھی کوئی خاص قول مرجح نہ ہوتو اقرب الی القرآن والسنۃ کو لیتے، جیسا کہ ''الخیرات الحسان'' کی مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **"فقد جاء عن أبي حنيفة من طرق كثيرة ما ملخصه أنه أولا يأخذ بما في القرآن، فإن لم يجد فبالسنة، فإن لم يجد فبقول الصحابة، فإن اختلفوا أخذ بما كان أقرب إلى القرآن أو السنة من أقوالهم ولم يخرج عنهم، فإن لم يجد لأحد منهم قولا لم يأخذ بقول أحد من التابعين، بل يجتهد كما اجتهدوا"** (۱)، ان سب اقوال وعبارات سے پتہ چلتا ہے کہ علم فقہ کوئی ذہنی یا خود سنت کے معارض نہیں۔ پھر بھی اس کا انکار کرتے ہوئے اس کو بدعات میں شمار کرنا خود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ہی انحراف ہے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے: **"فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد"** (۲)، (ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے)۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: **"من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"** (۳)۔ نیز فرمایا: **خياركم في الجاهلية خياركم في الإسلام إذا فقهوا"** (۴)۔ یہ سب روایات وعبارات بتلاتی ہیں کہ علم فقہ کا انکار کرنا الشمس فی نصف النہار کا انکار کرنا ہے۔

(۲) مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں اور اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے قائل ہیں، مطلق تقلید کی فرضیت کے لئے چند دلائل ذکر کئے جاتے ہیں قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: **"فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون"** (۵) (اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو)، **"أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم"** (۶) (اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور اولی الامر کی) کی تفسیر حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عطاء اور مجاہد اور ضحاک اور ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرہم نے خلفاء، علماء اور فقہاء سے کی ہے، اس تفسیر کو

۱- الخیرات الحسان ر ۲۹۔
۲- مشکوۃ شریف کتاب العلم ار ۳۷۷ مع شرح الطیبی۔
۳- بخاری مع الفتح ار ۱۶۴ رقم الحدیث: (۷۱)، مسلم (۱۰۳۷)۔
۴- فیض القدیر للمناوی ۳ر ۱۲۰ رقم الحدیث (۳۹۸۷) بخاری عن ابی ہریرۃ، کنز العمال حدیث نمبر: (۲۸۷۸۰)۔
۵- سورۂ انبیاء: ۷۔ ۶- سورۂ نساء: ۵۹۔

مولانا صدیق حسن صاحب رئیس اہل حدیث بھی اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں، نیز حدیث میں ہے فرمایا گیا: "إنما شفاء العيّ السؤال" (۱) (نہ جاننے والوں کی شفاء سوال کر لینے میں ہے)۔ غرض یہ تو واضح ہے کہ نہ جاننے والوں کے لئے تقلید ضروری ہے، اب کلام اس میں ہے کہ ہر وہ شخص جس کو لغت عرف میں عالم کہا جاتا ہے اس تقلید کے کام کو انجام دے سکتا ہے یا کوئی خاص عالم وفقیہ مراد ہے، علماء سلف نے ایسے عالم کا جس کی تقلید کرنی چاہئے، ایک معیار مقرر کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" میں تحریر فرماتے ہیں:

"الاجتهاد على ما يفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد في إدراک الأحكام الشرعية الفرعية عن أدلتها التفصيلية الراجعة كلها إلى أربعة أقسام الكتاب والسنة والإجماع والقياس (إلى أن قال): وشرطه أن لا بد أن يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع، وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة، ثم قال: ولا بأس أن يورد الكلام البغوي في هذا الموضع، قال البغوي: والمجتهد من جمع خمسة أنواع من العلم: علم كتاب الله عزوجل، علم سنة رسول الله ﷺ، أقاويل العلماء السلف من إجماعهم واختلافهم، وعلم اللغة، وعلم القياس إلى أن قال، انتهى كلام البغوي" (۲)۔

(اجتہاد کی تعریف جو کلام علماء سے سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ خوب محنت کرتا ہو دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم، کتاب اللہ، سنت اور اجماع اور قیاس ہے، اور اجتہاد کی یہ شرط ہے کہ اجتہاد والے کو ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے متعلق ہو، اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ ومنسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو (ترجمہ اسی طرح آخر تک)۔

اب خلاف تقلید شخصی میں رہا (یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ اور حکم میں کرنا) یہ علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک واجب ہے، کیونکہ مطلق جس کے دو فرد ہیں شخصی اور غیر شخصی، یعنی ایک معین شخص کی تقلید، اور غیر معین شخص کی تقلید، غیر معین شخص تو اس لئے جائز ہوا کہ اس مطلق فرض کو اس کے جس فرد میں چاہیں ادا کریں، تقلید غیر معین شخص کی بھی کر کے اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکتے ہیں، جیسے تقلید شخص معین کی کر کے بری ہو سکتے ہیں، کیونکہ مامور بہ جب مطلق بولا جاتا ہے تو

۱- مشکوۃ المصابیح باب التیمم / ۵۵۔

۲- عقد الجید فی أحکام الاجتہاد والتقلید /۔

لاعلی التعیین اس کے کسی بھی فرد کوادا کردینے سے بری الذمہ ہوجاتا ہے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانہ میں دونوں پر عمل ہوتا رہا، لیکن دوسری صدی کے اخیر میں جب دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین بکثرت پیدا ہوگئے ہیں، بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کی حرمت وجواز یا کراہت واستحباب میں خلاف نہ ہوا، پھر ابنائے زمانہ میں ہواوہوس کا غلبہ بھی ہوا، وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے، جس امام مجتہد کا جو مسئلہ اپنی خواہش کے مطابق دیکھا اسی کو اختیار کرلیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہوگیا کہ یہ دین متین خواہشات کا مجموعہ نہ بن جائے، اس زمانہ کے دوراندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب تقلید غیر معین شخص میں اتنے بڑے مفاسد پیدا ہوگئے، اور آئندہ ان سے بھی بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے، اس لئے مصلحت وقت اور شرعی تقاضا یہ ہے کہ سب لوگوں کو تقلید شخصی پر جمع کردیا جائے، چنانچہ ''الانصاف'' مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ میں ہے: **"وبعد المائتين ظهر فيهم التمذهب بالمجتهدين بأعيانهم وكان هذا هو الواجب في ذلك الزمان"** (۱) (دوسری صدی کے لوگوں میں خاص ائمہ کے مذہب کی پابندی شروع ہوگئی)، تقلید شخصی کی مثالیں دور صحابہ میں بکثرت ملیں گی۔ مثلاً ابوداؤد مجتبائی میں روایت ہے: **"عن عمر بن ميمونؓ قال: قدم علينا معاذ باليمن رسول رسول اللهﷺ - إلى قوله -: فألقيت محبتي عليه فما فارقت حتى دفنته بالشام ميتاً ثم نظرت إلى أفقه الناس بعده فأتيت ابن مسعودؓ فلزمته حتى مات"** (۲) (عمر بن میمون کہتے ہیں کہ جب معاذ بن جبلؓ یمن میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد ہوکر تشریف لائے تو میں نے ان سے محبت کی، اور ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا یہاں تک کہ میں نے ان کو شام میں دفن کردیا، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اب افقہ الناس کون ہے تو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا، اور ان کی خدمت میں رہا، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا)۔ نیز حضرت محدث الہند شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں: **"اختلف في كثير من الأحكام واتبعه في ذلك أصحابه من أهل مكة"** (۳) (حضرت ابن عباسؓ نے جب مکہ میں اقامت فرمائی تو بہت سے مسائل میں دوسرے صحابہؓ کے خلاف کیا، اور بہت سے اہل مکہ نے حضرت ابن عباسؓ کو مرجع بنا کر انہیں کے فتوی پر عمل کیا، نیز ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہی میں تحریر فرماتے ہیں: **"وكان إبراهيم وأصحابه يرون ابن مسعود وأصحابه أثبت الناس في الفقه"** (۴) (ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے تلامذہ کو فقہ میں اثبت الناس سمجھتے

۱- الانصاف ر ۴۴۔
۲- حوالہ سابق۔
۳- حوالہ مذکور۔
۴- حوالہ سابق۔

تھے محل خلاف میں انہیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے، اور تقلید شخصی کا اس سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں ہے، الحاصل تقلید زمانہ آنحضرت ﷺ میں خود آپ ﷺ کے حکم سے ہوئی، اور پھر صحابہؓ میں ہمیشہ رہی، بعض حضرات نے مطلق تقلید سے کام لیا اور بعض نے تقلید شخصی سے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان چار ائمہ ہی کی تقلید کیوں کی جاتی ہے سواس کا جواب یہ ہے کہ ان ائمہ پر تقلید کا ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں ہے، بلکہ اتفاقی ہے، مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے، اور مٹ کر کالعدم ہو گئے، کیونکہ دس بیس پچاس یا سو مسائل اگر کچھ مجتہدین سے منقول ہیں تو وہ مستقل مذہب نہیں بن سکتے، کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں، اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لی تو دیگر مسائل میں کیا کریں گے۔ اب جب دیکھا کہ ان چار مذہبوں کے علاوہ کل مذاہب کالعدم قرار پائے تو مسئلہ تقلید ان ہی چاروں ائمہ کے مذاہب پر منحصر ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس تقلید للمجتہدین اور اس تقلید پر اجماع کے بارے میں فرمایا: "**فالتمذهب للمجتهدين سر ألهمه الله تعالى وجمعهم عليهم من حيث يشعرون أو لا يشعرون**" (۱) (عوام الناس کا ان مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کرنا اور اس پر اجماع ہونا خواہ وہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں یہ من جانب اللہ الہام ہے)۔

جب مذکورہ دلائل سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی کہ مسئلہ تقلید اتفاقی طور پر ان چاروں مذاہب میں منحصر ہو گیا تو اب تقلید ان کے خلاف کی کرنا جائز نہ رہا، چنانچہ طحطاویؒ حاشیہ درمختار میں تحریر فرماتے ہیں: "**من كان خارجاً عن هذه الأربعة، فهو من أهل البدعة و النار**" (علامہ طحطاویؒ ان چاروں ائمہ کے مذہب کی تقلید سے خارج ہونے والے کو اہل بدعت و نار میں شمار کرتے ہیں)، اسی طرح فقہ کی دوسری کتابوں میں علماء فقہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تقلید شخص غیر معین پر عمل کرنا ضلال و گمراہی اور آخرت میں خسارہ کا موجب ہے۔

۳- تحت السرہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کی حدیث ابو داؤد نسخہ ابن عربی میں موجود ہے، بہتر ہے کہ "بزل المجہود شرح ابو داؤد مطبوعہ کتب خانہ یحیوی سہارنپور میں دیکھ لیا جائے، نیز مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ میں بھی موجود ہے، ابو داؤد کی روایت کا متن حسب ذیل ہے: "**عن أبي وائل عن أبي هريرة أخذ الكف عن الكف في الصلاة تحت السرة**" (۲)، اسی طرح ابوبکر ابن ابی شیبہ کی عبارت حسب ذیل ہے: "**ليضع يمينه على شماله في الصلاة تحت**

۱- الانصاف فی سبب الاختلاف/ ۴۷۔
۲- بذل المجہود ۲/ ۲۳۔

السرة"، اسی طرح ابوداؤد میں اس مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل روایت بھی موجود ہے: "عن جرير الظبي عن أبيه قال: رأيت عليا يمسك شماله بيمينه على الرسغ فوق السرة" (۱)، حضرت علیؓ کی اس روایت میں فوق سے مراد اتصالاً علی فوق السرہ ہے، نہ کہ فوق منفصلا، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت: "إني أراني أحمل فوق رأسي خبزا" (۲)، وایضاً: "وجعل فيها رواسي من فوقها" میں ہے۔

۴- اللہ تعالی سے دعا کرنے اور اپنی حاجت طلب کرنے میں کسی نبی یا ولی کو بطور وسیلہ کے ذکر کرنا اور یوں کہنا: اے اللہ! بوسیلہ فلاں نبی یا فلاں ولی میرے حال پر رحم فرما، اور میری فلاں حاجت پوری فرما، یہ جائز ہی نہیں، بلکہ مسنون بھی ہے اور اجابت دعا میں نہایت موثر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک صحابیؓ کو دعا کرنے کا اس طرح طریقہ تعلیم فرمایا تھا: "اللهم إني أسئلك وأتوجه إليك بنبيك محمد نبي الرحمة" (۳)، ایسے ہی عمر فاروقؓ کا معمول تھا کہ جب قحط پڑتا تو حضرت ابن عباسؓ کے توسل سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے: "اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقيا وانا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا فيسقون" (۴)، اسی وجہ سے ہمارے علماء دیوبند توسل کے قائل ہیں، کیونکہ توسل دراصل اللہ کی وہ رحمت ہے جس سے خدا کا مقبول بندہ نوازا گیا ہے، کسی نبی یا ولی کو وسیلہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی خاص رحمت کو جو اس بندے پر ہے وسیلہ بنایا گیا ہے، ناجائز توسل وہ ہے کہ جس میں غیر اللہ کو مطلب برآری کے لئے معین اور فریادرس سمجھا جائے، اور دل میں عقیدہ رکھا جائے کہ میری اس حاجت کو یہی پورا کرنے والے ہیں، یہ توسل ناجائز اور حرام ہے قرآن کریم میں ہے: "إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء" (۵)۔

۵- کسی بزرگ یا ولی بلکہ ہر مسلمان کی قبر پر فاتحہ پڑھنا جائز ہے، لیکن اس میں بدعات چادر چڑھانا، دیگر اشیاء خوردنی چڑھانا یا کھانے کے سامنے فاتحہ پڑھنا ایسا ثابت نہیں، بلکہ ایصال ثواب کا جو طریقہ کتاب وسنت سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی نے خدا کی راہ میں روپیہ پیسہ دے کر یا کپڑا، طعام وغیرہ دے کر خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! اس کا ثواب جو کچھ مجھے ملا ہے وہ فلاں کو پہنچا دیجئے یا اسی طرح قرآن کریم یا ایک آدھ سورت تلاوت کر کے یا اور کوئی نیک عمل کر کے

۱- حوالہ مذکورہ ۲/ ۲۴۔

۲- سورۂ یوسف: ۳۶۔

۳- ترمذی شریف ۲/ ۱۹۷، مشکوۃ شریف / ۱۱۹، حصن حصین منزل خامس / ۱۵۱، ابن ماجہ / ۱۰۰۔

۴- الصحیح للبخاری ۱/ ۱۳۷۔

۵- سورۂ نساء: ۴۸۔

خدائے تعالیٰ سے ایصال ثواب کی دعا کی جائے تو یہ طریقہ احسن وعمدہ ہوگا اور اتنا ہی قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس کے علاوہ اس میں ہونے والی سب خرافات ایجاد کردہ ہیں، جن کو ساتھ ملانا بجائے ثواب کے عذاب کا موجب ہوگا۔

٦- آنحضور ﷺ کے یوم ولادت میں آپ کی پیدائش کے وقت کے صحیح حالات یا پوری زندگی کے حالات بیان کرنا یا سننا سنانا ایک ایسا عمل ہے جس کے مستحسن ہونے کا ادنی سی تعلیم رکھنے والا مسلمان بھی انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ بلاشبہ نبی ﷺ کی سیرت پاک اور آپ ﷺ کے حالات ومقالات کا مسلمانوں تک خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً صحیح صورت میں شائع کردینا اسلام اور مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے۔

لیکن اس دور میں مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اس مروجہ طریقہ پر مذکورہ فعل، اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفر ہی نہیں، بلکہ ایک شیطانی تلبیس بھی ہے کہ جس سے بعض سادہ دل مسلمان دھوکہ میں پڑجاتے ہیں۔ اس لئے کہ برے کام کو نیک سمجھ کر کرنا یہ دوہرا گناہ ہے، چنانچہ فرمایا: **"من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم أن محمداً ﷺ خا ن الرسالة ؛لأن الله تعالى يقول: "اليوم أكملت لكم دينكم الخ، فما لم يكن يومئذ ديناً لا يكون اليوم ديناً"** (١) (جو شخص اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے جس کو وہ نیکی سمجھتا ہو گویا کہ وہ اس کا مدعی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکام امت کو پہنچانے میں خیانت کی (کہ یہ نیکی ان کو نہیں بتلائی)، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آج میں نے تمہارا دین کامل کردیا جو چیز اس دین میں داخل نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ عمل کے ساتھ جو رسوم کا اہتمام کیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ گناہ کا ارتکاب کرنا ہے، بلکہ حضور ﷺ کو خائن ٹھہرانا ہے کہ آپ ﷺ نے کچھ چیزیں امت سے چھپائیں، حالانکہ وہ جزو دین تھیں، آج کل مثلاً یوم ولادت کے موقع پر اس کی مقررہ تاریخ ۱۲/ربیع الاول کے دن ہی کو ضروری سمجھا جاتا ہے، حالانکہ شرع سے کوئی مقررہ تاریخ نہیں، نیز اس میں سجاوٹ روشنی وغیرہ کرنا، مٹھائی تقسیم کرنا یہ سب اسراف میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع اعمال ہیں، نیز اسی طرح اس میں جو سب سے بڑی خرابی ہے وہ یہ ہے کہ عوام الناس شریک ہونے والے اس اعتقاد سے شریک ہوتے ہیں کہ یہاں مجلس میں نبی کریم ﷺ تشریف لاتے ہیں، یا ہمارے اس پروگرام کو دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں جیسا کہ ان کے اس جملہ **"یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک"** سے ظاہر ہوتا ہے تو یہ عقیدہ کھلا ہوا شرک ہے، اور آپ پر بہتان ہے، تیسرا گناہ اس میں یہ ہے کہ اس کو فرض اور واجب کی طرح ضروری سمجھا جاتا ہے، چوتھا گناہ اس

١- الاعتصام للشاطبی ۱/۴۷۰۔

میں یہ ہے کہ اس میں شریک نہ ہونے والے بے گناہ مسلمانوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے، اور پانچواں گناہ مسجد میں بلند آواز سے پڑھنا کہ لوگوں کی نماز میں اور دیگر عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے، لہذا کسی تاریخ کے تعین کو ضروری سمجھے بغیر مذکورہ رسومات سے بچتے ہوئے مذکورہ عمل جائز ہے۔

۷- نصوص شرعیہ سے یہی ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو غیب کا علم نہیں تھا، بلکہ دور نبوت کے جن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو غیب کا علم حاصل تھا سو وہی واقعات ہیں جن میں بذریعۂ وحی آپ کو اطلاع دی گئی تھی، ورنہ پھر ان واقعات کا کیا جواب ہوگا کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ غیب کی بات نہیں جانتے تھے، مثلاً عامر بن ابو براءنامی ایک شخص آیا اور کہا کہ ہماری قوم کی تبلیغ کے لئے مبلغین روانہ کر دیجئے، آپ ﷺ نے عہد و پیمان کے بعد ستر صحابہ کرامؓ کو روانہ کیا، راستہ میں اس نے بغاوت کی اور ان اصحابؓ کو شہید کر دیا سوائے دو تین اصحابؓ کے کہ وہ میدان معرکہ میں زخمی پڑے تھے، دشمنان دین نے ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا، حالانکہ زندہ تھے، اور بعد تک زندہ رہے، ان کا نام کعب بن انصاریؓ تھا وغیرہ، اسی طرح ایک صحابیؓ بچ نکلے، جو اونٹوں کو چرانے نکل گئے تھے، صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت نہایت ہی مقدس اور پاکباز جماعت تھی، دن کو لکڑیاں چنتی اور شام کو فروخت کر کے اصحاب صفہؓ کے لئے کھانا لاتی، اور شب کا کچھ حصہ درس قرآن، قیام لیل اور تہجد میں گزارتی، اگر آنحضور ﷺ عالم الغیب ہوتے تو جانتے ہوئے اپنے جاں نثار اصحاب کے لئے اتنا گھناؤنا ظلم کیسے برداشت کر لیتے (۱)۔

اسی طرح رجیع کا واقعہ جس میں آپ ﷺ نے صحابہؓ کی ایک جماعت کو جن کی تعداد احادیث میں دس بتلائی جاتی ہے رجیع کی طرف روانہ کیا، لیکن جو شخص بلانے آیا تھا اس نے غدر کیا اور ان اصحابؓ کو شہید کر دیا (۲)۔

اب ہم اور آپ مل کر غور کریں کہ وہ ذات گرامی جو ادنی سی تکلیف دشمن کے لئے گوارہ نہیں کر سکتی تھی اور جس کی امانت وصداقت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے کہ وہ اپنے جاں نثار اصحابؓ کے لئے جانتے ہوئے اتنا گھناؤنا ظلم برداشت کر سکتی ہے، نیز اس کے علاوہ اس بحث پر قرآن کریم میں بہت سی آیات ناطق ہیں کہ غیب کا علم سوائے اللہ تعالی کے کسی کو نہیں، مثلاً "قل لا يعلم من في السموات والأرض الغيب إلا الله" (۳) اور خود سرکار دو عالم ﷺ کو حکم ہے کہ آپ فرما دیجئے: "ولو كنت أعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء إن أنا إلا نذير وبشير لقوم

۱- شرح الزرقانی ۲/۷۴-۷۵۔
۲- شرح الزرقانی ۲/۶۴۔
۳- سورۂ نمل: ۶۵۔

یؤمنون"(۱)، لہذا اس مسئلہ میں علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں بلکہ جن خفیہ باتوں کو آپ ﷺ بلا کسی مشاہدہ کے بتلا دیا کرتے تھے وہ وہی باتیں تھیں جن کی بذریعہ وحی اطلاع دی جا چکی ہوتی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۴/۱۴۰۲ھ

اللہ تعالیٰ ہر امر کا فیصلہ ہر سال شب براءت میں کرتے ہیں یا شب قدر میں؟

متعدد احادیث معتبرہ سے یہ ثابت ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب یعنی شب براءت کو ہی اللہ تعالیٰ ہر امر کا فیصلہ فرماتے ہیں شب قدر یعنی رمضان المبارک کے آخری ہفتہ کی طاق راتوں میں نہیں کرتے لیکن ایسی تمام احادیث کے خلاف قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے: "حم والكتاب المبين إنا أنزلناه في ليلة مباركة إنا كنا منذرين فيها يفرق كل أمر حكيم أمراً من عندنا إنا كنا مرسلين"(۲) (کتاب مبین کی قسم ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل فرمایا ہے بے شک ہم ڈرانے والے ہیں اس رات میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، بے شک ہم نے ہی آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے)۔

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کریم اس رات میں نازل ہوا جس میں کہ اللہ تعالیٰ ہر امر محکم کا فیصلہ فرماتے ہیں اور قرآن کریم نازل ہوا ہے، رمضان المبارک کی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إنا أنزلناه في ليلة القدر"(۳) (پس یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ شب قدر میں نازل ہوا، اور دوسری طرف ارشاد ہے کہ ایک مبارک رات کہ جس میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اس میں قرآن کریم نازل کیا گیا، اس صورت میں مندرجہ بالا آیت میں "ليلة مباركة"(۴) کو اگر شب براءت تسلیم کیا جائے تو قرآن کریم کی دو آیتوں کے درمیان تضاد واقع ہوتا ہے، جبکہ کلام ربانی ہر قسم کے اختلاف سے پاک ہے، اور اگر لیلۃ مبارکہ کو شب قدر تسلیم کیا جائے تو شب براءت کی بابت وارد ہونے والی تمام احادیث معتبرہ کو موضوع قرار دینا پڑے گا، جبکہ ایسا کئی

۱- سورۂ اعراف: ۱۸۸۔
۲- سورہ دخان: ۱ تا ۵۔
۳- سورۂ قدر: ۱۔
۴- سورۂ دخان: ۱۔

وجوہات سے ناممکن ہے۔

اول تو یہ کہ اگر قرآن کریم کی اس آیت میں لیلۃ مبارکہ سے فی الحقیقت شب قدر ہی مراد ہے، تو کیا اللہ تعالی نے ایک بھی سورت ایسی نازل نہیں فرمائی جس سے یہ فیصلہ ہوسکتا کہ شب قدر ہی ہر امر محکم کے فیصلہ کے لئے متعین ہے۔

دوم یہ کہ شب براءت کی بابت جتنی احادیث واقع ہوئی ہیں وہ سب کی سب معتبر ہیں، پھر اس کثرت کے ساتھ واقع ہوئی ہیں، کہ گمان غالب ہوتا ہے کہ بالفرض کچھ احادیث موضوع بھی ہوں تو بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضورﷺ نے ضرور شب براءت کے بارے ہی میں فرمایا ہے، کیونکہ شب قدر کے بارے میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو یہ ثابت کرتی ہو کہ دراصل شب قدر ہی میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اگر شب قدر ہی ہر امر محکم کے فیصلہ کی رات ہوتی تو آنحضورﷺ ضرور اس بارے میں ارشاد فرماتے اور وہ ارشادات تمام نہ سہی کچھ تو ہمارے سامنے موجود ہوتے ہی، پس یہاں ثابت ہوتا ہے کہ آنحضورﷺ نے شب قدر کی بابت سرے سے یہ فرمایا ہی نہیں کہ اس رات ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، علماء کرام اس آیت میں قیاس آرائی کرتے ہیں کہ ۲۵ ویں پارے کی اس آیت میں قرآن کریم کے نزول سے مراد وہ نزول نہیں جو آنحضورﷺ پر ہوا، بلکہ لوح محفوظ سے آسمان اول پر قرآن کریم کا نازل کرنا مراد ہے۔ یہ قیاس دل کو نہیں بھاتا، کیونکہ لوح محفوظ سے آسمان اول پر قرآن کریم کا نزول ایک بیکار سی بات ہے، پھر یہ کہ یہ بات محض قیاس آرائی ہے اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل کوئی بھی نہیں، اور قرآن کریم میں قرآن کے لئے لفظ نزول اسی جگہ مراد ہے جہاں پر آنحضورﷺ پر نازل ہونا فرمایا گیا ہے، ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قرآن کریم کسی اور جگہ بھی نازل فرمایا گیا اور یہ بھی کہ آسمان اول پر لوح محفوظ سے قرآن کریم کا نازل ہونا ایک واقعہ خاص اور واقعہ عجیب ہے، پس اللہ تعالی اگر ایسا کرتے تو ضرور اس کو مندرجہ بالا آیت میں بتاتے، جبکہ آیت میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں اور کسی حدیث میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو یہ ظاہر کرے کہ قرآن کریم آسمان اول پر بھی نازل کیا گیا تھا، پس اس صورت میں یہ قیاس کرلینا کہ اس آیت میں نزول سے مراد آسمان اول پر نزول ہے، کیا یہ ایک بے بنیاد اور ٹھیک نہ ہونے والا قیاس نہیں ہے۔

اب جناب والا سے التماس ہے کہ احقر کی اس بارے میں تمام ذہنی الجھنوں کو دور کردیجئے گا، میں سمجھتا ہوں کہ جناب والا مدلل طریقے سے ان باتوں کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

محمد شہباز السادات (محلہ ابوالمعالی دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

آیت کریمہ: "حم ،والکتاب المبین إنا أنزلناه فی لیلة مبارکة" (۱) میں لیلۃ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین ومحققین مفسرین کے نزدیک لیلۃ القدر ہی ہے، ۱۵ ویں شعبان کی شب نہیں اور اس لیلۃ القدر ہی کے بارے میں "فیها یفرق کل أمر حکیم الخ" (۲) فرمایا گیا، ۱۵ ویں شعبان کی رات کا اصل نام لیلۃ البراءۃ ہے، براءت سے مراد جہنم سے براءت یا عذاب سے براءت مراد ہے اور اس کا حاصل مغفرت ومعافی ہے، چونکہ اس شب میں بے شمار گنہگاروں کی معافی ومغفرت ہوتی ہے اس لئے یہ بھی نام پڑ گیا۔

اور چونکہ ۱۵ ویں شعبان کی شب بھی نہایت برکت والی شب ہے اور اس میں بھی باری تعالی عز اسمہ کی خصوصی تجلی دنیا اور آسمان دنیا پر آفتاب غروب ہوتے ہی شروع ہوجاتی ہے اور ساری رات رہتی ہے، اس لئے اس شب کو بھی برکت والی اور مبارک شب فرمایا گیا ہے اور: "فیها یفرق کل أمر حکیم" (۳) کے سلسلہ میں جن جن چیزوں کا ذکر وارد ہے ان میں سے جن بعض چیزوں کا ذکر جو بعض روایات میں "لیلۃ البراءۃ" کے سلسلہ میں مروی ہوگیا ہے، اول تو وہ روایات اس درجہ کی نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے نص قرآنی کو چھوڑ دیا جائے، یا پھر یہ مراد ہے کہ فیصلہ تو ہوتا ہے شعبان کی پندرہویں شب میں اور اس کا نفاذ وفرق یعنی کارکن ملائکہ کو سپردگی یہ شب قدر میں ہوتی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ فیصلہ ایک مستقل اور الگ چیز ہے، اور پھر اس کا نفاذ الگ اور مستقل چیز ہے، غرض دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ دنیوی عدالتوں میں بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ وڈگری ہو چکنے کے بعد بھی اجراء ڈگری اور نفاذ فیصلہ ایک مستقل مرحلہ اور کام ہوتا ہے اور دونوں الگ الگ چیزیں شمار ہوتی ہیں، پس اگر یہاں بھی ایسا ہی ہو تو کیا استبعاد ہے؟

اس توجیہ سے بھی سب روایات ایک دوسرے سے منطبق ہوجاتی ہیں اور تضاد کا شبہ ختم ہوجاتا ہے، پھر لیلۃ القدر حقیقت میں تو سارے سال میں دائر ہوتی ہے اور اس کو مخفی رکھا گیا ہے اور تلاش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، باقی عموماً رمضان المبارک کی طاق راتوں میں اور بالخصوص عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اکثر واقع ہونے کی صحیح روایات ملتی ہیں اور مخفی رکھنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ اس کو تلاش کرنے میں مومن جب سارے سال لگا رہے گا تو مولیٰ تعالی سے تعلق بڑھتا اور پائیدار ہوتا رہے گا اور نسبت احسان وحضوری جو مطلوب ہے وہ بآسانی حاصل ہوجائے گی اور اس کی تلاش کا ایک سہل اور آسان طریقہ

۱- سورۂ دخان: ۱ تا ۳۔

۲- سورۂ دخان: ۴۔

۳- سورۂ دخان: ۴۔

بھی بعض روایات میں فرمادیا گیا ہے، چنانچہ وارد ہے کہ جو شخص روزانہ شب میں دو رکعت نفل سارے سال لیلۃ القدر کی تلاش کی نیت سے پڑھے گا تو وہ شب قدر پا اس کی فضیلت پانے والا یقینا شمار ہوجائے گا۔

غرض اس تقریر سے "إنا أنزلناه في ليلة القدر" (۱) اور "إنا أنزلناه في ليلة مباركة" (۲) کے درمیان تضاد کا شبہ جس طرح ختم ہوا اسی طرح یہ شبہ بھی ختم ہوگیا کہ جب لیلۃ مبارکہ سے شعبان کی ۱۵ ویں شب مراد ہوگی، تو قرآن پاک کا نزول اول کو شعبان میں ہونا لازم آئے گا، حالانکہ نص قرآنی "شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن" (۳)، یہ اس کے خلاف اور اس کے متضاد ہے، نیز اس لئے کہ صحیح احادیث میں مروی ہے کہ حضور علیہ السلام پر پہلی بار جو نزول قرآن ہوا ہے وہ رمضان المبارک کی چوبیس تاریخ تھی اس طرح ۲۵ شب پڑی اور عشرہ اخیرہ کی طاق رات ہوئی اور بالخصوص عشرہ اخیرہ کی طاق رات میں شب قدر کا ہونا صحیح روایات میں مروی ہے ہی۔

یہاں ایک بار اور سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ قرآن مجید نام ہے اور علم ہے اس حصہ کلام الٰہی کا جو ہمارے سامنے تیس پاروں میں موجود ہے اور کلام الٰہی ازلی وابدی اور باری تعالیٰ عزاسمہ کے صفات ذاتیہ میں سے ہے اور اس کا اصلی مقام لوح محفوظ ام الکتاب اور کتاب مکنون ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: "بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ" (۴)، اور ایک جگہ فرمایا: "إنه لقرآن كريم في كتاب مكنون لا يمسه إلا المطهرون" (۵)، اور "إنه في أم الكتاب" اور یہ قرآن کریم تھوڑا تھوڑا ایک ایک دو دو چار چار آیت کر کے (نجماً نجماً) حضور علیہ السلام پر بطور نصیحت وذکر کے ہدایت بنا کر ۲۳ برس میں اتارا گیا یہ امر واقعہ ہے محتاج دلیل نہیں اس کو سب ہی جانتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ نزول ۲۳ برس میں صرف رمضان ہی رمضان میں نہیں ہوا ہے، بلکہ رمضان غیر رمضان دونوں ہی میں حسب مصلحت ومشیت باری تعالیٰ ہوا ہے، بلکہ ماہ رمضان میں صرف دو ہی چار آیتیں اتری ہیں باقی سب تو غیر ماہ رمضان میں اترا ہے، اس لئے اس اترنے کو پورے قرآن کریم کا رمضان میں اترنا نہیں کہہ سکتے، پس یہ

۱- سورۂ قدر: ۱۔
۲- سورۂ دخان: ۳۔
۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔
۴- سورۂ بروج: ۲۱، ۲۲۔
۵- سورۂ واقعہ: ۷۷ تا ۷۹۔

تھوڑا تھوڑا اترنا آیت کریمہ:"إنا أنزلناه في ليلة القدر"(۱)، اور"إنا أنزلناه في ليلة مباركة"(۲)اور"شهر رمضان الذى أنزل فيه القرآن"(۳) کا مصداق نہیں بن سکتا، کیونکہ قرآن مجید علم ہے۔

اور یہ مصداق نہیں بن سکتا ایسا ہے، جیسے آپ کا علم اور نام شہباز السادات ہے تو آپ کے بارے میں اگر کہا جائے کہ شہباز صاحب آگئے یا شہباز صاحب کوٹھے پر سے اترے تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ آدھا جسم اترا اور آدھا جسم نہیں اترا، یا آدھا جسم گیا اور آدھا جسم نہیں گیا وغیرہ، اس لئے کہ شہباز علم ہے اور ایسے مواقع میں علم کا تجزیہ اور ٹکڑا نہیں ہوتا، اس لئے آدھا جسم اترنا اور آدھا جسم نہ اترنا یا آدھا جسم آنا یا آدھا جسم نہ آنا مراد نہیں لیا جاسکتا پھر جب بھی مراد لیا جائے گا تو پورا جسم اترنا یا آنا یا جانا مراد ہوگا اسی طرح یہاں ان آیات کریمہ میں بھی پورے قرآن پاک کا بیک وقت اترنا مراد ہوگا۔

غرض ان تینوں آیتوں میں قرآن کریم پورا بیک وقت اور بیک دفعہ اترنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے "انزل" اور "أنزلناه" بول کر اس کی طرف اشارہ بھی فرمادیا کہ پورا قرآن پاک ماہ رمضان میں بھی ہم نے اتارا ہے، کیونکہ عربی میں "انزال" کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو پوری کی پوری بیک دم اور بیک وقت اتار دینا۔

اور ۲۳ برس میں اتارنا چونکہ اس طرح کا اتارنا نہیں ہے کہ بیک وقت اور دفعۃً اتار دیا ہو، اس لئے جب ۲۳ برس میں متفرق کرکے اتارنے کا تذکرہ فرمایا ہے تو قرآن پاک کو اس کی خاص صفت ذکر و نصیحت کے ساتھ موسوم کرکے فرمایا ہے، مثلاً:"إنا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون"(۴) فرمایا کیونکہ ذکر و نصیحت تو حسب موقع و محل تھوڑی تھوڑی کرکے او رتدریجاً ہی بہتر ہوتی ہے تو تنزیل بول کر اشارہ فرمادیا کہ یہ نصیحت و ذکر تھوڑا تھوڑا کرکے یہاں سے اتارا ہے کیونکہ تنزیل کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کرکے اتارنا۔

پس معلوم ہوا کہ خود قرآن کریم میں دو طرح پر نزول قرآن کا ذکر ہے ایک طرح کے نزول کا ذکر"إنا أنزلناه "اور "شهر رمضان الذى أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى"(۵) میں ہے کہ ایک نزول ماہ رمضان المبارک میں پورے قرآن پاک کا ہے اور دوسرا نزول پورے ۲۳ برس میں نجماً نجماً اور تھوڑا تھوڑا کرکے ہے۔

۱- سورۂ قدر:۱۔
۲- سورۂ دخان:۳۔
۳- سورۂ بقرہ:۱۱۸۔
۴- سورۂ حجر:۹۔
۵- سورۂ بقرہ:۱۸۵۔

یہاں خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ہوا تو اس کا جواب بھی حدیث شریف میں فرما دیا گیا اور اس کا حاصل یہ ہے کہ لوح محفوظ اور ام الکتاب سے سماء دنیا "بیت العزۃ" تک یک دم ودفعۃً ماہ رمضان میں اتار دیا گیا، پھر وہاں سے حسب مصلحت ومشیت خداوندی تھوڑا تھوڑا کر کے بذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام دنیا میں اتارا گیا۔

رہ گیا یہ سوال کہ پھر اس دوبارا اتارنے میں کیا حکمت ہے تو ایک حکمت تو وہی ہے جس کی طرف سورہ مزمل کی ابتدائی آیات "**یأیها المزمل قم اللیل (الی قوله تعالی) إنا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً**" (۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ساری ساری رات قرآن پاک پڑھنے اور بار بار پڑھنے کا حکم اس لئے دیا ہے، تاکہ قرآن کریم جو کہ کلام الٰہی ہے اور اللہ کی صفت خاصہ ہے جس کا وزن پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکا اس کے بار بار پڑھنے سے کچھ مناسبت اس سے ہو جائے اور پھر اس کے برداشت کرنے کی اور اس کے تحمل واداکی استعداد پیدا ہو جائے۔

بالکل اسی طرح سمجھئے کہ "ام الکتاب" اور لوح محفوظ سے اولاً سماء دنیا پر اور "بیت العزہ" میں اتارنے میں پھر وہاں سے نجماً نجماً (تھوڑا تھوڑا) حضور علیہ السلام پر اتارنے میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کلام الٰہی جو ذات بحث کی صفت خاصہ ہے جب تک ام الکتاب وکتاب مکنون اور لوح محفوظ میں محفوظ تھا اس وقت تک حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی اس کا پورا پتہ ہونا ضروری نہیں تھا اور نہ ان میں بھی اس کے تحمل اداکی پوری استعداد وطاقت کا ہونا لازم تھا، لیکن جب ام الکتاب ولوح محفوظ سے سماء دنیا اور بیت العزہ پر اتارا گیا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقام تھا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کو دیکھا اور بار بار پڑھا تو ان میں اس سے مناسبت وتحمل اداکی طاقت اور پوری استعداد پیدا ہوگئی۔

پھر سرکار دو عالم علیہ السلام کی بعثت کے چند ہی سال بعد کہ ابھی پورا قرآن پاک آپ پر نازل بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت جبرئیلؑ ہر سال ماہ رمضان المبارک میں تشریف لاکر حضور علیہ السلام کو پورا قرآن سناتے تاکہ حضور علیہ السلام کو بھی کلام ربانی سے انس ہو جائے، اور اس کے سمجھنے اور تحمل اداکی پوری استعداد وطاقت پیدا ہو جائے، چنانچہ جس سال آپ کا وصال ہونے والا تھا، احادیث صحاح میں وارد ہے کہ اس سال کے ماہ رمضان میں دو کلام پاک کا دور فرمایا، اور دو بار پورا قرآن پاک آپ کو پڑھ کر سنایا اور اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ اب میرے سفر آخرت اور رفیق اعلی سے ملنے کا وقت آ گیا۔

یہ ایک حکمت دو بار نزول کی اور اس طرح نزول کی برجستہ اس عاصی کے ذہن میں بھی آ گئی اور نہ معلوم کتنی کتنی حکمتیں اس میں مرکوز ہوں گی جن کو صاحب مشکوۃ نبوت علیہ السلام اور صاحب اسرار ہی سمجھ سکتے ہیں۔

۱- سورۂ مزمل: ۱ تا ۵۔

اعتقاد صحیح کرنے اور ایمان لانے کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ اللہ تعالی کی مرضی ومشیت یہی تھی اور اس میں ہزاروں حکمتیں ہوں گی جو ہماری عقول سے بالاتر بھی ہوسکتی ہیں، کتنا بہترین یہ مقولہ ہوگا ۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
احمد تو عاشقی بدلائل ترا چہ کار

پھر آپ خود خیال فرمائیے کہ آپ کے یہ جملے (یہ قیاس دل کو نہیں بھاتا) جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے، کیسے ہیں؟ اول تو اس کو محض قیاسی کہنا، حالانکہ اس پر صحیح صحیح روایات موجود ہیں پھر دل کو نہ بھانا، یا اس کو بے کاری بات بتانا وغیرہ وغیرہ کتنے خطرناک جملے ہیں؟ (العیاذ باللہ)۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدانہ خواستہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم یا کلام کو ہماری خواہش ومرضی یا ہمارے دل یا قیاس کے تابع ہونا چاہئے کہ جس کو ہم اچھا اور صحیح سمجھ لیں بس وہ اچھا اور صحیح ہو اور صرف اس کا حکم یا صرف وہی بات اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہو یا یہ مطلب ہو کہ جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اور نہ ہونی چاہئے یا پھر وہ غلط ہوگی ۔

ذرا سوچئے تو صحیح! یہ کس قدر غلط اور خطرناک خیال یا تخیل ہے، یہی تو گمراہی وضلالت کا پہلا اور سب سے بڑا پھاٹک ہے، جتنے مدعیان نبوت اور گمراہ فرقے (فرق باطلہ اور اہل الھوی والضلال) پیدا ہوئے سب کے سب پہلے اسی پھاٹک میں داخل ہوئے اور پھر اس کے محل تک اپنے اپنے کردار کے اعتبار سے پہنچے، امید کہ اتنی مختصری بات بھی سمجھنے کے لئے کافی ہوگی، اور الجھن میں پڑنے سے حفاظت کا سامان ہوگی ۔فقط واللہ اعلم بالصواب ۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا عورت کی تخلیق مرد کی پسلی سے ہوئی ہے؟

حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو برائے کرم حدیث کا وہ ٹکڑا مع عربی عبارت وحوالہ کتب نقل کریں ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

"عن أبی هریرةؓ أنه قال، قال رسول اللهﷺ: استوصوا بالنساء خیراً فإن المرأة خلقت من

ضلع، وان أعوج شيئ في الضلع أعلاه الخ"، وعلی هامش البخاری (۱/۴٦٨) تحت قوله: النساء، قيل أراد أن أول نساء هي حواء خلقت من ضلع من أضلاع آدم الخ وتحت قوله: من ضلع، قيل: فيه إشارة إلی أن حواء خلقت من ضلع آدم الأيسر والی أنها لا تقبل التقويم الخ" (۱)، مذکورہ بالا حدیث اور اس کے تحت کی جانے والی تشریح سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ہوئی تھی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مجتہد کے لئے کیا شرائط ہیں؟

سوال: مجتہد ہونے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

"وشرطه أنه لا بد له أن يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة" (۲)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ مجتہد کے لئے چند شرائط ہیں:

۱ - پہلی شرط یہ ہے کہ اسے کتاب وسنت کے ان تمام حصوں سے جن سے احکام متعلق ہیں کما حقہ واقفیت ہو۔

۲ -مواقع اجماع سے واقف ہو کہ کہاں اور کن مواقع پر اجماع ہوا ہے تا کہ وہ اجماع کی موجودگی میں قیاس سے کوئی حکم مستنبط نہ کرے۔

۳ -شرائط قیاس سے اچھی طرح واقف ہو تا کہ قیاس مع الفارق نہ کرے۔

۴ - کیفیت نظر سے واقفیت رکھتا ہو تا کہ مسائل کے استنباط میں غلطی نہ کرے۔

۵ -لغت عربی پر کافی عبور رکھتا ہو تا کہ قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اس سے مسائل مستنبط کر سکے۔

۱- بخاری ۱/ ۴٦٩۔

۲- عقد الجید فی أحکام الاجتہاد والتقلید / ۴۔

۶-ناسخ اور منسوخ کو جانتا ہو، اور رواۃ کی حالت سے واقف ہو جن کے اندر مذکورہ بالا شرائط پائی جائیں گی وہ مجتہد ہوگا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حضور علیہ کا سایہ پڑتا تھا:

سوال: نبی علیہ کے جسد مبارک کا سایہ تھا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ کے جسد مبارک کا سایہ تھا جس حدیث سے سایہ کے نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے، سایہ رسول سے متعلق احادیث اس طرح ہیں:

۱-"عن أنس بن مالکؓ صلی بنا رسول اللہﷺ ذات یوم صلاۃ الصبح ثم مد یدہ ثم أخرھا فلما سلم قیل لہ: یا رسول اللہ قد صنعت فی صلاتک شیئاً لم تصنعہ فی غیرھا، قال: إنی رأیت الجنۃ فرأیت فیھا دالیۃ قطوفھا دانیۃ حبھا کدباء فأردت أن أتناول منھا، فأوحی إلیّ أن استأخر فاستأخرت، ثم رأیت النار فیما بینی وبینکم حتی لقد رأیت ظلی وظلکم فأومأت إلیکم أن استأخروا فأوحی إلیّ أقرھم فإنک أسلمت وأسلموا وھاجرت وھاجروا وجاھدت وجاھدوا، فلم أدلی علیکم فضلاً إلا بالنبوۃ" (۱)۔

۲-"عن عائشۃؓ أن رسول اللہﷺ کان فی سفر لہ فاعتد بعیر لصفیۃؓ وفی أید زینب فضل، فقال لھا رسول اللہﷺ: إن بعیر الصفیۃ اعتد فلو أعطیتھا بعیراً من إبلک، فقالت: أنا أعطی تلک الیھودیۃ قال: فترکھا رسول اللہﷺ ذا الحجۃ والمحرم شھرین أو ثلاثۃ لا یأتیھا، قالت: حتی یئست منہ وحولت سریری، قالت: فبینما أنا یوماً بنصف النھار إذا أنا بظل رسول اللہﷺ مقبل قال عفان حدثنیہ حماد عن شمسیۃ عن النبیﷺ ثم سمعتہ بعد یحدثہ عن شمسیۃ عن عائشۃ، ولا أظنہ، إلا

۱- حادی الأفراح إلی بلاد الأرواح لابن قیم الجوزی جلد اول باب اول / ۴۲-۴۳۔

قال فی حجة الوداع"(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اللہ تعالیٰ کا جسم ہے یا نہیں؟ اور آیات صفات کا کیا مطلب ہے؟

(۱)اللہ تعالیٰ مجسم ہے یا غیر مجسم؟

(۲) اگر غیر مجسم ہے تو سورۃ القلم: "**یوم یکشف عن ساق ویدعون إلی السجود فلا یستطیعون**" (سورۂ قلم:۴۲)(جس دن کھولی جائے گی پنڈلی اور پکارے جائیں گے سجدہ کرنے کو پھر نہ کرسکیں گے) ساق کے معنی پنڈلی صاف لکھے گئے، جس سے ایک تخیل پیدا ہو جاتا ہے ایسا کیوں؟

(۳)اگر خدا مجسم ہے تو یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، مگر آنکھ نہیں، اللہ سنتا ہے، مگر کان نہیں ہے، وغیرہ غلط ظاہر ہوتا ہے(نعوذباللہ)۔

(۴)اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنے والا کافر ہے یا غیر مجسم کہنے والا؟

(۵)اللہ تعالیٰ کا جہنم میں قدم رکھنے سے کیا مراد ہے، جیسا کہ (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دیں گے)حدیث میں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱)اللہ تعالیٰ جسم وجسمانیات سے پاک ہیں تمام نقائص وعیوب سے منزہ ہیں غیر مجسم ہیں۔آیت کریمہ ہے: "**اللہ نور السموات والأرض**" (۲)اور نور کے معنی آتے ہیں ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ۔

(۲۔۳) "**یوم یکشف عن ساق**" (۳) میں یوم سے مراد قیامت ہے اور ساق کے معنی لغت میں مافوق القدم (پنڈلی) کے آتے ہیں اور کشف ساق اور تشمیر ساق (کپڑے اوپر کھینچ کر پنڈلی کھول لینا) یہ عرب کے محاورہ میں ایک

۱- مسند احمد ۲۳۱/۲-۲۳۲ فی مسند عائشہ۔
۲- سورۂ نور:۳۵۔
۳- سورۂ قلم:۴۲۔

مثل ہے، اس وقت بولتے ہیں، جبکہ کام کی انتہائی شدت اور حالات کی انتہائی سختی وصعوبت ظاہر کرنی ہوتی ہے، چنانچہ جاہلیت عرب کے امثال میں یہ کلام دائر وسائر ہے کہ "**وقامت الحرب بنا علی ساق**"(۱) اور یہ اشعار بھی اس معنی میں ہیں۔ شعر:

أخو الحرب إن عضت به الحرب عضها　　　وإن شمرت عن ساقها الحرب شمراء

في سنة قد كشفت عن ساقها　　　حمراء تبرى اللحم عن عراقها

اسی محاورہ کے اعتبار سے بیان فرمایا گیا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ جس دن تمام حالات ومعاملات کی حقیقت منکشف ہوجائے گی، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا (تمہیں اس دن سے ڈرنا چاہئے) پھر وہ حال بعد میں مذکور ہے، اور غرض اس آیت سے یوم قیامت کے احوال سے ڈرانا ہے، نہ کہ کوئی عضو مثل اعضاء انسانی کے ثابت کرنا ہے، بلکہ انسانی فہم سے قریب کرنے کے لئے اس طرح بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ ''روح المعانی'' میں بھی ہے: "**ساق الشيئ أصله الذي به قوامه كساق الشجر وساق الإنسان، والمراد به يوم يكشف عن أصل الأمر فتظهر حقائق الأمور وأصولها بحيث تصير عياناً**" (۲) اور سب کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن باری عز اسمہ کی تجلیات ذاتیہ ظاہر ہوں گی اور سب کے حالات وواقعات اور سب کی حقیقتیں اور سب کے کردار واعمال اس طرح ظاہر ہوجائیں گے جس کا مشاہدہ تمام لوگ اس طرح کریں گے جس طرح آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، اور پھر کسی کو بات بنانے اور کسی قسم کی تلبیس وتغیر وغیرہ کرنے کی جرأت وہمت نہ ہوگی۔

اور ساق کے معنی پنڈلی ہی کے لیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ کے لیے ساق ہے، لیکن ایسی جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب ہے، اور اسی طرح آنکھ، پیر وغیرہ والی تمام آیات میں ان اعضاء اور ان اعضاء کے اثرات اور احوال کے مناسب حال تجلیات ربانی مراد ہیں۔ اور اگر کوئی ان اعضاء کو ذاتِ باری عز اسمہٗ کے لئے مراد لے تو کہے گا وہ اعضاء ایسے نہیں، جیسے ہمارے لئے ہیں، بلکہ جو جناب باری سبحانہٗ کے مناسب ہوں، ورنہ کفر ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ سب آیات کریمہ آیاتِ متشابہات میں شمار ہوں گی۔

(۴)　اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنا کفر ہے۔ غیر مجسم کہنے والا کافر نہیں۔

۱- روح المعانی ۵۹/۱۶۔

۲- روح المعانی لعلامہ آلوسی ۵۹/۱۶ مطبع زکریا بکڈپو دیوبند۔

(۵)　اس سے بھی مراد وہی ہے جو ۲ و ۳ میں گذری، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۵/ ۱۳۹۳ھ

تقدیر کیا ہے؟

انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت کے واقع ہونے تک جو بھی اچھے اور برے اعمال کرتا ہے۔ کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے لکھے ہوتے ہیں؟

تقدیر میں گناہ کرنا لکھا ہے تو پھر عذاب کیوں؟

اگر پہلے سے ہی تقدیر میں نیکیوں اور گناہوں کی تعداد مقررہ اوقات میں متعین کردی جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ تقدیر کا لکھا اٹل ہے اگر تقدیر میں پہلے سے ہی گناہ لکھا ہو تو پھر اس پر سزا یا عذاب کیا معنی رکھتے ہیں؟ جبکہ وہ اپنی تقدیر میں لکھے ہوئے گناہ کا ہی مرتکب ہوا، انسان کی تقدیر میں پہلے سے کیا کیا لکھا ہوتا ہے؟ اگر اچھے اور برے تمام اعمال ہی تقدیر میں لکھے ہوئے ہوں تو کس بنیاد پر قبل از وقت تقدیر مرتب ہوئی ہے براہ کرم تفصیل کے ساتھ صراحت فرمائیں، کیونکہ یہاں پر بہت سے اصحاب اس تعلق سے شدید الجھن میں ہیں۔

عبدالمقتدر (ابوظہبی متحدہ عرب امارات)

الجواب وباللہ التوفیق:

جزا اور سزا کے ترتب کا مدار اختیار و شعور و عقل پر ہے اگر کسی کو عقل و شعور نہ ہو، مثلاً پاگل ہو تو وہ کوئی بھی کام کرے اس پر کوئی مواخذہ نہیں، لقوله عليه السلام: **"جف القلم عن الثلاثة النائم والصبي والمجنون أو كما قال"**(۱)، اسی طرح اگر عقل و شعور تو ہو، مگر فعل کا صادر ہونا اختیار میں نہ ہو تو اس میں بھی کوئی مواخذہ نہیں، جیسے کوئی شخص ہے اور آنکھیں کھولے بیٹھا ہے یا کہیں جا رہا ہے، اور کوئی نامحرم عورت سامنے آ گئی یا اس پر نگاہ پڑ گئی تو اس پر مواخذہ نہیں، کیونکہ آنکھ کھلی رہے اور نظر نہ آئے یہ بندہ کے اختیار میں نہیں: **"كما قال عليه السلام لعليؓ :يا علي لا تتبع النظرة النظرة فإن**

۱- وفي أبي داؤد: رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن المبتلى حتى يبرأ، وعن الصبي حتى يكبر" وفي رواية: عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق، وعن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يحتلم" (ابوداؤد کتاب الحدود ۴/۱۴۰)۔

لک الأولی ولیست لک الاٰخرۃ" (۱)، البتہ فوراً نگاہ ہٹالینا ضروری ہے اور دوبارہ اس پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں - **کما دل علیه أیضا هذا الحدیث** - اس لئے اگر فوراً نگاہ نہ ہٹائی یا ہٹا کر دوبارہ پھر دیکھا تو چونکہ جمائے نہ رکھنا اور پھر دوبارہ نہ دیکھنا اختیار میں تھا، اس لئے اس پر مواخذہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب کوئی انسان اپنی عقل وشعور باقی رہتے ہوئے اپنی قدرت واختیار سے کوئی برا کام کرے گا تو اس کو اس پر عذاب ہوگا، اور سزا کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی اچھا کام کرے گا۔ تو اس کو اس پر انعام ملے گا۔ اور جزا کا مستحق ہوگا۔ اور یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بندہ کو عقل وہوش ودانش سے نوازا اور قدرت واختیار بھی عطا فرمایا اور سب اچھے کام اور برے کام بواسطۂ انبیاء علیہم السلام بتلا کر قوت ممیزہ (تمیز) بھی دے دی اور تمام کاموں کا نفع ونقصان بھی اور تمام نتائج بھی بتلا دئے اور اچھے کاموں کے انعامات کا بھی واضح طور پر یقین دلا دیا۔ اب اس کے بعد بھی اگر کوئی احکام خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ انعامات خداوندی کی ناقدری کرتا ہے اور یہ احکام خداوندی کی تکذیب اور اس سے بغاوت کے مترادف ہوگا، اس لئے سزا کا مستحق ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہے: "**إنهم کانوا لا یرجون حسابا، وکذبوا باٰیاتنا کذابا، وکل شیءٍ أحصینٰه کتابا، فذوقوا فلن نزیدکم إلا عذابا**" (۲) (بیشک یہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ ہی نہ رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (ان کے اعمال میں سے) ہر چیز کو ان کے اعمال نامے میں لکھ کر ضبط کر رکھا ہے، سو اب اس کا مزہ چکھو کہ ہم اب تمہارا عذاب ہی بڑھاتے رہیں گے)۔

اور اسی طرح اگر عقل وشعور سے اور اپنے اختیار سے کام لے کر اچھا کام کرے گا۔ اور دوسرے کام سے اپنے کو روکے گا۔ تو اگر چہ اپنی عقل وشعور اور اختیار کے اعتبار سے خود اپنا فرض ادا کرنے والا ہوگا، مگر ذات خداوندی نے اس کو اپنا منقاد اور اپنے انعامات واحسانات کی قدر دانی کرنے والا شمار فرما کر اپنے فضل وکرم سے اس پر اپنا انعام مقرر فرما دیا، اس کو جزا کا لقب دے کر مستحق ثواب وجزا قرار دے دیا جیسا کہ فرمایا گیا:

"**لئن شکرتم لأزیدنکم ولئن کفرتم إن عذابي لشدید**" (۳) اور فرمایا گیا: "**إن للمتقین مفازا حدائق وأعنابا وکواعب أترابا وکأسا دهاقا، لا یسمعون فیها لغوا ولا کذابا جزاء من ربک عطاء حسابا رب السموات والأرض وما بینهما الرحمن لا یملکون منه خطابا**" (۴)، (اگر تم لوگ شکر ادا کرتے

۱- رواہ الترمذی والدارمی وابوداؤد، ترمذی مع عارضۃ الاحوذی کتاب الادب، (باب نمبر: ۲۸) ۱۰/۲۲۹ دار احیاء التراث بیروت۔

۲- سورہ نبأ: ۲۸-۳۰۔

۳- سورہ ابراہیم: ۷۔　　　۴- سورہ نبأ: ۳۱-۳۷۔

رہو گے تو میں تمہارے لئے انعامات میں زیادتی ہی کرتا رہوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو (سمجھ لو) بلاشبہ میرا عذاب بہت ہی سخت ہے، بے شک ڈرنے والوں کو مراد ملنی ہے باغ ہیں اور انگور اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب اور پیالہ چھلکتا، نہ سنیں گے وہاں بکنا اور نہ بدلا ہے تیرے رب کا دیا حساب سے جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اور جو ان کے بیچ ہے مہربانی والا قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے)۔

اور یہ سوال کہ انسان اپنے پیدا ہونے سے لے کر موت تک جو اچھے برے کام کرتا ہے تو کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے ہی تفصیل کے ساتھ لکھا ہوتا ہے؟ تو جی ہاں یہ صحیح ہے وہ سب کام پہلے ہی سے لکھے ہوتے ہیں، رہا یہ اشکال کہ اگر تقدیر میں پہلے ہی سے گناہ لکھا ہوا لخ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ربط حادث بالقدیم کے مسئلہ سے ہے، یعنی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سواء جتنی چیزیں ہیں، خواہ آسمان سے اوپر کی ہوں یا آسمان سے نیچے کی اور عالم سفلیات کی ہوں، جیسے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان وجنات سب کا ایک خاص رابطہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات سے ہے اور ان سب چیزوں کے پیدا ہونے سے بہت قبل، ازل سے ہی یہ تمام رابطے اور ان کی تمام تفاصیل سب کی سب ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے علم میں موجود ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: **"هو الأول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شيء عليم"** (۱) (وہی (ذات باری تعالیٰ) اول بھی ہے وہی آخر بھی ہے وہی ظاہر بھی ہے وہی باطن بھی ہے وہی ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے)۔

بلکہ ہر جزئی سے جزئی چیز کی تمام مقدار ایک خاص ترتیب کے ساتھ پورے عالم کے تکوین وانتظام واستحکام کی حکمت کے تقاضے کے مطابق ازل ہی سے لکھی ہوئی محفوظ وموجود ہیں جن میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق کبھی نہیں آسکتا کما قال اللہ تعالیٰ: **"إن الله خالق كل شيء"** (۲) (بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں)۔

اور ارشاد ہے: **"إن الله بالغ أمره قد جعل الله لكل شيء قدراً"** (۳) (بے شک اللہ تعالیٰ اپنے ہر کام کو اس کے کمال تک پہنچانے والے ہیں)۔

بیشک اللہ رب العزت نے ہر چیز کے لئے اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور ارشاد ہے: **"لا الشمس ينبغي لها أن**

۱- سورۂ حدید: ۳۔
۲- سورۂ زمر: ۶۲۔
۳- سورہ طلاق: ۳۔

تدرک القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلک يسبحون" (۱) (آفتاب کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ماہتاب کو پاجائے اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی ہے، بلکہ ہر ایک اپنے اپنے محور پر تیرتے رہتے ہیں)۔

اور ارشاد ہے: "**مرج البحرين يلتقيان، بينهما برزخ لا يبغيان فبأي آلاء ربكما تكذبٰن**" (۲)۔

اس قسم کی بے شمار آیات ونصوص میں جو قاطع دلیل ہیں کہ اللہ جل جلالہٗ نے یہ تمام چیزیں اپنی خاص حکمت وقدرت کے تحت پیدا فرمائی ہیں اور ازل ہی سے مکتوب بھی فرمالیا ہے اور وہ سب اٹل ہیں اور اس کے خلاف ذرہ برابر بھی کبھی نہیں ہوسکتا اور یہ سب اللہ کے علم وقدرت کے تحت ہے اور اگر ایسا نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ من ذلک۔ ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات کو علم سے عاری، قدرت وحکمت سے خالی اور عاجز وغیرہ ماننا پڑے گا۔

"**وتعالىٰ عما يقولون علواً كبيراً**" (۳) (اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے)۔

اور اسی مسئلہ کو مسئلہ تقدیر کہتے ہیں۔ اور چونکہ علم وعقل انسانی کسی ایک مخلوق کے اس رابطہ کی حقیقت اور اس کی کیفیات وحالات کو بھی سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے، کیونکہ انسان کی عقل و دانش اور علم ادھورا اور نامکمل ہے، ہر طرف سے جہل وعجز سے اور عدم علم سے گھرا ہوا ہے، بڑے بڑے عقلاء وحکماء بھی عاجز و درماندہ ہیں، مثلاً عقلاء کی وہ جماعت جو آسمان کے وجود کی قائل نہیں ہے۔ وہ بھی نہ بتاسکی کہ یہ فضا کہاں تک ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، بلکہ محض اس زمین سے اوپر کی اس خالی فضا میں کیا کیا چیزیں ہیں اور کس انداز وڈھنگ کی ہیں ان سب کو بھی ابھی تک عقل انسانی نہ معلوم کرسکی یہ تو بڑی بات ہے۔ زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کا احاطہ بھی عقل انسانی ابھی تک نہیں کرسکی آئے دن برابر نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اور نئی نئی چیزوں کا علم حاصل ہوتا رہتا ہے، کرۂ زمین مع کرۂ ماء محدود ہے اور اس کے اردگرد انسان بارہا چکر لگاچکا ہے، مگر اب تک معلوم نہ کرسکا کہ زمین کے اندر اس کی تہوں میں کیا کیا چیزیں مخفی ہیں یا سمندروں کی گہرائی کتنی ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں، حالانکہ ان چیزوں کا مشاہدہ وانکشاف اپنی قدرت واختیار میں سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی شب وروز کی مساعی سے اندازہ ہوتا ہے، تو پھر جن چیزوں کا انکشاف ومشاہدہ حواس خمسہ ظاہرہ وحواس خمسہ باطنہ میں سے کسی کے ذریعہ نہ ہوسکتا ہو اور اس کا انکشاف ومشاہدہ اپنی قدرت واختیار میں نہ ہو، اس کو یہ ہماری عقل انسانی محض اپنے بل بوتے پر کیسے معلوم کرسکتی ہے؟

۱- سورۂ یٰسین: ۴۰۔

۲- سورۂ رحمٰن: ۱۹ تا ۲۱۔

۳- سورۂ اسراء: ۴۳۔

اسی دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کے اثرات ہم دن رات دیکھتے ہیں۔ اور ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، مگر ان کی حقیقت معلوم کرنے سے ہماری عقل عاجز و درماندہ ہے۔ مثلاً یہی روح ہے جو ہر جاندار کے اندر رہوتی ہے اور اس کے اثرات (چلنا پھرنا کھانا پینا وغیرہ سب) ہم دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور جب وہ روح جسم سے الگ ہوجاتی ہے تو وہی جسم خاک کا ایک ڈھیر، بلکہ اس سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔

بڑے بڑے فلاسفہ وعقلاء نے روح کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہا، مگر متضاد کلام بول کر اپنے عجز و درماندگی کا اظہار کر کے چلے گئے، نہ ان کے تجربات نے ہمنوائی کی اور نہ ان کے حسیات ووجدانیات ہی نے رہنمائی کی۔ کلام الٰہی بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"ویسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربي وما أوتيتم من العلم إلا قليلا"(۱) (یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا حکم ہے (تم لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے کہ) تم لوگ علم کا بہت تھوڑا حصہ دیئے گئے ہو)۔

اسی طرح کیفیات نفسانیہ ہیں کہ ان کو بھی محض ان کے اثر وعلامات کے ذریعہ جانتے ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقین رکھتے ہیں، مگر اس کی حقیقت کا مشاہدہ نہ کر سکتے ہیں، نہ کرا سکتے ہیں، بلکہ بہت سی کیفیات نفسانیہ ایسی ہیں کہ جب تک انسان ان سے خود متصف نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی حقیقت کو نہ وہ خود سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو وہ حقیقت سمجھا سکتا ہے، خبر دینے والے اور بتلانے والے پر ہی اعتماد کر کے ماننا اور یقین کرنا پڑتا ہے اور یہ طریقہ رائج، بلکہ شائع وذائع ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جیسے نابالغ لڑکا اگرچہ ذی شعور ہو چکا ہے، مگر وہ بلوغت کی حقیقت ولذت نہیں سمجھا سکتا، اگر کوئی دوسرا سمجھانا اور بتلانا بھی چاہے تو بلوغت کی حقیقت ولذت نہیں سمجھا سکتا، بلکہ محض استاد کے بتلانے اور مخبر کے خبر دینے پر قناعت کرتا ہے اور یقین کر لیتا ہے اور اس کے مسائل کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور جب بالغ ہو جاتا ہے۔ تو خود بلوغت کی حقیقت ولذت وغیرہ سب کا مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کر لیتا ہے۔

اور جیسے عنین آدمی جو جماع پر قادر نہ ہو۔ اس کو جماع کی لذت وکیفیت معلوم نہیں اگر کوئی اس کو جماع کی لذت وکیفیت سمجھانا چاہے تو سمجھا نہیں سکتا، حالانکہ جماع کی لذت وکیفیت کا وجود یقینی ہے، اور اس عنین کی عقل ودانش بھی کامل

۱- سورۂ اسراء: ۸۵۔

ومکمل ہے، بلکہ وہ علامہ دوراں بھی ہوسکتا ہے، مگر اس کے معلوم کرنے اور سمجھنے سے عاجز وقاصر ہے، اور محض لوگوں کے بتانے پر تسلیم کرتا اور یقین کرتا ہے، جب عقل انسانی کا اس دنیا فانی کی چیزوں میں یہ حال ہے تو پھر آخرت کے معاملہ میں اور آخرت کی چیزوں میں جو اس عقل سے وراء الوراء ہے محض اپنی اس عقل وعلم کے ذریعہ کیسے معلوم کرسکتا ہے؟ اور محض اپنی اس عقل وعلم سے سمجھ لینے پر تسلیم کرنے کا مدار رکھنا کہاں تک قرین شعور ودانش ہے۔ اس کی مثال تو اس نابالغ بچے اور عنین شخص جیسی ہوگی جو نابالغ وعنین ہونے کے باوجود بلوغت ولذت جماع کی حقیقت معلوم کرنے کا خواہشمند ہو، غرض علم وعقل انسانی کا اس تمام کائنات اور مخلوقات کے اس رابطۂ حادث بالقدیم کی حقیقت وکیفیت کو سمجھانا تو درکنار وہ تو اس کی ایک ایک مخلوق کے بھی اس کے ساتھ رابطہ کی حقیقت وکیفیت کو معلوم کرنے اور سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے، اور اس کے لئے نابالغ وعنین کی طرح بجز اس کے چارہ نہیں کہ وہ مخبر صادق جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خبروں پر اور وحی الٰہی کی خبروں پر اعتماد کر کے صحیح تسلیم کر لے اور ہلاکت سے اپنے آپ کو بچالے اور صرف یہی ایک ذریعہ اس کو اپنے کو ہلاکت سے بچانے اور نجات دلانے کا ہے، ورنہ اس کی مثال بالکل اس شخص جیسی ہوگی جو جہاز میں سوار ہو کر کہیں جارہا ہو اور جہاز بھنور میں پڑ گیا ہو، اور جہاز ران کہہ رہا ہو کہ جلدی اپنے گلے میں یہ ہوا کا حلقہ ڈال لو، کمر میں یہ ہوا کی پٹی باندھ لو، اور سینہ سے یہ ہوا کی مشک لگالو اور بوقت ضرورت اس سے کام لو، ورنہ ڈوب کر ہلاک ہوجاؤ گے۔ اور وہ شخص جہاز ران کی ان ہدایتوں کو نہ مانے اور یہ کہے کہ ہم تو جب تمہاری بات تسلیم کریں گے اور مانیں گے جب جہاز کو بھنور میں غوطہ کھانے کی سب حقیقت اور کیفیت دکھلا دو یا بتلا دو یا سمجھا دو اس کے بعد ہی تمہاری بات مانیں گے۔ اور تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے۔ ایسے شخص کو کون صحیح الفہم، صائب الرائے اور صاحب عقل ودانش کہے گا۔ بالکل یہی حال وحکم ہوگا اس شخص کا جو ربط حادث بالقدیم کی حقیقت اور اس کی تمام کیفیات وتفصیلات کو وحی الٰہی اور مخبر صادق کی خبر کی مدد کے بغیر محض اپنے علم وعقل سے معلوم کرنے کے درپے ہوگا اور مطالبہ کرے گا۔ اور تقدیر کا مسئلہ بھی چونکہ اسی قبیل سے ہے، اس لئے اس کے بارے میں بھی یہی حکم وحال ہوگا۔ انہیں وجوہ سے رحمتِ عالم نبی اکرم ﷺ نے اس مسئلہ میں بحث کرنے سے روک دیا ہے مثلاً فرمایا کہ:

الف : "یأتی الشیطان إلیٰ أحدکم، فیقول من خلق کذا ،من خلق کذا، حتی یقول: من خلق ربک، فإذا بلغه فلیستعذ بالله ولینته" (۱)۔

ب : قال علیه السلام: "لا یزال الناس یتساء لون حتی یقال: هذا خلق الله الخلق، فمن خلق الله

۱- رواہ البخاری، مشکوٰۃ، کتاب الایمان ۱/ ۲۰۳۔

فقولوا: الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن لهٗ كفواً أحد، ثم يتفل عن يساره ثلاثا وليستعذ بالله من الشيطان الرجيم"(۱)۔

(الف-شیطان تم میں سے ایک کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ کس نے یہ پیدا کیا؟ کس نے وہ پیدا کیا پوچھ پڑتا ہے، پھر تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا، پس جب شیطان اس حد پر پہنچے تو تم اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو اور تھکار سے اس کو دفع کر دیا کرو)۔

ب- حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپس میں سوال و جواب کرتے کرتے یہ پوچھ پڑتے ہیں کہ تمام مخلوق کو تو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ پس جب لوگ اس قسم کا سوال کر بیٹھیں تو تم لوگ فوراً یہ کہو کہ اللہ کی ذات تو بے نیاز ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس ذات نے نہ تو کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور نہ کوئی اس کے مثل ومماثل ہے، پھر اپنے بائیں مونڈھے پر تھکار دے اور شیطان رجیم سے پناہ مانگے۔

ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اس مسئلہ میں رد وکد یا بحث مباحثہ کرے گا، تو عجب نہیں کہ شیطانی نرغہ میں پھنس کر اور مخبوط الحواس ہو کر یہ پوچھنا شروع کر دے کہ جب یہ ساری کائنات ومخلوقات اللہ نے پیدا کی ہے تو (نعوذ باللہ) خود اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے، چنانچہ بہت سی احادیث میں اس کو بیان فرمادیا گیا ہے، اور اس میں گفتگو کرنے سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، بلکہ ایک موقعہ پر چند صحابہ کو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر بہت سخت تاکید فرمائی ہے، "ترمذی شریف" میں حدیث ہے ایک صحابی فرماتے ہیں:

"خرج علينا رسول الله ﷺ ونحن نتنازع في القدر فغضب حتى أحمر وجهه حتى كأنما فقئى في وجنتيه حب الرمان فقال: أبهذا أمرتم؟ أم بهذا أرسلت إليكم إنما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا في هذا الأمر، عزمت عليكم عزمت عليكم أن لا تنازعوا فيه، رواه الترمذي" (۲)۔

(ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک حضور ﷺ تشریف لائے (اور ہم لوگوں کی یہ گفتگو دیکھ کر) سخت غضبناک ہو گئے، یہاں تک کہ آپ کا چہرہ اس طرح سرخ ہو گیا جیسے آپ کے مبارک رخساروں میں انار نچوڑ دیئے گئے ہوں، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم لوگ اسی کا حکم دیئے گئے ہو، یا کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ تم ان باتوں میں بحث وتمحیص کرو، تم سے قبل بہت سے لوگ اس تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرنے کی وجہ سے

۱- مشکوۃ عن سنن ابی داؤد کتاب الایمان باب الوسوسہ مع شرح الطیبی ۱/ ۲۱۲۔
۲- مشکوۃ مع شرح الطیبی کتاب الایمان ۱/ ۲۵۱۔

ہلاک کئے جاچکے ہیں۔خبر دار! خبر دار! میں تم لوگوں پر لازم کرتا ہوں کہ کبھی اس میں بحث ومباحثہ مت کرو)۔

اس حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس پر ایمان رکھتے ہوئے خاموشی سے ان مقاصد کی تکمیل کرنی چاہئے، جن کے لئے آپ مبعوث فرمائے گئے ہیں اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے اور احیائے سنت کیا جائے۔اگر غور کیا جائے تو اسی طریقہ کار میں عقلاً بھی سلامت روی اور ہوشمندی ہے،ایک موقعہ پر صحابہ کرام نے سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے اسی مسئلہ تقدیر کو پیش فرما کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ أفلا نتكل على كتابنا وندع العمل"، تو پھر کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ کرکے عمل کرنا ترک نہ کردیں تو آپ نے جواب میں ارشا فرمایا:

"قال: اعملو فكل ميسر لما خلق أما من كان من أهل السعادة فسيسر لعمل السعادة، واما من كان من أهل الشقاوة فسيسر لعمل الشقاوة، ثم قرا: فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنى الآية" (۱)۔

"وبقيه الأية هذا وأما من بخل واستغنى وكذب بالحسنىٰ فسنيسرهٗ للعسرىٰ وما يغنى عنه ماله إذا تردى"(۲)۔

(عمل کرو ہر شخص کے لئے وہی عمل آسان کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، پس جو شخص اہل سعادت سے ہوتا ہے اس کے لئے سعادت کے کام آسان ہوتے ہیں اور جو شخص اہل شقاوت میں سے ہوتا ہے اس کے لئے شقاوت کے کام آسان معلوم ہوتے ہیں، پھر آپ نے یہ آیت کریمہ:**"فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنىٰ فسنيسره لليسرىٰ"**(۳) تلاوت فرمائی (پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے)بہر حال جو شخص صدقہ وزکوۃ نکالتا رہتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے اور ایمان کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے اس کو ہم نیک کام اور فراغت دتی آسان کردیتے ہیں۔اور پھر اس کا مال اس کو ہلاک ہونے سے نہیں بچاتا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تقدیر میں لکھے ہوئے پر بھروسہ کرکے عمل چھوڑ بیٹھنے کی درخواست کی تھی تو آپ ﷺ نے عمل چھوڑ بیٹھنے سے منع فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ عمل کرتے رہو اور ہمیشہ نیک عمل کی کوشش کرتے رہو، یہ سب

۱- مشکوۃ عن البخاری ومسلم، سورہ لیل:۵ تا ۷، بخاری کتاب تفسیر القرآن، باب ۷، ۸۶/۶ و ابوداؤد کتاب السنہ حدیث نمبر ۴۶۹۴، ۲۲۳/۴ (مرتب)۔

۲- سورۂ لیل:۸ تا ۱۱۔

۳- سورۂ لیل:۵ تا ۷۔

اعمال (نیک وبد) انسان کے انجام پر اور مابعد الموت کے حالات پر قرینہ بنتے ہیں جو نیک بخت ہوتا ہے، اس کے لیے دنیا میں نیک اعمال آسان کردئے جاتے ہیں اور جو بد بخت ہوتا ہے، اس کے لئے اعمال بد آسان کردئے جاتے ہیں، لہذا اگر اعمال خیر صادر ہوں تو شکر کرو اور مزید عمل نیک کی توفیق مانگو اور اس کے لئے سعی کرو اور اس میں رضائے باری حاصل ہونے کی دعاء کرو اور رضاء باری حاصل کرنے کی توفیق مانگو۔

پوری انسانی زندگی کا اصلی سرمایۂ حیات رضاء باری تعالیٰ کا حاصل ہوجانا ہے، **كما أشار إليه قوله تعالىٰ:** ”**وما لأحد عنده من نعمة تجزىٰ إلا ابتغاء وجه ربه الأعلى ولسوف يرضى**“ (۱) نیکوں کے نزدیک اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں ہے کہ ان کو ان کے اعمال کے بدلہ میں دیدار خداوندی نصیب ہو اور باری تعالیٰ جلد ان کو اس نعمت سے خوش کردے گا۔

اور اس سرمایۂ حیات (رضاء باری) کا حصول اعمال نیک کے پردہ میں ہوتا ہے جو تقویٰ اور اخلاص کے ساتھ حکم شرعی کے مطابق ہو، جیسا کہ فرمایا گیا:

”**وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء**“ (۲) اور فرمایا گیا: ”**فأما من أعطىٰ واتقىٰ وصدق بالحسنىٰ فسنيسره لليسرىٰ وأما من بخل واستغنىٰ وكذب بالحسنىٰ فسنيسره للعسرىٰ وما يغني عنه ماله إذا تردى**“ (۳)۔

(لوگ حکم نہیں دئے گئے ہیں، مگر اس بات کا کہ کامل اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں اور دین کو خالص اللہ کے لئے بنائیں اور حنیف بنے رہیں، — سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا۔ اور سچ جانا بھلی بات کو سو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے آسانی میں اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا۔ اور جھوٹ جانا بھلی بات کو تو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے سختی میں اور کام نہ آئے گا اس کا مال جب گڑھے میں گرے گا)۔

لہذا اسی سرمایۂ حیات و مقصد زندگی کی حفاظت کو ہمیشہ مطمح نظر بنائے اور اسی پر قناعت کرے کہ اسی میں سلامتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- سورۂ لیل: ۱۹-۲۱۔
۲- سورۂ بینہ: ۵۔
۳- سورۂ لیل: ۵ تا ۱۱۔

شانِ رسول ﷺ میں گستاخی کرنا کیسا ہے؟

عالی جناب مفتی صاحب مدظلہ مندرجہ ذیل سوال کا جواب عنایت فرمائیں (۱):

"یہی نہیں، بلکہ آج سے چودہ سو سال قبل جب پیغمبر خدا (ﷺ) کو اہل مکہ نے اپنی ظالمانہ حرکتوں سے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، تو اسی واحد قوم انصار نے آپ کو پناہ دی، یہ ہی واحد قوم ہے جس سے رب العزت نے اپنے پیارے رسول کا تحفظ کر دیا، اور یہ ہی قوم انصار اپنی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے ہر دور ہر خطہ زمین سے گذرتی رہی۔ یہاں تک کہ اپنی تہذیب کے ساتھ میرے عزیز ملک میں بھی آئی۔"

اوپر لکھے ہوئے یہ الفاظ جو شانِ رسول اللہ میں استعمال ہوئے ہیں۔ استعمال کرنے والے پر کیا جرم عائد ہوتا ہے؟ اور پناہ کا لفظ شانِ رسول ﷺ کے لئے استعمال کرنا کیسا ہے؟ اور اس لفظ کا استعمال کہاں ہوتا ہے؟

عمر حسین کول ڈپو، نیاز گنج، الموڑہ، یوپی

الجواب وباللہ التوفیق:

شانِ رسول اللہ ﷺ میں گستاخی کرنے والا ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، باقی گفتگو اس مذکورہ عبارت پر ہے کہ اس کا کیا حکم ہے۔

"فیروز اللغات" میں لفظ پناہ کے مختلف معانی لکھے ہوئے ہیں، مثلاً حفاظت، حمایت وغیرہ (۲)۔

نیز (بخاری شریف ۲/۶۲۰) میں غزوۂ حنین کے ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ کہ آپ نے جنگ حنین کے مال غنیمت کو بعض قریش کو تالیف قلب کے لئے دیا اور انصارؓ کو نہیں دیا جس کی وجہ سے ان کے اندر خلجان پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے (لمبی حدیث ہے، اخیر میں) یہ فرمایا: "لو شئتم قلتم جئتنا کذا و کذا" اور "فتح الباری" (ص ۱/۴۱) میں ان جملوں کی تشریح میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے یہ الفاظ منقول ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: "**أما واللہ لو شئتم لقلتم فصدقتم وصدقتم أتیتنا هکذا مکذبا فصدقناک ومخذولاً فنصرناک وطریداً فاٰویناک وعائلاً**

۱- اصل مسودے میں سوال یہیں سے شروع ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ سوال کیا گیا ہے، اس کی بہت سی باتیں نقل کرنے کے بعد اپنے سوال کو مزید مدلل کرنے کے لئے سائل نے "یہی نہیں" بلکہ آج سے...... سے بات شروع کی ہے، اور سائل کا منشاء چونکہ اتنا ہی سے واضح ہو جا رہا ہے، اس لئے اصل مسودے میں "" کے درمیان کی عبارت نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے (مرتب)۔

۲- فیروز اللغات / ص ۳۰۳۔

فو اسیناک"(۱)۔

ان تمام باتوں کے باوجود حضور ﷺ نے ان کو خارج ایمان نہیں قرار دیا یہ سب اس بات کے قرائن ہیں کہ تکفیر نہ کرنی چاہئے، نیز فقہ کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں سو پہلو میں سے ننانوے پہلو کفر کے نکلتے ہوں اور صرف ایک پہلو ایمان کا نکل آتا ہو تو کافر نہ کہنا چاہئے، "إذا كان في المسئلة وجوه توجب الكفر ووجه واحد يمنع فعلى المفتي أن يميل إلى ذلك الوجه كذا في الخلاصة"(۲) اور یہاں تعدد معانی کی وجہ سے احتمال عدم تکفیر پیدا ہو گیا، اس لئے بھی تکفیر نہ کریں گے، البتہ ایسے الفاظ جو موہوم ہوں ان کا استعمال جناب رسالت مآب ﷺ کی شانِ اطہر میں ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیونسٹ پارٹی میں شامل شخص کا حکم:

"نسأل الله تعالىٰ لنا ولكم العفو والعافية ولغرض لدى الاستاذ الكريم ان افجع ما نزل اليوم بعامة المسلمين ولا سيما مسلمي جبال الافغانستان وسكان القرى والبلاد فيه فاجعة سلطة الكميونستين العارضين من نور محمد التركي إلى من يحذو حذوة وبعدها سلطة الكميونستين الأصلين من برزنيف إلى من يتلو تلوه، والفرقة الاوى قد تصلي وتتلو آية من القرآن الكريم عند الناس وانها لتصدق وتؤمن باحكام كميونست وتبطل قانون الملك والإرث و تقول بدل التبادل في الحقوق على قدر الاستحقاق بالتساوى في العمل فكما يصوغ للرجل خروج التبرج، كذلك يجوزونه للمرأة بل يجبرونها به، والرجل يطيع شمول الفوج الحربي ويقهرون النسوان بذلك و يبطلون الملك ولو ملك المتعة يحقون الطلاق من الجانبين الزوج، والزوجة، بل يقولون: إن التدين بأى دينٍ كافيون منّوم، وكتب العقائد الاسلامية والفقه الاسلامي مشحونة بكفر من أنكر نصًا قطعياً أو إجماعاً كذلك، وذلك الصديق أكبرؓ قد قاتل ما نعي الزكوة وهم يصلون ويصومون،

۱- فتح الباری ۲/ ۴۱۔

۲- الفتاوی الہندیہ احکام المرتدین ۲/ ۲۸۳۔

وهولاء المرتدين يقابلون معاملات الشرع باسرها ويبطلونها بفرامينهم المشؤمة، فنرجو أن تزيحوا شبهتنا من فتيا معنونة بعنوانكم الف ۳۰۲ باستفتاء۔"

مسلم لندني فيها نص آتي (جو شخص نماز روزہ کرتا ہو اس کو محض کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے قتل کر دینا جائز نہیں)۔ بینوا توجروا۔

شیخ صاحب قندھاری مہاجر کوئٹہ پاکستان

الجواب وبالله التوفيق:

جواب ہمیشہ سوال کے تابع اور اس کے مطابق ہوتا ہے، لہذا یہ جواب بھی اپنے سوال کے تابع اور اس کے مطابق ہوگا اگر اس جواب کے ساتھ پورا سوال و پورا جواب بھی یہاں نقل ہوتا ہے تو خود بخود آسانی سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اگر سوال نقل کرنے کا موقعہ نہیں تھا تو صرف نمبر سوال بھی اگر مذکور ہوتا جب بھی ہم اپنے فائل سے نکال کر دیکھ لیتے بہر حال چونکہ یہ جواب احقر کا ہی لکھا ہوا ہے، اس لئے اس کا پورا مفہوم بھی احقر کے ذہن میں ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان صحیح العقیدہ وصحیح الاعمال ہو اور وہ ہندوستان کی سیاسی جماعت جو کمیونسٹ کے نام سے موسوم ہے محض سیاسی اشتراک کر لینے کی وجہ سے چاہے اس سیاسی کمیونسٹ جماعت کا ایک فرد کہا جائے، مگر اس کو محض اس وجہ سے قتل کر دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ بالکل ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ کانگریس وغیرہ دوسری جماعتوں میں صحیح العقیدہ اور صحیح الاعمال مسلمان کے شریک سیاست ہو جانے سے ان کا قتل کر دینا جائز نہیں۔

بصیرت کے لئے ذرا اور تفصیل سمجھ لیجئے ہندوستان میں بہت سی سیاسی جماعتیں (کانگریس، شوسلسٹ، کمیونسٹ وغیرہ) ہیں اور ہر ایک میں غیر مسلموں (کافروں مشرکوں، دہریوں) وغیرہ کی اکثریت ہے، مگر ہر جماعت میں لوگ اپنے عقیدے ومذہب پر قائم رہتے ہوئے شریک جماعت ہوتے ہیں اور محض اس وجہ سے کسی کو مرتد یا کافر یا واجب القتل نہیں کہا جاتا اور نہ کہہ سکتے اسی طرح اس کو بھی واجب القتل نہیں کہہ سکتے (۱)، اور جو مسلمان اسلامی عقائد واعمال کو چھوڑ کر کافرانہ عقیدہ

۱- عن أنس بن مالک ؓ قال، قال رسول اللهﷺ: ثلاثة من أصل الإيمان، الكف عمن قال لا إله إلا الله، ولا تكفره بذنب ولا تخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل والإيمان بالأقدار (سنن ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الغزو مع ائمۃ الجور ۳/۸ احدیث ۲۵۳۲) روى الطحاوي عن أصحابنا لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه، ثم ما تيقن أنه ردة يحكم بها به، وما يشك أنه ردة لا يحكم بها، إذ الإسلام الثابت

واعمال اختیار کرلے تو اگر چہ وہ کسی بددین جماعت میں داخل نہ بھی ہو جب بھی شرعی حکومت کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام پیش کرے، اور پیش کرنے کے بعد ارتداد پر قائم رہے تو اس کو قتل کردے(۱)۔

اور جو اعمال وعقائد سوال میں درج ہیں اس کا قائل ومعتقد بلاشبہ اسلام سے خارج ہوگا اور شرعی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ اسلام پیش کرے، اگر اس کے باوجود باز نہ آئے تو سزائے مرتدین جاری کردے، لہذا اس فتوی سے مغالطہ نہ کھانا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا توریت، انجیل وبائبل پڑھنے والا مرتد ہوگیا؟

اگر کوئی شخص توریت انجیل یا بائبل محض معلومات کے لئے مطالعہ کرے حالانکہ وہ مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے اور جمیع امور مسلمانوں کی طرح بجالاتا ہے کیا یہ شخص مرتد ہوگیا۔

مذکورہ شخص کو مرتد کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے مفصل تحریر فرمائیں۔

اسرار احمد ضلع سہارنپور، یوپی

الجواب وبالله التوفيق:

محض معلوماتی مطالعہ کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہاں جو شخص اپنے مذہبیات پر پورا عبور رکھتا ہو ہر قسم کے نشیب وفراز کو سمجھتا ہو حق وباطل کو خوب پہچانتا ہو اور اس کے رد کرنے کی بھی پوری قدرت رکھتا ہو اور رد کرنے کے ہی نیت سے دیکھے اور پھر جہاں کچھ اشکال ہو وہاں اس فن کے ماہر علماء سے رجوع کرتا رہے، تو اس کو اس کی اجازت ہوگی باقی اسکولوں کالجوں وغیرہ اور مدارس میں جو ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اسکا حکم ایسا ہے جیسا کہ عربی دینی مدارس میں فلسفہ کی کتابیں جن میں عقائد

لا يزول بشک مع أن الإسلام يعلو، ويبغي للعالم إذا رفع إليه هذا أن لا يبادر بتكفير أهل الإسلام مع أنه يقضي بصحة إسلام المكره (البحر الرائق ۵/۲۰۹) (مرتب)۔

۱- وفي المسايرة: ولاعتبار التعظيم المنافي للاستخفاف كفر الحنفية بألفاظ كثيرة وأفعال تصدر من المتهتكين لدلالتها على الاستخفاف بالدين (البحر الرائق ۵/۲۰۲)، ويعرض الإسلام على المرتد وتكشف شبهته ويحبس ثلاثة أيام، فإن أسلم وإلا قتل (کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ۵/۲۰۱) (مرتب)۔

اسلام کے خلاف باتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے اثبات "جزء الذی لا یتجزی، ہیولی بصورت جسمیہ وقدم عالم وصفات باری تعالی، کے مسائل وغیرہ اور جیسا کہ دفع سحر کے لئے مسائل کا پڑھنا پڑھانا کہ ان مسائل وعقائد کو رد کرنے اور ان کے ضرر سے بچنے اور انکا صحیح شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں اور جیسا کہ اسکولوں کالجوں میں حساب سود کا اور دیگر ناجائز قوانین کا اور داخل نصاب گیتا اور رامائن وغیرہ پڑھنے پڑھانے کا حکم کہ اس کو وقت آنے پر رد کرنے کی نیت سے یا محض نصاب کے جزو لازم ہونے کی وجہ سے اور امتحان میں پاس ہونے کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں اور ان مضامین کو حق نہیں مانتے اور نہ ان کو حق وصحیح کہتے ہیں، بلکہ موقع آنے پر اس کو رد کرنے کی نیت رکھتے ہیں اور ایسی صورتوں میں بوجہ ضرورت او ربقدر ضرورت ان کے پڑھنے پڑھانے کی گنجائش ہوگی (۱) اور سوال کا پرچہ محض مطابق سوال لکھنے سے یا اس کو صحیح جواب کہنے سے مرتد نہیں کہیں گے، جبکہ وہ ان چیزوں اور مضامین کو حق وصواب نہیں جانتا، ارتداد نام ہے دین سے پھر جانے کا اور وہ شخص ایسا نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اسلامی عقیدے رکھتا ہے، اسلامی قاعدہ وقانون کے مطابق اسلامی عبادت بھی کرتا ہے، پس ایسی حالت میں جو لوگ اس کو مرتد اور خارج از اسلام کہیں گے وہ گنہگار ہوں گے انکو ایسا کہنے اور سمجھنے سے باز آنا لازم ہے اور کہہ ڈالنے کے بعد توبہ استغفار بدرگاہ رب غفار کرنا لازم ہے (۲)۔

ہاں اگر کسی کو خطرہ ہو کہ اس پڑھنے یا پڑھانے سے اس کا عقیدہ بگڑ جائے گا کفر کا عقیدہ رکھنے لگے گا تو اس کو ان چیزوں کے پڑھانے اور پڑھنے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، بلکہ ناجائز وحرام اور قطعاً ممنوع تک ہو سکتا ہے، اور ممنوع رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند ۳۰/۳/۱۴۰۱ھ

نوٹ: احقر کے نزدیک استفتاء مذکورہ کا یہی جواب ہے۔

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دار العلوم دیوبند، محمود غفرلہ

۱- ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها (الاشباہ والنظائر ص/۹۱ الطبعۃ کراچی)۔

۲- عن أنس قال قال رسول اللهﷺ: ثلث من أصل الإيمان، الكف عمن قال لا إله إلا الله لا تكفره بذنب ولا تخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض مذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر هذه الأمة الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل، والإيمان بالأقدار (مشکوۃ المصابیح باب الکبائر وعلامات النفاق ص/۱۷) (مرتب)۔

کیا رسول اللہ ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں؟ اور سلام پڑھنے والے کے سلام کو سنتے ہیں؟

علماء دیوبند سارے کے سارے اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں اور اگر روضۂ اقدس پر سلام پڑھا جائے تو آپ ﷺ خود سنتے ہیں۔ لیکن علماء دیوبند میں چند عالم ایسے بھی ہیں جو کہ اس بات کو نہیں مانتے جیسے حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری گجرات، حضرت مولانا احمد سعید ملتانی، احمد سعید صاحب تو گالی بھی دیتے ہیں ان کو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتے ہیں پاکستان میں علماء دیوبند صرف اس لئے بدنام ہوئے کہ ایسے دو ایک عالموں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنالی اس مسئلے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تفصیل سے جواب دیں اور ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو ایسا عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں وہ مشرک ہیں۔

محمد امجد سہارنپور، یوپی

الجواب وباللہ التوفیق:

نبی کریم ﷺ روضۂ اطہر میں زندہ ہیں، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا درجہ شہداء کے درجے سے کم نہیں ہے جن کے بارے میں نص صریح ہے۔

"ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله اموات بل أحياء ولكن لا تشعرون " (۱) حضرت انسؓ سے مروی ہے: **"قال النبي ﷺ الانبياء أحياء في قبورهم ..... الحديث** (۲)، صحیحین کی حدیث ہے انسؓ سے: **"عن أنسؓ عن النبي ﷺ قال: العبد إذا وضع في قبره وتولى وذهب أصحابه — حتى إنه يسمع قرع نعالهم — أتاه ملكان فاقعداه.....الحديث"** (۳) (جب بندے کو اسکی قبر میں رکھدیا جاتا ہے اور اسکے ساتھی چلے جاتے ہیں تو وہ

۱- سورۂ بقرہ: ۱۵۴۔

۲- الأنبياء احياء في قبورهم يصلون (المطالب العاليه ۳/ ۲۶۹ حديث: ۳۴۵۲ نشر وزارة الاوقاف والشؤون الاسلاميه كويت، تحقيق الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي بحواله مسند ابو يعلى ۶/ ۱۴۷ حديث ۳۴۲۵ دار الثقافة العربية دمشق ومسند بزار، وعن شداد بن أوسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم، وفيه النفخة، وفيه الصعقة، فأكثروا علي من الصلاة فيه، فإن صلوتكم معروضة عليَّ، فقال رجل: يا رسول الله كيف تعرض صلاتنا عليك وقد أرمت يعني بليت، فقال: إن الله قد حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء (سنن ابن ماجه ۱/ ۳۴۵ كتاب اقامة الصلاة باب في فضل الجمعة حديث ۱۰۸۵)) (مرتب)۔

۳- صحيح بخاری مع فتح الباری ۳/ ۲۰۵ کتاب الجنائز باب الميت يسمع خفق النعال حديث ۱۳۳۸، وص ۲۳۲ حديث ۱۳۷۴ (مرتب)۔

ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے دوسری حدیث ہے جس کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ من صلى علي عند قبري سمعته ومن صلى علي نائيا أبلغته(۱)۔

(جس نے میرے اوپر درود بھیجا میری قبر کے پاس میں اس کو سنتا ہوں اور جس نے دور سے پڑھا وہ میرے پاس پہنچایا جاتا ہے)اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ پر جو درود وغیرہ بھیجا جاتا ہے اور روضۂ اقدس پر پڑھا جاتا ہے اس کو سنتے ہیں ان دلائل او رشواہد کے ہوتے ہوئے جو لوگ منکر ہیں وہ غلطی پر ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۰۲/۱/۳۰ھ

عقیدہ رضاخانیت:

لقد كلفت من قبيل رئيس القضاء الشرعي المكرم بان اكتب تقريراً عن الطائفة البريلوية أى أسسها أحمد رضا خان البريلوى وقد اطلعت على جملة من عقائدها الفاسده الخارجة عن عقيدة أهل السنة والجماعة مباشرة وبواسطة من لم فيهم من إخواننا الذين قرؤا مولفات رئيس الطائفة وأعوانه بلغته الأصلية وفيها أنه لا يفرق بين الله ورسوله، وأن الرسول ﷺ يعلم جميع الغيب بدون استثناء وانه عليه الصلوة والسلام حاضر في كل مكان وانّ السّيد عبدالقادر الجيلاني هو المستغاث به الكبير كما اطلعنا على بعض التحريفات في الآيات القرآنيه لفظاً ومعنىً إلى أن ارتكبها

موئسس الطائفة واطلعنا كذالک على كتبه من فضيلة الشيخ العلامة المرحوم عبدالحئى بن فخرالدين الحسني في كتابه نزهة الخواطر (المجلد الثامن ۳۸۔ و ۴۱)

ولكن لم نجد له حكماً فصلاً يتعلق بخروجه عن الملة لما فسّر لنا بأنه من الخرافات واضحُ عن الاسلام كما ذكر نقلا عن مؤسسي الطائفه أن النبيﷺ يعلم الغيب علماً حكيماً منذ بدء الخلقية إلى قيام الساعة، بل إلى دخول الجنة والنار وأنه ليحمل لو اء الكفر كفر من يخالف عقيدة ولا سيما علماء اهل الندوة وأهل ديوبند وغير المقلدين واتباع الشيخ محمد بن عبدالوهاب الشيخ مما

۱- رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما ذکر فی المشکوۃ ۸۷، مشکوۃ ۷۹۔

يعرفون عنه أكثر مما يعرف لذا نطلبُ من فضيلتكم التفضل بمكاتبة إلينا برائكم فى هذا المذهب البريلوى وطائفته حتى نسيئه المسلمين على خطورة هذه الطائفة ، وانها بهذه الأداء خرجت عن مذهب الاسلام ومذهب السنة والجماعة أم هو فاسقة فقط، حتىّ يتضح لنا الأمر والله الموفق والهادى إلى سواء السبيل وموفق مع هذا اسماء بعض الكتب اتى فيها ما يخالف عقيدة السنة والجماعة ملفوظات احمد رضاء حدائق بخشش، جاء الحق، مقياس الحنفية، فوائد بديعة الامن والعلاء، احكام شرعية، الفتاوىٰ البريلوية، خالص الاعتقاد، كنز اليمان فى تفسير القرآن، وصايا شريف، هذا اللغو"۔

سیدمحمود مصطفےٰ العیس، عالم الاحادیث دائرۃ القضاء الشرعی، ابوظبی متحدہ عرب امارات

الجواب وبالله التوفيق:

الحمدلله رب العالمين والعاقبة للمقتين والصلاة والسلامعلى سيدنا محمد النبى الأمى الذى بعثه بالحق إلى كافة الناس بشيراونذيرا وداعيا إلى الله بإذنه وسراجا منيرا، وجعله أشرف خلقه وختم به النبوة فلا بنى بعده

وعلى العلماء الربانين الراسخين فى العلم وعلىٰ آله وصحبه واتباعه الذين فازوا ببركة اتباع شريعته الدرجة العليا فى المارين۔

سماحة الفضيلة السيد الحمود مصطفىٰ عيسىٰ

عالم الأحاديث دائرة القضاء الشرعية من دولة الإمارة العربية المتحدة۔

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعدا لقد تشرفت بمسئلتكم الكريمة من قبل رئيس القضاء الشرعى المكرم المؤقر، فان عقائد المولوى أحمد رضا خان البريلوى أكثرها فاسدة خارجة عن عقيدة اهل السنة والجماعةً فإنه يدعى أن الرسول عليه السلام يعلم كل المغيبات علما تفصيليا من الأزل إلى الأبد، ولايخفى منه مثقال ذرة وإنه حاضر وناظر فى كل مكان؛ فى الحياة وبعد االتحاق بالرفيق الاعلىٰ۔

وإنه يدعي أن الرسول عليه الصلوٰة والسلام هو الأول والآخر والظاهر والباطن وهو علىٰ كل شئ قدير، اى يرجع ضمير هو (فى الآية الكريمة) إلى الرسول عليه الصلوٰة والسلام، وهو تحريف معنوى فى كلام الله تعالى، لأن مرجع هو في الآية الكريمة إلى الله تعالىٰ إجماعا، والتحريف المعنوي ايضا كفر كالتحريف اللفظي وهذه الاعتقادات منه مذكورة فى رسالته "خالص الاعتقاد" فى صفحات (۴۰ إلى ۵۵۴) وفي رسالته الدولة المكيةُ (ص ۴۰)، وحاشية، ومن ضلالته أنه مع ادعائه علم الغيب للرسول عليه السلام يقول: ويمكن نسيان بعض الآيات منه عليه السلام، كما في الملفوظ فى الجزء الثالث ۸ و ۹ بلفظه فى الهندية انتهىٰ بلفظه

والحال إنه من ضلالات الروافض وإنه مخالفه صريحة لقوله تعالىٰ؛ "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" الآية وانه يزيل سالمية كلامه تعالىٰ فالحذر الحذر ومن خداعاته: إنه يكفر كل من يخالف اعتقاداته الفاسدة ويشمل تكفيره كلا من العلماء الفحول الربانيين في الهند وخارجه من العرب والعجم حتى صرح في تكفيرهم بأسمائهم مثلا الشيخ محمد بن عبد الوهاب وأتباعهم وعلماء غير المقلدين واتباعهم وعلماء أهل ديوبند وعلماء سهارنفورى والندوه والامارة الشرعية (بهار)، وعلماء جمعية العلماء في الهند وأيه جماعة المسلمين فى الهند سواء كانت مذهبية أوسياسية وقال: من شک في كفرهم فهو ايضاً كافر. وهذه التكفيرات كلها مصرحة فى كتابه تجانب أهل السنة في صفحات شتى ۲۳،۸۶،۹۰، حتى قد ابتلىٰ بتكفير نفسه أيضاً في هذه التكفير لأن والده لايكفر هذه العلماء الفحول فكفر والده من هذا الفتوى فهو ايضاً كفر بنفسه، لأنه لايكفر والده، وكذلک يكفر السيد إسماعيل الشهيد الدهلوى في مقام فى كتابه "خالص الاعتقاد" ثم فيه في مقام آخر قال لانكفر إسماعيل (الشهيد، لأن الشرع منعنى بتكفير رجل فى كلامه مائة جهة كلها مكفرة إلا جهة واحدة يقتضي عدم التكفير وحال هذا الرجل هكذا.

ومن خداعاته، انه لما لم يفز في مرامة من هذه التكفيرات فاخترع اختراعاً تشنيعا جدا۔ اى ألتقط ثلاثة جمل من كتاب "عالم ربانى" (تحذير الناس) من ثلاث مقامات صيرها عبارة واحدة كفرية وترجمها بالترجمة الكفرية بنفسه وجاء بها إلى علماء الحرمين وأظهرها عليهم وأخذ منهم

فتوى الكفر على هذا الرجل واتباعهم وجيلهم الهندية ثم اشا ع هذا الفتوى باسم "حسام الحرمين" فلما اطلع على هذا الكيد وخداعه العلماء الربانيون فاظهروا عند علماء ألحرمين أصل الكتاب وأوقفوهم على الحقيقة فردوا عليه رداً كاملا وأخذوه معاتبين عليه فخاف منهم وتقياً وقال معتذرا عند حضرتهم إنا لانعتقد ان علم الرسول عليه السلام مسا ولعلم البارى بل من اعتقد المساواة بينهما فهو خارج عندى عن الاسلام ثم لما رجع إلى الهند وأشاع ثانيا رسالته الدولة المكية فكتب في حاشيته من سوى علم الرسول مع علم البارى لانقول له إنه كافر، ومن خرافات أنه يعتقد ان الشيخ عبد القادر الجيلانى مستغاث كبير فى العالم مع أنه شرک صريح ويدخل به تحت وعيد الآية الكريمة:" إن الله لايغفر أن يشرک به ويغفر مادون ذلک الآية" ولكنه من قوم لايفقهون وهكذا له خرافات أخرى أتركها لخوف التطويل.

ومن سلسلة كتب الترديد لخرافاته كتاب (غاية المامول فى تتمة منهج الوصول فى تحقيق علم الرسول) ألفه مولانا السيد احمد آفندى البرزنجي المفتي بالمدينة المنوره في اللسان العربى طبع الآن في انجمن ارشاد المسلمین ۱۶/ بی، شاداب کالونی حمید بلڈنگ نئی روڈ لاہور۔

فمن شاء مزيد الواقفية فليراجع إليه ويطالعه وعليه تقريظات وتائيدات من خمسة عشر عالما من علماء الحرمين الشريفين.

ومن غواية فهمه ومن دنائة ماجه وبذاذة لسانه إنه قال في قصيدته المدحيه في شان عائشة أم المومنين رضى الله عنها اشعارا لايقدر أحد من المومنين ان يظهره بلسانه أو بقلمه فمن شاء فلينظر في رسالت "حدائق بخشش" في ۳۷۔

وهذه أنموذجة من أكثر خرافاته التى هي باعثة في الرصاد الشقاق والنفاق والتفريق بين المؤمنين ليقع الوهن في أخلاء الإنجليز من الهند ومع هذا ما افتى أحد من أكابرنا عليه الكفر حزما واحتياطا من اكفار اهل القبلة.

وخشية من النصوص المهددة الواردة فيه حتى وجدوا صراحة إنكار النصوص القطعية أوانكار الدلائل الشرعية القطعية من غير تأويل صحيح، بل أشغلوا أنفسهم باتباع سنة سيد المرسلين

ظاهرا وباطنا بالقلب واللسان والجوارح والحالات وفوضوا أمورهم إلى الله لتحصيل الرضاء عنه والقول واخيراً نقول إن في البدعة ظلمة وفي السنة نورا فإذا عمل رجل بالسنة ودوام عليها ظاهراً وباطنا حتى تكون راسخة في قلبه صغيرها وكبيرها ويصير دينه وطبيعته الثانية ويضوح نور السنة من قوله وفعله وجوارحه ويتلألأ من جوانبه، فترتفع الظلمة وتسخر قناديلها من غير كلمو بحث ومناظرة وغيرها، ويدخل نورها في قلوب العوام ويجري مجرى الدم من حيث لايشعرون حتى جعلت تصلح أعمالهم وتصح عقائدهم، وهذا النفع أكبر وأرسخ من نفع المناظرة والبحث والكد كما هو مشاهد من التجربة۔

ولعل هذا سر في اشتغال أكابرنا في أنفسهم باتباع السنة فليحزم علينا أن نسلک على هذا الوطيره سرا وعلنا لنكون فائزين من غير مشقة هائلة وعناء فقط والسلام

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خاتم النبیین کے صحیح معنی:

کتاب خاتم النبیین کے بہترین معنی ص ۴۰ مرتبہ مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل جالندھری سابق پرنسپل جماعت احمدیہ۔ دعوت وتبلیغ سلسلہ احمدیہ قادیان (مشرقی پنجاب) عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم وتأخر زمان میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر مقام مدح میں ''ولكن رسول الله وخاتم النبيين''(سورۂ احزاب:۴۰) فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ کتاب خاتم النبیین کے بہترین معنی کیا ہیں؟ یہ عقیدہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

یہ عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے اس میں قرآن پاک کی تنقیص ہے، آپ اگر تحریری بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب ختم نبوت دیکھئے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں ختم النبوۃ فی القرآن، ختم النبوۃ فی الحدیث، ختم النبوۃ فی

الآ ثار،اس سے آپ کو پوری بصیرت ہوگی،فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا:

مندرجہ ذیل عبارت کے اس عقیدہ پر شرعی فتویٰ دیجئے (کتاب تحذیر الناس ص ۳) از افاضات مبارکہ حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔

عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں،مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم وتاخر زمان میں بالذات کچھ فضیلت نہیں ہے پھر مقام،مدح میں ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کتاب تحذیر الناس ص ۳ کیا یہ عقیدہ رکھنا درست ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

عبارت منقولہ پوری عبارت نہیں ہے پوری عبارت کا جو مفہوم ہے وہ بالکل صحیح و برحق ہے اور وہی عقیدہ تمام اہل سنت والجماعت کا ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ محض زمانہ ہی کے اعتبار سے خاتم النبیین نہیں تھے بلکہ ذات ومرتبہ کے اعتبار سے بھی آپ خاتم النبیین ہیں،فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱۰/۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

خواجہ اجمیری کے مزار کے پھول اور عود کی خصوصیت:

۱-لوگ اجمیر والے خواجہ معین الدین صاحبؒ کے مزار پر جاتے ہیں اور وہاں سے پھول اور عود لاتے ہیں اور خواجہ صاحبؒ یہ کرامت ظاہر کرتے ہیں کہ اس پھول اور عودی کو کھلانے سے جسم کی بہت بیماری دور ہوجاتی ہیں،خصوصاً چھوٹے بچوں کے گلے میں باندھنے سے اور عموماً بڑوں کو کھلانے سے آرام ہوجاتا ہے،ایسی کرامت پر اعتقاد کرے یا کہ نہیں اور کرنے والوں کو منع کرے یا کہ نہیں؟

۲- مندرجہ بالا عبارت پر اعتقاد کرنا شرک ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- کرامات الاولیاء حق ثابت (۱) یہ تو عقیدے کی چیز ہے۔ کرامت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جس اولیاء سے صادر ہوتی ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتی، بلکہ جب خدا چاہتا ہے ان کے ہاتھ پر صادر کرتا ہے، اجمیر شریف کے بزرگ مسلم ہیں (ان کے ہاتھ پر بیشمار کرامتیں صادر ہوئیں اور ہوسکتی ہیں) لیکن یہ بدعتی لوگ جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں خواجہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کو موثر و دخیل سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی باتوں کو نہ سننا، نہ ماننا چاہئے ان میں ہی سے یہ چیزیں بھی ہیں جو سوال میں لکھی ہیں، لہٰذا اسپر اعتقاد یا اس کو صحیح نہ کہنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۸/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

کافر کو کافر نہ کہنا کفر ہے کا مطلب؟

جناب مولانا محمد مرتضی حسن صاحب دربھنگی نے کتاب ''اشد العذاب'' کے (ص ۱۳) پر یہ عبارت تحریر کی ہے۔ اگر خان صاحب کے نزدیک بعض علماء دیوبند واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا تو خان صاحب کو ان علماء دیوبند کی تکفیر فرض تھا۔ اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے تو وہ خود کافر ہوجاتے جیسے علماء دیوبند نے جب مرزا صاحب کے عقائد کفریہ معلوم کر لئے اور وہ قطعاً ثابت ہوگئے تو اب علماء اسلام پر مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر و مرتد کہنا فرض ہوگیا ہے اگر وہ مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر نہ کہے تو وہ خود کافر ہوجائیں گے جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے۔ یہ عبارت اس کتاب کی آپ کی نظر سے گزری ہے کیا اور عبارت کا خط کشیدہ جو جملہ ہے کہ جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے حق ہے یا کہ نہیں؟

۱- عبارة النسفي في عقائد وكرامات الاولياء حق فتظهر كرامة على طريق نقض العادة للولي من قطع المسافة البعيدة في المدة القليلة وظهور الطعام والشراب واللباس عند الحاجة والمشي على الماء والهواء وكلام الجمار والعجماء واندفاع المتوجه من البلاء وكفاية المهم من الأعداء وغير ذالك من الاشياء (الرد المحتار على الدر ۲۴۶/۵، مکتبہ زکریا) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کفر کو ایمان کہنا یہ بھی کفر ہے اور کافر کو مؤمن کہنا یہ بھی کفر ہے باقی محض کافر کو کافر نہ کہنا یہ بھی کفر ہو یہ خلاف احتیاط ہے ایسا نہ کہنا چاہئے کہ جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے، اس لئے کہ کافر کو کافر نہ کہنے پر یہ لازم نہیں ہے کہ پھر کافر کو مؤمن کہہ دیا جو واقعی کفر ہے، بلکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کافر کو کافر نہ کہا تو مومن بھی نہ کہا ہو بلکہ سکوت کیا ہو، اس لئے مطلقا بلالحاظ قیود ایسا عام جملہ نہیں بولنا یا لکھنا چاہئے احتیاط کرنا چاہئے۔

یہ کتاب ''اشد العذاب'' میری نظر سے نہیں گزری ہے، مگر جتنا آپ نے نقل کیا اس کے اعتبار سے جواب ہے، البتہ کتاب کے سیاق وسباق کے اعتبار سے عبارت محولہ (جو کافر کو کافر نہ کہے وہ کافر ہے) کا مفہوم ہے کہ کافر نہ کہے، بلکہ مؤمن کہے اور یہ مفہوم بالکل ظاہر ہے اور بیشک یہ کفر ہے، اس لئے کتاب کا مضمون صحیح ہے اور صاحب کتاب حق پر ہے، کیونکہ مرزائیوں کا کفر ثابت ہے۔ ہذا ما عندی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بہائی مذہب اختیار کرنے کے بعد تجدید ایمان ونکاح لازم ہے:

زید ایک مرد مسلمان پابند صوم وصلوۃ وعلم دین سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے مذہب بہائیہ کا فارم بھر کر اسے قبول کرلیا نمازیں ترک کردیں اور اپنی زبان سے اقرار کیا کہ قیامت تک رسول آتے رہیں گے۔ رسالت ختم نہیں ہوئی نبوت ختم ہوچکی ہے، اب وہ زید مسلمانوں سے کہتا ہے کہ میں نے صرف مذہب بہائیہ کی معلومات کرنے کے لئے ایسا کیا تھا۔ اور اب وہ پھر مسلمانوں کی نمازوں میں شریک ہوتا ہے اور امامت بھی کرتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کو دوبارہ داخل اسلام ہونے کے لئے تجدید اسلام اور تجدید نکاح کی ضرورت ہے یا کہ نہیں۔ زید کے گھر میں بیوی مومنہ ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعی صحیح ہے تو تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے جب تک تجدید ایمان اور تجدید نکاح نہ کرے اس وقت

تک بیوی کے پاس ہرگز نہ جائے۔اور نہ امامت کرے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند،محمود عفی عنہ

مزار پر پھول چڑھانے کے کشف کا حکم:

ایک بدعتی مولانا نے وعظ کے دوران میں یہ فرمایا کہ میرے پیارے بھائی جو صاحب کشف ہے انکے اپنے سلسلہ کے کسی شہید صاحب کے مزار پر گئے تو صاحب مزار نے صاحب کشف سے یہ فرمایا کہ ہمیشہ تازہ گلاب کے پھول لا کر ڈالا کرو پھر یہ واقعہ ہم سے بیان کیا اس دن سے میں بھی ہمیشہ مزار پر تازہ گلاب کے پھول چڑھاتا ہوں دریافت ہے کہ کیا یہ صاحب مزار قبر میں سے کچھ کہہ سکتے ہیں یا کہ نہیں وران کا کہنا صاحب کشف سن سکتے ہیں یا نہیں اور اس پر عقیدہ رکھنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جو کشف شریعت کے خلاف ہوتا ہے وہ غلط ہوتا ہے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہوتا ہے،قبروں پر پھول چڑھانا بدعت اور ناجائز ہے،اس لئے یہ کشف صحیح نہیں ہے اور اس پر عمل کرنا ناجائز ہے۔ بلکہ اس کا ترک کرنا واجب ہے (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- واعلم أن النذر الذی یقع للأموات من أکثر العوام ومایؤخذ من الدراھم والشمع والزیت ونحوھا إلی ضرائح الأولیاء الإکرام تقرباً إلیھم فھو بالإجماع باطل وحرام،الدرالمختار علی الرد ۲/ ۵ ۱۷،مطبوعہ عثمانیہ،قال ابوالحسن الشاذلی: قد تضمنت لنا العصمة فیما جاء به الکتاب والسنة ولم تضمن لنا العصمة فی الکشوف والإلھام،فتاوی لابن تیمیہ ۲/ ۲۲۶،مکتبہ المعارف الرباط (مرتب)۔

تحذیر الناس، حفظ الایمان وبراہین قاطعہ کی عبارتوں پر اشکال:

۱۔ بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو تب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے، بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو تو خاتمیت میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائے کہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجئے اس زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے تحذیر الناس کی ان عبارتوں میں انکار ختم نبوت ہے یا نہیں انکار ختم نبوت ثبوت کفر ہے یا کہ نہیں اور یہ کتاب قادیانیت کی معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ آپ کی ذات پر عالم غیب کا حکم کیا جانا اگر بعض غیب ہے یا کل غیب اگر بعض علوم غیب مراد ہیں تو حضور ﷺ کی کیا تخصیص ہے ایسا علم غیب تو زید عمرو، بلکہ ہر صبی ومجنون، بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لئے بھی حاصل ہے۔ (حفظ الایمان) مذکورہ بالا حفظ الایمان کی عبارتوں میں حضور ﷺ کی توہین ہے یا نہیں؟ اور یہ کفر ہے یا کہ نہیں؟

۳۔ الحاصل غور کرنا چاہئے کہ شیطان وملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا فخر عالم کو خلاف نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے شیطان وملک الموت کو یہ وسعت تو نص سے ثابت ہے فخر عالم کی وسعت علم کی کونسی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے (براہین قاطعہ) یہ عبارتیں کفریہ ہیں کہ نہیں اسلئے کہ شیطان کے علم کو حضور ﷺ کے علم اقدس سے زائد بتایا ہے اور شیطان کو خدا شریک مانا ہے۔ پھر اس شرک کو نص سے ثابت کیا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ ہر موقع پر اگر بالفرض یا فرض کیجئے کا عنوان ہے اور عنوان (بالفرض) بولا ہی جاتا ہے محالات اور ان ہونی چیز کے لئے لہٰذا یہ مضمون کفری نہیں ہے، بلکہ اس عنوان سے ختم نبوت کا اور بھی ثبوت کرنا ہوا یہ مصنف معلوم ہوتا ہے، نیز یہ کتاب تحذیر الناس قادیانیوں کی نہیں اور نہ ان عبارتوں میں انکار ختم نبوت ہے۔

۲۔ یہ عبارت کفریہ نہیں اور نہ اس میں توہین رسول ﷺ کی متلزم ہے ان عبارتوں میں علوم تکوینی کی گفتگو ہے نہ کہ علوم تشریعی کی علوم تکوینی خضر علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے علوم تکوینی سے زیادہ ہونا خود قرآن پاک میں منصوص ہے (۱۵۔۱۶ پارہ دیکھئے) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر نبی اور یقیناً خضر علیہ السلام سے اعلیٰ وافضل ہیں۔

۳۔ اسی طرح براہین قاطعہ کی مذکورہ عبارتیں بھی کفریہ نہیں ہیں، ان میں ان ہی علوم تکوینیہ کی گفتگو ہے جن کا

انبیاء علیہ السلام کو نہ ہونا کوئی نقص نہیں یہ تو فرسودہ اور پرانا مسئلہ ہے کوئی نیا مسئلہ نہیں اس پر تو مستقل کتابیں اور تصنیفیں موجود ہیں ان کتابوں کو منگا کر دیکھئے اور ''بسط البنان'' کو منگا کر خود دیکھ لیجئے بصیرت ہو جائے گی کتابیں تو اس موضوع پر بہت ہیں ہم چند کی نشاں دہی کر دیتے ہیں۔

تصانیف:

۱۔تصانیف مولانا مرتضی حسنؒ　　۲۔مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔جہد المقل مصنفہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

وہ ہندو جس کو کبھی دعوت اسلام نہ دی گئی کیا وہ بھی مستحق جہنم ہے؟

ایک ہندو جس کو نہ کبھی اسلامی تعلیم سے آگاہ کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کو اسلام کی دعوت دی گئی کیا وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم کا مستحق ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اسباب علم عام وتام ہو چکے ہیں اور مسئلہ توحید عقلی ہے، لہذا ایسے مقامات میں جہاں یہ اسباب عام ہو چکے ہوں یہ عذر کافی نہ ہوگا، ہاں پہاڑ کی کھائیوں میں یا دنیا کے کسی ایسے علاقے میں جہاں دعوت ورسالت واقعی نہ پہنچی ہو جہل معتبر ہو سکتا ہے (۱)، یہ اصل مسئلہ ہوا اب اس ہندو کا حال متعین ہو کر اس کا متعین حکم معلوم ہو سکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۲/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- لیکن اصول الشاشی میں اس طرح ہے: ''وجب الإيمان على من لم تبلغه الدعوة ...... قال أبو حنيفة لو لم يبعث الله تعالىٰ رسلا لوجب على العقلاء معرفته بعقولهم''، (اصول الشاشی ۳۴، مکتبہ یاسر ندیم دیوبند) (مرتب)۔

۱- کیا کافر جنت میں جائے گا؟

کویت ریڈیو سے (دینی مسائل کے عنوان سے) سوال وجواب جاری ہوتے ہیں وہاں اسکی مملکت نے ایک جماعت رجسٹرڈ کردیا ہے اس کی طرف سے ایک سوال کے جواب میں ریڈیو پر یہ مسئلہ نشر ہوا ہے کہ مسلمان کو ہمیشہ کے لئے راحت وچین کی زندگی کے لئے جنت اللہ تعالی عنایت فرمائیں گے لیکن کفار کے واسطے ہمیشہ کے لئے دوزخ نہیں ہے، بلکہ ان کی سزائیں انہیں ملنے کے بعد اللہ تعالی انہیں بھی جنت نصیب فرمائیں گے تو یہ بات درست ہے یا غلط؟

۲- کیا صرف نیت کر لینے سے نیکی مل جائے گی؟

کیا صرف نیک ارادہ کرنا اور نیک عقیدہ رکھنا کافی ہے اور کیا اللہ تعالی صرف نیت کو دیکھتے ہیں اور عمل کی ضرورت نہیں یا عمل بھی ہونا ضروری ہے، کیا صرف نیت کر لینے سے نیکیاں حاصل ہوجائیں گی۔

الجواب وبا الله التوفیق:

۱۔ کویت ریڈیو سے یہ جو خبر نشر ہوئی ہے کہ کافر بھی اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں آجائیں گے غلط ہے، قرآن وحدیث کے صریح نصوص کے خلاف ہے یہ حکم گنہگار مسلمانوں (عُصاۃ مومنین کا ہے جنہوں نے کبھی کفر وشرک نہیں کیا تھا یا کیا تھا، مگر دل سے توبہ کر چکے ہیں اس کے بعد مرے تھے "**کما قال تعالیٰ: الا الذین تابو وأصلحوا و۔۔فاتوب علیھم وانا التواب الرحیم**"(۱)۔

البتہ جن لوگوں نے کفر یا شرک کیا اور اس پر قائم رہے اور بغیر توبہ کے مرگئے ان کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم ہے کبھی بھی انکی مغفرت نہ ہوگی، "**کما قال تعالی :إن الله لا یغفر أن یشرک به ویغفر ما دون ذالک الخ**" (۲)۔

ایک جگہ ارشاد باری تعالی ہے:"**قال تعالی: ان الذین کفروا وما تو وھم کفار فأولئک علیھم لعنة الله والملائکة والناس أجمعین لا یخفف عنھم العذاب ولاھم ینظرون**" (۳)۔

بلکہ ان کے جہنم میں رہنے اور کبھی جہنم سے نہ نکلنے کی تصریح بھی ان نصوص قرآنیہ میں ہے:"**کما قال تعالیٰ: إن**

۱- سورۂ بقرہ:۱۶۰۔

۲- سورۂ نساء:۴۸۔

۳- سورۃ البقرۃ:۱۶۱۔

الله لعن الکافرین وأعدّ لھم سعیرا خالدین فیھا ابداً لا یجدون ولیاً ولا نصیرا'' (۱)۔

(بے شک اللہ نے دور کردیا کافروں کو اپنی رحمت سے اور نکال دیا اپنی رحمت سے اور ان کے واسطے بڑھتی آگ کا عذاب مسلط کردیا، ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے بڑھتی آگ میں کبھی نہ نکل سکیں گے اس سے اور نہ پائیں گے کوئی دوست یا مددگار جو انکو وہاں سے نکال سکے)۔

اور دوسری اور آیت: "قال تعالیٰ: ومن یعص الله ورسوله فإن له نار جهنم خالدین فیھا ابداً'' (۲)۔

ان دونوں آیتوں میں حکم ابد مذکور ہے اور ابد کے معنی یہ آتے ہیں ایسی مدت جس میں کبھی انقطاع نہ ہو اور وہ کبھی ختم نہ ہو ان دونوں آیتوں میں کلمۂ ابد مذکور ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو کافروں کے حق میں اسی مضمون کو ادا کرتی ہیں محض اختصار کے خیال سے نقل نہیں کرتا ہوں۔

مثلاً سورۂ معارج (پ۲۹): "لقوله تعالیٰ: لیس له دافع من الله ذی المعارج'' (۳)، اور مثلاً سورہ عم یتسائلون (پ۳۰) میں: "لقوله تعالیٰ: فذوقوا فلن نزیدکم الاعذابا" (۴) اور مثلاً: "بقوله تعالی :لم یکن الله لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا'' (۵) وغیرہا۔

اسی طرح اس مضمون کے سلسلے میں کافروں کے تا ابد نارجہنم میں رہنے کی صحیح حدیثیں بھی میں بہت زیادہ مروی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ گنہگار مومن (عصاۃ مومنین) تو ضابطہ عدل کے تحت ایک مدت تک خواہ طویل ہو یا قصیر ہو سزا بھگتنے کے بعد انکی مغفرت ہو سکے گی اور بعد مغفرت جنت میں لے لئے جائیں گے، جیسا کہ شروع جواب کی آیات سے معلوم ہوتا ہے نیز شفاعت کی بہت ساری صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے، مگر جو لوگ کفر و شرک سے بغیر توبہ کے مریں گے ان کے لئے جہنم سے نجات کی کوئی شکل نہیں ہے یہ سب مذکورہ آیات اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہیں اور اللہ تعالی سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے، "قال تعالی :ومن اصدق من الله قیلا'' (۶)، اس لئے وہاں کے لوگوں پر شرعاً ضروری ہے کہ وہ لوگ

۱- سورۂ احزاب ۶۵۔
۲- سورۂ جن: ۲۳۔
۳- سورۂ معارج: ۳۔
۴- سورۂ نبا: ۳۰۔
۵- سورۂ نساء: ۱۳۷۔
۶- سورۃ النساء: ۱۲۲۔

حکومت کو آگاہ کر کے اس غلط معنوں میں تردید کرائیں اور ایسے غلط مضامین کی اشاعت سے روک دیں۔

(۲) عمل خیر کے ساتھ نیک ارادہ مفید ہوتا ہے عمل نہ ہو اور نیک ارادہ ہو یہ نجات کے لئے کافی نہیں ہے: "إن الله لا ینظر إلیٰ صورکم وأموالکم ولکن إنماینظر إلی أعمالکم وقلوبکم أو کما قالؐ" (۱) کا یہی مطلب ہے جو احقر نے بیان کیا ہے کہ وہ مطلب ہے جو سوال میں مذکور ہے یہ مطلب تو زندقہ اور لادینی کا دروازہ کھول دے گا عمل کے ساتھ ساتھ صحیح نیت ہو تو وہی کامیابی ہے جیسا کہ اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے: "إنما الأعمال بالنیات وإنما لإمرئٍ ما نوی فمن کان هجرته إلی الله ورسوله فهجرته إلی الله ورسوله ومن کانت هجرته إلی دنیا یصیبها إلی الآخر الحدیث" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قرآن وحدیث کو کچھ نہیں مانیں گے کہنا:

۱۔ایک شخص نے کہا کہ کتاب وقرآن اور حدیث ہم کچھ نہیں مانیں گے فقط ہمارے پرانے عالم نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔

۲۔چند آدمی نے ایک قانون بنالیا کہ جو عالم یا جاہل ہمارے یہاں قیام او رضاد کے مسئلہ پر گفتگو کرے گا اس کو دس جوتا مارا جائے گا۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-جب وہ کہتا ہے کہ ہمارے بڑے عالم نے جو کہا ہے وہی کروں گا تو اس کا مقصد قرآن وحدیث کو جھٹلانا یا انکار کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ اس مخاطب کو جھٹلاتا ہے کہ جو قرآن وحدیث کی ترجمانی کر رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے وہ اس سے کافر نہیں ہوا ہے، لیکن ایسے جملے بولنے سے احتیاط کرنا واجب ہے، آئندہ اسطرح نہ کہے۔

۲-یہ جملہ بہت سخت اور گناہ ہے اس سے علماء کی توہین نکلتی ہے ہرگز نہ کہنا چاہئے، ورنہ سخت گنہگار ہوگا اور بعض

۱- رواہ ابن ماجۃ عن أبی ہریرۃ، ورفعہ إلی النبی ﷺ، (ابواب الزہد، رقم الحدیث ۴۱۹۵) ۲/ ۴۱۶) (مرتب)۔

۲- رواہ البخاری والمشکوۃ فی ابتداء کتابیہما۔

صورتوں میں کفر کا موجب ہوجائے گا بہت ڈرنے کی چیز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

کسی بھی مخلوق کو دافع البلیات کہنا:

غیر خدا کو دافع البلیات کہنا کیسا ہے آیا کفر ہے یا شرک یا حرام اور حضور ﷺ کی ذات پاک غیر خدا میں شامل ہے یا نہیں جو شخص درود شریف وغیرہ میں حضور ﷺ کی صفت دافع البلیات کہہ کر آپ پر درود وسلام بھیجتا ہے ہیں تو اس کا نکاح درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس درود میں دافع البلیات کے لفظ سے مراد آپ کی برکات بھی لی گئی ہیں، یعنی آپ کی برکات سے بلائیں دفع ہوجاتی ہیں، اس لئے اس کے بولنے کو کافر نہ کہیں گے، لیکن ایسے موہم لفظ کا بولنا مناسب نہیں خاص کر جہلاء کو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

خنزیر کا گوشت کھانے کی وجہ سے مسلمان رہا یا نہیں؟

ایک مسلمان مرد کسی کافر کسان کی ملازمت کرتا تھا اس کافر نے خنزیر کا گوشت پکا کر کھلا دیا اس مسلمان مرد کو بعد میں یہ کہتا ہے کہ یہ تو بکرے کا گوشت تھا یا مرغ کا تھا گویا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ وہ گوشت خنزیر کا تھا باوجود یکھنے جانکر کھلایا ہو یا بھول کر کھلایا پھر اس مسلمان کو بتلایا گیا تھا کہ یہ گوشت تمہارے کھانے کے قابل نہیں ہے تم مت کھاؤ لیکن اس نے کھالیا۔ دریافت ہے کہ وہ مسلمان رہا یا کہ نہیں اس کے ساتھ مسلمان کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق

اگر خنزیر یا مردار کا گوشت جانتے بوجھتے ہوئے اور حلال ہونے کے اقرار کے ساتھ کھایا ہے تو ایمان بھی ختم اور

نکاح بھی ٹوٹ گیا پھر سے تجدید ایمان او رتجدید نکاح بعد توبہ ضروری ہے (لأن استحلال الحرام کفر، عالمگیری ۲/۵۵، مطبع رشیدیہ پاکستان) اور اگر دیدہ ودانستہ کھایا ہے مگر اس کو حلال نہیں قرار دیا تھا بلکہ حرام ہی سمجھتا تھا تو ایمان ونکاح نہیں ختم ہوا لیکن سخت گناہ گار وفاسق اور عند اللہ مجرم ومعذب ہوگا۔ فوراً بدرگاہ رب العزت دل سے نہایت ندامت کے ساتھ توبہ واستغفار کرنا اور آئندہ ہمیشہ کے لئے اس سے باز رہنا لازم ہے۔

اور اگر مردار یا خنزیر کا گوشت نہیں جانتا تھا، بلکہ دھوکہ دے کر اس کو کھلا دیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کو بتلا دیا گیا تھا کہ یہ تمہارے کھانے کے قابل نہیں ہے مت کھاؤ اس کے باوجود اس نے کھالیا ہے اس لئے خلاف احتیاط کیا اور عاصی ہوا گو دوسرے درجہ کا ایسی حالت میں بھی اس کو بلا تحقیق کھانا درست نہ تھا توبہ کرے اور آئندہ باز رہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۰/۱۹۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بارہویں شریف کی مجلسوں کا حکم:

حضور اکرم ﷺ کا ذکر مبارک موجب ثواب ہے یا نہیں اگر موجب ثواب ہے تو بارہویں شریف کی مجلسوں کا کیا حکم ہے یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بارہویں کی مجلسوں میں اس کو خاص کر دیتے ہیں اور ذکر مبارک کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں تو کیا یہ درست ہے اکثریت اس کو درست قرار دیتے ہیں۔ اور کہاں یہ بات بتلائی ہے۔ اور عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حضور اکرم ﷺ کا ذکر مبارک بغیر کسی التزام مالایلزم کے خواہ ولادت شریفہ کا ذکر ہو بلاشبہ باعث خیر او موجب اجر وثواب ہے لیکن آجکل کی مروجہ مجلس میلاد قرآن پاک، حدیث شریف اور اجماع امت وقیاس ائمہ سے ثابت نہیں، بلکہ بے اصل او ربدعت ہے، لہذا اس خاص نام سے کوئی مجلس نہ کی جاوے وعظ یا بیان سیرت کے نام سے کی جاوے اور اس میں حضور انور ﷺ کے حالات مقدسہ بیان کئے جائیں اور ذکر ولادت کے وقت قیام نہ کیا جاوے شیرینی وغیرہ تقسیم نہ ہو تو وہ جائز ہے اللہ رب العزت اور حضور ﷺ نے کسی کو مولود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے نہ خلفائے راشدین نے کبھی مولود کے نام سے مجلس منعقد فرمائیں ہیں، بلکہ چھ ۶ صدی پوری اس مجلس سے خالی گذری ہیں۔ ۶۰۰ھ کے بعد سلطان اربل نے اس کی

ابتداء کی اور بہت شان وشوکت سے بادشاہی انتظام کے ساتھ مجلس منعقد کی پھر انکی حرص میں دوسرے لوگوں نے اسکو اپنے بادشاہ کے اتباع میں شروع کیا، اس وقت سے ہی علماء حق نے اس کی تردید میں فتوئی دیئے اور کتابیں لکھیں۔ چنانچہ المدخل میں تقریباً ۳۲ صفحات میں بہت مدلل اس کی تردید میں فتوی دئے اور کتابیں لکھیں۔

قال في المدخل :و قد منع علماء نا رحمة الله عليهم الجلوس إلى القصاص من الرجال أعني الوعاظ الذين يعملون في المساجد وغيرها قال الإمام أبو طالب المكي رحمة الله عليه في كتابه كانوا يرون القصص بدعة، ويقولون: لم يقص في زمن الرسول ﷺ، وفي زمان أبي بكر، ولا في زمن عمر رضي الله عنهما حتى ظهرت الفتنه، فلما وقعت الفتنة ظهر القصاص (١) وهذه المفاسد مركبة علي فعل المولود إذا عمل بالسماع، فإن خلا منه وعمل طعاما فقط و نوى به المولود دعا إليه الاخوان ومسلم من كل ما تقدم ذكره، فهو بدعة بنفس نيته، فقط اذن ذلک زيادة في الدين وليس من عمل السلف الماضين واتباع السلف أولى بل أو جب من أن يزيد نيته مخالفة بما كانو عليه، لأنهم أشد الناس إتباعاً لسنة رسول الله ﷺ و تعظيما له (المدخل ١ / ٢٦٨)(٢) .

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ہتیا کا قول اٹھالیا گیا کہنے سے مسلمار ہا یا نہیں؟

۱- یہاں موضع کھوڑ کے علیا خان ولد رسول خانصاحب حال مقیم کھوڑے ہندوؤں کے مذہب میں مل کر سووچن لے کر ہتیا کا قول اٹھالیا ہندوؤں نے اس کے کھنڈ مارے نہ جانے کیا کھلایا کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے ایسی صورت میں کیا یہ مسلمان ہے یا کہ نہیں؟

۲- کیا اس سے پھر سے مذہب اسلام میں شامل کیا جاسکتا ہے اور اگر کیا جاسکتا ہے تو کن شرائط میں؟

۳- یہ اس بات کا عادی ہو چکا ہے معلوم ہونے پر برادری سے خارج کر دیا گیا ہے عند الشرع اسکا کیا جواب ہے؟

۱- المدخل لابن الحاج المالکی ۲/ ۱۳، مکتبہ دارالتراث القاہرۃ۔
۲- المدخل لابن الحاج المالکی ۲/ ۱۰، مکتبہ دارالتراث القاہرۃ۔

الجواب وبالله التوفيق:

(او ۲ و ۳) عبارت سے سوال واضح نہیں ہوتا ہے کہ بتیا کا قول اٹھالیا ہندوؤں نے اس کے کنڈے مارنے کا کیا مطلب ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ اس کو ہندو بنالیا ہے یا مرتد کرلیا ہر حال میں توبہ کر کے اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرنا واجب ہے، اسی طرح جب وہ خود توبہ کر کے اسلام میں داخل ہونا چاہے تو داخل کرلینا واجب ہے، صحیح حدیث میں ہے: "التائب من المذنب كمن لا ذنب له" (۱)، البتہ اگر وہ اس جرم کا عادی ہو چکا ہے اور بار بار کر چکا ہے تو اس کو اسلام میں داخل کرنے کے بعد برابر سمجھتے سمجھاتے رہیں اور جب تک اس کے حالات سے اس کی توبہ پر اطمینان نہ ہو جاوے اور اس کے اسلام کا پختہ اور راسخ ہونا معلوم نہ ہو جاوے اس کے ساتھ کسی مسلمان عورت کا نکاح کرنے میں احتیاط کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/۴/۸۵ ۱۳ھ

حضور علیہ السلام کا اللہ کے نور سے پیدا ہونے کا مطلب؟

یہ شخص کہتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا نور اللہ کے نور سے بنا ہے کیا یہ صحیح ہے میری طبیعت پر یہ بات نہیں آتی ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

حضور اکرم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں نور ایک ہی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی نور خداوندی سے نور محمدی براہ راست مستفاد ہے اور اس پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

آپ کی کھٹک غایت احتیاط کی بناء پر تھی اب امید ہے کہ دور ہو گئی ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- رواہ ابن ماجہ، مشکوۃ المصابیح باب الاستغفار والتوبہ/۲۰۶۔

حضرت تھانویؒ کا مقام:

عبارت برہان دہلی فروری ۱۹۵۶ء ص ۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴ مرتبہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند۔
حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کا سب سے نمایاں اور بڑا کمال بقلم احقر (مولوی عبدالباری ندوی) کی نظر میں یہ تھا کہ علم وعمل میں حدود کی رعایت اس درجہ تھی کہ حضرات انبیاء کا توذکر ہی نہیں، ورنہ لوازم بشریت کیساتھ اس سے زائد کا تصور ہے اس عبارت کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ عظام صدیقین وشہدا تو کیا حضرت تھانوی کا مقام صحابہ سے بھی اونچا تھا اور لوازم بشریت کے ساتھ اس سے زائد کا تصور ہی نہ ہوتا یہ سب سے اونچا مرتبہ ہے اس بنا پر مولانا تھانوی فرداًفرداً ہر ایک صحابہ سے جو دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں مفضول تھے ان سے لامحالہ تھانویؒ اونچے ہو ہی گئے۔ماہنامہ برہان دہلی سعید احمد اکبرالہ آبادی یہ عقیدہ رکھنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مولانا عبدالباری ندوی نے ایک بات اپنے جذبات کے ماتحت لکھی اور اکبرآبادی صاحب نے اس کی اصلاح کردی کہ اس طرح نہیں لکھنا چاہئے اور بس یہ کوئی عقیدہ تو ہوا نہیں کہ کچھ تصویب یا تردید کی جائے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ایک علمی اشکال کا جواب:

چار پانچ مسائل آپ کی خدمت میں لکھ کر بھیج رہا ہوں اگر آپ اس کا جواب ارسال فرمادیں تو یہ آپ کی نوازش ہوگی اور جاہل مطلق کا ذہن صاف ہوجائے گا، کیونکہ میرا زیادہ تر بیٹھنا اٹھنا ہندوؤں میں ہے، کچھ ہندو ایسے بھی ہیں جو نہایت متعصب قسم کے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آقا (علیہ السلام) کی ہر بات کو صحیح اور صاف ستھرا ثابت کردوں، اور آپ تو بہتر جانتے ہیں کہ واحد اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ دنیا کے ہر شخص کو مدلل اور معقول جواب دیتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی خلش باقی نہ رہے۔ایک ہندو کو میں نے عقلی دلیل سے راون کے پوجنے پر سمجھایا کہ یہ بالکل غلط ہے۔الحمدللہ اس نے قسم گیتا کی کھائی کہ آج سے ہم راون کو نہیں پوجیں گے، اور اس نے پوجا چھوڑ دی، جیسا کہ شق القمر کا ہمارے آقا ﷺ کا معجزہ جس پر راجہ بھوج نے تحفہ تحائف بھیجے تھے، راجہ بھوج کے نزدیک معجزہ ثابت ہوا، اسی صورت سے میرے رہبر آپ قرآن اور

حدیثوں کے علاوہ دلیلوں سے تمام مسئلہ ثابت کیجئے گا، یہ اس نا کارہ کی درخواست ہے، کہ غیر مسلموں کو جواب دینا ہے۔ میرے غم گسار یہ نہ کہئے گا کہ تم کیوں ان چیزوں سے الجھ رہے ہو۔ان میں ہمارے مذہبی وقار کا سوال ہے۔اگر جواب طویل ہوں تو اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک ایک کر کے یا عامر عثمانی سے کہہ کر تجلی میں عنایت فرما دیجئے اگر آپ مناسب سمجھئے تو اور یہ ضرور لکھ کر بھیجئے گا کہ کس مہینہ کی تجلی میں جواب آرہے ہیں، باقی ہماری تو دلی خواہش یہی ہے کہ یہ زحمت آپ گوارا فرمائیں۔

☆ کیا ثبوت ہے کہ بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے والا ہر بچہ مسلمان ہوتا ہے؟

☆ اگر مسلمان شراب کی حالت میں مرجائے تو حدیث کے مطابق کافر مرا، اب اس کو ایصال ثواب پہنچا سکتے ہیں یا نہیں؟

☆ کیا ثبوت ہے مذہب اسلام ہی سچا مذہب ہے؟

☆ لوگ مردے سے کیوں ڈرتے ہیں، اکیلے رات کو اس کے پاس نہیں بیٹھتے، چاہے جتنی محبت کرتے ہوں؟

☆ اگر کوئی عورت جنگل میں یا کسی بھی ویران جگہ میں مرجائے، کوئی وارث نہ ہو تو پتہ کیسے چلے گا کہ ہندو ہے یا مسلمان؟

☆ جب آدم ہی کی سب اولاد ہیں تو پھر ہندو کیا، مسلمان کیا، سکھ کیا، عیسائی اور پارسی کیا؟

☆ اگر بچہ کو ننگا نہ دیکھیں تو کیسے پتہ چلے گا کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی؟

چاہے دو تین دفعہ میں جواب دیجئے، مگر میرے اللہ کے ولی ہم کو جواب ضرور دیجئے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جناب نے جس مقصد کے حصول کا تذکرہ گرامی نامہ میں کیا ہے اس کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ اہل دل ومشائخ کی صحبت میں اسی مقصد کی تحصیل کی غرض سے رہا جائے، اور اخذ مقصد ان کی ہدایت کے مطابق کیا جائے۔ان کی صحبت وگفتگو کی برکت سے قلب وذہن اس طرح تیار ہو جاتا ہے کہ ہر مرحلہ میں خود رہبری کرتا ہے اور دوسروں پر بھی اپنا اثر ہی نہیں ڈالتا، بلکہ ان کو بھی اپنا ہم رنگ بنا دیتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: "صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة" (۱)۔

۱- سورۂ بقرہ:۱۳۸۔

وہ ملکہ جس کے حصول کی آنجناب کو فکر ہے، یقیناً بہت نیک مقصد ہے اور فی زمانہ تو اس کی تحصیل بہت ہی ضروری ہے، مگر اس کا طریقہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا محض خط وکتابت ولٹریچر ومضامین وغیرہ دیکھ کر کچھ معلومات میں اضافہ یا بولنے کا ڈھنگ تو آجاتا ہے، مگر وہ ملکہ راسخہ پیدا نہیں ہوتا جو مقصود ہے یا جو دوسروں پر اپنا رنگ چڑھادے نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ۔

اس لئے اگر اس کا شوق ہے تو کسی اہل دل محقق شیخ سے ربط وتعلق قائم فرمائیے، البتہ آپ کی بصیرت کے لئے اور ازدیاد شوق کے لئے ایک اور ضابطہ عرض کئے دیتا ہوں، اگرچہ یہ ضابطہ اس اصلی ضابطہ وطریقہ کا جو اوپر مذکور ہوا ہے بدل تو نہیں ہوسکتا، لیکن کارآمد ضرور ہوگا اور بہت ہوگا، نیز اس اصل طریقہ کی تحصیل میں معین ومددگار ہوگا، جس سے اس کی تحصیل کا شوق بھی بڑھے گا۔

روزمرہ نئے نئے حالات، پھر نئے نئے مسائل وسوالات نئے نئے انداز سے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے نئے نئے انداز سے تحقیقات وجوابات بھی درکار ہوتے ہیں، اور یہ سب چیزیں غیر متناہی سلسلہ رکھتی ہیں، ہر ایک کے لئے محض رٹے ہوئے جوابات کافی نہیں ہوتے، پس اگر وہ ملکہ راسخہ جو مشائخ کی صحبت وبرکت وتوجہ سے حاصل ہوتا ہے موجود نہ ہو جب بھی اگر کم از کم علمی عقلی درجہ کا ہی ضابطہ محفوظ رہے تو ان پیدا شدہ جزئیات وسوالات کا جواب معتدبہ درجہ میں دیا جاسکتا ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے:

توحید باری تعالیٰ عقلی ہے اور اس کا ثبوت عقلی وواقعاتی ہے۔ اگر کوئی بھی نبی مبعوث نہ ہوتا اور نہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی جب بھی محض عقل کی رہبری سے اور واقعات کے تجزیہ اور تجربہ سے توحید کا قائل ہونا ضروری ہوتا، بلکہ ضروری تھا اور ہے، اور اسی بناء پر متقدمین حکماء یونان بھی محض عقلی دلائل کی رہبری سے اپنے اپنے انداز پر مدعی توحید ہوئے ہیں، پس اس کو تو عقل اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جائے اور اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے فن علم کلام سیکھا جائے، اور علم کلام وعلم عقائد کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی معلومات فراہم کی جائیں۔

توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے بعد باری تعالیٰ عزاسمہٗ کی ذات وصفات کا تفصیلی علم اور اس کے حقوق وآداب کا علم، نیز اس چیز کا علم کہ کیا کیا چیزیں باری تعالیٰ عزاسمہ کی مرضی کے مطابق اور پسندیدہ ہیں، تاکہ ان کا امتثال کیا جائے اور کیا کیا چیزیں ان کی مرضی کے خلاف ونا پسندیدہ ہیں، تاکہ ان سے پرہیز واجتناب کیا جائے اور اپنی دنیوی واخروی صلاح وفلاح کا سامان پیدا کیا جائے اور نجات حاصل کی جائے، ان سب علوم کا احاطہ محض عقل نہیں کرسکتی، عقلاء کے متضاد نتائج بھی اس کی کھلی دلیل ہیں، ایک صاحب عقل، ایک چیز کو مرضی قرار دے کر اس کے کرنے کا حکم دیتا ہے، اور دوسرا صاحب عقل اسی

چیز کو نامرضی قرار دے کر اس سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے، اگر کوئی ذی عقل بطور محاکمہ کے کچھ فیصلہ بھی کر دے جب بھی اس فیصلہ کا یقینی ہونا ضروری نہیں ہوگا، غیر یقینی بلکہ مشکوک ہوگا، ہاں اگر باری تعالیٰ عزاسمہ خود ہی اپنی ذات وصفات سے متعلق اپنے حقوق وآداب سے متعلق، اپنی مرضی ونامرضی سے متعلق کچھ معلومات عطا فرمادیں تو بے شک وہ معلومات یقینی اور غیر مشکوک ہوں گی۔

چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہٗ نے اپنے فضل وکرم سے اور اپنی شفقت ورحمت کے طفیل جو مخلوق پر متوجہ ہے، تخلیق کائنات انسانی کے روز اول سے ہی انبیاء ورسل مبعوث فرمانے کا سلسلہ شروع فرمادیا، ان میں سے بہتوں کو ان کی قوم کی ضرورت کے مطابق مستقل کتابیں بھی دیں، نیز بقدر ضرورت اور بطور اتمام حجت بہتوں کو معجزے بھی ساتھ کر دیئے، تاکہ اگر کوئی معاند عناد برتے تو اس کو مقہور ومغلوب بھی کیا جاسکے۔

چنانچہ نبی آخر الزماں نبی امی خاتم المرسلین حضرت مصطفیٰ ﷺ (روحی فداہ وقلبی) کو سب سے اخیر میں قیامت تک کے لئے اپنا رسول بنا کر بھیجا جو تمام ادیان کے لئے ناسخ ہو، مبعوث فرمایا اور آپ پر اپنا کلام ازلی وسرمدی قرآن پاک نازل فرمایا اور اس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے والا معجزہ بنایا اور اس کی حفاظت کی ضمانت خود اپنے ذمہ لی، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ بلاشبہ ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن پاک) نازل کیا ہے۔ہم ہی اس کے محافظ ہیں کہ اس کو مٹنے اور ہر تغیر سے محفوظ رکھیں گے: "**انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون**" (۱)۔

نیز مزید اظہار اعجاز کے لئے اور تحدی ومقابلہ کرنے والوں کی عاجزی ظاہر کرنے کے لئے اور مومنین کی تقویت وطمانیت کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا:

"**وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فأتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله إن كنتم صادقين، فإن لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التي وقودها الناس والحجارة أعدت للكافرين**" (۲)۔

(اے انسانو!) اگر تم اس کتاب (قرآن مجید) کے نازل کرنے میں جس کو میں نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کیا ہے شک میں ہو تو اس کتاب کی کسی (چھوٹی سے چھوٹی) سورت کے مثل ہی (بنا کر) لاؤ، اور اس (معاملہ) میں اپنے

۱- سورۂ حجر: ۹۔
۲- سورۂ بقرہ: ۲۳، ۲۴۔

تمام معبودین کو شریک کرلو، اللہ کے سوا، اگر تم (اپنے اس شک و دعویٰ میں) سچے ہو تو ضرور ایسا کرو) اور (سن لو) اگر تم اس کے مثل نہ لاسکے اور (یقین کرلو کہ) ہرگز کبھی مثل نہیں لاسکتے، لہٰذا اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے ان منکرین کے لئے وہ آگ (جہنم) تیار کرلی گئی ہے)۔

غرض کہ جب ان چیزوں (توحید، رسالت و کتب سماوی کا نزول) مدلل کردیا جائے گا اور مخاطب کو اس پر مطمئن کردیا جائے گا تو پھر اگلی منزل (افہام و تفہیم مسائل و معاملات) آسان تر ہوجائے گی اور محض کتاب و سنت کے دلائل سے ہی دل میں اترتی اور پیوست ہوتی چلی جائیگی۔

ان چیزوں (توحید و رسالت و کتب سماوی کا نزول) کا عقلی انداز کا محققانہ ثبوت جس کے انکار کی کسی معاند کو بھی مجال نہ ہو، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے مضامین و رسائل و تصانیف میں ملے گا، مثلاً حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، میلۂ خدا شناسی وغیرہ ان کا مطالعہ کرنا چاہئے، بلکہ کسی محقق ذی مناسب و استعداد عالم سے سبقا سبقا سمجھ کر محفوظ کرنا چاہئے۔

اور قوت فکریہ و ذہنیہ کی تصحیح و تکمیل و تزکیہ و صفائی کے لئے اہل دل شیخ محقق کی صحبت کی تلاش کرنا چاہئے، اور جب تک یہ صحبت میسر نہ ہو اس وقت تک حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہٗ کی تصانیف و مضامین کے مطالعہ کے ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مواعظ و ملفوظات و تصانیف کا بالخصوص اشرف الجواب ہر سہ حصہ اور "المصالح العقلیہ فی الاحکام الشرعیہ" کے مستقل مطالعہ کا معمول رکھنا چاہئے، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ ان مذکورہ سوالات ہی کا نہیں بلکہ ہر پیش آنے والے سوال کا شافی جواب خود دے سکیں گے۔

کثرت مشاغل کی وجہ سے جناب کے تمام سوالات کا تفصیلی جواب کا موقع نہیں ملا، نیز وہ اتنا مفید بھی نہ ہوگا جتنا ان اصول کو اپنانا اور اس پر کاربند ہونا مفید ہوگا۔

آپ کی تسکین خاطر کے لئے اجمالی طور پر مختصر جواب کتاب و سنت کی روشنی میں بھی عرض کردیا جاتا ہے:

۱- حدیث شریف میں وارد ہے:

"كل مولود يولد على فطرة الإسلام فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه" (۱)۔

(ہر بچہ فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (مربی) اسکو یہودی بنادیں یا نصرانی بنادیں یا مجوسی

۱- کتاب اللؤلؤ والمرجان ۲۰/۷، حدیث نمبر: ۱۷۰۲۔

بنا دیں (غرض جیسے خود ہوتے ہیں ویسا بنا دیتے ہیں))۔

اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ بچہ بالکل خالی الذہن اور صحیح الفطرت ہوتا ہے۔ جیسی تعلیم وتربیت وصحبت ہوتی ہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ یہیں سے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بچہ شعور پیدا ہونے سے پہلے بالکل تنہا واکیلا چھوڑ دیا جائے تو جب وہ بڑھے گا اور عقل حاصل ہوگی تو موحد ضرور ہوگا۔ شرک وکفر سے محفوظ رہے گا اور یہی حقیقت تو اسلام کی بھی ہے۔

۲- کافر نہیں مرتا، مومن مرتا ہے مومن ہی رہتا ہے، اس معصیت کی وجہ سے گنہگار وفاسق، البتہ ہو جاتا ہے اور ہر فاسق کا کافر ہونا ضروری نہیں، بلکہ عاصی وفاسق الگ چیز ہے اور کافر الگ چیز ہے۔ جس نے اس کے خلاف کہا ہے اس نے غلط کہا ہے۔

۳- قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے: "إن الدین عند الله الإسلام" (۱)۔

اور ارشاد ہے: "**ومن یبتغ غیر الإسلام دینا فلن یقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرین**" (۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام ہی برحق اور سچا دین ہے۔

۴- وہم کے غلبہ اور ایمان کے ضعف کی وجہ سے ڈرتے ہیں، قوی الایمان اور صحیح العقل نہیں ڈرتے۔

۵- جس طرح مرد کو اسلامی لباس وپوشاک، شکل وصورت اختیار کرنے کا اور رکھنے کا اور شعائر اسلامی اپنانے کا حکم ہے اور ضروری ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی حکم ہے اور اس کو اپنانا ضروری ہے، پس جس طرح ان چیزوں کے ذریعہ سے مرد پہچانا جائے گا اسی طرح وہ بھی پہچانی جائے گی، پھر اگر وہ نمازی ہوگی تو نور نماز بھی اس کو متمیز کردے گا اور اگر اس نے یہ سب چیزیں اختیار نہیں کیں، اور بزی مسلم (مسلم وضع قطع) اختیار نہیں کی، نماز روزہ کو نہیں اپنایا اور پھر نہ پہچانی گئی تو وہ خود اس کی ذمہ دار ہوگی، دوسروں پر اس کا دبال نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمادیا گیا ہے: "**ومن تزیا بزی قوم فهو منهم**"، برتقدیر تسلیم اگر دنیا میں اس کے ساتھ کچھ خلاف ایمان اور غلط معاملات ہو جائیں تو ہو جائیں، مگر نفس ایمان کی برکت سے آخرت میں حقیقت واضح ہو کر اپنے اعمال نیک وبد کے اعتبار سے بدیر یا جلد مومنین کے زمرہ میں آجائے گی۔

۶- اسی توحید اور اس کے تفصیلی حقوق، آداب واحکام کے اختیار کرنے اور ترک کرنے سے یہ فرق پیدا ہو گیا، کوئی مومن، کوئی کافر، کوئی ناجی، کوئی ناری، کوئی جنتی، کوئی دوزخی ہو گیا۔

۷- بچوں کے غیر ذی شعوری کے زمانہ تک ان کا ننگا بھی دیکھنا درست ہے اور بلکہ پیدا ہوتے ہی جب کہ وہ قدرتا

۱- سورہ آل عمران: ۱۹۔

۲- سورہ آل عمران: ۸۵۔

ننگا ہوتا ہے، لڑکا یا لڑکی ہونا معلوم ہوجاتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق اس کے لباس و پوشاک بھی عادۃً ہوجاتے ہیں، پھر یہ کونسی پوچھنے کی بات یا استعجاب کی چیز ہے، بلکہ خود یہ سوال بھی قابل استعجاب ہے۔

البتہ شریعت مطہرہ نے ان ایہامات کے دفع کرنے کے لئے بھی یہ حکم دیا ہے کہ لڑکوں کو بچپن ہی سے مردانہ لباس اور لڑکیوں کو زنانہ لباس پہنایا جائے، اس کے خلاف کرنا حکم شریعت کے خلاف ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

غیر مسلم کی شادی میں شرکت کا حکم:

کیا غیر مسلم کی شادی میں شرکت کی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ سابق سے رجوع کرکے یہ جواب بھیجا کہ: دعوت ولیمہ جس کا قبول کرنا واجب ہوتا ہے جب اس میں امور معصیت وگانا، باجا وغیرہ منضم ہوجانے پر شرکت ناجائز ہوجاتی ہے۔ اور اسی طرح جب مسلمان کی شادی میں جب امور ممنوعہ کا انضمام ہوجاتا ہے تو شرکت ناجائز ہوجاتی ہے۔ تو پھر کافر کی شادی میں جس میں بہت سے امور ممنوعہ پوجا پاٹ وشرکانہ امور وگانا بجانا منضم ہوں پھر اس میں شرکت کیونکر جائز رہے گی؟ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۱/۱۴۱۱ھ

غیر مسلم کی میت میں جانا:

ایک غیر مسلم کی میت میں جانا کیسا ہے؟ جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیجئے حضور پاک ﷺ کی کبھی غیر مسلم کی شادی میں یا میت میں شرکت ہوئی ایسا ہمیں علم نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کافر کی میت محل غضب خداوندی ہوتی ہے جس سے نفور عن المحل ہونا اور غضب خداوندی سے پناہ مانگنا چاہئے، نیز

ارتھی (جنازہ) لیجاتے ہوئے کفریہ شرکیہ نعرے وغیرہ امور ممنوعہ ہوتے ہیں کس طرح شرکت جائز رہے گی؟ اس لئے احقر اپنے دونوں سابق جوابوں سے رجوع کر کے عدم شرکت کا حکم شرعی قرار دیتا ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۲/۱۱ ۱۴ھ

سورج گرہن اور چاندگرہن کے وقت کھانا وغیرہ کیسا ہے؟

سورج گرھن پڑتے وقت بڑے لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی کام نہ کرو کھانا نہ کھاؤ بلکہ خوب خیرات کرو حمل والی عورت کو کچھ چیز کاٹنے یا کوئی کام کرنے کو منع کر دیتے ہیں اس کے ہاتھ سے مہتر وغیرہ کو نمک دلاتے ہیں اور باہر نکلنے کو منع کر تے ہیں۔عندالشرع یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

سورج گرہن یا چاندگرہن پڑنے کے وقت دو رکعت نماز اتنی لمبی پڑھیں کہ گرہن ختم ہوجائے اگر کچھ بچ جائے تو تسبیح و استغفار میں مشغول رہنا مستحب ہے گرہن کے وقت میں کھانا پینا بہتر نہیں ہے اور خیرات کرنا بہتر ہے اور اس کے علاوہ جو باتیں سوال میں لکھی ہیں بے اصل ہیں ان پر عقیدہ رکھنا گناہ اور جاہلیت کی باتیں ہیں، البتہ سورج گرہن اور چاندگرہن کی نماز میں اتنا فرق ہے کہ سورج گرہن کی نماز امام مسجد میں جماعت سے آہستہ پڑھائے اور چاندگرہن میں الگ الگ ہر آدمی نماز پڑھے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کتاب الطہارت

کتاب الطہارت (باب الأنجاس وتطہیرہا)

مخصوص کاغذ سے استنجاء کا حکم:

آج کل عام طور پر سرکاری دفاتر، ہوائی اڈوں اور اسٹیشنوں وغیرہ کے استنجاء خانوں میں پیشاب سکھانے کے لیے مخصوص کاغذ رکھے ہوئے ہوتے ہیں جن کو عام طور پر استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ان مخصوص کاغذوں سے استنجاء کرنا کیسا ہے؟

حافظ اکبر علی (میرٹھ شہر)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر یہ کاغذ کلوخ (مٹی کے ڈھیلوں) کی طرح جاذب ہوتے ہیں تو ان کا حکم بھی وہی ہے جو کلوخ کا ہے کہ اگر مبرز سے اِدھر اُدھر پیشاب نہیں پھیلا ہے، یا پھیلا ہے مگر ہتھیلی کی مقدار کے اندر ہی پھیلا ہے تو اس کے استعمال کے بعد محض وضوء کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، ورنہ پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا ضروری رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۷/۱۰/۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- یہ حکم انہی مخصوص کاغذوں کے متعلق ہے جو برائے استنجاء بنائے جاتے ہیں، ان مخصوص کاغذوں کے علاوہ سے استنجا کرنا، مکروہ ہے: وکرہ الاستجاء بعظم، إلی قولہ وشئی محترم، قال الشامي: ویدخل أیضاً الورق۔ اور علامہ شامیؒ اس کی کراہیت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: لصقالتہ وتقومہ ولہ احترام أیضا لکونہ آلة لکتابة العلم ولذا عللہ في التاتر خانیة: بأن تعظیمہ من أدب الدین (شامی ۱/ ۲۲۷ فصل الاستنجاء) (مرتب)۔

دہ دردہ کی تعریف:

دہ دردہ کی تعریف کیا ہے، سوہاتھ کی تحدید کیا ہے کس طرح ہونا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

شریعت میں دہ دردہ حوض کو حوض کبیر شمار کیا جائے گا، صورت اس کی یہ ہے کہ حوض کی طولاً وعرضاً چاروں جانب دس دس ذراع مربع ہوں، اس طرح کہ پانی کا گرد چاروں طرف سے چالیس ذراع مربع ہو اور اس کی سطح سو ذراع مربع ہو، ذراع شرعی، ۹ گرہ کا ہوتا ہے، جب طول بھی دس ذراع اور عرض بھی دس ذراع ہو اور دس کو دس میں ضرب دینے سے سو حاصل آتا ہے، تو سطح سو ذراع مربع کی ہوگی۔

"وفي الفتاوى :الحوض الكبير مقدر بعشرة أذرع في عشرة أذرع وصورته أن يكون من كل جانب من جوانب الحوض عشرة أذرع وحول الماء أربعون ذراعاً ووجه الماء مأة أذرع هذا مقدار الطول والعرض" (۱)۔

فلذا أفتى به المتأخرون الإعلام أى في المربع بأربعين وفي المدور بستة وثلاثين وفي المثلث من كل جانب خمسة عشرو ربعاً وخمسا بذراع الكرباس ، ولوله طول لا عرض لكنه يبلغ عشر في عشر جاز تيسراً "(۲)۔

عام اس سے کہ موجودہ شکل اس کی لمبی ہو سہ گوشہ ہو یا جیسی بھی ہو، مگر مربع نکالیں تو دس دس ذراع نکل آوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- وفي الخلاصة وصورة الحوض الكبير المقدر بعشرة في عشرة أن يكون من كل جانب من جوانب الحوض عشرة وحول الماء أربعون ذراعا ووجه الماء مأة أذرع هذا مقدار الطول والعرض (البحر الرائق ۱/۱۴۰، مکتبہ زکریا، دیوبند وخلاصۃ الفتاوی ۱/۳)۔

۲- الدر المختار علی الرد ۱/۱۷۷-۱۷۸، مطبع عثمانیہ۔

حوض وٹنکی کی تطہیر کا حکم شرعی؟

چھوٹے حوض یا پانی کی ٹنکیوں میں اگر نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا، ایا اس صورت میں پانی پاک رہے گا یا ناپاک؟ اگر پانی ناپاک ہوجائے گا تو اس کے پاک کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبالله التوفيق:

چھوٹے حوض یا پانی کی ٹنکیاں جو چھوٹی ہوں، یعنی وہ دردہ (عشر فی عشر) نہ ہوں ان میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک ہوجائیں گی ورنہ ناپاک نہیں ہوں گی، اور پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ ناپاکی نکال کر اس کا کل پانی نکال دیں اور پھر پانی سے اس کی دیواریں وغیرہ دھو کر اس پانی کو بھی گرادیں یا نکال دیں پھر پاک پانی بھر دیں، اور اگر یہ حوض وٹنکی اس قسم کی ہوں کہ جن میں پانی اوپر سے آتا ہے اور نیچے سے گرتا ہے تو اس کے اندر پانی آنے اور نکلنے کے دونوں راستے کھول دیں اور مرئی نجاست نکال دیں۔ پھر دیکھیں اگر اتنا پانی نکل گیا ہو جتنا اس میں تھا تو اب یہ سب پانی پاک شمار ہوگا۔ (اور اگر ٹنکی یا چھوٹا حوض اس طرح پر ہو کہ اس میں دو پائپ لگے ہوئے ہوں ایک سے پانی برابر آتا ہو، اور دوسرے سے نکلتا رہتا ہو تو یہ جاری پانی کے حکم میں ہے)، پانی ناپاک نہ ہوگا" **كمافي العالمگيرية، واذا كان الحوض صغيراً يد خل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز الوضوء به من جميع جوانبه وعليه الفتوىٰ**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

ناپاک اشیاء ڈالے ہوئے صابن کا حکم شرعی:

مغربی ممالک سے جو صابن آتے ہیں ان کے متعلق سننے میں آتا ہے کہ ان میں ناپاک اجزاء اور خنزیر کی چربی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، اس طرح کے صابن سے کپڑے صاف کرنا کیسا ہے، اور کپڑے پاک رہیں گے یا ناپاک؟

۱-　عالمگیری ۱/۱۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

مغربی ممالک سے آئے ہوئے صابنوں میں جب تک حرام چربی یا سور کی چربی کا ملا ہوا ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ویقینی نہ ہوجائے اس وقت تک ان کے استعمال کو ناجائز نہیں کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اشیاء میں اصل حلت واباحت ہے: "الأصل في الأشياء الإباحة" (۱)، البتہ اس کے استعمال کرنے سے ان حالات میں اجتناب کرنا تقویٰ واحتیاط کہا جا سکتا ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

پیشاب سے بنائے گئے نمک کا حکم:

بعض مقامات پر پیشاب کو پکا کر اس کی شوریت کو نکال کر نمک بنا دیا جاتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس نمک کا استعمال درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

پیشاب شوریت وغیر شوریت بجمیع اجزاء نجس بعینہ اور غیر مباح الشرب والاکل ہوتا ہے، اس لیے شوریت نکال دینے کے بعد بھی بقیہ اجزاء ناپاک ونجس ہی باقی رہیں گے اور ان کا استعمال ناجائز ہی رہے گا (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

۱- الاشباہ والنظائر ۸۷ باب الیقین لا یزول بالشک۔

۲- علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی صراحت کی ہے: "جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته، لأنه تغير و التغير يطهر عند محمد رحمه الله، ويفتى به للبلوى" (شامی ۱/ ۲۱۰ باب الانجاس)، اس کے علاوہ دیگر اکابر کے فتاویٰ میں بھی اس کا حکم مذکور ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۱/ ۱۳۰) (مرتب)۔

۳- (ويرفع أي الحدث بماء ينعقد به ملح لا بماء... ملح لبقاء الأول على طبيعته الأصلية والقلاب الثاني إلى طبيعة الملحية (الدر المختار على هامش الشامي ۱/ ۱۲۱، باب المياه) ہاں اگر پیشاب نمک کی کان میں پڑ کر نمک بن جائے اور غیر متمیز ہوجائے تو "الخلط استهلاک" کے مطابق اس پر پیشاب کا حکم باقی نہ رہے گا (مرتب)۔

کیا پیشاب فلٹر کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا؟

ابھی کچھ ایام قبل روسی سائنسدانوں نے ایک شخص کو ایک ہوابند کوٹھری میں تجربہ کے طور پر بند کردیا اور اس کے لیے سامانِ خوردونوش کا کچھ انتظام کردیا، لیکن کچھ ایام کے لیے پانی سپلائی نہ کیا، تا کہ پانی کے بغیر زندگی کا تجربہ کرسکیں، چنانچہ ان لوگوں نے ایک برتن میں پیشاب کیا اور اس کے تمام اجزاء متعفنہ اور ضاریہ کو ایک مشین سے کشید کرکے ختم کرنے کے بعد مثل پانی کردیا، جس طرح سمندری پانی کو کھارے سے تبدیل کرکے میٹھا بنالیتے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ یہ انقلاب ماہیت کے تحت آتا ہے یا نہیں؟ مع دلائلِ شرعیہ ونقلیہ ثابت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس کشید کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ پیشاب کے اندر سے اس کے متعفن اور مضرت رساں اجزاء کو نکال دیا گیا، اور باقی جو اجزاء بچے وہ اسی پیشاب کے اجزاء ہیں۔ اور پیشاب بجمیع اجزاء نجس العین اور نجس بنجاست غلیظہ ہے، اس لیے یہ باقی ماندہ اجزاء بھی نجس العین اور نجس بنجاستِ غلیظہ ہی رہیں گے (۱)۔ اس میں تقلیب ماہیت کی کوئی صورت نہیں پائی گئی اس کو قلبِ ماہیت نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ تجزیہ وتخرجہ ہوا نہ کہ قلب ماہیت، قلب ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت ونئی ماہیت بن جائے، نہ پہلی حقیقت وماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے، نہ اس کی صورت وکیفیت باقی رہے، نہ اس کے خواص وآثار وامتیازات باقی رہیں، بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں، نام بھی دوسرا، صورت بھی دوسری، آثار وخواص بھی دوسرے، اثرات وعلامات اور امتیازات بھی دوسرے پیدا ہوجائیں، جیسے شراب سے سرکہ بنالیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

قرآن کریم کی کیسٹ بے وضو چھونا، ٹیپ کرنا، نیز کتابت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

آج کل قرآن کریم کو بذریعہ ٹیپ ریکارڈ کیسٹ میں ٹیپ کیا جاتا ہے، اس طرح بغیر وضو کے ٹیپ کرنا جائز ہے یا

۱- ویرفع أي الحدث بماء ينعقد به ملح لا بماء ملح لبقاء الأول على طبيعته الأصلية وانقلاب الثاني إلى طبيعة الملحية (الدر المختار على هامش الشامي ۱/ ۱۲۱، باب المياه)۔

نہیں۔نیز قرآن کریم کی کیسٹ بغیر وضو کے ہاتھ میں لیجاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور بغیر وضو کے قرآن کریم کی کتابت کرنا شرعی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس طرح بغیر وضو کے کیسٹ میں بھرنا اور اس کا ہاتھ میں لینا سب جائز ہے، کیونکہ کیسٹ میں صرف ہوا محبوس ہوتی ہے، کلمات جیسی کوئی چیز محبوس ہو کر مقید نہیں ہوتی، بخلاف کتابت کے کہ اس میں کلمات جیسی چیز محبوس ہو کر مقید ہوتی ہے، اس لیے کتابت بے وضو کرنا اور اس کو بے وضو چھونا کچھ بھی جائز نہیں ہوگا(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

نجاست میں گرے بسکٹ کا حکم:

ہمارے بسکٹ جو کہ کاغذ میں ملفوف تھے، ایک دم اچانک غلیظ پانی میں گر پڑے، فوراً ایک شخص نے نیچے پہنچ کر اٹھا لیا، کھول کر دیکھا تو بعض پر چار، چھ دھبے یا ہلکی چھینٹیں تھیں اور بعض پر صرف کاغذ کی تری ہی پہنچی تھی، اب سوال یہ ہے کہ ان کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے، کیا بسکٹوں کے تنور میں اس کو سینک کر پاک کر سکتے ہیں؟

۱- (مسئلہ مذکورہ میں فقہاء حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک محدث کے لئے قرآن کی آیت کی کتابت جائز ہے جبکہ امام محمد کے نزدیک مکروہ ہے، علامہ حلبی نے دونوں قولوں کے درمیان تطبیق اس طرح دی ہے: امام ابو یوسف کے قول کا محمل یہ ہے کہ کاتب اور اس کی کتاب کے درمیان قلم وغیرہ کا واسطہ ہو اور کاتب کا ہاتھ قرآن کی آیت کو مس نہ کر رہا ہو اور امام محمد کے قول کا محمل یہ ہے اور ان کا قول اس صورت سے متعلق ہے کہ جب کاتب اور قرآن کی کتابت شدہ آیت کے درمیان کوئی واسطہ اور فصل نہ ہو۔ بعض حضرات نے امام ابو یوسف کے قول کو کراہت تحریمی کی نفی پر محمول کیا ہے اور امام محمد کے قول کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے۔ الدر المختار میں ہے: "ولاتكره كتابة قرآن والصحيفة أو اللوح على الأرض عند الثاني خلافا لمحمد، وينبغي أن يقال: إن وضع على الصحيفة مايحول بينها وبين يده يؤخذ بقول الثاني، وإلا فبقول الثالث قاله الحلبي" علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: قوله (خلافا لمحمد) حيث قال أحب إلى أن لايكتب، لأنه في حكم الماس للقرآن، قال في الفتح: والأول أقيس، لأنه في هذه الحالة ماس بالقلم وهو واسطة منفصلة فكان كثوب منفصل إلا أن يمسه بيده قوله: (وينبغي) ووفق بين القولين بما يرفع الخلاف من أصله بحمل قول الثاني على الكراهة التحريمية، وقول الثالث على التنزيهية بدليل قوله أحب إلى" (الدر المختار علی رد المحتار ۱/ ۱۷۵ طبع کراچی) نیز دیکھئے: (امداد الفتاوی ۱/ ۱۴۷ طبع زکریا بکڈپو، دیوبند) چونکہ قرآن کریم کی ایک دو آیتوں کو لکھنے میں اس احتیاط پر عمل کرنا ممکن ہے، لیکن پورے قرآن کو بے وضو تحریر کرنے میں اس کا قوی امکان ہے کہ کاتب کے ہاتھ سے قرآن کریم کی دیگر آیتیں مس ہو جائیں جو کہ بالاتفاق حرام ہے، اس لئے احتیاطاً حضرت مفتی صاحب نے مطلقاً کتابت کو ناجائز قرار دیا ہے (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض سینکنے سے یہ بسکٹ پاک نہ ہوں گے، سینکنے سے نجاست کے اجزاء لطیفہ تو نکل سکتے ہیں، مگر اجزاء ثقیلہ وکثیفہ کا اخراج نہ ہوگا، اس لیے یہ سوال بیکار ہے، البتہ یہ طریقہ بہتر ہے کہ جس حصہ پر نجس پانی یا نجاست کا اثر (دھبہ وغیرہ) ہو اس کو کھرچ کر نکال دیا جائے اور بقیہ کو استعمال کرلیا جائے (۱،۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

خنزیر کے چمڑے کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

خنزیر کا چمڑا بعض اچھی موٹر کاروں میں استعمال ہوتا ہے، تو جس گاڑی میں اس چمڑے کا استعمال ہو اس گاڑی میں سوار ہونا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی دریافت طلب ہے کہ جہاں وہ چمڑا لگا ہوا ہے وہاں پر ہمارا کوئی بھی عضو یا کپڑا مس ہوتا ہو تو کیا وہ عضو یا کپڑا ناپاک ہوجائے گا، یا اس کی کچھ تفصیل تری اور غیر تری میں ہے، اگر ہے تو وہ بھی تحریر فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

چمڑا جو بالکل خشک ہو اس پر اپنا خشک جسم یا خشک کپڑا مس کرنے یا لگنے سے کپڑے یا جسم پر نجاست نہیں آئے گی (۳)، البتہ اگر وہ چمڑا پانی سے یا کسی بھی طرح سے تر ہو اور اس پر اپنا خشک جسم یا کپڑا لگے گا تو اس چمڑے کی تری آجائے گی جس کی بنا پر ناپاک ہوجائے گا۔ یا وہ چمڑا خشک ہی ہو لیکن پسینہ وغیرہ سے اپنا جسم یا کپڑا تر ہو کر اس چمڑے سے لگے اور پھر اس

۱- (ویؤیده: ويطهر المني الجاف ولو مني امرأة على الصحيح بفركه عن الثوب ولو جديدا مبطنا، وعن البدن بفركه في ظاهر الرواية طحطاوي على مراقي الفلاح / ۸۹، باب الأنجاس وتطهيرها، وهكذا في الفتح ۱ / ۱۳۶)۔

۲- (ومنها الحث والدلک الخف إذا أصابته النجاسة إن كانت متجسدة كالعذرة والروث والمني يطهر بالحث إذا يبست وإن كانت رطبة في ظاهرا لرواية لايطهر إلا بالغسل وعند أبي يوسف إذا مسحه على وجه المبالغة بحيث لايبقى لها أثر يطهر وعليه الفتوى لعموم البلوى) (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۴، دارالفکر) (مرتب)۔

۳- (وإذا أصاب الثوب المبلول النجس في ثوب طاهر يابس فظهرت نداوته ولكن لايصير رطبا يسيل منه شئي بالعصر، بل كان بحيث لو عصر لا يسيل منه شئي ولا يتقاطر، اختلف المشائخ فيه، والأصح أنه لايصير نجساً كذا في الخلاصة كبيرى/ ۱۷۱، فصل في الآسار (مرتب)

چمڑے کا کوئی اثر (رنگ یا بو وغیرہ) اپنے جسم یا کپڑے پر آجائے تو بھی ناپاک ہوجائے گا (۱)، ایسے اشتباہ کے موقع پر جب اس پر بیٹھنا ہو یا ٹیک لگانا ہو تو کوئی موٹا کپڑا، رومال یا تولیہ وغیرہ ڈال کر بیٹھے کہ احتیاط اسی میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

کپڑے وغیرہ پر جب تک نجاست کا دھبہ و داغ نظر نہ آئے اس کو ناپاک نہیں کہیں گے:

جملہ سرکاری دفاتر و کوٹھیوں میں بڑے عمدہ قسم کے قالین بچھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ان دفاتر و کوٹھیوں ہی میں کام کرتے ہیں وہ اپنے جوتوں سمیت آتے ہیں جو کچھ پانی یا تھوڑی بہت تری جوتوں کو لگتی ہے تو وہ قالین اتنے موٹے ہوتے ہیں کہ اس تری کو فوراً جذب کر لیتے ہیں، اور ان پر بھنگی دن میں کئی مرتبہ جھاڑو دیتے ہیں، اور بڑے صاف، شفاف نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ کوئی نجاست نظر نہیں آتی، ایسے قالینوں پر نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

حافظ محمد طاہر (پنجاب)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر استنجا خانہ و بیت الخلا اس قالین یا فرش سے اتنی دوری پر ہو کہ آنے میں درمیان میں کچھ زمین پڑتی ہو، یا پختہ فرش اتنا وسیع پڑتا ہو کہ اس پر گذرنے میں جوتوں کی تری راستہ ہی میں جذب ہوجاتی ہو، جب تو اس فعل سے قالینوں کو اس وقت تک ناپاک نہیں کہیں گے جب تک نجاست کا داغ، دھبہ یا اثر (رنگ و بو وغیرہ) ان قالینوں پر نظر نہ آئے اور محض شبہ کی بنا پر کوئی حکم نہیں لگے گا۔

ہاں اگر استنجاء خانہ و بیت الخلاء اتنے قریب ہیں کہ درمیان میں کچھ ایسی زمین نہیں پڑتی کہ جوتوں کے تلوے اس پر گذرنے سے خشک ہوجاتے ہوں اور نہ پختہ فرش ہی ایسا حائل ہو تو ظنِ غالب اسی کا ہوگا کہ ناپاکی و نجاست کا اثر قالین پر

۱- (ولو بسط المصلي أی السجادة علی شئ نجس رطب أو جلس علی أرض نجسة رطبة أو لف الثوب اليابس الطاهر في ثوب نجس رطب فأثر الرطوبة النجسة في ثوبه في الصورتين الأخريين أو أثرت في مصلاه في الصورة الأولی ينظر إن كان ثانية الرطوبة بحال لو عصر الثوب أو المصلي يقاطر منه شئ يتنجس الثوب والمصلي والا أی، وان لم يكن الثانية بذلک الحال فلا يتنجس ...... وأيضا يشترط أن لايوجد أثر النجاسة من لون أو ريح) (غنیۃ المستملی ص: ۱۷۸، دارالکتاب دیوبند) (مرتب)۔

آ گیا۔ایسی صورت میں اس پر کوئی پاک کپڑا بچھائے بغیر نماز پڑھنا درست نہ ہوگا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں کا حکم؟

ڈرائی کلین کیے کوٹ، پتلون یا شیروانی وغیرہ کی تطہیر کیے بغیر نماز پڑھنی یا پڑھانی درست ہے یا نہیں؟ ڈرائی کلین ایک فلٹر میں چند گیلن پٹرول ڈال کر گرم کپڑے چار، پانچ عدد ڈال دیے جاتے ہیں اور مشین چالو کر دی جاتی ہے۔جس سے کپڑے پٹرول میں زوروں سے گردش کرنے لگتے ہیں اور میل کچیل پٹرول میں آجاتا ہے۔پھر پٹرول کو نتھار کر کپڑے خشک کر کے پریس کر دیے جاتے ہیں۔فلٹر میں جو کپڑے ڈالے جاتے ہیں ان میں نوے فیصد یقینی طور پر نجس ہوتے ہیں،لہٰذا ان کی وجہ سے ٹنکی یا پٹرول اور اس کے سارے کپڑے یقیناً نجس ہو جاتے ہیں جو محض خشک کرنے سے پاک نہیں ہوتے،اس لیے ان کی تطہیر کے بغیر ان کپڑوں میں نماز کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی کپڑا (سوتی ہو یا اونی یا ریشمی) ابتداءً جب بنا جاتا ہے اور تیار کیا جاتا ہے اس وقت بھی اس کے دھاگے (تانے بانے وغیرہ) میں مسالہ (ماڑی وغیرہ) لگایا جاتا ہے اور وہ بھی اکثر غیر مسلم لگاتے ہیں اور نہایت گندے پیروں سے اور گندی جگہوں میں خوب مسلتے ہیں جس میں ناپاکیوں کی آمیزش کبھی دیکھی بھی جاتی ہے اور کبھی مظنون ہوتی ہے اور تطہیر شرعی کے اصول تو قطعاً ملحوظ نہیں ہوتے،جیسا کہ ان کے کارخانوں اور فیکٹریوں کا مشاہدہ کرنے والوں پر ظاہر ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نئے کپڑے بھی خواہ سوتی ہوں یا اونی یا ریشمی۔بغیر شرعی ضابطہ سے پاک کیے ہوئے استعمال کرنا درست نہ ہو،لیکن فتوی یہ نہیں ہے،کیونکہ اصل اشیاء میں طہارت ہے (کمافی الاشباہ)(۱)،جب تک ناپاکی لگی ہوئی یا لگتے ہوئے نہ دیکھ لیا جائے،یا شرعی ثبوت یا شہادت سے ناپاک ہونا متیقن نہ ہو جائے ناپاکی کا حکم نہیں لگا سکتے۔

اسی طرح دیہاتوں میں عام طور پر سوتی کپڑے جو دھوئے جاتے ہیں وہ گدھوں کی لیدوں میں ملوث کرنے اور خوب ملنے کے بعد دھوئے جاتے ہیں اور بسا اوقات پانی کی کمیابی کی وجہ سے وہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں اور کبھی محض

۱- (الاصل فی الاشیاء الاباحۃ/۸۷،باب الیقین لایزول بالشک،الفن الاول،الاشباہ النظائر مع شرح الحموی)۔

ٹبوں میں دھوئے اور صاف کئے جاتے ہیں، اور خشک بھی بسا اوقات ناپاک زمینوں پر (جیسے تالاب وغیرہ کے گندے حواشی یا گندی جھاڑیوں میں) پھیلا کر کئے جاتے ہیں جس کا مشاہدہ بھی عام ہے، اور جہاں کہیں دھوبی غیر مسلم ہوں اور آبادی بھی عموماً غیر مسلموں کی ہو، وہاں تو اس کا مشاہدہ اور بھی عام ہے، مگر اس کے باوجود ان دھلے ہوئے کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جاتا اور نہ بغیر شرعی ضابطہ کے پاک کئے ہوئے ان کپڑوں میں نماز پڑھنے سے نماز جائز نہ ہونے ہی کا حکم دیا جاتا ہے(۱)۔

یہ صرف اسی قاعدہ مسلمہ کی بنا پر ہے کہ اصل اشیاء میں طہارت ہے، پس جب تک اس کے خلاف دلیل شرعی سے نجاست کے ملوث وبقاء کا یقین نہ ہو جائے حکم بنجاست حکم شرعی نہ ہوگا، بالخصوص جب ابتلاء عام بھی اس میں شریک ہو جائے۔

بالکل اسی طرح یہاں پٹرول سے دھلے ہوئے کپڑوں کا بھی حکم ہوگا، بلکہ پٹرول کے اندر جذب نہ ہونے اور اڑ جانے کی قوت پانی سے کہیں زیادہ اور قوی ہوتی ہے، اور پھر اونی کپڑوں میں سوتی کپڑوں کے مقابلہ میں جذب کرنے کی صلاحیت بھی تقریباً نفی کے برابر ہوتی ہے، اور اسی بنا پر اونی کپڑوں کو بھگو کر نا تک دو تو محض تھرنے کے ساتھ ہی ساتھ بالکل خشک ہو جاتے ہیں، بخلاف سوتی کپڑوں کے کہ تھرنے کے بعد کافی تر رہتے ہیں۔

اس کا تقاضا بھی یہ ہونا چاہئے کہ اونی کپڑوں میں نجاست کی سرایت بھی بہت کمزور ونا پائیدار ہو، اور ان کی تطہیر کا طریقہ بھی سہل وآسان ہو، انہیں وجوہ کی بنا پر پٹرول سے دھلے ہوئے ان کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں ہوتا اور نہ ان کے دوبارہ دھونے کا حکم ہوتا ہے اور نہ پاک کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب پٹرول میں کپڑوں کی گردش کرانے اور جھنجھوڑنے سے کپڑوں کے داغ دھبے (خواہ وہ ناپاکی ہی کے داغ دھبے ہوں) زائل ہو جاتے ہیں اور کپڑا صاف ستھرا ہو جاتا ہے تو جب کپڑے میں پٹرول جذب نہ ہو کر اڑ جاتا ہے اور اس کے اڑ جانے کے بعد بھی اثر نجاست (رنگ وبو مزہ وغیرہ) باقی نہیں رہتا ہے بلکہ زائل ہو جاتا ہے تو کہنا پڑے گا کہ پٹرول ہی سے ازالہ ہوا ہے، اور تطہیر نام ہے اسی ازالۂ نجاست کا خواہ قلبِ ماہیت کی وجہ سے ہو جیسے شراب کا سرکہ بن جانا اور سرکہ کا پاک شمار کیا جانا، یا محض اڑ جانے سے ہو، جیسے ناپاک روئی کے دھننے سے روئی کا پاک ہو

۱- (واختلف في أنه هل يطهر بالغسل في الأواني، بأن غسل الثوب النجس أو البدن النجس في ثلث إجانات، قال أبوحنيفة ومحمد رحمهما الله: يطهر حتى يخرج من الإجانة الثالثة طاهراً (بدائع الصنائع، ۸۷/۱ كتاب الطهارت) (مرتب)۔

جانا، یا غسل بالماء کے ذریعہ سے یا کسی بھی سیال طاہر شئی سے غسل کے ذریعہ سے، اور یہ صورت یہاں بھی حاصل ہے (۱)، لہٰذا اس بنا پر بھی دوبارہ تطہیر کا حکم دینے کی ضرورت نہ ہوگی (۲)۔

البتہ جن لوگوں کو اپنے کپڑے کی ناپاکی کا یقین ہو، مثلاً نجاست لگتے ہوئے یا لگی ہوئی خود دیکھی ہے تو ان کو پٹرول میں دھونے کے لیے دینے سے قبل خود پاک کر لینا چاہئے یا پھر دھل کر آنے کے بعد احتیاطاً خود پاک کر لینا افضل ہوگا (۳)۔ اسی طرح مشین سے نکلنے کے بعد ذی جرم نجاست کا جرم باقی رہے تو اس کا دھونا ضروری رہے گا اس کے بغیر پاک نہیں کہا جائے گا (۴)۔

اسی طرح یہ بات بھی الگ ہوگی کہ از روئے تقویٰ ایسے دھلے ہوئے کپڑوں کی تطہیر بقاعدۂ شرع خود کر لی جائے، مگر اس کو فتویٰ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

غیر ملکی پنیر کا حکم:

جس طرح اس ملک میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں غیر مسلم عیسائی اور یہودیوں کی فیکٹریوں میں بنتی ہیں اور مسلمان ان کو خرید کر کھاتے ہیں، اسی طرح پنیر جس کو انگریزی زبان میں چیز (CHEESE) کہتے ہیں، اپنے تمام تر اقسام کے ساتھ غیر مسلموں کی فیکٹریوں میں بنتا ہے اور مسلمان انہیں خرید کر کھاتے ہیں۔

۱- (روئی میں نجاست لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار اتنی ہو کہ دھنائی سے اس کا اثر زائل ہو جائے تو دھننے سے روئی پاک ہو جائے گی، لیکن اگر نجاست کی مقدار زیادہ ہو تو اس کو دھونا ضروری ہے، قال الشامی قوله: وندف قطن تنجس أقله ومن عده شرط كون النجس مقدارا قليلا يذهب بالندف وإلا فلا يطهر، ردالمحتار ۱/ ۳۱۴) (مرتب)۔

۲- (وإن كان لها جرم كثيف، فإن كان منيا فإنه يطهر بالحت بالإجماع، وإن كان غيره كالعذرة والدم الغليظ والروث يطهر بالحت عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله وعند محمد لايطهر إلابالغسل، (بدائع الصنائع ۱/ ۸۴ كتاب الطهارة)۔

۳- (لأن اليقين لايزول بالشک - الاشباه والنظائر مع شرح حموی، ص، ۷۵، الفن الاول) (مرتب)۔

۴- (مايطهر به النجس عشرة: منها الغسل، يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن إزالتها به كالخل ومنها المسح ومنها الفرک في المني ومنها الحت والدلک ومنها الجفاف وزوال الأثر، ولافرق بين الجفاف بالشمس والنار والريح والظل ومنها الإحراق ومنها الاستحالة ومنها الدباغ والزكاة والنزح) (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۱-۴۵) (مرتب)۔

اب کچھ دنوں سے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ پنیر کے بنانے میں انفحہ استعمال کیا جاتا ہے جو نوزائدہ گائے کے بچہ کے شکم سے جمے ہوئے دودھ کی شکل میں نکالا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بچھڑے کو دودھ پلا کر اس کو ذبح کیا جاتا ہے، اس کے بعد پیٹ چاک کر کے وہ دودھ جو دہی کی شکل میں جم جاتا ہے اس کو نکال لیا جاتا ہے۔

توسوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے ذبیحہ سے کشیدہ انفحہ سے بنا ہوا پنیر مسلمان کے لیے حلال ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

غنیۃ المستملی الکبیر، (ص، ۱۴۸) پر ہے: ’’البيضة إذا وقعت من الدجاجة في الماء أو في المرقة لاتفسدهِ وكذا سخلةٍ وكذا الإنفخة بكسر الهمزة وفتح الفاء وقد تكسر وهي مايكون في معدة الرضيع من أجزاء اللبن طاهرة عند أبي حنيفة رحمه الله لاتفسد الماء ولاغيرهِ وإذا خرجت من شاة ميتة سواء كانت جامدة أو مائعة وعندهما المائعة نجسة والجامدة متنجسة تطهر بالغسلِ فيفسد ان الماء وغيره، إلا إذا اغتسلت الجامدة، أما لوخرجت من مذكاة فلا خلاف في طهارتها‘‘ (۱)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انفحہ جو گائے کے بچہ کے شکم سے یا بکری وغیرہ کسی بھی ایسے جانور سے نکالا جاتا ہے جس کا گوشت کھانا حلال ہے، وہ انفحہ اس جانور کے شکم سے شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد نکالا جائے تو وہ بالاتفاق حلال و پاک ہوتا ہے اور اس کا کھانا اور استعمال کرنا درست رہتا ہے، اور جو انفحہ ماکول اللحم ہی جانور کے پیٹ سے نکال دیا جائے مگر بغیر شرعی ذبح کئے ہوئے (مردار) جانور سے نکال دیا جائے تو صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک حلال تو ہوتا ہے، مگر معدہ کی خارجی ناپاک رطوبت کی آمیزش کی وجہ سے ناپاک رہتا ہے۔ اگر خشک اور منجمد ہو تو دھو کر پاک وطاہر بھی کیا جاسکتا ہے اور بعد تطہیر استعمال بھی کیا جاسکتا ہے اور اگر رقیق وسیال ہے تو ناپاکی کے سرایت کرجانے کی وجہ سے اس کی تطہیر کی کوئی شکل مفید نہیں رہتی، اور اس کا استعمال درست نہیں ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر حال میں اس کا استعمال درست رہتا ہے اور رہے گا کیونکہ وہ رطوبت امام صاحب کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتی۔

اور اس اختلاف کا ثمرہ یہ نکلے گا کہ ازروئے فتویٰ اس کا استعمال جائز اور درست رہے گا۔ ازروئے تقویٰ احتیاط افضل ہوگا۔

۱- (وهكذا في الطحطاوي على مراقي الفلاح على صفحة، ص، ۹۱، قبيل كتاب الصلوٰة) (مرتب)۔

پس یہ رینٹ جو گائے کے بچہ سے بعد ذبح نکالا جاتا ہے یہ حلال وپاک ہے، اس کا استعمال بلا اختلاف جائز اور درست ہے اور اس کے ذریعہ سے جو پنیر بنایا جائے گا اس کا استعمال بھی جائز اور درست رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

ذبیحہ سے کشید مادہ سے بنایا ہوا پنیر:

مسلمان کے ذبیحہ سے کشید مادہ سے بنایا ہوا پنیر حلال ہے یا نہیں؟

سوال (۳):

(الف) ایک مسلمان کے سوال پر محکمہ زراعت واقتصادیات کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک اخبار میں یہ بیان دیا ہے کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لیے رینٹ، یعنی انفحہ استعمال ہوتا ہے، مگر چونکہ بچھڑے بڑی تعداد میں ذبح نہیں کئے جاتے، اس لیے سور (خنزیر) کے پیٹ سے بھی کوئی مادہ اس غرض کے لیے کشید کیا جاتا ہے اور بڑی تحقیقات کے بعد سائنس داں سبزہ جات سے ایک مادہ کشید کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو دودھ کو جمانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور حیوانی رینٹ کا قائم مقام ہو گیا ہے۔

(ب) ڈیری انڈسٹری کنٹرول بورڈ کے منیجر نے جمعیۃ العلماء ٹرانسوال کے سوال کے جواب کے ضمن میں فرمایا: یہ معلوم ہے کہ بیرونی ممالک میں بعض رینٹ میں خنزیر کے پیٹ سے کشید کوئی سیال مادہ شامل ہوتا ہے، مگر جہاں تک اس آفس کا ذکر ہے اور علم ہے، اس میں آخر الذکر رینٹ مستعمل نہیں ہے۔

(ج) جمعیۃ العلماء نٹال کے سوال پر اور بندہ کی اس ذاتی گفت وشنید اور تحقیق پر نیشنل کوآپریٹو ڈیریز لمیٹیڈ کے پروڈکٹ کنٹرولر اور معاون منیجر نے زبانی اور تحریری بیان دیا کہ اب ان کی جملہ برانچوں میں جو ساری پبلک میں پھیلی ہوئی ہیں، صرف سبزی کے مصنوعی رینٹ کا استعمال ہوتا ہے۔

(د) کیپ ٹاؤن کی جمعیت العلماء کے شیخ ابو بکر نجار کی تحقیق وسوال کی بنا پر کیپ ٹائمس نامی اخبار میں ڈاکٹر جے۔ ایف۔ لاگیر نے جو بایو کیمیکل مینوفیکچرنگ فرم کے جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر ہیں، یہ بیان دیا کہ ہماری کمپنی تمام ساؤتھ افریقہ کی واحد رینٹ ساز کمپنی ہے، جو صرف گائے کے بچہ کے پیٹ سے کشید مادہ سے رینٹ بناتی ہے جس میں خنزیر کے

پیٹ کا کوئی جزء نہیں ہوتا ہے۔

تو اب کلام کا ملخص اور سوال یہ ہے کہ محکمہ زراعت واقتصادیات کے ذمہ دار شخص نے بتلایا کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لیے خنزیر کے پیٹ سے کوئی سیال مادہ بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس ملک میں بھی اس کا استعمال ہے یا نہیں اور دیگر تمام بیان دینے والوں نے یہ بتایا کہ اس ملک میں بچھڑے کے پیٹ سے کشیدہ رینٹ یا مصنوعی نباتی رینٹ مستعمل ہے اور نیشنل کوآپر ٹیوڈیر یز کے ذمہ دار اشخاص نے صراحت سے یہ بتلا دیا کہ وہ اب حیوانی رینٹ یعنی بچھڑے کا رینٹ استعمال نہیں کرتے ہیں، وہ اپنی تمام ترفیکٹر یوں میں صرف نباتی رینٹ استعمال کرتے ہیں۔

تو کیا ایسی صورتِ حال میں پنیر کو مشکوک ٹھہرا کر اس کو حرام سمجھا جائے، یا ان ذمہ دار اشخاص کے انکار کرنے کی بنا پر اس کو حلال ٹھہرایا جائے؟

قاسم محمد عفی عنہ (ناظم جمیعۃ العلما نٹال ساؤتھ افریقہ)

الجواب وبالله التوفيق:

سوال نمبر ۲ کا جواب نمبر ا کے ضمن میں آچکا ہے کہ اس کا استعمال جائز ہے۔

جواب نمبر ۳ (الف) خنزیر مثل غلاظت کے ناپاک، یعنی نجس العین وحرام ہے، ذبح کے بعد بھی یہ پاک نہیں ہوتا، اس کے پیٹ سے کشید کیا ہوا کوئی مادہ سیال ہو یا منجمد پاک وحلال نہ ہوگا۔ ناپاک وحرام ہی رہے گا۔ اور اس کا استعمال جس کھانے وغیرہ میں ہوجائے گا وہ بھی ناپاک وحرام ہوجائے گا اور اس کا کھانا اور اس کا استعمال کرنا بھی درست وجائز نہ رہے گا۔ "لأنه نجس العين بمعنى أن ذاته بجميع أجزائه نجسة حياً وميتاً" (۱)۔

البتہ جب تک ناپاک وحرام کی آمیزش کا ثبوت ویقین نہ ہوجائے، اس وقت تک قطعی حرمت کا حکم نہیں دیا جائیگا۔ "إن اليقين لاَ يزول بالشک" (۲) لیکن احتیاط اولی اور بہتر رہے گی مکروہ یا حرام نہ کہہ سکیں گے۔

(ب، ج، د) ان کے اندر درج شدہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مادہ وغیرہ خنزیر کے پیٹ سے کشید کیا جاتا ہے، وہ ٹرنسوال ونٹال اور ساؤتھ افریقہ میں عام طور سے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یا تو گائے کے بچہ کے شکم سے نکالا ہوا رینٹ

۱- شامی ۱/ ۱۳۶۔

۲- الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی، ص، ۵۷، الفن الاول۔

استعمال ہوتا ہے، اس مصنوعی رینٹ کے بنانے میں یا اور کسی طرح پر اگر کسی ناپاک یا حرام چیز کی آمیزش نہیں ہوتی ہے تو یہ نباتی رینٹ بھی بلاشبہ پاک وحلال ہے۔غرض جب پنیر بنانے میں دونوں قسم کے (حرام وناپاک اور پاک وحلال) رینٹ استعمال ہوتے ہیں اور اصل اشیاء میں حلت اور اباحت ہے(۱)، تو جب تک کسی پنیر کے بارے میں یہ بات دلیل سے متحقق نہ ہوجائے کہ اس میں حرام یا ناپاک رینٹ استعمال ہوا ہے اس وقت تک اس پر حرام یا ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگائیں گے۔ ہاں جب یہ دلیل سے یقین ہوجائے اور ثبوت مل جائے کہ اس میں کوئی حرام یا ناپاک چیز ملی ہے جیسے یہ کہ پیکٹ وڈبہ پر ہی لکھا ہو کہ یہ پنیر کسی حرام یا ناپاک چیز سے تیار شدہ ہے تو اس کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے یا مثلاً معتبر شہادت مل جائے کہ اس میں حرام یا ناپاک چیز ملی ہوئی ہے۔

نیز اس سلسلے میں تجارتی اصول کے ماتحت ذمہ دار اشخاص کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا، کیونکہ دنیوی اصول کے مطابق بھی تجارت کو سچائی اور دیانت ہی سے فروغ ہوتا ہے۔اس لیے بھی بغیر وجہ شرعی کے کسی کو جھوٹا ودغاباز سمجھنا یا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔امید کہ اس تفصیل سے اطمینان ہوجائے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

گھی پاک کرنے کا طریقۂ شرعی:

مولانا احمد رضا خاں مرحوم نے اپنے فتاویٰ رضویہ مطبوعہ رضوی پریس بریلی، ص ۷۶ و ۷۷ پر تحریر کیا ہے۔ایک سوال کے جواب میں سوال وجواب بعینہٖ مندرجہ ذیل ہیں:

سوال: گھی گرم تھا، اس میں مرغی کا بچہ گرا اور فوراً مر گیا۔یہ گھی کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: گھی ناپاک ہوگیا، بے پاک کئے اس کا کھانا حرام ہے، پاک کرنے کے تین طریقے ہیں: ایک یہ کہ اتنا ہی پانی اس میں ملا کر جنبش دیتے رہیں، یہاں تک کہ سب گھی اوپر آجائے، پھر اسے اتار لیں، دوسرا پانی اسی قدر ملا کر یوں ہی کریں پھر اتار کر تیسرے پانی سے اسی طرح دھوئیں، اور اگر گھی سرد ہوکر جم گیا ہو تو تینوں بار اس کے برابر پانی ملا کر جوش دیں یہاں تک کہ گھی اوپر آجائے پھر اسے اتار لیں۔

۱- الاصل فی الأشیا ءالإباحۃ، الأشباہ والنظائر مع شرح حموی ۸۷/۱، باب الیقین لا یزول بالشک، الفن الاول (مرتب)۔

اقول: بلکہ جوش دینے کی پہلی ہی بار حاجت ہے، پھر تو گھی رقیق ہوجائے گا اور پانی ملا کر جوش دینا کفایت کریگا۔

"قال في الدر: المدهن يصب عليه الماء فيغلي فيعلو الدهن الماء، فيرفع بشئ هكذا ثلاث مرات، وهذا عند أبي يوسف خلافا لمحمد، وهو أوسع، وعليه الفتوىٰ، كما في شرح الشيخ إسماعيل عن جامع الفتاوىٰ، وقال في الفتاوىٰ الخيرية: إن لفظة فيغلي، ذكرت في بعض الكتب، والظاهر أنها من زيادة الناسخ، فإنا لم نرمن شرط لتطهير الدهن الغليان مع كثرة النقل في المسئلة والتتبع لها إلا أن يراد به التحريک مجازاً، فقد صرح في مجمع الرواية وشرح القدوری أنه يصب عليه مثله ماء ويحرک، فتأمل (ه)۔ أويحمل على ما إذا جمد الدهن بعد تنجسه، ثم رأيت الشارح صرح بذالک في الخزائن فقال: والمدهن السائل يلقى فيه الماء، والجامد يغلى به حتى يعلو الخ "(۱)۔

دوم:

ناپاک گھی جس برتن میں ہے، اگر جمنے کی طرف مائل ہوگیا ہوتو آگ پر پگھلالیں اور ویسا ہی پگھلا ہوا پاک گھی اس برتن میں ڈالتے جائیں، یہاں تک کہ گھی سے بھر کر ابل جائے، سب گھی پاک ہوجائے گا۔" جامع الرموز" میں ہے:"الماء كالماء والدبس وغيرهما فطهارته بإجرائه مع جنسه مختلطاً به"۔

سوم:

دوسرا پاک گھی لیں اور مثلاً تخت پر بیٹھ کر نیچے ایک خالی برتن رکھیں اور پرنالے کے مثل کی چیز میں وہ پاک گھی ڈالیں، اس کے بعد یہ ناپاک گھی اس پرنالے میں ڈالیں یوں کہ دونوں کی دھاریں ایک ہوکر پرنالے سے برتن میں گریں، اسی طرح پاک و ناپاک دونوں گھی ملا کر ڈالیں، یہاں تک کہ سب ناپاک گھی پاک گھی سے ایک دھار ہوکر برتن میں پہنچ جائے کو سب پاک ہوگیا۔" خزائن" میں ہے: "إن كان أحدهما طاهراً والآخر نجساً فصبا من مكان عال فاختلطافي الهواء ثم نزلا طهر كله"۔

پہلے طریقہ میں پانی سے گھی کے کو تین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ دوسرے طریقہ میں ابل کر تھوڑا گھی ضائع ہوجائے گا، تیسرا طریقہ بالکل صاف ہے مگر اس میں احتیاط بہت درکار ہے کہ برتن میں ناپاک گھی کی کوئی بوند نہ پاک سے پہلے پہنچے نہ بعد کو گرے، نہ پرنالے میں بہاتے وقت اس کی چھینٹ اڑ کر پاک گھی سے جدا برتن میں گرے ورنہ

۱- ردالمحتار، باب الانجاس ۱/ ۵۴۳، ۵۴۴، طبع دار الکتب العلمیہ)(مرتب)۔

برتن میں جتنا پہنچا، یا اب پہنچے گا سب ناپاک ہوجائے گا۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا نے جواپنے فتوے میں ایک طریقہ میں ''در''، دوسرے طریقہ میں ''جامع الرموز''اور تیسرے طریقہ میں خزائن کا حوالہ دیا ہے تو کیا وہ واقعہ کے عین مطابق ہے، اور یہ کہ کیا یہ مذکورہ طریقے معتمد علیہا ہیں؟

التبصرة علی الجواب:

پہلے جواب کی تقدیر پر گھی تو پاک ہوجائے گا مگر اس کے مضر ہونے کا اندیشہ ہے، جیسا کہ خود مجیب نے لکھا ہے کہ اس طریقہ سے تین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے عامۃً جوش دینے کو لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ گھی کی مقدار پاک پانی میں گھی ڈال کر جوش دیں بعد جوش کے جب گھی، پانی مختلط ہوجائیں، گھی اوپر سے اتار لیں اور تین بار ایسا ہی کریں، لہٰذا اس جواب نمبر ا کی تعبیر میں سقم ہے اور بالخصوص جب کہ اس طریقہ پر کوئی معتبر وصریح حوالہ نہیں، جو حوالہ ہے وہ نہیں بتلاتا کہ یہ تحریک ٹھنڈے ہی پانی میں ہو۔

دوسرے جواب کی تعبیر میں بھی غلطی ہے، اس لیے کہ جس عبارت (عبارت جامع الرموز) سے استدلال کیا ہے اس میں لفظ ''**یاجرائه مع جنسه مختلطاً به**'' ہے۔ اجراء کے معنی ابلنے کے نہیں آتے، بلکہ بہادینے کے آتے ہیں، اور اس بہادینے (اجراء) کا یہ طریقہ نہیں ہوسکتا جو اس جواب میں مذکور ہے، تیسرا جواب کوئی الگ اور مستقل شکل نہیں ہے، بلکہ وہی ہے جو نمبر ۲ میں ''جامع الرموز'' سے نقل کیا ہے، پھر تیسرے جواب میں جو دو شقیں بیان کی ہیں ان میں پہلی شق میں تعبیر کی غلطی کے ساتھ آپس میں عبارت کے اندر تدافع وتزاحم بھی ہے، اس لیے وہ شق بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے اور دوسری شق بعینہٖ وہی ہے جو جواب ۲ میں ''جامع الرموز'' کی عربی عبارت میں ہے، لہٰذا اس کی دوسری تشریح بھی نافہمی یا غلط فہمی کی بنیاد پر ہے۔

صحیح اور آسان اور بے ضرر طریقہ گھی پاک کرنے کا وہی ہے جو ردالمحتار (۱) وغیرہ فقہاء احناف کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے جس کو بہشتی زیور میں بھی نقل کیا ہے، **فلينظر هناک**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

۱- ''(والدهن يصب عليه الماء فيغلى فيعلو الدهن الماء فيرفع بشئى هكذا ثلاث مرات الخ (شامی ۱/ ۲۲۲، فصل في

انسانی بالوں کی ٹوپی کا حکم:

یہاں بہت سے لوگوں کے سروں پر بال نہیں ہوتے ہیں، اس لیے انسانی بالوں کی طرح ٹوپی بنا کر سر پر رکھتے ہیں، یا سر کے ساتھ منسلک سلائی کر دیتے ہیں جس کی بنا پر یہ معلوم نہیں ہوتا، کہ اصلی بال ہیں یا نقلی، بعض مسلمان یوں کہتے ہیں کہ ہم یہاں کی سردی کی وجہ سے اس طرح کرتے ہیں، جو بندہ کے نزدیک ضروری نہیں، تو ایسا کرنا کیسا ہے، اگر انسانی بالوں کے علاوہ نائلون یا مصنوعی یا حیوانی گھوڑے وغیرہ کے بال سر پر لگائے تو کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

انسانی بال بھی اجزاء انسانی میں سے ہے اور اجزاء انسانی اگرچہ کافر اور غیر مسلم کے ہی ہوں وہ بھی مکرم ومحترم ہوتے ہیں اور ان کا استعمال ان کی توہین ہے اور نا جائز بھی ہے، کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ: "**ولقد كرمنا بني آدم**"(۱)، اور "مراقی الفلاح" میں ہے: "**وجلد الآدمي لحرمته صونا له لكرامته، وإن حكم بطهارته لا يجوز استعماله كسائر أجزاء الآدمي/ ۹۰، (باب الانجاس وتطهیرها)وتحته في الطحطاوي: وجلد الآدمي ولوكافراً كما في القهستاني، فيطهر ولايستعمل لكرامته**"، اور درمختار (۱/ ۳۸ باب المياه) میں ہے: "**فلا يدبغ أى جلد الإنسان لكرامته(الى قوله)حتى لو طحن عظمه في دقيق لم يؤكل في الأصح احتراما، أى لانجاسة**"۔

لہٰذا انسانوں کے بالوں کی ٹوپی بنانا یا ان سے ٹوپی کا کام لینا یا سر کے ساتھ منسلک کر کے سلائی کرنا اور اصلی بالوں کی طرح بنا کر استعمال کرنا خواہ اصلی ونقلی ہونے کا امتیاز ہو یا نہ ہو، غرض کسی طرح بھی ہو، اس کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا اور مذکورہ عذر معتبر نہ ہوگا۔ ہاں خنزیر کے علاوہ اور جانوروں کے بالوں کو یا نائیلون واون یا مصنوعی بالوں کو سردی سے تحفظ کی خاطر ٹوپی ولباس کے طور پر جیسے کنٹوپ، پوستین، کمبل وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں، یہ جائز رہے گا، البتہ ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرنا کہ وہ سر یا داڑھی وغیرہ کے قدرتی بالوں کی طرح غیر متمیز ہو کر نمایاں ہوں منع ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

تطهير الدهن والعسل) والدهن المتنجس يطهر بصب الماء عليه ورفعه عنه ثلاثاً، أو يوضع في إناء مثقوب ثم يصب عليه الماء فيعلو الدهن ويحركه ثم يفتح الثقب إلى أن يذهب الماء وهذا إذا كان مائعاً وأما إذا كان جامداً فيقور"طحطاوى على مراقى الفلاح، ص، ۱۲۷، باب الأنجاس والطهارة عنها ۔ مرتب)۔

۱- سورہ بنی اسرائیل: ۷۰۔

خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کی شرعی حیثیت:

۱-یہاں برش کا کام تقریباً پچاس سال سے ہوتا چلا آرہا ہے جس میں برش کارخانہ دار مسلم اور غیر مسلم بھی ہیں اور آبادی کے تناسب سے پچاس فیصد مزدور اس کام سے وابستہ ہیں۔

۲-برش پینٹنگ خنزیر کے بال اور بھینس وگائے کی دم اور گھوڑے کی دم کے بال سے ملاوٹ کے ساتھ یا خالص خنزیر کے بال سے تیار کیا جاتا ہے، بال کے علاوہ اس میں لکڑی کے ہینڈل وٹین کے خول، برش سیٹنگ چیرا ورلاکھ باہر سپلائی کرنے کے لیے گتے کے ڈبے استعمال ہوتے ہیں۔باہر جن کو سپلائی ہوتا ہے ان میں دکاندار مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔

ہم نے خنزیر کے بال کو برش سے ہٹانے کی ہر چند کوشش کی اور اس کی جگہ نیولوں اور گائے بھینس وگھوڑوں کے بالوں سے تیار کیا گیا، لیکن پینٹس کرنے میں ناکام رہے، آخر مجبور ہو کر پوری طرح خالص خنزیر کے بال یا ملاوٹ سے تیار کرنے پڑے، یہاں کا برش ہندوستان میں پینٹنگ کے لئے خواہ متبرک جگہ ہو یا غیر متبرک، حتی کہ شیر کوٹ کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں ہیر کٹنگ سیلون (نائی صاحبان) اسی خنزیر کے بال کے برش کو داڑھی میں استعمال کرتے ہیں، حتی کہ بسکٹ فیکٹریاں بسکٹوں وڈبل روٹیوں میں گھی، تیل اور چربی وغیرہ بھی اسی خنزیر کے برش سے پینٹ کرتے ہیں۔

۳-خنزیر کے بال جو ہم تک پہنچے ہیں ان کو صاف دھلائی کے ساتھ پاوڈر و کیمیکل کے ذریعہ گرم پانی سے پکا کر پہنچتے ہیں، پھر کاریگروں سے برش تیار کرا کر باہر سپلائی کئے جاتے ہیں۔کام ختم ہونے پر کاریگر مزدور اپنے ہاتھوں کو صابن وغیرہ سے صاف کر لیتے ہیں۔

۴-ہم خدا اور رسول کی عظمت اور خوف خدا دل میں رکھتے ہیں۔اس کاروبار سے دل سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر بہت سے کام کئے، لیکن کسی کام نے ساتھ نہیں دیا اور نقصان ہوا پھر مجبوراً اسی کام کو کرنا پڑا اور کچھ لوگوں نے دوبارہ اسی کام کو کر کے حج بھی کیا، رہن سہن کے مکانات بھی بنائے، ہم سب اس کی کمائی سے بڑھ چڑھ کر زکوۃ نکال کر ضرورت مندوں، بیواؤں، یتیموں ومسکینوں کو کافی دیتے ہیں۔نیز مدرسوں کے چندوں میں بھی دیتے ہیں۔اور کوئی غرض نہیں رکھتے۔

ایک برش آرٹسٹ جاورہ سے تیار ہوتا ہے جس میں نیولے کا بال بھی لگتا ہے، اس کو سائین بورڈ لکھنے کے لیے سپلائی کیا جاتا ہے، کاریگر مدت سے یہی کام کرتے آرہے ہیں، اور برش خنزیر کافی تعداد میں بنا رہے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح برش کا بنانا اور استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس برش کے معاملہ میں تین درجے ہیں: ایک درجہ اس کے استعمال کا ہے، دوسرا درجہ اس کے بنانے کا ہے اور تیسرا درجہ اس کے بنوانے کا ہے، اور تینوں درجوں کے احکام الگ الگ ہیں، تقریب فہم کے لیے پہلے چند فقہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

"وأما الخنزير: فقد روي عن أبي حنيفة رحمه الله أنه نجس العين، لأن الله تعالىٰ وصفه بكونه رجسا فيحرم استعمال شعره وسائر أجزائه، إلا أنه رخص في شعره للخرازين للضرورة، وروي عن أبي يوسف رحمه الله في غير رواية الأصول أنه كره ذالك أيضاً (إلى قوله)وعن محمد رحمه الله أنه لاينجس مالم يغلب على الماء كشعر غيره"(۱)۔

اور ردالمحتار(۱/۱۳۸) میں ہے: **"قوله (وشعر الميتة الخ، وعند محمد لاينجسه أفاده في البحر، وذكر في الدرر أنه عندمحمد طاهر، لضرورة استعماله أي للسخرازين، قال العلامة المقدسي: وفي زماننا استغنو ا عنه، أی فلا يجوز استعماله لزوال الضرورة الباعثة للحكم بالطهارة الخ"**۔

"بدائع الصنائع" کی عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام صاحب علیہ الرحمۃ کے نزدیک خنزیر کے بال وسائر اجزاء نجس ہیں، لیکن امام صاحب علیہ الرحمہ نے بھی خرازین (جوتی سینے والوں) کو جوتا گانٹھنے میں خنزیر کے بال کے استعمال کی اجازت دی ہے اور یہی قول امام ابو یوسفؒ کا بھی ہے، لیکن غیر روایۃ الاصول میں امام ابو یوسفؒ سے مکروہ ہونا بھی نصاً منقول ہے، اور امام محمدؒ سے یہ منقول ہے کہ خنزیر کا بال غیر خنزیر کے بال کی طرح پانی کو ناپاک نہیں کرتا جب تک کہ پانی پر غالب نہ آجائے اور ردالمحتار (شامی) سے معلوم ہوتا ہے کہ خنزیر کا بال پانی وغیرہ میں پڑ جائے تو بغیر وجہ شرعی کے پانی کو ناپاک نہ کہیں گے، اس کی ضرورت استعمال داعی ہونے کی وجہ سے خرازین کے لیے اس کے طاہر ہونے کا حکم ہے اور فی زمانہ جو اس کے استعمال سے بغیر ضرورت استغناء کا حکم ہے وہ حکم اس کی علت کے غلط ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ تحقق علت نہ ہونے کی بنا پر ہے، پس جب کہیں وہ علت محقق ہوجائے گی تو اس کے استعمال وغیرہ کا حکم بھی محقق ہوجائے گا:

اس تمہید کے بعد معاملہ برش کا حکم لکھا جاتا ہے۔

۱- یہ کہ بر تقدیر صحتِ سوال جب یہ برش خنزیر کے بال کے بغیر بھی بنتے ہیں، خواہ ایسے برش کم بنتے ہوں جب بھی

۱- بدائع الصنائع ۱/۶۳۔

چونکہ اشیاء میں اصل حلت واباحت ہے، اس لیے جب تک کسی برش میں خنزیر کے بال ہونے کا یقین نہ ہوجائے اس وقت تک اس کا استعمال جائز رہے گا، اور جس برش میں خنزیر کے بال کا استعمال یقینی طور پر معلوم ہوجائے تو پھر دیکھا جائے گا کہ پوتائی کرتے وقت وہ بال ٹوٹ کرا گر روغن وغیرہ میں نہیں آتے، اور وہ ایسے بال ہیں کہ سائنٹیفک طریقہ سے اس طرح صاف وخشک کرلئے گئے ہیں کہ دسومت ورطوبت بھی قطعاً روغن ومسالوں میں نہیں آتی تو اس کا استعمال بھی بلاشبہ درست رہے گا، اور اگر وہ بال پوتائی کرتے وقت ٹوٹ کر روغن وغیرہ میں گر کر پوتائی کی جگہ آکر چپک جاتے ہیں یا سائنٹفک طریقہ پر ایسے صاف وخشک نہیں کہ دسومت ورطوبت بالکل خشک ہوکر ختم ہوگئی ہو تو ایسے برش سے مسجد کی دیواروں وغیرہ کی پوتائی کرنا درست نہ رہے گا۔ اور نہ کسی ایسی چیز کی پوتائی کرنا جائز رہے گا جس کو پاک وطاہر رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے ان بالوں کے برش کے استعمال کا عدمِ جواز واضح ہوگیا جو اس طرح خشک یا صاف نہ کئے گئے ہوں، یہ تفصیل تو ان برشوں سے متعلق تھی، اب برش بنانے یا بنوانے کا حکم شرعی مذکور ہے:

اگر غیر مسلم مزدور رکھ کر ان سے یہ برش بنوائے جائیں اور وہ مزدور ایسے برش بنا کر دیدیں تو ان کی سپلائی کرنا درست رہے گا، البتہ جس قسم کے برش ہوں ان کو واضح کرنا ضروری ہوگا، یعنی یہ کہہ دینا ضروری رہے گا کہ اس میں خنزیر کے بال کا استعمال نہیں ہوا ہے، یا سائنٹفک طریقہ سے خشک وصاف کئے ہوئے بال لگے ہوئے ہیں۔ یا اس طرح صاف وخشک کئے ہوئے نہیں ہیں تا کہ بوقتِ استعمال دھوکہ نہ ہو، اگر سپلائی کرتے وقت یہ تفصیل نہیں کی گئی تو یہ فعل باعثِ گناہ وخداع شمار ہوکر باعث بربادی کاروبار ہوسکتا ہے۔

اور یہ برش خود بنانے کا حکمِ شرعی یہ ہے کہ اگر خنزیر کے بال نہ لگاتے ہوں جب تو بلاشبہ ایسے برش بنانا جائز رہے گا، اور خنزیر کے بال کا لگانا بغیر ضرورتِ شدیدہ کے جائز نہ رہے گا۔ خاص کر ایسے بال لگانا جو سائنٹیفک طریقہ سے اس طرح صاف وخشک نہ کئے گئے ہوں جس کی وجہ سے دسومت ورطوبت پوتائی کرنے میں روغن وغیرہ تک نہیں آتی۔ ایسے بالوں کا استعمال اگر ضروری ہی ہوجائے تو اس کا ہر سامان الگ رکھنا ہوگا۔ اور کام کر چکنے کے بعد ہاتھ مانجھنا ضروری رہے گا اور کپڑوں وغیرہ پر جہاں اس کی چھینٹیں پڑ گئی ہوں ان سب کو بغیر پاک کئے ہوئے کسی کام کے لیے استعمال کرنا درست نہ رہے گا، بلکہ احتیاط اسی میں رہے گی کہ ایسے برش غیر مسلم مزدوروں سے حسبِ ہدایت بالا بنوائے اور سپلائی کئے جائیں۔ اور یہی حکم ہر مسلم شخص ومزدور کے لیے ہے جو بنوائے یا استعمال کرے۔

پس جن صورتوں میں برشوں کا بنانا یا بنوانا، بیچنا خریدنا جائز ہے ان صورتوں میں اس کا پیشہ حلال وجائز رہے گا اور

اس کا خودکھانا دوسروں کوکھلانا، خیر وخیرات کرنا اور ہر نیک کام میں صرف کرنا درست رہے گا، اور جن صورتوں میں اس کا بنانا یا بنوانا یا خرید وفروخت کرنا ناجائز رہے گا ان صورتوں میں اس کا روپیہ حرام وناجائز رہے گا۔ اور اس کا حکم شرع صرف یہ ہوگا کہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جہاں تک جلد ہو سکے فقراء ومساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے کما في البذل (۱)، اور ثواب کی نیت اس دینے پر نہ کرے بلکہ ایسا کرنا کفر ہے۔

پس ایسی صورت میں صرف ان مدرسوں میں دینا درست رہے گا جن میں نادار طلباء کو کھانا، کپڑا دیا جاتا ہے اور یہ کہہ کر دینا ضروری رہے گا کہ یہ رقم اس قسم کی ہے تاکہ اہل مدرسہ اسی میں اس کو خرچ کریں اور جن مدرسوں میں اس قسم کے مصرف نہ ہوں ان میں دینا یا ان مدرسہ والوں کا جانتے بوجھتے لینا کچھ بھی درست نہ رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

جن مواقع میں ڈھیلا استعمال کرنا متعذر ہو وہاں کیا کرے؟

مدارس دینیہ میں جو سینڑی پاخانے ہوتے ہیں اگر ان میں مٹی کے ڈھیلے استعمال کئے جائیں تو خطرہ واندیشہ ہے کہ بعضوں کی بے احتیاطی سے وہ اندر گھس جائیں اور ٹنکی بھر کے پاخانے خراب ہو جائیں ایسے خطرہ واندیشہ کی بناء پر اگر ان کو ممنوع الاستعمال قرار دیتے ہوئے ٹوائلیٹ پیپر کی اجازت دی جائے تو کیا رفع سنت کے وبال کا مورد بنے گا یا ٹوائیلٹ پیپر کے استعمال سے استنجاء بالحجر کی سنت ادا ہو جائے گی؟ بینوا توجروا۔

عبدالحق غفرلہ (خادم مدرسہ نصیر الاسلام ناظر ہاٹ چاٹگام)

الجواب وبالله التوفيق:

جن مواقع میں کلوخ استعمال کرنا متعذر ہو ان مواقع میں ٹوائیلٹ پیپر سے کلوخ کی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے، جیسے ہوائی جہاز کے سفر میں، باقی اپنے مکانات میں انسان ٹوائیلٹ پیپر استعمال کرنے کے لئے مجبور نہیں ہوتا، عموماً کلوخ میسر ہوتا ہے اور اگر اس کو استعمال کرنے کے بعد رکھنے کے لئے کوئی ٹن (برتن) متعین کر کے رکھا لیا جائے کہ استعمال شدہ

۱- (وأما إذا كان عندر جل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أوحصل له بغير عقد ولايمكنه أن يرد ه إلى مالكه (إلى قوله)، فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء ولكن لايريد بذالک الأجر والثواب، ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه (بذل المجهود/ ۱ ۳۷ كتاب الطهارة، باب فروض الوضو)(مرتب).

کلوخ اس میں رکھے جائیں جس کو بھنگی پھینک دیا کرے گا تو ایسی صورت میں ٹوائیلٹ پیپر، کلوخ کی قائم مقامی نہیں کرسکتا۔

ہاں جہاں کلوخ میسر نہ آئیں جیسے بحالت سیلاب یا ایسے ممالک میں جہاں کلوخ نہیں ملتے وہاں ہوائی جہاز والے استعمال کی طرح گنجائش نکل سکتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ڈھیلے (کلوخ) ٹنکی خراب کردیں گے اور ٹوائیلٹ پیپر سے ٹنکی خراب نہیں ہوگی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مٹی کے ڈھیلے جلد گل کر تہہ نشین ہو جائیں گے، بخلاف ٹوائیلٹ پیپر کے کہ وہ نہ جلدی گلیں گے، نہ سڑیں گے، نہ تہہ نشیں ہوں گے، نہ مٹی بنیں گے، بلکہ پانی پر دیر تک تیرتے رہ کر ٹنکی کو جلد خراب کریں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

حضور اکرم ﷺ کا فضلہ پاک ہے:

کیا حضور ﷺ کا فضلہ (پیشاب و پاخانہ) مذہب حنفی میں پاک اور قابل استعمال (خورد نوش) ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں آنحضرت ﷺ کا فضلہ پاک تھا شامی ج ا میں تصریح ہے، (۲) باقی یہ کیا سوال ہوا کہ قابل استعمال (خورد نوش) کے قابل ہے یا کہ نہیں؟ یہ سوال تو اس وقت پیدا ہو جب آج بھی کہیں موجود ہو۔

لغو سوالات نہیں اٹھانے چاہئے بالخصوص جبکہ موقوف علیہ نجات مسئلہ نہ ہو اس قسم کے سوالات سے فتنے پیدا ہوتے ہیں، بچنا چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

۱- حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے ٹوائلیٹ جلدی نہ گلنے کی جو بات لکھی ہے، وہ پرانی بات ہے، ورنہ اب تو ٹوائلیٹ اور ٹی سو پیپر پانی کے ساتھ ہی گل کر پانی بن جاتے ہیں اور پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں، اس کے برخلاف مٹی تہہ میں جم جاتی ہے، نیز یہ کہ شہروں میں مٹی کے ڈھیلے تو در کنار پتھر بھی میسر نہیں ہوتے، مرتب کے خیال میں ٹوائلیٹ پیپر سے کلوخ والی سنت ادا ہو جانی چاہئے (مرتب)۔

۲- ’’(صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته، وبه قال أبو حنيفة كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخاري للعيني وصرح به البيري في شرح الاشباه، وقال الحافظ ابن حجر تضافرت الادلة على

رنگا ہوا کپڑا پاک ہے یا ناپاک؟

کپڑا رنگ کر پاک کرنا چاہئے یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ سب رنگ ناپاک ہوتے ہیں ان میں شراب ملائی جاتی ہے کیا زید کا کہنا ٹھیک ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سب رنگ ناپاک نہیں ہوتے ہیں (۱)، اور جب تک کسی رنگ کے ناپاک ہونے کا یقین نہ ہوئے اس کا پاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۶/۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

جنبی کا قرآن کو چھونا اور دوسری جگہ لے جانا:

قرآن شریف غسل کی حاجت میں چھوسکتا ہے اور ہاتھ میں لیکر کہیں لے جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جنابت اور حاجت غسل کی حالت میں قرآن پاک پر کپڑا لپٹا ہوا ہو تو اس کے اوپر سے چھوسکتے ہیں (۲)، اور ساتھ میں لے جا بھی سکتے ہیں بغیر کسی حائل کے جنابت کی حالت میں اسی طرح بے وضو کی حالت میں بلا کسی حائل کے نہیں چھوسکتے فرق یہ ہے کہ بے وضو کے زبان سے بلا قرآن پاک چھوئے ہوئے پڑھ سکتا ہے اور حاجت غسل کی حالت میں بلا غسل کئے زبان سے بھی نہیں پڑھ سکتا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲/۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ذلک وعد الائمة ذالک من خصائصه صلی الله علیه وسلم) (شامی ۱/ ۲۳۳، فیض القرآن) (مرتب)۔

۱- الاصل ان ماثبت بالیقین لایزول بالشک (قواعد الفقہ لسید عمیم الاحسان ص ۱۱، مکتبہ دار الکتاب دیوبند)۔

۲- الحرمة مس المصحف لایجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلاف متجاف عنه کالخریطة (فتاوی

استرہ کے ذریعہ ڈاڑھی بنوانے سے کیا چہرہ ناپاک ہوجاتا ہے؟

استرے سے ڈاڑھی منڈوانے کے بعد کیا چہرہ ناپاک ہوجاتا ہے کیا اس چہرہ کو دومرتبہ دھونا ضروری ہوتا ہے یا صرف چہرہ پر لگایا ہوا صابن چھڑانا ضروری ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ناپاک پانی یا ناپاک کوئی چیز چہرہ پر لگائی ہے تو ناپاک ہوگا اور دھونا بھی ضروری ہوگا ورنہ نہیں، لیکن ڈاڑھی منڈانا حرام ہے(۱)۔

"قوله (وأما الأخذ منها الخ) بهذا وفق في الفتح بين ما مروبين مافي الصحيحين عن ابن عمر عنه صلى الله عليه وسلم احفوا الشوارب واعفوا اللحى قال: لأنه صح عن ابن عمر راوی هذا الحديث ...... وعن النبي صلى الله عليه وسلم يحمل الاعفاء على اعفاء ها عن أن يأخذ غالبها أو كلها كما هو فعل مجوس الأعاجم من حلق لحاهم" (۱)۔

"والأخذ من اللحية وهو دون ذالک كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال لم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم" (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۹/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

بڑے کمرے میں بیت الخلاء بنوانا:

دیہات میں (گاؤں میں) اگر گھر بڑا ہو، پھر اس گھر کے ایک کمرے میں بیت الخلاء وغیرہ بنائیں تو کوئی حرج ہے یا نہیں؟ جبکہ اور کہیں جانے سے تکلیف ہوگی اور پردہ وغیرہ کا انتظام بھی نہیں، اس بارے میں بیان فرمائیں۔

ہندیہ ۱/۸ ۳، رشیدیہ، پاکستان)۔

۱- عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم احفوا الشوارب واعفوا اللحى (مسلم شریف ۱/۱۲۹ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

۲- ردالمحتار علی الدر ۳/۹۸ ۳، مکتبہ زکریا۔

۳- الطحطاوی علی المراقی رص ۲۷ ۳ مطبعہ سلیمان مصطفی ماموددمشق۔

الجواب وبالله التوفيق:

گھر کے اندر ایک کمرہ میں عورتوں کے لئے بیت الخلاء بنالینا ضروری ہے، بلکہ امریکی پاخانہ یا اس قسم کی کوئی اور باتھ روم وغیرہ بنالینا زیادہ بہتر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا ہو اس کا استعمال:

عام طور سے کلہو میں کتے برتن میں منھ ڈال کر خراب کر دیتے ہیں لیکن لوگ اس کو استعمال کر لیتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

بغیر پاک کئے اس کو استعمال کرنا درست نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۴ھ

حالت حیض میں بیوی سے مجامعت:

اگر کوئی شخص حالت حیض میں اپنی بیوی سے مجامعت کرے اور اس کو شیوہ بنائے تو اس پر حکم شرع کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

شیوہ بنالینا استحلال کو مستلزم نہیں، بلکہ اصرار کو مستلزم ہے جو گناہ کبیرہ ضرور ہے، مگر کفر نہیں ہے اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے تفریق بین الزوجین کا حکم نہیں ہے، محض توبہ اور استغفار کافی ہے، اور اگر استحلال کو مستلزم کر بھی لیں جب بھی

۱- "وسور الكلب والخنزير وسائر سباع البهائم نجس باتفاق علمائنا" (حلبی کبیر فصل فی الآسار ۱۶۷، مکتبہ سہیل اکیڈمی لاہور، وقال في البحر الرائق: ولنا قوله صلى الله عليه وسلم "يغسل الاناء من ولوغ الكلب ثلاثا" روى عن أبي هريرةؓ فعلا وقولا. مرفوعا وموقوفاً الخ (البحر الرائق کتاب الطہارۃ ۱/ ۲۲۵، مکتبہ زکریا، وقال الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح، یندب عندنا التسبیع وکون إحداهن بالتراب، طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱۸، فصل فی بیان احکام السور) (مرتب)۔

تفریق بین الزوجین کا حکم نہیں ہے، مستحل الوطی فی حالتہ الحیض مفتی بہ قول میں کافر نہیں ہوتا ہے، کما صرح بہ فی "الطحطاوی علی مراقی الفلاح"(۱)۔

(ص ۷۴ في باب الحيض والنفاس):" وصحح صاحب الخلاصة عدم كفره، وقال في الفصل الثاني من ألفاظ الكفر: أن من اعتقد الحلال حراماً أو علی القلب يكفر إذا كان حراماً لعينه وثبت حرمته بدليل قطعي، أما إذا كان حراماً لغيره بدليل قطعي أوحراماً لعينه بخبر الأحاد لايكفر، إذا اعتقده حلالاً ،فعلی هذا لايفتی بكفر مستحله، لأن حرمته لغيره وهو الأذی"۔

لہذا تکفیر یا تفریق کا فتوی غلط ہے۔ بلکہ صورت مسئولہ میں نکاح علی حالہ باقی ہے، البتہ شخص مذکور کو لازم ہے کہ وہ اس شنیع حرکت سے توبہ کرے اور باز آجائے اور اس جرم کے صدور کی وجہ سے کچھ مال تصدق کردے تو بہتر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

فرج میں مانع حمل بعض دواؤں کے استعمال کا حکم:

مسئلہ یہ ہے کہ ایک دوائی ہے اور وہ دوائی ایسی ہے کہ اگر اس کو اپنی فرج کے اندر استعمال کرے تو اس کو تین سال تک حمل قرار نہیں پاتا، اب آیا ایسی دوائی کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر اس دوائی کا استعمال کرنا جائز نہیں تو اس کو لگا کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

ضرورت شرعیہ جس کا اعتبار محقق اطباء نے کرلیا ہو اس ضرورت شرعیہ واقعیہ کے تحت اس دوا کا استعمال کرنا جائز ہو جائے گا، ورنہ اس کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، اس کے استعمال کے جواز وعدم جواز ہر دو صورت میں اس کو لگا کر نماز کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر محض وہ دوا یا رطوبت فرج میں ملی ہوئی باہر خارج ہوتی ہو تو مثل پیشاب وغیرہ ناپاکی کی طہارت کے جب تک استنقاء واستنجاء کے ذریعہ طہارت حاصل نہ کرلی جائے وضوء ونماز کچھ صحیح نہ ہوگا، پورے ممقیہ

۱- طحطاوی علی المراقی ص ۷۴ مطبع سلیمان مصطفی (دمشق)۔

واستنقاء واستنجاء کے بعد وضو کر کے نماز پڑھنا جائز رہے گا۔ بغیر اس کے نماز پڑھنا جائز نہ رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۱۲/ ۱۴۱۰ھ

باب الوضوء

ٹوتھ پیسٹ یا برش کا استعمال مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے؟

مسواک کی جگہ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کیا جائے تو کیا یہ مسواک کے قائم مقام ہوگا، اور مسواک کا ثواب بھی ملے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کچھ دانت وغیرہ گر جانے کی وجہ سے اگر مسواک کا استعمال نہ ہوسکے تو کسی بھی منجن یا پیسٹ وغیرہ سے بوجہ مجبوری مسواک کا ثواب ملے گا، ورنہ مسواک کا ثواب نہ ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

مصنوعی اعضاء یا پلاسٹر اور زخم پر پٹی ہونے کی صورت میں غسل اور وضو کے احکام:

۱-مصنوعی دانتوں اور دانتوں کے علاوہ دیگر مصنوعی اعضاء کی صورت میں وضو اور غسل کے کیا احکام ہوں گے؟

۲-اسی طرح اگر کوئی شخص پلاسٹر کرائے ہوئے ہے یا زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہے، ایسا شخص وضو اور غسل کس طرح کرے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ظاہری اعضاء جسم میں جو مصنوعی اعضاء لگے ہوئے ہوں تو غسل جنابت کرنے میں ان سب کا نکالنا ضروری

رہے گا جن کے نکالنے سے نہ نقصان ہو اور نہ کسی قسم کی مجبوری ہو، ورنہ بغیر نکالے غسل کرلینا درست رہے گا، اور یہی حکم ان اعضائے ظاہری کا جو کسی عضو وضو پر لگے ہوئے ہوں نکالنے اور لگانے میں ہے، اسی قاعدۂ کلیہ پر تمام جزئیات کے احکام نکل آئیں گے(۱)۔

۲-اسی مذکورہ بالا ضابطۂ شرعیہ سے پلاسٹر کئے ہوئے حصہ کا، نیز زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو اس کا حکم بھی نکل آئے گا کہ جس وقت پلاسٹر کھولنے میں یا پٹی کے کھولنے میں ضرر کا ظنِ غالب ہو تو بغیر کھولے ہوئے غسل و وضو کرلے ورنہ کھول کر کرلے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

وضو کی دعا:

وضو کے اندر کونسی دعا حدیث سے ثابت ہے ہم نے پڑھا ہے کہ وضو کے بعد سورہ انا انزلنا پڑھنے پر چالیس ۴۰ سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟

الجواب وبالله التوفيق:

وضو میں ابتداء "بسم الله العلي العظيم، والحمد لله على دين الاسلام" پڑھنا(۳) اور اعضاء وضوء کو دھوتے وقت "أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله" اور وضو سے فارغ ہونے کے بعد "اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين" پڑھنا(۴) مسنون ہے، جس کی

۱- اس کی واضح مثال علامہ شامی کا وہ جزئیہ ہے جس میں موصوف فرماتے ہیں کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس طرح کے مصنوعی دانت لگوانے یا دانتوں کو سونے، چاندی کے تاروں سے باندھنے کی اجازت دی ہے، کما قال تحت قولہ: (وكذا الإناء المضبب أي الحكم فيه كالحكم في المفضض، يقال باب مضبب: أي مشدود بالضباب وهي الحديدة العريضة التي يضبب بها وضبب أسنانه بالفضة إذا شدها بها" (فتاویٰ شامی ۳۱۹/۵، کتاب الحظر والاباحۃ)(مرتب)۔

۲- (ويجوز المسح على الجبائر إذاكان يضره المسح على الجراحة ويمسح على العصابة كلها سواء كان تحته جراحة أولا، لأن العصابة لاتعصب على وجه يأتي على موضع الجراحة الخ (فتح القدیر ۱۴۰/۱، باب المسح علی الخفین)(مرتب)۔

۳- الدرالمختار علی الرد ۱۰۱/۱، مطبع عثمانیہ۔

۴- شامی ۱۱۸/۱، مطبع عثمانیہ۔

حدیث میں بہت زیادہ فضیلت ہے۔

حدیث میں لکھا ہے کہ اس شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جاتے ہیں جس میں چاہے داخل ہوجاوے اور اگر دھیان سے دو رکعت تحیۃ الوضوء پڑھ لے جو کہ مستحب ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو تو گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو:

"قال في الحلية عن البراء بن عازب رضي الله تعالىٰ -عن النبي ﷺ قال: ما من عبد يقول: حين يتوضأ "بسم الله، ثم يقول بكل عضو: أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمداً عبده و رسوله، ثم يقول حين يفرغ: اللهم أجعلني من التوابين وأجعلني من المتطهرين إلا فتحت له ثمانية أبواب الجنة يدخل من أيها شاء، فان قام من وقته ذلك فصلى ركعتين يقرأ فيهما ويعلم ما يقول إنفتل من صلاته كيوم ولدته أمه، ثم يقال له إستأنف العمل (رواه الحافظ المستغفري، وقال: حديث حسن "(۱)۔

اس کے علاوہ ہر عضو کے دھونے کے وقت کی دعائیں بھی منقول ہیں ان کا پڑھنا مستحب ہے وضوء کے بعد انا انزلنا کا پڑھنا آداب وضوء میں سے لکھا ہے: "ومن الآداب إلى أن قال وقراة سورة القدر"(۲)۔

انا انزلنا کے پڑھنے پر چالیس سال کے گناہ معاف ہونے کی حدیث ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، البتہ حدیث میں بعد وضو کے انا انزلنا پڑھنے کی یہ فضیلت لکھی ہے کہ جس نے ایک مرتبہ انا انزلنا پڑھی اس کا شمار صدیقین میں ہوگا اور جس نے دو مرتبہ پڑھی اس کا نام شہداء کے رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے اور جس نے تین مرتبہ پڑھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ فرمائیں گے(۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- شامی ۱/۸۱، مطبع عثمانیہ۔

۲- الدرالمختار علی ہامش ردالمختار ۱/۹۷۔

۳- وقرائة سورة في ليلة القدر مرة واحدة كان من الصديقين ومن قرأها مرتين كتب في ليلة ديوان الشهداء ومن قرأتها ثلاثاً حشرهٗ الله محشر الأنبياء (مراقی الفلاح علی ہامش الطحاوی ۳۲)(مرتب)۔

ہاتھ پاؤں سے معذور طہارت میں کس سے مدد لے؟

ہاتھ پاؤں سے معذور شخص ایک عورت سے یا مرد سے آب دست وموئے زیر ناف کٹوانے اور پاکی وطہارت کے سلسلہ میں دوسروں سے تعاون لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر تعاون لے سکتا ہے یا لے سکتی ہے تو کس سے؟

الجواب وبالله التوفيق:

موئے زیر ناف اگر بال صفا صابن وغیرہ کوئی چیز لگا کر بلا تعاون صاف کرا سکتا ہو تو صاف کرے، ورنہ استنجاء وطہارت کے طریقہ سے بیوی سے یہ کام لے لے۔ اور عورت ہو تو اپنے شوہر سے یہ کام لے لے۔ اگر یہ دونوں نہ ہوں تو مرد کسی عورت سے نکاح کر کے اس کے ذریعہ سے یہ کام لے اور عورت کسی مرد سے نکاح کر کے کام لے لے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی مرد مرد کے لئے ہاتھ میں دستانہ باندھ کر کلوخ سے پہلے مبرز صاف کرے پھر پانی سے طاہر کر لے اور بیٹا پوتا نواسہ کو تقدیم ہوگی اور عورت کے لئے بیٹی پوتی نواسی ہوں تو ان سے یا بہو سے، ورنہ پھر محرم عورت سے اور پھر کسی بھی عورت سے یہ کام لے لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اذان کے وقت وضو کرتے ہوئے وضو کی دعاء پڑھنے کا حکم:

۱-وضو کرتے وقت اگر اذان ہو رہی ہو تو کیا جو دعائیں وضو کے عضو دھونے کے وقت حضور ﷺ سے منقول ہیں وہ پڑھنی چاہئیں؟ یا اذان کا جواب دینا چاہئے؟

۲-کیا تصویر (جاندار) کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے، اگر جاندار کی تصویر نکلی ہوئی نہ ہو، یعنی سامنے نظر نہ آتی ہو، لیکن کسی طرح چھپی ہوئی ہو تو ایسی تصویر دیکھنا بھی گناہ ہے (مثلاً کسی کتاب کے اندر تصویر کا ہونا اخبار کے اندر کے ورقوں پر جاندار تصویر کا ہونا وغیرہ)۔

۳-انگریز لوگ جب ان کی کرسمس ہوتی ہے تو مسلمان کے گھر میں بھی اکثر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں تو کیا مسلمان کو بھی (اخلاقاً) جن انگریز نے اس کے گھر کارڈ بھیجا ہے کرسمس کارڈ بھیجنا جائز ہے؟

۴-جب اذان میں مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو منہ کب پھیرے اور کہاں تک تفصیل سے لکھیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-بہتر ہے کہ کلمات اذان کا جواب دیا جائے۔

۲-عزت وعظمت ومحبت یا رغبت وشہوت یا بدنگاہی کے جذبہ سے دیکھنا منع ہے۔

۳-ہاں اپنے عید وغیرہ خوشی کے موقع میں اخلاقاً مسلمان بھی بھیج سکتے ہیں۔

۴-جب حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہنا شروع کرے تو منہ پھیرے اور پورا چہرہ کندھے تک پھیرے، فقط

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹۶/۱/۲۵ ۱۳ھ

۱-جنازہ کے لئے کئے گئے وضو سے نماز فرض کی ادائیگی:

زید نے جنازہ کی نماز کے لئے وضو کیا پھر اسی وضو سے مغرب کی نماز پڑھی آیا اس وضو سے نماز ادا ہو جائے گی یا دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

۲-غسل کے وضو سے فرض وواجب کی ادائیگی:

غسل کے وضو سے فرض نماز بلا کراہت جائز ہے یا کہ نہیں اس طرح عیدین کی نماز کے وضو سے فرض نماز ادا ہو جائے گی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

۱-دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں اس وضو سے ہر نماز پڑھ سکے گا۔

۲-بلا شبہ جائز ہے اور یقیناً ادا ہو جائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸۵/۷/۱۲ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "لایستحب وضوء ان للغسل اتفاقا، قال العلامة نوح آفندی: بل ورد مایدل علی کراهية، اخرج الطبرانی فی الأوسط عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ من توضأ بعد الغسل فليس منا" (شامی ۱/۱۱۷، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

نماز جنازہ کے بعد تازہ وضو ضروری ہے یا نہیں؟

مورخہ ۴/رمضان کو ایک میت کے وارث نے آکر مسجد میں بیان کیا کہ ہم فلاں شخص کی میت لائے ہیں، اس لئے میت کی نماز پڑھا دی جائے ہم میت کو دفن کرنے بھی لے جائیں گے، ورنہ لوگ پھر دفن میں نہ جائیں گے اور یہ میت کو رات بھر گھر میں نہیں رکھ سکتے ہیں جس وقت وہ شخص مسجد میں آیا اس وقت تراویح شروع ہو کر صرف دو رکعت ہوئی تھی، چنانچہ اس وقت مسجد کے باہر جا کر امام اور دیگر نمازیوں اور شرکاء نے نماز جنازہ پڑھی اور بعد نماز جنازہ شرکاء جنازہ اور کچھ مقتدی میت لیکر قبرستان چلے گئے امام مسجد میں آکر تراویح شروع کر دی اور بعد تراویح وتر اور نفل پڑھ لیئے۔

مطلع فرمائیے کہ امام اور مقتدیوں کو بعد نماز جنازہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھانا اور پڑھنا تھا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

امام نے صحیح عمل کیا اس کو یہی کرنا چاہئے تھا، بعد نماز جنازہ تازہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں، نماز جنازہ سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے، یہ غلط اور جاہلانہ باتیں مشہور ہو گئی ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

وضو کا مسئلہ:

اگر وضو کرتے وقت ایک عضو باقی رہ جائے اور پانی قریب میں بھی نہ ملے تو اس وقت کیا کیا جائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب پانی کم ہونے کا اندیشہ ہو تو شروع وضوء سے ہی کفایت کر کے وضو کفایت یا وضو فرض پر قناعت کرے، بہر حال اگر ایک عضو دھونے سے قبل پانی بالکل ختم ہو جائے اور حسب قاعدہ شرع پانی ملنے کی توقع نہ ہو تو تیمم کر لیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۴ھ

۱- لوکان مع المحدث مایکفی بغسل بعض اعضاء الوضوء فإنه تيمم من غير غسله، هكذا في شرح الوقاية (ہندیہ باب التیمم، الفصل الثالث فی المتفرقات ۱/۳۰، دارالکتاب) (مرتب)۔

نائیلون یاسوتی موزوں پرمسح درست ہے یانہیں؟

نائیلون، کپڑے کے موزوں پرمسح درست ہے یانہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جوازمسح علی الخفین میں اصل خفین ہیں، اورخفین چمڑے کے موزوں کا نام ہےاوریہ حکم غیرمدرک بالقیاس ہے، اس لیےقیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ غیر چمڑے کے موزوں پربھی مسح جائز ہی نہ ہو،لیکن قیاس خفی اوراستحسان کی مدد سے غیر چمڑے کے موزوں پربھی (خواہ نائیلون ہو یاسوتی وغیرہ ہو) جن میں خفین کےخصوصی اوصاف واحوال پائے جاتے ہوں، ان پربھی جوازمسح کی گنجائش نکلتی ہے،اوروہ خصوصی احوال واوصاف یہ ہیں کہ:

''خفین ساتر للقدمین مع الکعبین'' ہوتا ہےاورعضومستورکا کوئی حصہ اوپر سےنظرنہیں آتا،اورمسح کی تری اندرحصہ تک نہیں پہنچتی،اوربغیرجوتا پہنےاوربغیرباندھےہوئے چلا جائےتومیل دومیل اس طرح چل سکتے ہیں کہ نہ تو وہ کٹے گااورنہ ساق سے نیچےاترے گا۔

پس جوموزہ غیرچمڑے کا خواہ نائیلون کا ہوخواہ سوتی یااونی ہو۔ان اوصاف کا حامل ہویعنی اگراتنا موٹا ہو کہ مسح کی تری جسم تک نہ پہنچے،اوراتنا مضبوط ہو کہ بغیرجوتا پہنےاوربغیرباندھےہوئےمیل دومیل چلےتو نہ کٹے،اورنہ پیر سے نکلےتواس پرمثل خفین کےمسح جائزرہےگا(۱)۔

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور

۱- ''(ولا يجوز المسح على الجوربين عند أبي حنيفة رحمه الله إلا أن يكونا مجلدين أو منعلين، وقالا: يجوز إذا كانا ثخينين لايشفان لماروي أن النبي عليه السلام مسح على جوربيه، ولأنه يمكنه المشي فيه إذا كان ثخينا وهو أن يستمسك على الساق من غير أن يربط بشئي فأشبه الخف، (إلى قوله)وعنه أنه رجع إلى قولهما وعليه الفتوى(ہدایہ اولین/۶۱،باب المسح علی الخفین)،لاَ شك أن المسح على الخف على خلاف القياس، فلا يصح إلحاق غيره به إلاّ إذا كان بطريق الدلالة وهو أن يكون في معناه، ومعناه الساتر لمحل الفرض الذى هو بصدد متابعة المشي فيه في السفر وغيره للقطع بأن تعليق المسح بالخف ليس لصورته الخاصة بل لمعناه للزوم الحرج في النزع المتكرر الخ'' (فتح القدیر مع العنایہ ۱/۱۰۹،کتاب الطہارۃ،مرتب)۔

انجکشن لگوانا ناقض وضو ہے یا نہیں؟

انجکشن لگوانا یا بدن میں دوا، خون، گلوکوز چڑھوانا ناقضِ وضو ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ان چیزوں کے استعمال سے خون یا پیپ وغیرہ کچھ بدن سے نہ نکلے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اس لیے کہ ناقض وضو خروجِ نجاست ہے(۱)، اور وہ یہاں نہیں پایا گیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ریح خارج ہونے پر وضو کرنے کا حکم کیوں ہے؟

ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ریح خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن ایک بہت ہی تعلیم یافتہ غیر مسلم کا سوال ہے کہ ریح خارج ہونے پر آپ وضو ہی کیوں کرتے ہیں، آبدست کیوں نہیں کرتے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خروج ریح میں وضو کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس سے ریح نکل کر بدن کو ناپاک کر دیتی ہے اور اس نجاست کو دور کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ سوال پیدا ہو کہ پاخانہ کے مقام پر تو ضرور ہی لگی ہوگی، پھر اس کو دھونے کا حکم کیوں نہیں ہے؟ بلکہ یہ امر تعبدی ہے اور اس کی وجہ دوسری ہے اور حکم خداوندی ہے، اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ پاخانہ پیشاب وغیرہ (غلاظت) ہر وقت ہی رہتی ہے، اور جب تک وہ غلاظت اپنے محل و مستقر میں رہتی ہے اس وقت تک اس آدمی کو نہ تو کوئی ناپاک کہتا ہے اور نہ کسی عضو کے دھونے وغیرہ کا حکم دیتا ہے، اور جب وہ غلاظت اپنی جگہ و محل و ظرف سے نکل کر

۱- ’’وينقضه خروج كل خارج نجس منه أى من المتوضى الحي معتاد. أولا، من السبيلين أولا إلى مايطهر‘‘ (الدرالمختار علی ہامش الشامی ۱/ ۹۰، نواقض الوضوء) لیکن اگر انجکشن کے ذریعہ خون بدن سے نکالنا مقصد ہو تو یہ ناقض وضو ہے، اس کی نظیر یہ جزیہ ہے: ’’القراد إذا مص عضو انسان فامتلاء دما إن كان صغيراً لاينقض وضوه كما لو مصت الذباب أوالبعوض، وإن كان كبيرا ينقض، وكذا العلقة إذا مصت عضو إنسان حتى امتلأت من دمه انتقض وضوءه‘‘ (فتاوی عالمگیری ۱/ ۶، کتاب الطہارت)۔

جسم سے باہر آجاتی ہے تو فوراً دھونے اور پاک کرنے کا تقاضا ہوجاتا ہے اور طبیعت سلیمہ دھوتی بھی ہے، ورنہ سب کو نجس وناپاک قرار دیتی ہے اور ناپاک وگندہ تصور کرتی ہے اور اس سے طبیعت منقبض رہتی ہے، پس ریح خارج ہونے میں اگر چہ کوئی غلاظت وغیرہ مثلاً پیشاب پاخانہ خارج نہ ہو، مگر وہ ریح پاخانہ کے محل ومستقر وظرف سے نکل کر باہر آتی ہے اور کچھ نہ کچھ اثر غلاظت کا لیکر آتی ہے، جیسا کہ اس کی بدبو وغیرہ سے اندازہ ہوجاتا ہے اور اس سے طبیعت سلیمہ کچھ اثر انداز بھی ہوجاتی ہے، اور کچھ انقباض وتکدر بھی بسا اوقات طبائع سلیمہ میں پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے عقل سلیم کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جب ریح خارج ہو تو اسی وقت فوراً آب دست بھی لے اور ہاتھ منہ دھوکر تکدر طبعی وانقباض بھی دور کرلیا جائے، اور اپنی بشریت کو اعلیٰ ومرتفع کرلیا کرے، مگر چونکہ اس میں عام طبائع پر تنگی واقع ہوتی، اور ناپاکی کسی جگہ لگی نہیں ہوتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بشری کمزوری پر نظر فرماکر اور شفقت کرتے ہوئے یہ حکم تطہیر وتنظیف کا نہیں دیا۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ کم از کم جب میرے دربار میں حاضری دینا ہو اور نماز کے لئے آنا ہو، تو وہ بھی چونکہ میرے دربار کی حاضری ہے اس وقت کم از کم وضو، یعنی ایک خاص طریقہ سے ہاتھ منہ، پیر وغیرہ دھوکر آیا کرو، اس سے ہم وہی انشراح دیں گے جو فوراً پوری تطہیر سے تم حاصل کرتے، بلکہ بنظر شفقت مزید یہ بھی آسانی فرمادی کہ اگر تم پہلے سے وضو کرچکے ہو تو اگر چہ اس سے نماز بھی پڑھ چکے ہو، وہ بھی کافی قرار دے لیں گے، اس کے علاوہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جو صرف اللہ کے علم میں ہیں، اور بہت سی حکمتیں علماء نے بیان بھی کی ہیں، مثلاً اس عمل سے صفت ملکوتیت بھی پیدا ہوگی اور ملائکہ سے قربت ومناسبت بھی پیدا ہوگی، جو باعث قرب خداوندی ہوگا، وغیرہ وغیرہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۷/۹۵ ۱۳ھ

خروج ریاح کے مریض کے لئے وضو ونماز کا حکم:

ایک شخص عرصہ ۱۷۔۱۸ سال سے ریاحی مریض ہے جس کی وجہ سے وضو ایک بار کرنے کے بعد فوراً یا کچھ دیر بعد یا عین نماز میں رکوع وسجود کے وقت ساقط ہوجاتا ہے اگر ریاح کو روکا جاتا ہے تو مزید حبس ریاح سے اور دیگر امراض کا اندیشہ ہے۔ ایسی صورت میں بار بار وضو کرنا بھی بے سود ہے کیونکہ پھر ساقط ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، عموماً مغرب اور عشاء میں صرف ایک وضوء سے پوری نماز مشکل ہے، نیز دوبارہ وضو کرنے سے جماعت کے آداب اور تسلسل میں فرق پڑتا ہے، ایسی مجبوری کی حالت میں صرف ایک بار کر کے پوری نماز ادا کی جاسکتی ہے اور درمیان میں کسی بھی وقت وضو کا ساقط ہونا مرض سے قابل

معافی ہوسکتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر آپ کے خروج ریح کا مرض ایسا ہے کہ کوئی وقت نماز کا پورا اس طرح نہیں گذرتا ہے جس میں آپ وضو کر کے نماز پڑھ سکیں اور یہ مرض پایا جاتا ہے تو آپ شرعاً معذور ہیں اور بقائے عذر کے لئے ہر وقت میں ایک آدھ مرتبہ بھی یہ مرض (خروج ریح) پایا جانا کافی ہے، تو آپ معذور رہیں گے اور پورے وقت کے لئے آپکو ایک ہی وضو کافی رہے گا وقت بھر یہ وضو خروج ریح سے نہیں ٹوٹے گا جتنی نمازیں فرض سنت نفل تراویح آپ چاہیں پڑھیں، البتہ اگر خروج ریح کے علاوہ اور کوئی دوسرا ناقض پایا جائے گا تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹے گا، خروج ریح سے نہیں ٹوٹے گا، جب ایک وقت نماز کا ختم ہو جائے اور دوسرا شروع ہو تو پھر سے نیا وضو آپ کر لیں۔ چاہے خروج ریح بعد وضو کے نہ ہوا ہو، کیونکہ معذور کے حق میں وقت کا نکلنا اور داخل ہونا ہی ناقض وضو کے حکم میں ہے، مثلاً آفتاب غروب ہونے سے پہلے آپ نے وضو کیا تو یہ وضو عصر کے وقت میں ہوا اور عصر کے ہی وقت بھر رہے گا، جب آفتاب غروب ہوا وقت عصر ختم ہوا ساتھ ساتھ یہ وضو بھی ختم ہوا اب مغرب کا وقت شروع ہو گیا اب اس وقت کے لئے ایک جدید وضو کر لیجئے اور عشاء کا وقت ہونے تک جتنی نمازیں چاہئیں اسی وضو سے جس طرح وقت بھر جتنی نمازیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں مس مصحف وغیرہ سب کر سکتے ہیں (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

آنسو نکلنے سے وضو کا حکم:

وضو کے بعد کسی جذبہ کے تحت آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے تو ایسی حالت میں وضو باقی رہے گا یا کہ ٹوٹ جائے گا؟

۱- ”ومن به عذر كسلسل بول أو استطلاق بطن) وانفلات ريح ورعاف دائم وجرح لايرقأ ولايمكن حبسه بحشو من غير مشقة ولابجلوس ولا بالايماء في الصلوة فبهذا يتوضئون (لوقت كل فرض) لا لكل فرض ولا نفل ...... (ويصلون به) اى بوضوء هم في الوقت (ماشاء وامن الفرائض) اداء للوقتية وقضاءء لغيرها“ (مراقی الفلاح ۷۲ دار الکتب العربیۃ الکبری بمصر)(مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

باقی رہے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان مفتی دارالعلوم دیوبند

حافظ قرآن ریاح کا مریض ہو تو وہ کیا کرے؟

سوال: گذارش ہے کہ مجھے ریاح بہت آتی ہے اور میں قرآن کا حافظ ہوں رمضان میں تراویح پڑھانے میں پانچ چھ ٦ دفع روزانہ ریح خارج ہوجاتی ہے بار بار نیت توڑنے پر لوگوں میں بدنامی ہوجائے گی اور کوئی سنانے والا بھی نہیں ہے، اسی طرح میں ایک وضو پر پوری تراویح پڑھا دیتا ہوں جبکہ دس پانچ منٹ سے زیادہ ریح نہیں رکتی ہے اگر اس طرح نہ پڑھایں تو قرآن پاک رہ جائے گا میں بہت پریشان ہوں کیا کروں؟

دریافت ہے کہ قرآن پڑھانا بند کردوں یا اسی طرح پڑھاتا رہوں؟

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال آپ شرعاً ایسے معذور نہیں ہیں کہ محض ایک وضو سے وقت بھر نماز پڑھتے رہیں، خواہ ریح خارج ہوا کرے۔

اور آپکے پیچھے تمام مقتدیوں کی جنھوں نے ریح خارج ہونے پر نمازیں پڑھی ہیں کوئی نماز نہیں ہوگی اور جو پڑھی ہیں وہ نہیں ہوئیں۔

آپ قطعاً نماز پڑھانا ترک کردیں اور جتنی نمازیں اس طرح ریح خارج ہونے کے بعد پڑھائی ہوں اعلان کردیں کہ وہ نمازیں دہرالیں، ورنہ سب کا گناہ آپ پر ہوگا(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

۱- مراقی الفلاح ۷۲، دارالکتب العربیۃ الکبری مصر۔

بغیر وضو قرآن پڑھنا:

بغیر وضو قرآن مجید کھول کر پڑھ بھی سکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جنابت اور حاجت غسل کی حالت میں قرآن پاک پر کپڑا لپٹا ہوا ہو تو اس کے اوپر سے چھو سکتے ہیں (۱) اور ساتھ میں لے جا بھی سکتے ہیں بغیر کسی حائل کے جنابت کی حالت میں اسی طرح بے وضو کی حالت میں بلا کسی حائل کے نہیں چھو سکتے فرق یہ ہے کہ بے وضو کے زبان سے بلا قرآن پاک چھوئے ہوئے پڑھ سکتا ہے اور حاجت غسل کی حالت میں بلا غسل کئے زبان سے بھی نہیں پڑھ سکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۲۱/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ” الحرمة مس المصحف لایجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة“ (فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۸، رشیدیہ، پاکستان) (مرتب)۔

باب التیمّم

جنبی کا تیمم کر کے تلاوت اور نماز پڑھنا:

ایک شخص ماسٹری کرتا ہے اور دینی تعلیم وغیرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ رکھتا ہے تو وہ بحالت جنابت کلام پاک تعلیم دے سکتا ہے یا کہ نہیں؟ اور احتیاطاً صبح کو غسل نہیں کرتا ہے دوپہر کو غسل کرتا ہے فجر کی قضا ظہر کے وقت میں پڑھتا ہے۔ غسل جنابت کے بجائے تیمم کر کے قرآن چھونا اور پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں۔ اگر غسل کر کے صبح کی نماز یا تلاوت قرآن کرتا ہے تو بیمار ہونے کا غالب گمان ہے، جبکہ کلام پاک میں موجود ہے ''**لایمسه الا المطهرون**'' دوسری جگہ ''**فتیمموا صعیدا طیبا**'' بھی موجود ہے۔

سائل کی مراد ہے کہ جنابت کے دفع کے لئے تیمم کر کے نماز اور قرآن پاک پڑھے۔ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر آپ نے بار بار کے تجربہ سے یا مسلمان دیندار حاذق طبیب کی تشخیص وقول کے مطابق غسل کے نقصان کرنے کا ظن غالب ہو تو غسل کے لئے تیمم کر کے تمام نمازیں اور تلاوت سب پڑھیں اور کریں، اگر وضو میں نقصان کرتا ہو تو اس کے لئے بھی تیمم کرلیا کریں، مگر نماز قضاء ہرگز، ہونے نہ دیں۔ اور جس تیمم سے نماز پڑھ سکتے ہیں اس سے تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ تلاوت کے لئے علیحدہ تیمم کی ضرورت نہیں ہے (۱)، البتہ محض تلاوت کے لئے یا ذکر اذکار کے لئے تیمم کرے تو اس تیمم

۱- ''لو كان يجد الماء إلا انه مريض يخاف إن استعمل الماء اشتد مرضه .... ويعرف ذلک الخوف، إما بغلبة الظن عن امارة والتجربة أو اخبار طبيب حاذق مسلم'' (ہندیہ ص ۲۸/۱، رشیدیہ پاکستان)---لو تيمم الجنب يريد به الوضوء جاز. لو تيمم لقراة القرآن عن ظهر القلب أو عن المصحف أو لزيارة القبور أو لدفن الميت أو للاذان أو للاقامة او لدخول المسجد أو لخروجه، الخ (ہندیہ ۲۶/۱، رشیدیہ، پاکستان) (مرتب)۔

سے نماز نہ ہوگی نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو فقہ کی کتابوں میں عام طور سے لکھا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ٹھنڈک کی وجہ سے تیمم:

زید پر غسل واجب ہے لیکن سردی میں کاہلی کی وجہ سے صرف تیمم پر اکتفاء کرلیتا ہے اور نماز پڑھ لیتا ہے آیا اس کا یہ فعل درست ہے کیا نماز ہو جائے گی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض کاہلی کی وجہ سے تیمم پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر بار بار کا اپنا تجربہ ہو کہ اس حالت میں غسل نقصان کرتا ہے یا مسلمان حاذق طبیب تشخیص کردے کہ پانی مضر ہوگا تو تیمم کرنا صحیح ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

گرم پانی بھی نقصاندہ ہو تو تیمم کرنا کیسا ہے؟

گرم پانی سے وضو کرنے سے سر میں درد ہوتا ہے کیا ایسی حالت میں میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسلمان دیندار حاذق طبیب کی اجازت سے جائز ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

باب الغسل

نرودھ استعمال کرنے کی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

آج کل عورت سے جماع کے وقت بعض لوگ نرودھ کا استعمال کرتے ہیں، کیا اس صورت میں غسل واجب ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

غسل واجب ہوجائے گا(۱)، اور اگر بغیر ضرورت شرعی ایسا کیا گیا تو گناہ بھی سخت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

بحالت غسل جنابت چھینٹ ٹب میں پڑنے سے پانی ناپاک ہوگا یا نہیں؟

حالت جنابت میں غسل کرتے وقت بالٹی یا ٹب میں چھینٹ پڑتی رہتی ہے اب اس کا پانی پاک رہتا ہے یا کہ ناپاک ہوجاتا ہے ٹب یا بالٹی سے پانی نکالنے کے لئے ہاتھ بھی ڈالتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس پانی سے وضو یا غسل جائز یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس جگہ بدن پر ناپاکی لگی ہو اگر وہاں سے اچھل کر چھینٹ پانی میں گرے گی تو بالٹی کے پانی کو ناپاک

۱- "(ولو لف ذكره بخرقة وأولجه ولم ينزل، فالأصح أنه إذا وجد حرارة الفرج واللذة وجب الغسل وإلا فلا، والأحوط وجوب الغسل في الوجهين، لقوله صلى الله عليه وسلم: إذا التقى الختانان وغابت الحشفة وجب الغسل أنزل أو لم ينزل" (طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱/۵۴، كتاب الطهارت) (مرتب)۔

کردے گی (۱) جس سے غسل جائز نہیں ہوگا، اور اگر دوسری جگہ سے اچھل کر بالٹی میں چھینٹ گرے گی تو بالٹی کا پانی ناپاک نہ ہوگا جس سے وضو غسل درست ہوجائے گا،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید،محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بغیر پانی وکلوخ استنجاء کرنے سے غسل:

زید سواری سے سفر کررہا ہے چلتی گاڑی میں اس کو پیشاب معلوم ہوتا ہے روکنا نا قابل برداشت ہے نہ وہاں پانی ہے نہ دوسری چیز جس سے استنجاء ممکن ہو مجبوراً پیشاب سے فارغ ہوجاتا ہے پھر جب گاڑی ٹھہرتی ہے تو وہاں پانی یا ڈھیلہ سے استنجا کرے آیا وہ پاک ہوا یا کہ ناپاک ہی ہے وہ بغیر غسل کے نماز ادا کرسکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ڈھیلے یا پانی سے استنجاء کرکے وضو کرکے نماز پڑھ سکتا ہے غسل کی ضرورت نہیں (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید،محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

حجامت کے بعد غسل ضرور نہیں ہے:

حجامت یا بال کٹوا کر صرف وضوء کرکے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہانا ضروری ہے اگر بغیر غسل کے نماز پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

۱- ”وکل ماء وقعت فیہ نجاسۃ لم یجز الوضوء بہ قلیلا کان او کثیرا“ (قدوری علی اللباب ۱/ ۴۴، دارالایمان سہارنپور) (مرتب)۔

۲- ”اعلم ان الجمع بین الماء والحجر افضل“ (شامی ۱/ ۲۴۸، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

محض حجامت بنوانے یا بال کٹوانے سے غسل واجب نہیں ہوتا محض وضوء کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں بلکہ اگر پہلے سے باوضوء ہوں تو اس سے وضوء نہیں ٹوٹے گا اور بغیر نیا وضو کئے نماز پڑھ سکتے ہیں اور نماز ہو جائیگی ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

غسل کی نیت پڑھ کر پھونکے ہوئے پانی سے غسل:

غسل کرتے وقت جو نیت پڑھی جاتی ہے وہ پڑھ کر پانی پر پھونک کر پانی سے غسل کرنا چاہئے یا پانی پر نہیں پھونکنا چاہئے۔

کے، کے ممبئی

الجواب وبالله التوفيق:

غسل کرتے وقت جو نیت کی جاتی ہے اس کا دل میں کر لینا بھی کافی ہوتا ہے، اس کو پڑھ کر دم کرنے کا حکم نہیں ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۷/۱/۱۴۰۲ھ

غسل کی حاجت میں قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر مسجد میں جانا:

غسل کی حاجت میں قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر مسجد میں جاسکتا ہے اس ارادہ سے کہ میں وہاں جا کر اور پہلے غسل اتار کر نماز پڑھنے کے بعد میں قرآن مجید پڑھوں گا۔

۱- ''وهي لغة عزم القلب على الشئ واصطلاحاً كما في التلويح: قصد الطاعة والتقرب إلى الله تعالى في إيجاد الفعل'' (البحر الرائق ۱/۴۹) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پاک کپڑے میں لپیٹ کر لے جاسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۱/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

كتاب الصلوة

کتاب الصلوۃ (باب مواقیت الصلوۃ)

برطانیہ وغیرہ میں موسم سرما میں رات مختصر ہوتی ہے، وہاں نماز، روزہ وتراویح کا حکم ؟

برطانیہ میں عموماً اوراس کے شمال مغربی صوبہ اسکاٹ لینڈ میں بطور خاص سردیوں میں دن بالکل مختصر اور موسم گرما میں از حد طویل ہوتا ہے، امسال توقع ہے کہ پہلا روزہ ۱۴ رجولائی کو ہو جائے گا، اگر ۱۴ رجولائی کا روزہ ہوا تو مقامی تقویم کے اعتبار سے اس دن اوقاتِ سحر وافطار وصلوات خمسہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ہوں گے۔

صبح صادق	طلوع شمس	زوال	وقت عصر	وقت مغرب	وقت عشاء
منٹ - گھنٹہ	منٹ - گھنٹہ	منٹ - گھنٹہ	منٹ - گھنٹہ	منٹ - گھنٹہ	منٹ گھنٹے
۱-۴۶	۴-۴۸	۱-۴۰	۶-۴۳	۱۰-۲	۱۱-۳

اس تفصیل کے مطابق صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک تین گھنٹے دو منٹ کا فاصلہ ہوگا۔ اور طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقفہ (روزہ کی طوالت) ۲۰ گھنٹے ۱۶ منٹ کا ہوگا، عشاء کی نماز اگر غروب سے ایک گھنٹہ بعد شروع کریں اور ۲۰ رکعات تراویح بشمول سوا پارہ قرآنِ کریم ایک گھنٹہ پندرہ منٹ میں بعجلت اور ڈیڑھ گھنٹہ میں بسہولت ختم کرلیں۔ اور اذان عشاء و جماعت کے درمیان ۱۲ منٹ کا فاصلہ رکھ کر سوا گیارہ بجے عشاء کی جماعت شروع کریں تو تراویح وغیرہ سے پورے پونے ایک بجے فراغت ہوگی۔ اور طلوع فجر سے پانچ منٹ قبل سحری کی بندش رکھیں تو اس طرح یہاں کے مسلمانوں کو صرف ایک گھنٹہ کی رات میسر ہوتی ہے جس میں ضروریات اور تناول سحری وغیرہ سب کچھ سرانجام دینا ہوتا ہے (مثلاً گھروں سے مسجد آنا جانا اور کھانا پکانا)۔

نوٹ: یہاں اسکاٹ لینڈ میں مئی، جون اور وسط جولائی تک پوری رات شفق ابیض مغرب کے بعد افق پر

بصراحت نمودار رہتی ہے جوکہ صبح صادق کے بعد پھیل کر مکمل روشنی مہیا کردیتی ہے۔باہر آبادی سے دور جاکر مختلف تاریخوں میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔دریں صورتِ حال بیان فرمائیں کہ ہم یہاں عشاء اور منتہائے سحر کا تعین کس طرح کریں، کیا مقامی تقویم کا التزام ضروری ہوگا یا اس کا کوئی متبادل حل موجود ہے؟ آئندہ امسال روزہ تقریباً ساڑھے بیس گھنٹہ اور اس سے بھی کچھ زائد طویل ہوجائے گا۔

مقبول احمد خادم (جامع مسجد گلاسکو)

الجواب وبالله التوفيق:

الف: حاصل سوال یہ ہے کہ برطانیہ میں عموماً شمالی حصہ میں اکثر گرمی کے موسم میں عشاء کا وقت گیارہ بج کر تین منٹ پر شروع ہوتا ہے اور صبح صادق ایک بج کر چھیالیس ۴۶ منٹ پر ہوجاتی ہے۔گویا رات کی کل مقدار دو گھنٹہ تینتالیس ۴۳ منٹ تک ہوجاتی ہے، امسال رمضان میں ایسا ہی ہوگا اب اگر وقت شروع ہوتے ہی اذان دے کر بارہ، چودہ منٹ پر بھی نماز شروع کردی جائے تو فرض وتراویح سے فراغت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوگی، اس طرح اب رات کا حصہ کم وبیش صرف ایک گھنٹہ بچے گا، اس مختصر وقت میں سحری کھانا پینا اور دوسری ضروریات پوری کرنا اور مسجد تک جانا وغیرہ سب کچھ کرنا بہت دشوار ہوگا تو عمل کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عزیمت تو یہی ہے کہ سنت کے مطابق پورے ایک ختم قرآن پاک کے ساتھ پوری تراویح پڑھ کر پورا ماہِ مبارک مجاہدہ میں گذاردیں، ورنہ اگر معذوری ہو، مثلاً کمزوری ہو یا مریض ہو یا ملازمت کی مجبوری ہو تو الم ترکیف، سے بیس رکعات تراویح کی پوری کرلیں (۱)، اور اگر اس کی بھی طاقت یا موقع نہ ہو تو فرض اور وتر کے درمیان محض آٹھ رکعت بنیت تراویح پڑھ لیا کریں (۲)۔

ب- اسکاٹ لینڈ یا جہاں بھی ایسا ہو کہ کسی مہینہ میں مثلاً مئی، جون اور وسط جولائی تک پوری رات شفقِ ابیض بعد مغرب قائم رہتی ہے اور صبح صادق ہونے پر بیاض پھیلا کر مکمل روشنی مہیا کردیتی ہے تو ایسے مقام میں وقتِ عشاء اور منتہائے سحر کا تعین کس طرح کیا جائے۔اور نماز عشاء کس طرح اور کس وقت پڑھی جائے؟

۱- "واختار بعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل أى البدائة منها ثم يعيدها وهذا أحسن لئلا يشتغل قلبه بعدد الركعات" (شامی ۱/۴۷۵، باب الوتر والنوافل) (مرتب)۔

۲- "وذكر في الفتح أن مقتضىٰ الدليل كون المسنون منها ثمانية والباقي مستحبا (شامی ۱/۴۷۴، باب الوتر والنوافل)۔

تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چہ فقہاء احناف ؒ نے شفقِ ابیض کے بعد ہی شروعِ وقتِ عشاء بیان کیا ہے، لیکن بعض محققین فقہاء شفق احمر کے غروب کے بعد سے ہی وقتِ عشاء کی ابتداء بیان کرتے ہیں (۱)۔

اس لیے مذکورہ حالت میں شفقِ احمر کے غروب ہوتے ہی وقتِ عشاء تسلیم کرکے نمازِ عشاء صبح صادق کا بیاض شروع ہونے سے قبل، ادا کرلی جائے، اور ماہِ رمضان المبارک میں بھی عشاء کے فرض و وتر کے درمیان صبح صادق کی سفیدی ظاہر ہونے سے پہلے تراویح بھی پڑھ لینے کی کوشش کی جائے، اگر بیس رکعات کا موقع "الم تر کیف" پڑھ کر بھی نہ ملے تو آٹھ رکعت ہی پڑھ لیا کریں، ہاں جہاں اس کا بھی موقع نہ ہو تو صرف عشاء کے فرض و وتر ہی پڑھ لیا کریں۔ اور بنیت ادا پڑھیں جیسا کہ مقیمین بلغار یہ کے لیے نماز عشاء کی ادائیگی کی بحث میں فقہاءؒ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر شفق ختم ہونے سے قبل ہی صبح صادق شروع ہو جائے اور عشاء کا وقت نہ ملے جب بھی صلوٰۃِ مغرب و فجر کے درمیان بعد مغرب کچھ وقفہ دیکر فرض عشاء او وتر بنیت ادا پڑھ لینا راجح ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جہاں چھ ماہ دن، چھ ماہ رات مسلسل رہتی ہے وہاں کے لوگ روزہ و نماز کس طرح ادا کریں؟

سوال: جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، وہاں نماز، روزہ اور وظائف یا وہ نمازیں جو سورج کے حساب سے پڑھی جاتی ہیں کس طرح ادا کی جائیں، کیا دن کے چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہی پڑھی جائیں گی اور چھ مہینے کے دن کا روزہ کس طرح رکھا جائے گا؟

ظہر پڑھنے کے بعد ایسی جگہ پہنچنا جہاں اس کے بعد ظہر کا وقت ہوا تو کیا دوبارہ ظہر پڑھنی ہوگی؟

ایک شخص برق رفتار جہاز سے ظہر کی نماز پڑھ کر مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے، منزل پر پہنچنے کے بعد یہاں نماز ظہر کا وقت ہوتا ہے، اب اس کو نماز ظہر پھر پڑھنی چاہیے، یا جو پڑھ کر آیا ہے وہ کافی ہے۔

سید محمد میاں نظامی (بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی)

۱- كما بينه وفصله في الدر والرد. (وقت العشاء والوتر منه إلى الصبح، قال الشامي قوله: منه أي من غروب الشفق على الخلاف فيه" (شامی ۱/ ۲۴۱؛ کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۲- "وفاقد وقتهما كبلغار فإن فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق في اربعينية الشتاء مكلف بهما فيقدر لهما" (الدر المختار ۲/ ۱۸) (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-جس مقام پر آفتاب چھ مہینے مسلسل غروب رہتا ہے اور چھ مہینے مسلسل طلوع رہتا ہے اس مقام پر انسانی آبادی مشکل ہے، بہرحال وہاں جو لوگ آباد ہیں ان کے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت آفتاب غروب ہو اس وقت سے ہر چوبیس گھنٹہ کو گھڑی دیکھ کر ان کو دن ورات کا مجموعہ قرار دے کر پانچوں نمازیں جس فصل واندازہ سے پڑھتے ہیں پڑھتے رہیں، حدیث دجال (۱) سے بھی اس طرف روشنی ملتی ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، پھر اسی طرح جب چھ ماہ مسلسل طلوع رہے اس وقت بھی وہی سابق حساب کے اعتبار سے ہر چوبیس گھنٹہ میں شب وروز کی نمازیں اندازہ کے لحاظ سے پڑھتے رہیں اور اسی طرح حساب سے جب رمضان کا مہینہ آئے تو اس میں روزہ بھی رکھیں (اسی اعتبار سے) اور جس طرح دنیا کا اپنا ہر کام (سونا، جاگنا، کام کرنا، ڈیوٹی دینا وغیرہ) وقت کے حساب سے کریں گے، اسی طرح نماز روزہ بھی حساب کر کے ادا کریں گے (۲)۔

۲-جب ایک مرتبہ کوئی نماز پڑھ لی گئی تو پھر اگر اسی نماز کا دوبارہ وقت آئے گا تو دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی وہی ایک بار کی ایک دن میں پڑھی ہوئی نماز کافی ہوگی (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وہ مصلیٰ یا چادر جس پر خانہ کعبہ یا مسجد نبوی کا نقشہ ہو، اس پر بیٹھنا اور نماز پڑھنا کیسا ہے؟

مسلمان حرمین شریفین سے ایسے مصلے لاتے ہیں جو رنگ برنگ اور پھول پھال والے ہوتے ہیں اور ان پر بیت

۱- اور حدیث دجال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جب آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جب ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا تو کیا ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ اندازہ سے نمازیں ادا کرنی ہوں گی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:" قلنا: يارسول الله! اليوم الذى كسنة أتكفينا فيه صلوٰة يوم؟ قال: لا، أقدروا له قدره.. الخ" (مسلم شریف ۲/ ۴۰۱، باب ذکر الدجال) (مرتب)۔

۲- "قال الرملى فى شرح المنهاج: ويجرى ذالك فيما لو مكثت الشمس عند قوم مدة الخ، قال فى امداد الفتاح قلت: وكذالك يقدر لجميع الآجال كالصوم والزكوٰة والحج والعدة وأجال البيع والسلم والإجارة؛ وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الأربعة بحسب ما يكون كل يوم من الزيادة والنقص كذا فى كتب الأئمة الشافعية ونحن نقول بمثله إذ أصل التقدير مقول به إجماعا فى الصلوٰة (شامی ۱/ ۲۴۴، فصل فی فاقد وقت العشاء کاہل بلغار کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۳- "وإذا أتمها أى الظهر يدخل مع القوم، والذى يصلى معهم نافلة، لأن الفرض لا يتكرر فى وقت واحد" (ھدایہ ۱/ ۱۵۲، باب ادراک الفریضۃ) (مرتب)۔

اللہ شریف اور مسجد نبوی علیہ السلام کے گنبد کا نقشہ بھی رہتا ہے اور اپنی نمازوں میں مسجد میں امامت کی جگہ پر اور اب اسی طرح کی چادریں بنی ہوئی لاکر پوری صف میں بچھاتے ہیں جن پر لامحالہ لوگوں کے پیر پڑتے ہیں، ایسے مصلے اور ایسی چادروں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ ہمارے اسلاف رحمہم اللہ کا معمول کیا رہا؟ اکابرین کیا فرماتے ہیں؟

محمد یوسف باوا (لندن)

الجواب وباللہ التوفیق:

حرمین شریفین سے مصلے جولائے جاتے ہیں جن پر پھول، بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر بیت اللہ شریف یا گنبد خضراء کا نقشہ اس پر صحیح اور صاف طور سے نمایاں ہو کہ اس کے دیکھتے ہی ان کی اصل صورت سامنے آجاتی ہو تو اس پر پیر رکھنا یا سجدہ کرنا دونوں ناجائز ہوگا، اس لیے کہ کعبۃ اللہ اور گنبدِ خضراء دونوں کا شعائرِ دینی سے ہونا مسلم اور ظاہر ہے اور تمام دینی شعائر کا احترام و تعظیم واجب ہے: "**کما أشار إليه قوله تعالىٰ: ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب**" (۱) "**وأيضا من المسئلة مسلمة، أي تحريم الحرمات واجب كما في المرقات شرح المشكوٰة**"۔ اور معظم و محترم چیز کو پیروں سے روندنا اس کی اہانت کو مستلزم ہونا اور ناجائز ہونا ظاہر ہے اور یہ دونوں نقشے اگرچہ عین کعبہ اور عین گنبدِ خضراء نہیں ہیں، لیکن ان کے عکاس و ترجمان اور ان پر دال ہیں، اس لیے ان کی اہانت اور توہین بھی ان دونوں کی اہانت اور توہین کو مستلزم ہوگی اور ناجائز ہوگی اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جب عینِ کعبۃ اللہ پر سجدہ کرنا درست نہیں، کما صرح بہ العلماء کہ کعبۃ اللہ مسجود لہ نہیں، بلکہ صرف مسجود الیہ ہے اور وہ بھی بطور امر تعبدی اور غیر مدرک بالقیاس ہونے کے درجہ میں محض اللہ کے حکم سے کہ کعبہ کی جانب سجدہ کرو، کعبہ کی جانب سجدہ کیا جاتا ہے کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ اللہ کو سجدہ کیا جاتا ہے، اس لیے کعبہ کو سجدہ کرنا شرک کہا گیا ہے (۲)، تو گنبدِ خضراء کو یا گنبدِ خضراء پر سجدہ کرنا بدرجہ اولیٰ شرک اور ناجائز ہوگا۔

پس یہ نقشے جب ان دونوں کے ترجمان و عکاس ہیں، تو ان دونوں نقشوں پر بھی سجدہ کرنا ناجائز و حرام ہوگا۔ اگر یہ چیز شرک نہ ہو تو ایہام شرک اس سے ضرور ہوگا اور یہ ایہام شرک بھی ممنوع ہوجائے گا اور اگر وہ نقشے صاف اور نمایاں نہ ہوں یا غلط

۱- سورۂ حج: ۳۲۔

۲- حتى لو سجد للكعبة نفسها كفر، قال الشامي: فإن المسجود له هو الله تعالىٰ والتوجه إلى الكعبة مأمور به كما تقدم كان السجود لنفس الكعبة كفرا (الدر المختار مع الشامی ص ۲۸۶، ج ۱، کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

ہوں اور کسی ذی روح کی تصویر یا صلیب وغیرہ کسی کفر کے شعار کے نقوش نہ ہوں تو اس پر نماز پڑھنا بے تکلف جائز رہے گا، بشرطیکہ شاغل مصلی نہ بنے ورنہ مکروہ ہوگا، یہی حکم بعینہٖ اور اسی تفصیل کے ساتھ ان منقش چادروں کا بھی ہوگا کہ جن پر نماز پڑھی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ہوائی جہازوں میں نماز کس نظام الاوقات کے مطابق ادا کی جائے؟

استفتاء کی بنا اس پر ہے:

۱-اسلام میں پانچ نمازیں فرض ہیں: قال النبی ﷺ: ''**خمس صلوات افترضهن الله تعالىٰ**'' (۱)۔

۲-ان نمازوں کی ادائیگی کے لیے مخصوص اوقات فرض کیے گئے ہیں: ''**لها أوقات مخصوصة لاتجزی قبلها بالإجماع**'' (۲)۔

ان اوقات کی فقہی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ عملاً ان کو صحتِ ادا کے لیے شرط سمجھا جاتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ فرضیتِ نماز کی علت شاید یہی اوقات ہیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔حدیث میں آتا ہے:

''**نام رسول الله ﷺ في حجر علي رضي الله عنه حتى غربت الشمس فلما استيقظ ذكر له أنه فاتته العصر، فقال: اللهم إنه كان في طاعتك وطاعة رسولك فرددها عليه، فرددت حتى صلى العصر وكان ذلك بخيبر''والحديث صححه الطحاوی و عياض، وأخرجه جماعة منهم الطبرانی بسند وأخطا من جعله موضوعا كابن الجوزی، وقواعدنا لاتأباه**'' (۳)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں وقت کو خاص اہمیت حاصل ہے، جب ہی تو ان کے لیے سورج کا اعادہ کرایا گیا ہے، کیا وقت کی اسی اہمیت کی بناء پر فقہاء نے اس کو سببِ وجوب قرار دیا ہے، جیسا کہ مشہور ہے: ''**وسببها أوقاتها عند الفقهاء**''(۴)۔

۱- ابوداؤد، کتاب الصلاۃ حدیث نمبر: ۴۲۵، عن عبادۃ بن الصامت ۱/ ۱۱۵۔
۲- نیل الاوطار ۱/ ۳۲۶۔
۳- شامی کتاب الصلاۃ ۱/ ۲۶۵۔
۴- البحر الرائق کتاب الصلوۃ ۱/ ۴۲۳۔

لیکن اگر ایسا ہے تو واقعۂ دجال کے متعلق کیا کہا جائے گا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وقت ایک سال تک بھی نہ آئے تو نمازیں برابر تقدیر و اندازہ کے ساتھ ادا کی جاتی رہیں گی:

"أنه ذکر الدجال رسول الله ﷺ قلنا: ما لبثهٗ فی الأرض؟ قال: أربعون یوماً یوم کسنة ویوم کشهر ویوم کجمعة وسائر أیامه کأیامکم فقلنا: یا رسول الله! فذلک الیوم الذی کسنة أتکفینا فیه صلوٰة یوم؟ قال: لا، اقدروا له قدره" (۱)۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے، علماء کا ایک طبقہ اسی طرف گیا ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے صرف علامت ہے، محقق ابن ہمام علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: **"جعل علامة علی الوجوب الخفی الثابت فی نفس الأمر"** (۲)۔

بہر حال وقت کی حقیقت سبب وجوب کی ہو یا علامت کی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہوائی جہازوں کے سفر میں اکثر امتدادِ وقت کی حالت سے سابقہ پڑتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زمین اپنے طول پر ہے، مشرق کی طرف سے ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چوبیس گھنٹہ میں ایک چکر پورا کرتی ہے اور ہوائی جہاز عموماً زمین سے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہیں تو اگر زمین کی مخالف سمت میں یعنی سورج کی طرف پشت کر کے پرواز کرتے ہیں تو ان پر رات کے اوقات بڑھتے رہتے ہیں اور اگر ان کی پرواز زمین کے موافق سمت ہوتی ہے تو اس صورت میں چونکہ سورج سامنے ہوتا ہے اس لیے ان پر مسلسل دن کا وقت بڑھتا رہتا ہے، یہ ابتداءِ وقت کی صورت ہے، لیکن اس سے زیادہ حیرت ناک وہ شکل ہے جس میں وقت کم ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ راکٹ چوبیس گھنٹہ میں زمین کے سترہ چکر لگاتا ہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹہ میں ایک چکر، جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نمازوں کے تمام اوقات راکٹ پر گذر جاتے ہیں اور اس طرح چوبیس گھنٹہ میں سترہ دن کی نمازیں فرض ہو جاتی ہیں، ان مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں جب کہ وقت معدوم بھی نہیں ہے لیکن معمول کے مطابق موجود بھی نہیں ہے، نمازوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا؟

۱- کیا جو وقت گذر رہا ہے اس کے حساب سے نمازیں ادا کی جائیں گی؟ لیکن یہ صورت حدیثِ دجال کے خلاف ہے۔

۱- اخرجہ مسلم من حدیث طویل ۴/ ۵۵-۲۲۵۰، فی کتاب الفتن ۱۱۰، ۱۱۱، ۲۹۳۷۔

۲- فتح القدیر ۱/ ۲۲۴۔

۲-یہ جو وقت معمول کے مطابق موجود نہیں ہے، تقدیر و انداز کر کے اس کے حساب سے نمازیں ادا کی جائیں گی، لیکن اس صورت میں یہ اشکال ہے کہ تقدیر و اندازہ کے لیے کون سے اوقات کو معیار بنایا جائے گا؟

۳-یہ جو وقت معمول کے مطابق موجود نہیں ہے اس کو بنیاد قرار دے کر نماز کی عدمِ فرضیت کا فیصلہ کیا جائے گا، یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر استفتاء مرتب کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں احقر بھی چند معروضات بغرض اصلاح پیش کر رہا ہے، ملاحظہ فرمائیں اور اپنی تحقیقات علمیہ وفقہیہ سے سرفراز فرمائیں۔

اس میں شک نہیں کہ شریعت نے نماز کا مدار شمس کے اوقات پر رکھا ہے، **قال الله تعالى: "أقم الصلوٰة لدلوک الشمس إلى غسق الليل وقرآن الفجر"** (۱)، اور اس میں بھی شک نہیں کہ شمسی اوقات کرۂ ارض کے ہر حصہ میں یکساں نہیں پائے جاتے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، بلکہ ان میں تفاوت کثیر نظر آتا ہے۔

۱-اصولاً جن مقامات میں یہ اوقات نہ پائے جاتے ہوں، نماز فرض نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ جب سبب وجوب ہی نہیں ہے تو نماز کی فرضیت کا حکم کس طرح دیا جا سکتا ہے، چنانچہ علماء کا ایک طبقہ ایسے موقعہ پر نماز کی عدمِ فرضیت ہی کا قائل ہے: **"وبه جزم في الكنز والدرر والملتقىٰ وبه أفتى البقال ووافقه الحلواني والمرغيناني ورجحه الشرنبلالي والحلبي"** (۲)۔

یہ تمام حضرات عدمِ سبب ہی کی بنا پر نماز کی عدمِ فرضیت کے قائل ہیں، اور ان کی اصل بقالیؒ کا فتویٰ ہے۔ **"ومن لم يوجد عندهم وقت العشاء كما قيل يطلع الفجر قبل غيبوبة الشفق عندهم، أفتى البقاليؒ بعدم الوجوب عليهم لعدم السبب، وهو مختار صاحب الكنز كما يسقط غسل اليدين من الوضوء عن مقطوعهما من المرفقين، وأنكره الحلواني ثم وافقه"** (۳)۔

میرے نزدیک بقالیؒ کی اس عبارت پر کہ وقت سببِ وجوب ہے، کچھ اور بھی اشکالات ہیں:

۱-وقت جس کا سبب یا علامت ہونا محض دلیل ظنی سے ثابت ہے اس کو نماز کی متواتر الثبوت خمسیت کو ختم کرنے کے لیے حجت بنایا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔

۲-لیلۃ الاسراء میں جو خمسین صلوٰۃ فرض ہوئیں اور آخر میں معاف ہو کر خمس صلوٰۃ رہ گئیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔
۲- الدر مختار ۱/ ۲۶۷۔
۳- فتح القدیر ۱/ ۱۹۷۔

ان سے مراد خمس اوقات ہیں، کیونکہ ہم اوقات میں تو خمسیت پاتے ہیں صلوٰۃ میں نہیں پاتے، معراج میں صلوٰۃ کا عدد گیارہ کا فرض ہوا پانچ کا نہیں، "فرضت الصلوة ليلة الإسراء ركعتين ركعتين إلا المغرب" (۱) نیز بعد کو حضر میں دو، دو کا مزید اضافہ کیا گیا ہے، "ثم زيدت بعد الهجرة إلا الصبح" (۲) یہ اضافہ اوقات میں نہیں نماز میں کیا گیا ہے۔

تو کیا ایک مرتبہ معاف کرا کے دوبارہ بالکل وجوب کا حکم نہ ہونا اس کا کوئی قائل نہیں ہے؟ لہٰذا خمس اوقات کی بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے تو اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جاتا ہے تو اس صورت میں اوقات کا خود اپنے لیے سببِ وجوب ہونا لازم آتا ہے جو صحیح نہیں ہے بلکہ غلط ہے۔

۳–یہ حقیقت ہے کہ ہر رکعت ایک مستقل نماز ہے۔"إن كل ركعة صلوٰة"(۳) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ادائیگی رکعۃً، رکعۃً ممنوع ہے۔"نهىٰ رسول الله ﷺ عن الصلوٰة ركعة ركعة"۔ بلکہ شفعۃ شفعۃ ادا کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کی فرضیت ہی دو دو رکعت ہوئی ہے۔ "الصلوٰة فرضت ليلة الإسراء ركعتين ركعتين إلا المغرب، ثم زيدت بعد الهجرة إلا الصبح" (۴) اور فقہاء کا یہ اصول ہے کہ وجوبِ نماز کا تکرار وجوبِ اوقات کی وجہ سے ہوتا ہے، مثلاً ظہر اصولاً اپنے وقت پر فرض ہوتی ہے اور اصلاً دو رکعت ہوتی ہے، لیکن اس میں بعد کو جو دو رکعتوں کا اضافہ کیا گیا ہے تو کیا اس کا موجب بھی یہی ظہر کا وقت ہے۔اصولاً تو اس کے لیے کوئی اور مستقل وقت ہونا چاہئے تھا، کیونکہ یہ دو رکعتیں خود ہی ایک مستقلِ نماز ہیں، لیکن ایسا کوئی نہیں کہتا، سب ان کو ظہر ہی کہتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ وقت کو دو اور چار سے بحث نہیں شریعت نے جتنی نمازیں اس میں فرض کردیں وہ ان کی ادائیگی کا محل بن جائے گا، اس وجہ سے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے۔

۴–وقت اس لیے بھی سببِ وجوب نہیں ہے کہ اگر یہ سببِ وجوب ہی ہوتا تو اس کو نمازوں سے مقدم ہونا چاہئے تھا حالاں کہ تمام احادیث اس پر متفق ہیں کہ اوقات کا تعین فرضیتِ نماز کے اگلے دن ہوا ہے۔

۵–اور اس لیے بھی اس کو سببِ وجوب نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ کلام اللہ میں اس کے علاوہ ایک اور سبب کا تذکرہ بھی

۱– نیل الاوطار۔
۲– نیل الاوطار ۱/ ۳۰۹۔
۳– ہدایہ ص ۱۰۷۔
۴– نیل الاوطار ۱/ ۳۰۹۔

موجود، یعنی ذکر کا، "قال الله تعالى: أقم الصلوٰة لذكري"(۱)، کیا ایک نماز کے لیے ایک وقت میں دو سبب موجب ہو سکتے ہیں؟

ان وجوہات کی بنا پر وقت کو سببِ وجوب قرار دینا خدشہ سے خالی نہیں ہے۔ اگر وقت سبب وجوب نہیں ہے تو کیا اس کو علامت سمجھا جائے، جیسا کہ محقق ابن ہمامؒ کی رائے ہے وہ فرماتے ہیں: "جعل الوقت علامة على الوجوب الخفي الثابت في نفس الأمر" پھر کچھ آگے چل کر الخفی الثابت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "هو ما تواطئت أخبار الإسراء من فرض الله تعالىٰ الصلوٰة خمساً بعد ما أمروا أولاً بخمسين ثم استقر الأمر على الخمس شرعاً عاماً لأهل الآفاق، لا تفصيل فيه بين أهل العلم" (۲)۔

گو اس تشریح پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ احکام و مسائل کی بہت سی ایسی صورتیں ہیں جن میں نماز کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اس لیے حضرت محقق ابن ہمامؒ کا شرعاً عاماً فرمانا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کے بعض ایام میں فرضیت نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ نیز قصر کی بنا پر دو رکعتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ نیز حالتِ محاربہ میں دو رکعتوں میں ہیئت کذائی ساقط ہو جاتی ہے۔ وغیرہ ذالک، لیکن بغور دیکھنے سے یہ اشکال صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں فرضیت نماز حکماً ساقط کی جاتی ہے حقیقۃً ساقط نہیں ہوتی۔

البتہ وقت کو علامت تسلیم کرنے سے ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ہوائی جہازوں کے مذکورہ بالا حالات میں وجوبِ نماز کا علم کس طرح حاصل ہو۔ علامہ شامیؒ نے اس کا حل تجویز فرمایا ہے: "إنا لا نسلم لزوم وجوب السبب حقيقة بل يكفي تقديره كما في أيام الدجال" (۳)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس تقدیر و انداز کا معیار کیا ہونا چاہئے، کیونکہ فضا میں جو وقت گذر رہا ہے وہ امتداد کی وجہ سے قابلِ اعتماد نہیں ہے، کیونکہ اس کا ایک وقت نمازوں کے متعدد اوقات پر چھایا ہوا ہے اس سلسلے میں گو فقہاء کی کوئی تشریح نظر سے نہیں گذری لیکن ان کا میلان بظاہر اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ مقاماتِ قریبہ کے اوقات کو معیار بنایا جائے، علامہ شامیؒ ایک حوالہ سے لکھتے ہیں: "أن يكون وقت العشاء في حقهم بقدر ما يغيب فيه الشفق في أقرب البلاد

۱- سورۂ طٰہٰ: ۱۴۔
۲- فتح القدیر ۱/ ۱۹۷۔
۳- شامی ۱/ ۲۶۶۔

إلیھم"(۱)، مگر دشواری یہ ہے کہ ہوائی جہاز چونکہ فضاء میں اڑتا ہے اس لیے وہاں مقاماتِ قریبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ زمین کو فضا کا مقام سمجھا جاسکتا ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ زمین بھی اختلاف اوقات سے خالی نہیں ہے مثلاً لینن گراڈ میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے۔ یا ماسکو میں ۲۳/ جون کو ۲۳/ گھنٹہ کا دن اور ایک گھنٹہ کی رات ہوتی ہے اور ۲۳/ دسمبر کو اس کے برعکس ہوتا ہے، اس لیے ان مقامات میں خود ہی تقدیر و انداز کی ضرورت درپیش رہتی ہے یہ معیار کس طرح بن سکتے ہیں۔

آخری صورت یہ ہے کہ زمین کی مخصوص سطح کے اوقات کو تقدیر و اندازہ کا معیار قرار دیا جائے جو عموماً ۱۲ گھنٹہ کا دن اور ۱۲ گھنٹہ کی رات پر مشتمل ہوتے ہیں یہ آخری صورت ہی بچند وجوہ صحیح معلوم ہوتی ہے:

۱- اوقاتِ عالم میں یہ اوقات سب سے زیادہ معتدل ہیں۔

۲- قیاس یہ ہے کہ "لیلة الاسراء" میں انہیں اوقات کو بنیاد قرار دے کر نمازیں فرض کی گئی تھیں، کیونکہ آں حضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "فرضت بخمسین صلوٰة فی کل یوم"(۲)، یہ ارشاد "لیلة الإسراء" کے موقع کا ہے، اسی موقع کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے: "إن أمتک لا تستطیع خمسین صلوات کل یوم وانی واللہ قد جربت الناس قبلک"(۳)، ان دو عظیم پیغمبروں (علیہما السلام) نے کل یوم کے لفظ سے جو مراد لیا ہے یقیناً اسی کو فرضیت نماز کا کل یوم ہونا چاہئے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر و فلسطین کا یوم اور جناب رسول اللہ ﷺ حجاز کا یوم ارشاد فرمارہے ہیں، اس لیے اوقاتِ نماز کے واسطے سر زمین انبیاء علیہم السلام کے اوقات کو تقدیر و اندازہ کا معیار بنانا نہ صرف یہ کہ بہتر ہے بلکہ اقرب إلی اللہ ہے، ہم فضاء کے اوقات کو اس لئے بھی اپنے واسطے معیار نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ ہماری فطرت کے خلاف ہے، ہماری فطرت یہ ہے کہ "ولکم فی الأرض مستقر ومتاع إلی حین"(۴)، زمین چونکہ ہمارا مستقر ہے، اس لیے زمین ہی کے اوقات ہمارے لیے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ بنا بریں احقر کی رائے یہ ہے کہ ہم خواہ چاند پر ہوں یا راکٹ اور ہوائی جہاز میں یا لینن گراڈ اور ماسکو میں ہر جگہ ہم کو ۱۲ گھنٹے کا دن اور ۱۲/ گھنٹے کی رات کے

۱- ردالمحتار ۱/ ۲۴۳۔
۲- مشکوۃ باب المعراج/ ۵۲۸۔
۳- مشکوۃ باب المعراج/ ۵۲۸۔
۴- سورۂ بقرہ: ۳۶۔

معتدل نظام الاوقات کے مطابق نمازیں ادا کرنی چاہئیں۔ فقط واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

محمد مقبول الرحمٰن سیوہاروی (خادم ادارہ المباحث الفقہیہ دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

محترم المقام زادت مکارمکم ومعالیکم　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا تحریر کردہ جواب بغور پڑھا، جناب نے خلاصہ جواب جواخیر میں بایں الفاظ (ہم خواہ چاند پر ہوں یا راکٹ میں ہوں یا ہوائی جہاز میں یا لینن گراڈ اور ماسکو میں ہر جگہ ہم کو ۱۲ گھنٹے کے دن اور ۱۲ گھنٹے کی رات کے معتدل نظام الاوقات کے مطابق نمازیں ادا کرنی چاہیں) تحریر فرمایا ہے، اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے اور وہ بالکل صحیح ہے۔

سوال میں مذکورہ حالات کے اندر انہی ایام معتدلہ کے اوقات کا لحاظ کر کے جس وقت سے سفر کریں گے اس وقت سے ہر چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازوں کے فصل کا اندازہ کر کے نماز پنجگانہ ادا کرتے رہیں گے، اور باقی اس خلاصہ سے اوپر جو اشکال و جواب اور طویل بحث و تمحیص پیدا ہوگئی ہے، اس کا بڑا سبب علت اور سبب کے اصطلاحی معنیٰ کا ذہن سے ذہول کر جانا معلوم ہوتا ہے۔ غالبا دونوں کو ایک اور متحد المعنیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ علت اور سبب دونوں دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں، علت کے انتفاء سے معلول کا منتفی ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے، اسی طرح علت سے معلول کا تخلف بیشک ممکن نہیں ہوتا اور نہ علت میں تعدد و توارد ہو سکتا ہے۔ بخلاف سبب کے کہ اسباب میں تعدد و توارد بھی ہو سکتا ہے اور سبب کے انتفاء سے مسبب کا انتفاء لازم نہیں آتا ہے۔ نیز مسبب کا تخلف بھی سبب سے ممکن ہے جہاں کہیں اس کے خلاف نظر آتا ہے وہاں سیاق وسباق کے قرائن سے سبب سے مراد علت ہوتی ہے۔ اور یہ اطلاق بھی شائع و ذائع ہے اور اس عرفی اطلاق کو بھی ممکن ہے کہ اس خلط میں دخل ہو۔ یہی حکم اور حال علامت کا بھی ہے کہ اس میں بھی تعدد و توارد اور تخلف سب ہو سکتا ہے، نماز پنجگانہ میں اصل علت وجوب کی حکم باری تعالی عز وجل ہے اور وہ حکم ان اوقات پنجگانہ میں متوجہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ انتہائی خفی ہوتا ہے اس لیے اس پر شریعت غراء اور دربار رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے کچھ اسباب وعلامات مقرر فرما کر ہماری رہبری فرمادی ہے جن سے حکم خداوندی (جو اصل علت وجوب ہے) کا پتہ چل جاتا ہے اور امتثال امر سہل ہو جاتا ہے۔

پھر بعض کتب مذہب میں جو اوقات کو سبب اور بعض میں علامت ذکر کیا گیا ہے، ان میں نزاع حقیقی نہیں ہے محض تعبیر و عنوان کا فرق ہے جو اختلاف لفظی سے آگے نہیں ہے اور مآل ان دونوں کا قریب قریب ایک ہی ہے۔

اسی طرح شمسی حرکات کے اندر جو انحصار کیا گیا ہے وہ انحصار بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح دلوک شمس کا ذکر ہے اسی طرح غسق لیل اور قرآن الفجر بھی مذکور ہے: "**أقم الصلوة لدلوک الشمس إلی غسق اللیل وقرآن الفجر**" (۱) نیز روایات صحیحہ میں عشاء کے وقت کے بارے میں آتا ہے کہ تیسری رات کا چاند جس وقت غروب ہوتا ہے اسی وقت آپ ﷺ عشاء کی نماز ادا فرماتے: "**عن النعمان بن بشیرؓ قال: أنا أعلم الناس بوقت هذه الصلوٰة کان رسول الله ﷺ یصلیها لسقوط القمر الثالثة**" (۲)، اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ شفق کی غیبوبت سے وقت عشاء شروع ہوتا ہے۔ "**وأول وقت العشاء إذا غاب الشفق**" (۳)، اسی طرح نماز فجر کے وقت کے بارے میں وارد ہے کہ جس رات کی تاریکی میں افق کے اندر سفیدی نمایاں ہونے لگے اس وقت سے فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ "**وقت الفجر من الصبح الصادق وهو البیاض المنتشر فی الأفق إلی طلوع الشمس**" (۴)، یہ سب بھی اوقات کی نشاندہی میں وارد ہے۔

غرض جناب کی مساعی اور کاوشیں ایک علمی سعی و کوشش ہے جو بلا ریب قابل ستائش و تحسین ہے۔ اور خلاصہ جواب جو اخیر جواب میں مذکور ہے وہ بلا ریب صحیح و درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح العبد محمود غفرلہٗ

جن ملکوں میں بعض نمازوں کا وقت ہی نہیں ملتا وہاں ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

۱- یورپ کے بعض ملکوں میں ایام سرما کی مخصوص تاریخوں کے اندر نماز عصر کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا، نہ سیدنا امام اعظمؒ کے نزدیک نہ صاحبین وائمہ ثلاثہ کے نزدیک، یعنی کسی چیز کا سایہ سایہ اصلی کے علاوہ ایک مثل نہیں ہو پاتا ہے کہ سورج غروب ہو جاتا ہے دریں صورت غروب آفتاب کے بعد نماز عصر پڑھی جائے گی یا پہلے؟ اور اس کی ادائے گی بہیت ادا ہوگی یا قضا یا پھر وہ نماز فرض ہی نہ ہوگی؟

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔
۲- ترمذی شریف/ ۲۳، باب ماجاء فی وقت صلوٰۃ العشاء الآخرۃ۔
۳- ھدایہ اولین/ ۸۲، کتاب الصلوٰۃ۔
۴- فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۵۱، کتاب الصلوٰۃ۔

اگر اس میں ائمۂ اسلام کا اختلاف ہوتو اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

۲-ہر سال یہاں کم وبیش ۶۵ راتیں ایسی آتی ہیں کہ سیدنا امام اعظم کے مسلک میں نمازِ عشاء کا وقت ہی داخل نہیں ہوتا ہے، کیونکہ افق غربی سے نہ شفق ابیض زائل ہوتی ہے نہ ساری رات سورج ۱۸ درجے سے نیچے ہوتا ہے (۱۲، اور ۱۸ کے درمیان گردش کرتا ہے)، ایسی صورت میں احناف کے لیے نماز عشاء کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ اس خاص مسئلہ میں قولِ صاحبین کی طرف امام ابوحنیفہؒ کی رجعت صحیح ہے؟ جیسا کہ ''فتح القدیر'' اور ''شامی'' وغیرہما میں ہے، اگر صحیح ہے تو کیا مذکورہ راتوں کے علاوہ بھی ضرورت صحیحہ (بہت کم وقت ہونا) ومصلحتِ شرعیہ ارتفاع نزاع بین المسلمین وغیرہما کے پیش نظر قول صاحبین رحمہما اللہ پر حنفیوں کو عمل کرنا جائز ہے؟

۳-مذکورہ راتوں میں جب ساری رات سورج ۱۸ درجے سے نیچے نہیں ہوتا صبح کاذب ہوتی ہی نہیں تو ''إمساک عن الأکل والشرب للصوم'' کا کیا حکم ہوگا؟

فیروز احمد (سکریٹری نیوزی لینڈ اسلامک سوسائٹی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-جن ملکوں میں ایام سرما کی چند مخصوص تاریخوں میں آفتاب کے نصف دائرہ سے آگے بڑھنے کے بعد سایہ اصلی کے علاوہ ایک مثل بھی پورا نہیں ہوتا کہ آفتاب غروب ہوجاتا ہے، یعنی عصر کا وقت بروایاتِ حنفیہ نہیں ملتا وہاں بھی نماز ادا کرنا فرض رہے گا اور عمل کی صورت یہ ہوگی کہ جب آفتاب ڈھل جائے یعنی اس کا سایہ مغرب سے مشرق کی جانب منتقل ہونے لگے اسی وقت ظہر کی نماز ادا کرلی جائے پھر بغیر لحاظ سایہ اصلی اور بغیر لحاظ سایہ کے مثلین و مثلِ واحد غروب ہونے سے پہلے نمازِ عصر پڑھ لی جائے بقضا نہ کی جائے، بلکہ ادا کی نیت سے پڑھی جائے پھر آفتاب غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھ لی جایا کرے۔

اسی طرح غروب آفتاب کے بعد جب شفق احمر غائب ہوجائے تو نماز عشاء پڑھ لی جایا کرے اور اگر ایسا ہو کہ شفقِ احمر بھی غروب نہیں ہوتی یہاں تک کہ مشرقی جانب میں صبح کی روشنی نظر آجاتی ہو تو شفقِ احمر کے باقی رہتے ہوئے بھی نمازِ عشاء بنیت ادا پڑھ لی جائے۔

اس مسئلہ کی بہت اچھی بحث صاحب ردالمحتار نے فاقد وقت عشاء کے تحت کی ہے اور بنیت ادا کو ترجیح دی ہے اور

یہ قول اشبہ بالفقہ ہے اور اس کی مزید تائید احقر کی اگلی گفتگو سے بھی ہو جائے گی، پھر آفتاب طلوع ہونے سے کچھ قبل نماز فجر پڑھ لی جایا کرے۔

اس طرح ۲۴ رگھنٹہ کی پانچوں نمازیں بنیت ادا پڑھ لی جایا کریں، یہ طریقہ عمل حضرت امام ابوحنیفہؒ کے خلاف نہ ہوگا، اس کی وضاحت اگلی تقریر سے بخوبی ہو جائے گی۔

اسی طرح جب عصر کا وقت نہ ملنے کی وجہ سے اور عشاء کا وقت نہ ملنے کی وجہ سے اوپر لکھے ہوئے قاعدہ کے مطابق عصر وعشاء پڑھیں گے تو قضاء کی نیت نہ کریں گے بلکہ ادا ہی کی نیت سے پڑھیں گے۔

اس لیے کہ فرض نمازوں کے اوقات کی ابتداء وانتہاء اور یہ تعیینِ اوقات نمازوں کے فرض ہونے کی علت نہیں کہ ان کے منتفی ہونے سے نماز (کا حکم) ہی منتفی ہو جائے بلکہ اوقات کی یہ ابتداء وانتہاء اور یہ تعیین صرف علامات واسباب کے درجے کی چیزیں ہیں اور اسباب وعلامات کے منتفی ہونے سے اصل حکم مسبب منتفی نہیں ہوتا، جیسا کہ ”فتح القدیر“ وغیرہ میں مکمل بحث موجود ہے البتہ علت کے منتفی ہونے سے معلول حکم منتفی ہوتا ہے۔

نماز پنج گانہ کے فرض ہونے کی اصل علت نصوص قرآنیہ مطلقہ ہیں مثلاً: ”أقيموا الصلاة“ (۱) وغیرہا اور اس کی شرح اس حدیث پاک میں ہے: ”إن الله تعالیٰ فرض علی كل مسلم ومسلمة فی كل يوم وليلة خمس صلوٰت“ (۲) اور اس حدیث جیسی اور احادیث میں بھی ہے اور یہ سب مشاہیر احادیث رواۃ الصحاح میں سے ہیں۔

اگر اس مسئلہ کی پوری بحث تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو ۱۹۸۳ء کے لندن کے سیمینار کے موقع میں جو جناب عبداللہ مغرم مامور فی المملکۃ السعودیہ کی نگرانی میں ہوا تھا، اس کے تفصیلی جواب میں اس کی تفصیل بصیرت کے ساتھ ملے گی یہ تفصیلی جواب عربی اور اردو دونوں زبان میں ہے، عربی جواب دار العلوم کے رسالہ الدراسۃ میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اردو جواب احقر کے پاس سے غیر مطبوعہ مل سکتا ہے۔

ان احکام کی تائید حدیث دجال سے بھی ہوتی ہے، حدیث دجال صحاح میں مروی ہے، خاص کر مسلم شریف میں بہت تفصیل سے مذکور ہے، حدیث بہت طویل ہے صرف بقدر ضرورت یہاں نقل کی جاتی ہے، دجال چالیس یوم تک رہے گا، اس کا پہلا دن چھ ماہ کا ہوگا پھر کم ہوتے ہوتے مثل شررہ کے ہو جائے گا۔

۱- سورۂ بقرہ: ۴۳۔

۲- ”وفی أبی دائود: جاء رجل إلی رسول الله ﷺ وهو......فاذا هو سأل عن الاسلام فقال رسول الله ﷺ: خمس صلوات فی اليوم والليلة“ (ابوداؤد ۱/۶۰ حدیث نمبر ۳۹۱، کتاب الصلاۃ)۔

"عن أبي أمامة الباهلي رضی اللہ عنہ قال رسول الله ﷺ: وإن إيامه (أى أيام دجال) أربعون يوماً إلى قوله وآخر أيامه كالشررة يصبح أحدكم على باب المدينة، فلا يبلغ بابها الآخر حتى يمسي، فقيل له كيف نصلي يارسول الله في تلك الأيام القصار! قال: تقدرون الصلوة، كما تقدرون في هذه الأيام الطوال، ثم صلوا، أو كما قال"

آپ کے فرمان "تقدرون الصلوۃ الخ" کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح چھ ماہ اور دوسرے بڑے بڑے دنوں میں اندازہ سے فرق کر کے پانچوں نمازیں پڑھو گے، اسی طرح چھوٹے چھوٹے دنوں میں بھی اندازہ سے فرق کر کے تمام نماز پنج گانہ پڑھتے رہنا۔

حاصل یہ نکلا کہ جس طرح چھوٹے سے چھوٹے دن میں دن کی سب نمازیں اندازہ کر کے پڑھنا خواہ تھوڑا ہی تھوڑا فصل ووقفہ کر کے ہو بلکہ اگر متصلاً دن کی نمازیں اندازہ کر کے پڑھنی پڑیں تب بھی پڑھتے رہنا (اسی طرح سے چھوٹی سے چھوٹی راتوں میں بھی رات کی سب نمازیں اندازہ کر کے، خواہ متصلاً تینوں نمازیں رات کی پڑھنی پڑیں یا کچھ وقفہ کے ساتھ پڑیں پڑھتے رہنا)۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ۲۴ رگھنٹہ میں اللہ تعالیٰ نے جو پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں ان کی تعمیل ہوتی رہے اور رشتہ عبودیت الی المعبود صحیح ومستحکم رہے۔

نوٹ: ابتداء وقت عصر میں اور ابتداء وقت عشاء میں ایک قول امام اعظم سے بھی صاحبین کے قول کے مطابق ملتا ہے اور اس پر عمل کر لینے کی گنجائش بھی ہے، لیکن جہاں امام کا قول صراحۃً ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے میں تعذر وغیرہ بھی نہیں ہوتا ہو وہاں اختلاف سے محفوظ رہنے کی خاطر امام کے ہی قول پر فتویٰ ہوتا ہے باوجود اس کے اگر کوئی عذر شرعی کی وجہ سے صاحبین کے قول پر عمل کرے تو مسلکِ حنفیت سے خارج شمار نہیں کیا جائے گا، باقی صورتِ مسئولہ میں مذکورہ حالات کے تحت اس مسئلہ میں بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کما لا یخفی۔

کیونکہ یہاں پر تو امام کے قول کے مطابق ابتداء عصر اور ابتداء عشاء کا وقت ظاہر ومحسوس ہی نہیں ہوتا کہ مفتیٰ بہ اور غیر مفتیٰ بہ قول کی بحث پیدا ہو سکے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

شبہ یہ ہے کہ بعض علماء متاخرین نے فرمایا ہے کہ جس جگہ عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا ہو یا مفقود رہتا ہو ملتا نہ ہو

وہاں عشاء کی نماز فرض نہ ہوگی، جیسا کہ اہل بلغاریہ پر اگر کوئی کہے جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے اسی پر قیاس کرکے کہ یہی حکم اس جگہ کا بھی ہوگا جہاں عصر کا وقت داخل نہ ہوتا ہو کہ وہاں عصر فرض ہی نہ ہوگی اور وجوب ادا کا حکم متوجہ نہ ہوگا، اس طرح کا حکم سمجھنا اور اس طرح کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ تعبیر اس طرح ہونی چاہئے کہ ان مقامات میں عصر وعشاء کے وقت کا ادراک اور احساس نہیں ہوتا ہے اور یہ اوقات محسوس وظاہر نہیں ہوتے ہیں اور یہ کہنا کہ وہاں عصر وعشاء کی نماز فرض ہی نہ ہوگی تو اس قول کا مبنی وہی غلطی ہے کہ ان اسباب وعلامات کو علت فرضیت سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ یہ اسباب علت فرضیت نہیں ہیں جیسا کہ بعض محققین متقدمین کے قضا وادا کے کلام میں گذر چکا ہے کہ علت فرضیت تو مخصوص آیاتِ قرآنیہ ہیں اور قرآن پاک کلام الٰہی ہے اور کلامِ تربیت ہے اور تدریجی طریقہ اصلاح کا کلام ہے، اسی نماز کے حکم میں غور فرمائیے ایک جگہ بہت مختصر جامع کلمہ فقط "أقيموا الصلوة" فرمادیا گیا ہے پھر ایک جگہ ذرا وضاحت فرمائی گئی کہ "أقم الصلوة لدلوک الشمس إلى غسق الليل وقرآن الفجر إن قرآن الفجر كان مشهوداً" (۱) فرمایا گیا اور اس میں پانچوں نمازوں کو مجمل طور پر بیان فرمایا گیا اسی کی ترجمانی حضور پاک ﷺ نے "إن الله فرض على كل مسلم ومسلمة خمس صلوة في كل يوم وليلة" والی حدیث میں فرمائی، یہی آیت وحدیث حکم فرضیت صلوٰۃ کی اصل علت ہیں اور اس آیت وحدیث سے معلوم ہوگیا کہ جب تک ۲۴ گھنٹہ میں یوم ولیل بنتا رہے، اس وقت تک یوم ولیل کی مقدار کم ہو یا زیادہ ان میں یہ پانچ نمازیں پڑھی جائیں گی۔

لہٰذا اب یہ کسی کا کہنا کہ عصر کا وقت یا عشاء کا وقت نظر نہ آیا تو وہ نماز فرض ہی نہ رہی بداہۃً غلط ہوجائے گا جمہور متقدمین ائمہ مجتہدین کے نزدیک یہی راجح ہے اور ایام معتدلہ میں جہاں سورج کا طلوع وغروب معتدل رہتا ہو وہاں پانچوں نمازوں کے وقت کی ابتداء اور انتہاء امامت جبرئیل والی حدیث میں بتلادی گئی اور جہاں طلوع وغروب ۲۴ گھنٹہ میں یومیہ نہ ہوتا ہو بلکہ زائد مقدار تک طلوع یا غروب رہ جاتا ہو وہاں کے لیے حدیث دجال میں حکم بتلادیا گیا۔

پھر تمام نماز کے اوقات کو تھوڑا تھوڑا کرکے حسب مصلحت وحکمت تربیت قرآن پاک کے مختلف مقامات میں بیان فرمادیا گیا، چنانچہ دو ڈھائی سو آیات سے زیادہ آیات میں نماز سے متعلق اوقات واحکام بیان فرمائے گئے اور نمازوں کی غرض وغایت "وأقم الصلوة لذكرى" (۲) میں بیان فرمادی گئی کہ میری یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لیے اور مجھ سے رشتہ

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔

۲- سورۂ طٰہٰ: ۱۴۔

عبودیت محکم واستوار رکھنے کے لیے نماز پڑھا کرو۔

اس آیت کریمہ کے اشارہ سے بھی نیز حدیث دجال والی روایت سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ ایام معتدلہ میں دو نمازوں کے درمیان جس انداز کا فرق وبعد ہوتا ہے اسی انداز کا فرق وبعد طویل ایام میں قائم کر کے ۲۴ رگھنٹہ کی ایک مقدار غروب اول سے شمار کر کے نصف اول کو شب قرار دے کر اس میں رات کی تینوں نمازوں مغرب، عشاء اور فجر کو جہر سے پڑھ لیا کریں اور نصف ثانی کو یوم قرار دے کر اس میں دن کی نمازیں ظہر اور عصر کو سراً پڑھ لیا کریں تا کہ خالق کائنات کے ساتھ رشتہ عبودیت برابر قائم رہے۔

غرض ابتداء عصر وعشاء یا ابتداء فجر کا وقت الگ الگ اور جدا جدا ظاہر نہ ہونے کے باوجود مذکورہ بالا دلائل کے مطابق دونوں نمازیں عشاء مع الوتر اور فجر بہیت ادا پڑھنا فرض رہے گا، یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آفتاب کا ۱۸ر درجہ وغیرہ زیر افق ہونا اداء نماز کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے لیے مدار نہیں ہے، بلکہ ان ہی دلائل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام عباداتِ محضہ کی ادائیگی صحت کا مدار علوم اہل فلکیات اور علوم اہل ہندسہ کی تحقیقات اور تدقیقات پر نہیں ہے اور نہ ان کو اصل نصوص اور شرعی علامات واسباب پر فوقیت دی جاسکتی ہے، بلکہ اصل مدار اور فوقیت صرف اور صرف نصوص قرآنیہ اور حدیث پر ہے، بلکہ شرعی علامات واسباب بھی ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اور ماہرین فلکیات اور ماہرین ہندسیات کا صرف تابعیت وفرعیت کے درجہ میں اطمینان قلب اور تسکین قلبی کے لیے لحاظ کریں تو مضائقہ نہیں اور یہ بھی صرف میدانی علاقوں کے ان خطوں میں جہاں طلوع وغروب وغیرہ متعادل ومنتظم اور تدریجی ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کا حساب وغیرہ نصوص وعلامات واسباب شرعیہ کے مطابق ہو اور مروجہ نقشہ بھی ان اسباب وعلامات کے موافق ہو نیز گھڑیاں بھی ان نقشوں کے مطابق ہوں ورنہ ان چیزوں کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہوگی اور ان کا شرعاً کوئی اعتبار نہ ہوگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"یسئلونک عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج"(۱) **"ويسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربي وما أوتيتم من العلم إلا قليلاً"** (۲) کے اشارہ سے، نیز حدیث پاک: **"نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب" أوكما قال عليه السلام"** (۳)۔

اور اس جیسی دوسری احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے، پس عرض البلدتین سے، بلکہ اس کے کچھ قبل ہی سے جہاں

۱- سورۂ بقرہ:۱۸۹۔
۲- سورۂ بنی اسرائیل:۸۵۔
۳- اس حدیث کی تخریج وتحقیق رویت ہلال اور اختلاف مطالع کے جواب کے ضمن میں گذر چکی ہے)(مرتب)۔

سے طلوع وغروب کے اوقات اعتدال اور تدریج کے ساتھ نہ ہوں بلکہ غیر معتدل یا غیر تدریجی ہوجائیں وہاں اس حساب کو "لیطمئن قلبی" کے درجہ میں بھی علی الاطلاق اعتبار کرنا صحیح نہ ہوگا، جیسا کہ برطانیہ اوراس سے شمال کی سمت کے اکثر ممالک ومقامات جن میں طلوع وغروب کے اوقات تدریجی تفاوت اور اعتدال کے ساتھ نہ ہوں ایسے ممالک اور خطوں میں صرف نصوص اور شرعی علامات واسباب منصوصہ پر صحت عباداتِ محضہ کا مدار رکھا جائے گا، بلکہ اگر شرعی علامات واسباب بھی ظاہر ومحسوس نہ ہوں تو محض نصوصِ قرآنیہ وحدیثیہ پر مدار رکھ کر انداز ہ وتحری سے عمل کرلینا کافی اور صحیح ہوجائے گا۔

۳-مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ "إمساک عن الأکل والشرب للصوم" میں بھی ۱۸/ ۱۲/درجہ افق سے نیچے آفتاب کا ہونا شرط نہیں ہوگا۔

اور ادائیگی صوم کی صحت کے لیے ان درجات سے نیچے آفتاب کے ہونے پر مدار نہ ہوگا، بلکہ شرعی علامات واسباب کا ظہور جب تک سادہ فطری اصول مشاہدہ وغیرہ سے ہوتا رہے کہ غروب کے بعد افطار اور کھانے پینے اور مغرب وعشاء وتر کی نماز ادا کرلینے کے ساتھ اگر سحری کھانے اور فجر کی نماز پڑھنے کا وقت ملتا رہے تو گھڑیاں رکھ کر اس کے مطابق انتظام کر کے عمل کرتے رہنا درست وصحیح ہوگا اور جب ان شرعی علامات واسباب کا ظہور سادہ فطری اصول سے بھی دشوار ومتعذر ہوجائے تو نصوص قرآنیہ واحادیثیہ پر مدار رکھ کر کہ وہ اصل ومتبوع اور علتِ احکام ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں ان پر صحیح عمل کرلینا کہ وہ سارے عالم کے لیے مدارِ صحتِ اعمال اور مدار نجات ہیں کافی اور درست رہے گا۔

پس ان نصوص واحادیث کا جو مفہوم قرون ثلثہ مشہود لہا بالخیر میں لیا گیا ہے اور جس کی تفصیل وتشریح جس طرح ائمہ اربعہ متقدمین ائمہ ہدیٰ نے کی ہے جن کے اہل حق ہونے پر اجماع سلف ہو چکا ہے، اسی تفصیل وتشریح کے مطابق عمل کرلینا کافی اور درست ہوگا، اور عنداللہ مقبول ہوگا، جیسا کہ عرض البلدتین کے بعد جوں جوں شمال کی جانب بڑھیں گے یہی اصول معمول بہا اور صحیح ہوگا، پس جب شرعی علامات واسباب بالکل ظاہر نہ ہوں تو محض نصوص واحادیث کے حکم کے مطابق محض اندازہ اور تحری کر کے طلوع آفتاب سے پہلے ہر عمل کا انتظام کر کے اس پر عمل کرلیں۔

آپ کی تحریر کے مطابق تو آپ کے علاقہ اور خطے میں افطار وطعام نماز ہر چیز سے فارغ ہو کر طلوع آفتاب سے سوا گھنٹہ قبل سے تکمیل صوم کا موقع نظر آتا ہے، پس اسی کے مطابق عمل رکھنا عنداللہ مقبول ہوگا اور مدار نجات کے لئے کافی ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جن مقامات میں عشاء کا وقت نہیں ملتا وہاں نماز پڑھنے کا طریقہ؟

(الف) دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں پر بعض موسموں میں بائیس، تئیس گھنٹہ کا دن ہوتا ہے، ایک طرف سورج غروب ہوا کہ دوسری طرف سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد دن ہو جاتا ہے، وہاں پر مغرب تو پڑھ سکتے ہیں عشاء کا وقت نہیں ہوتا، اور فجر پڑھیں گے یا نہیں؟ نیز وہاں پر ظہر وعصر دن کے کون سے حصہ میں پڑھیں گے؟

نارتھ شال میں سیوون ناروے اور دوسرے جزیرے ہیں، وہاں پر ایک مسلمان بھائی خود رہا تھا اور اس نے خود وہاں پر دیکھا ہے، نیز وہاں پر ترک مسلمانوں کی مسجد ہے اور وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں، مگر نہیں معلوم کہ کونسے وقت میں پڑھتے ہیں۔

(ب) نیز سردیوں میں رات لمبی ہوتی ہے، ایک دو گھنٹہ کے لیے سورج طلوع ہو جاتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے، وہاں پر پانچوں نمازیں کس وقت پڑھیں گے؟

الجواب وبالله التوفيق:

(الف) اگر چہ دن ۲۲/ ۲۳ گھنٹہ کا ہوتا ہے مگر جب آفتاب کا طلوع وغروب روز ہوتا ہے تو غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھ لیں اور طلوع ہونے سے کچھ پہلے فجر کی نماز پڑھ لیں۔ درمیان میں اگر چہ عشاء کا وقت نظر نہیں آتا، لیکن مغرب وفجر کے درمیان جب موقع ہو عشاء کی نماز بھی بلالحاظ جمع بین الصلوتین پڑھ لینا ضروری ہے، اگر چہ وقت کی تنگی وقلت سے سنن ونوافل کا موقع ووقت نہ ملے مگر فرض، وتر پڑھ لینا چاہئے، مفتی بہ قول میں ایسا نہیں ہے کہ عشاء کی نماز ساقط ہو جائے۔

(ب) اسی طرح سردیوں میں بھی جب تک آفتاب روزانہ طلوع وغروب ہوتا رہے اگر چہ گھنٹہ دو گھنٹہ ہی کے لیے تو طلوع وغروب کی پوری مقدار کے نصفِ ثانی کے شروع ہوتے ہی ظہر پڑھ لیں اور غروب ہونے سے کچھ قبل عصر پڑھ لیں سنن ظہر کا وقت نہ ملے جب بھی فرض ضرور پڑھ لیا کریں، اتنی ہی مقدار کے یہ لوگ مکلّف ہیں، اس سے پورے عابد شمار ہوں گے۔

(ت) جہاں مسلسل کئی دن یا کئی ہفتہ یا ماہ آفتاب غروب نہیں ہوتا یا طلوع نہیں ہوتا وہاں بھی ۲۴ گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیل (دن رات کا ایک چکر) متعین کر کے اس کے اجزاء میں پانچوں نمازیں ادا کریں گے اور نمازوں کے درمیان فصل و

فاصلہ کا وہی تناسب رکھیں گے جو یہاں معتدل ایام کے ملکوں میں ہوتا ہے (۱)۔

اور چوبیس گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیلی معلوم کرنے کے لئے کہ اس کی ابتداء کب سے اور کس طرح کریں تو اس کا آسان اور سہل طریقہ یہی ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہو کر طلوع نہ ہونا شروع ہو جائے بلکہ مسلسل غروب ہی رہے اس دن کے غروب سے ۲۴ر گھنٹہ تک کی مقدار کو پورے ایک دن ایک رات کی مقدار شمار کر کے اس میں حسب تصریح بالا پانچوں نمازیں ادا کریں، اور پھر اس ۲۴ گھنٹہ کے ختم ہونے پر دوسرا ۲۴ر گھنٹہ، پھر تیسرا ۲۴ر گھنٹہ مقرر کرتے جائیں اور ان سب میں مثل اول ۲۴ر گھنٹہ کے نصف اول رات قرار دے کر اس میں رات کی نمازیں اور نصف ثانی کو دن قرار دے کر دن کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں، اور دن بڑا ہوتے ہی جس دن آفتاب طلوع ہو کر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو اس میں پہلا دورہ مکمل کرنے کے لئے صرف ۱۲ر گھنٹہ کی مقدار پر ایک دورہ یومی ولیلی مکمل قرار دیں اور اس بارہ گھنٹہ میں دن کی نمازیں ادا کریں، اس بارہ گھنٹہ کا دورہ ختم ہونے کے بعد پھر ۲۴ر ۲۴ گھنٹہ کی مقدار کا دورہ یومی ولیلی (دن رات کا مجموعہ) مقرر کرتے جائیں اور اس کے نصف اول میں رات کی نمازیں (مغرب، عشا، فجر) پڑھتے جائیں اور نصف ثانی میں دن کی نمازیں (ظہر وعصر) پڑھتے جائیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح العبد محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

وہ مقامات جہاں شفق ابیض اسی طرح شفق احمر غائب نہیں ہوتی وہاں نماز وروزہ کا حکم:

وہ علاقہ جہاں پر شفق ابیض غائب نہوئی اسی طرح جہاں پر شفق احمر بھی غائب نہیں ہوئی وہاں کے لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ عشاء کی نماز کے لئے تقدیر کرے جیسا کہ درمختار میں ہے **فیقدر لهما** اور فجر کے متعلق لکھتے ہیں کہ فجر طلوع ہوئی ہے، کبلغار **فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق** الخ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں پر عشاء کا وقت نہیں ہوتا وہاں پر طلوع فجر ہوتی ہے اس میں حسب ذیل سوالات وارد ہوتے ہیں امید ہے کہ ان کو حل فرمائیں گے۔

۱- قال الرملی فی شرح المنهاج ويجری ذلک فيما لو مكثت الشمس عند قوم مدة الخ قال فی امداد الفتاوی قلت وكذلک يقدر لجميع الآجال كالصوم والزكوة والحج والعدة واجال البيع والسلم والاجارة وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الاربعة بحسب ما يكره كل يوم من الزيادة والنقص كذا فی كتب الائمة الشافعية، ونحن نقول بمثله اذا صل التقدير مقول به اجماعا فی الصلوة شامی ۱/ ۲۴۴ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

(الف) درمختار کی عبارت ہے "**فیقدر لهما**" علامہ شامیؒ بحث کرتے ہیں جس سے بظاہر یوں مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اقرب البلاد پر قیاس کرکے عمل کرنا غیر صحیح ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: **بقي الكلام في معنى التقدير والذي يظهر من عبارة الفيض أن المراد أنه يجب قضاء العشاء، بأن يقدر أنَّ الوقت أعني الوجوب، قد وجد كما يقدر وجوده في أيام الدجال على ما يأتي، لانه لايجب بدون السبب، فيكون قوله: ويقدر الوقت جوابا عن قوله في الأول لعدم السبب، وحاصله إنا لا نسلم لزوم وجوب السبب حقيقة، بل يكفي تقديره كما في أيام الدجال، ويحتمل أن المراد بالتقدير المذكور هو ما قاله الشافعية من أنه يكون في حقهم يقدرما يغيب فيه الشفق في أقرب البلاد إليهم والمعنى الأول أظهر الخ** (۱)۔

لہٰذا عرض ہے کہ "درمختار" کی عبارت میں تقدیر سے کیا مراد ہے؟

"ب" فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں عشاء کا وقت مفقود ہے وہاں فجر طلوع ہوئی ہے اس میں ایک علمی سوال وارد ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "**كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر**" (۲)۔ اس میں بالاتفاق اسود سے رات کی سیاہی اور ابیض سے صبح صادق کی سفیدی مراد ہے اب سوال یہ ہے کہ ملک بلغاریا اس کے مانند بلاد میں واقع علاقہ جہاں تمام لیل شفق ابیض باقی رہتی ہے یعنی غائب نہیں ہوتی اسلئے عشاء کا وقت نہیں ہوتا ہے اور آیت قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ طلوع فجر کے لئے اسود ہونا لازم ہے اور ان علاقوں میں پوری رات بیاض موجود ہونے کی وجہ سے طلوع فجر کس طرح ہوگی، لہٰذا عرض یہ ہے کہ فقہاء کی عبارت میں طلوع فجر سے کیا مراد ہے کیوں کہ تمام فقہاء جنہوں نے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے تمام یک زبان ہیں کہ طلوع فجر ہوئی ہے اور کسی نے تردید نہیں کی نیز آیت مذکورہ میں اسود سے کیا مطلب ہے رات کی مکمل تاریکی یا نفس تاریکی اسی طرح وجود شفق بیاض کی وجہ سے طلوع فجر کی جو تعریف فقہاء نے کی ہے وہ کس طرح صادق آئے گی۔

۲- طلوع فجر صادق سے قبل کاذب کا ہونا لازم ہے؟

۳- طلوع فجر جہاں سے کھانا پینا روزہ رکھنے والوں کے لئے حرام ہے اور فجر کی نماز پڑھنا جائز ہے وہ طلوع فجر صادق کے حصہ اوّل سے یا انتشار سے علامہ شامی لکھتے ہیں: "**نعم في كون العبرة بأول طلوعه أو استطارته إلى**

۱- مطلب فی فاقد وقت العشاء کتاب الصلاۃ ۱/۲۴۲ دار احیاء التراث بیروت۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

قوله إن الأول أحوط والثاني أوسع" اس عبارت میں بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ طلوع فجر کے بعد بھی سحری وغیرہ کھائی جاسکتی ہے، لہٰذا اوالثانی اوسع اور عبارت مذکورہ کی مالہ وماعلیہ مراد کیا ہے، نیز اگر اوسع صحیح ومفتی بہ ہے تو استطار وانتشار کا معیار کیا ہوگا۔

امید ہے کہ مذکورہ سوالات کو حل فرما کر ممنون فرمائیں گے یہ احقر برائے تشفی اور ازدیاد علم کے لئے عرض خدمت کررہا ہے لہٰذا مدلل جواب مرحمت فرمائیں گے اگر جرم نہ ہو ورنہ ان دلائل کی طرف اشارہ کردیا جائے۔

یوسف (باٹلی یوکے انگلینڈ)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- وہ علاقہ جہاں پر شفق ابیض غائب نہیں ہوتی یا وہ علاقہ جہاں پر شفق احمر بھی غائب نہیں ہوتی یا وہ علاقہ جہاں آفتاب اس سے بھی کم یا محض تھوڑی دیر کے لئے غائب رہتا ہے، ان سب مقامات کے لئے متن "درمختار" میں ہے: "**وفاقد وقتها مكلف بهما فيقدر لهما، وقيل: لا مطلب في فاقد وقت العشاء**" (۱) اس عبارت کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ ان تمام مقامات میں یعنی عشاء اور فجر دونوں کے لئے لوگ مکلف رہیں اور ان دونوں نمازوں کے لئے یعنی (عشاء وفجر کے لئے)، ایک وقت مقدر مانا جائے گا یہ عام فقہاء کا قول ہے اور ظاہر الروایۃ یہی ہے باقی بعض فقہاء کے نزدیک ایسا نہیں ہے اور "درمختار" میں بطور مثال کے "**كبلغار**" "**فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق**" کہا ہے اور بعض فقہاء نے جو "**لهما**" کا مرجع عشاء کا فرض ووتر لیا ہے، اس میں بھی یہی مندرجہ گفتگو جاری ہوگی۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جہاں پر عشاء کا وقت نہیں ملتا، یعنی اس کے غایت درجہ خفی ہونے کی وجہ سے نہ نظر آتا ہے اور نہ اس کا ادراک ہی ہوتا ہے وہاں بھی فجر کا طلوع ہوتا ہے اور " **فاقد وقتها** " کا ترجمہ عشاء کا وقت نہیں ہوتا صحیح نہیں ہے، بلکہ نہ پانا صحیح ترجمہ ہوگا، اس لئے کہ فاقد کے معنی نہ پانے والا ہے نہ کہ نہ ہونے والا، کیونکہ فقدان کے معنی نہ پانے کے ہیں نہ ہونے کے نہیں ہیں **كما لا يخفى** اور دونوں کے مفہوم میں بہت فرق ہے۔

ان عبارات پر جو اشکالات جناب نے ظاہر فرمائے ہیں بجا ہیں ان سب کا حل احقر اپنی بضاعت کے مطابق عرض کرتا ہے خدا کرے صحیح ہو، مذکورہ بالا متن اور اس کی شرح (درمختار) پر علامہ شامی نے جو دو تین صفحہ تک بے نظیر بحث

۱- كتاب الصلاة ۱/ ۲۴۲، دار احیاء التراث، بیروت۔

فرمائی (۱) ہے، اس میں فقہاء کرام کے متضاد نظریات وتحقیقات منقول ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب سے اتفاق ممکن نہیں، بلکہ محض کسی ایک کی مطلقاً موافقت کا کوئی مرجح نہیں ہے۔

اس لئے کہ ذہین انسان کے ذہن میں لامحالہ بہت سے اشکالات وارد ہوں گے، جیسا کہ جناب نے بھی متعدد اشکالات فرما کر ان کا حل طلب فرمایا ہے، احقر اپنے بے بضاعت و بے استعداد وکم فہم ہونے کے باوجود انہیں فقہائے کرام ”صواباً فمن الله وان كان خطأ فمن تلقاء نفسي بل على الله التكلان واليه المرجع والمآب ومنه اسئل التوفيق والسداد“ ہر ایک کا حل حسب نمبر سوال مذکور ہے۔

”الف“ یہ صحیح ہے کہ اقرب بلاد پر قیاس کرنا غیر صحیح ہے اور فیض کی عبارت کا یہ مفہوم (۲) توضیح او رتسلیم ہے، مگر ایام دجال پر قیاس کرنا یہ ہمہ وجوہ صحیح نہیں، بلکہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ حدیث دجال میں آتا ہے کہ وہ چالیس دن رہے گا (۳)، اور اس کا ایک دن چھ ٦ مہینہ کا ہوگا اور ایک دن چالیس دن کے برابر ہوگا اور سات ۷ دن ایک ہفتہ کا ہوگا باقی اور ایام ایسے ہی ہوں گے۔ آجکل تو ظاہر ہے کہ ان دنوں میں جو آجکل کے مثل ہوتے ہیں ان سے تو اس تقدیر کا تعلق نہیں ہے جو وہ انہیں دنوں سے ہے جن میں روزانہ کی طرح، یعنی چوبیس گھنٹہ میں آفتاب غروب ہوکر طلوع نہ ہوگا وہاں کا کیا حکم ہوگا (اندازہ کر کے نماز پڑھتے رہنا)۔

اور صورت مجوزہ عنہا میں آفتاب چوبیس ۲۴ گھنٹہ میں غروب ہوکر طلوع ہوتا ہے، پس ”يقدر لهما“ کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مثل حدیث دجال کے وقت کا اندازہ کرے اس کے اندر نماز ادا کی جائے، بلکہ یہ مفہوم ہوگا کہ غروب وفجر کے درمیان میں ایک وقت عشاء کا ضرور گذرتا ہے اور اگر چہ وہ وقت نہایت دقیق و خفی ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے یا اس کا ادراک نہ ہوسکے اور اس کے اندر نماز نہ پڑھی جاسکے تو بھی اس وقت کو مقدر اور موجود مانکر اس کے ختم ہوجانے اور گذرجانے کی وجہ سے عشاء وتر کی دوسرے وقت میں قضاء کی جائے جس طرح اوقات ظاہر کے ختم ہوجانے اور گذرجانے پر قضا کی

۱- شامی ۱/ ۲۶۶ تا ۲۶۸، مکتبہ فیض القرآن دیوبند۔

۲- ”ان المراد انه يجب قضاء العشاء بأن يقدر الوقت أعني سبب الوجود قد وجد“ (شامی ۱/ ۲۶۶، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

۳- روى انه ﷺ ذكر الدجال قلنا: مالبسه في الأرض قال: أربعون يوما يوم كسنته ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر أيامه كأيامكم قلنا: يا رسول الله فذالك اليوم الذى كسنته اتكفينا فيه صلوٰة يوم قال لا اقدر واله“ (رواہ مسلم شامی ۱/ ۲۶۷، مکتبہ فیض القرآن) (مرتب)۔

جاتی ہے۔وھذا ظاہر اوراس گفتگو سے جناب کا یہ اشکال حل ہو گیا کہ تقدیر سے کیا مراد ہے،یعنی اس سے وقت کا اندازہ کر کے اس میں پڑھنا مراد نہیں ہے، بلکہ نفس وقت کے وجود کو مقدر اور تسلیم کرنا مراد ہے اور یہ الگ بات ہے کہ عشاء کا سارا وقت یا اس کا بعض حصہ غیر محسوس اور غیر مدرک ہوتا ہے یا فجر کے وقت کی ابتداء وشروع غیر محسوس اور غیر مدرک ہے اور باقی حصے میں اتنا وقت مل جائے کہ نماز فجر ادا کی جا سکے خواہ مختصر ہی سہی اور طلوع آفتاب کے کچھ ہی پہلے سہی تو بجائے قضاء کے ادا کر لی جائے ہاں اگر اس میں بھی اتنا وقت نہ ملے کہ نماز ادا کی جا سکے تو مثل عشاء کے اس کی بھی قضاء کی جائے۔زیلعی کے کلام سے اس طرح اشارہ ملتا ہے (۱)،اور درمختار کا یہ قول:"ولا ينوي القضاء الخ " (۲)،متن کے بالکل متضاد ہے اور تسلیم نہیں اسی طرح مقطوع الیدین رجلین پر قیاس تسلیم نہیں کیوں کہ یہاں محل حکم ہی مفقود ہے اور فاقد وقت میں ایسا نہیں نیز اس شخص کے اصول پر قیاس کرنا بھی تسلیم نہیں جو طلوع آفتاب کے بعد اسلام قبول کرتا ہے اور اس پر اس سے قبل کی نمازوں کا وجوب نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں قبل اسلام کا وہ شخص خطاب ونصاب کا اہل نہیں رہتا کہ یہ حکم متوجہ ہو اور یہاں اہل رہتا ہے اسی طرح یہاں حائضہ وغیرہ کے حکم پر بھی قیاس کرنا تسلیم نہیں اس لئے کہ یہاں وجوب کے معانی احادیث صحیح وصریح سے ثابت ہیں اور یہاں نہیں اس لئے یہ سب قیاسات مع الفارق ہوں گے،اور کلام الٰہی **"حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر "**(۳) میں اسود سے رات کی سیاہی مراد لینے پر جو اشکالات فرمایا ہے وہ بھی غایت ذہانت سے ہے،اور اس کا حل یہ ہے کہ منطوق کلام الٰہی میں خیط اسود رات کی سیاہی سے مقصد یہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تعبیر ہے اور عام حالات واماکن کے اعتبار سے ہے اور غلط نہیں ہے اور اگر کوئی قید اس منطوق **"حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر"**(۴) میں **"هيتو من الفجر "**کی ہو سکتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ فجر طلوع ہوتے وقت جو ایک سیاہی ہوتی ہے،رات کے حصہ میں ہو یا شفق احمر یا ابیض کے حصہ میں ہو اور خواہ گہری سیاہی ہو یا مفصل سیاہی ہو وہ سیاہی جب فجر کے بیاض سے (جو چمکدار ہوتی ہے) تبین ہو جائے تو وہ مبیّن صائم کے لئے منتہائے اکل و شرب ہوگا اور وہیں سے ابتداء فجر وسحر شروع ہوتی ہے،جیسا کہ فقہاء کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے:**"وقت الصبح**

۱- "ما اورده الزيلعي عليه من أنه يلزم من عدم نيته القضاء ان يكون اداء ضرورة" (شامی ۱/۲۶۷،مکتبہ فیض القرآن)(مرتب)۔

۲- شامی ۱/ ۲۶۷،مکتبہ فیض القرآن۔

۳- سورۂ بقرہ:۱۸۷۔

۴- سورۂ بقرہ:۱۸۷۔

من ابتداء طلوع الفجر الصادق وھو الذی یطلع عرضا منتشراً"(۱)۔

وھکذا فی عامۃ کتب الفقہ اور یہ متبین وتمیز ایک لمعہ (چمک) سے ہوتا ہے کہ فجر صادق طلوع ہونے کے وقت جہاں سے آفتاب طلوع ہونے والا ہے وہاں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوتی ہے جو سابق کے رنگ وحالات سے جدا اور متمیز ہوتی ہے پھر وہی چمک افق میں دائیں بائیں پھیلنے لگتی ہے اور ابتداء فجر ہی اس چمک وانتشار کی تعین میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے، جیسا کہ طحطاوی علی المراقی (ص ۱۳۹) سے جو (جواب ۳) میں آئے گی معلوم ہوتا ہے اور اصحاب متون نے احکام میں لمعہ کی ابتداء معتبر ماننے کے بجائے اس کے استطارو انتشار کو حدیث "مسلم وترمذی" کی مدد سے اختیار فرمایا ہے اور یہ لمعہ (چمک) اس خاص وقت میں ہر جگہ اور ہر ملک میں جہاں آفتاب طلوع ہونے والا ہوتا ہے ہوتی ہے، خواہ رات کی سیاہی میں ہو یا شفق احمر یا شفق ابیض میں ہو ہر جگہ ہوتی ہے اور اپنے ماقبل کی حالت سے متمیز ہوتی ہے۔ خواہ اول وہلہ میں دقیق مخفی رہے اور بعد چند سیکنڈ کے نمایاں اور واضح ہو۔ غرض اس تمیز کی حالت سے قبل کی حالت جو مضمحل وکمزور ہوگی اس کا مفہوم ہی ہے کہ اس میں سیاہی مشوب ومختلط ہوتی ہے، خواہ وہ سیاہی شفق ہی ہو یا غیر شفق ہو یہی سیاہی آیت کریمہ میں مذکور ہے، جس کا حاصل محض رات کی سیاہی نہیں ہے، بلکہ نفس سیاہی ہے اور یہی سیاہی منطوق نص میں مراد ہے اور اس سے طلوع فجر کی تعریف جو فقہاء نے کی ہے پھر وہ بھی واضح ہوگئی۔

(۲) طلوع فجر صادق سے قبل فجر کاذب کا ہونا ہر جگہ لازم نہیں ہے، بلکہ انہیں مقامات میں ہوتا ہے جہاں شفق ابیض کے غروب کے بعد رات کا معتد بہ حصہ گذرتا ہے، جیسا عرض سے قبل کے بعض حصے۔

(۳) ابتداء طلوع فجر صادق میں فقہاء کے دو قول ہیں، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "**فی مجمع الروایات ذکر الحلوانی فی شرحہ للصوم أن العبرۃ لأول الطلوع، وبہ قال بعضھم: فإذا بدت لمعۃ لہ أمسک عن المفطرات، وقال بعضھم: العبرۃ لاستطارتہ فی الأفق، وھذا القول أبین وأوسع والأول أحوط وروی عن محمدؒ أنہ قال: اللمعۃ غیر معتبر فی الافق فی حق الصوم و حق الصلوۃ، وانما یعتبر الانتشار فی الأفق قالہ فی الشرح**" (۲)۔

مگر اصحاب متون نے عموماً قول ثانی کو لیا ہے اس لئے کہ اس کی تائید وتقویت مسلم شریف وترمذی شریف کی

۱- المراقی مع الطحطاوی ص ۱۷۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان۔

۲- طحطاوی علی المراقی: ۱۷۰، دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان، فی اول کتاب الصلوۃ۔

روایت "**لا يمنعكم من سحوركم أذان بلال ولا الفجر المستطيل، ولكن الفجر المستطير في الأفق**"(۱)۔

معلوم ہوتی ہے، لیکن اس فرق سے یہ بات نہیں نکلتی کہ لمعہ نمودار ہونے کے بعد بھی سحری کھانے کی با قاعدہ اجازت دی جائے، اس لئے لمعہ نمودار ہونے کے محض دو تین منٹ میں لمعہ کے دائیں اور بائیں ہر دو طرف چمکدار لہریں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں جیسا کہ انا روانہ یا فوارہ میں دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی لہریں اور انہیں چھوٹی لہروں کا دائیں بائیں نمودار ہونا استطار وانتشار کا معیار ہے، بس بہت سے بہت اس فرق سے یہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس وقت محض ایک دو گھونٹ پانی پی لے یا پہلے سے سحری کھاپی رہا ہو اور لمعہ نمودار ہونے پر جلدی ختم کرکے منھ صاف کر لے تو اس کے صوم کو غیر صحیح نہیں کہیں گے اور بس۔

اور حدیث پاک میں جو اجازت دی گئی ہے وہ صبح کاذب کے بعد کھانے کی دی گئی ہے نہ کہ ظہور لمعہ کے بعد اور طلوع صبح کاذب اور طلوع صبح صادق کے مابین کافی فصل ہوتا ہے، کم از کم اتنا فصل ضرور ہوتا ہے کہ ایک شخص اطمینان سے کھاپی لے اور حدیث پاک میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی اجازت دی گئی ہے۔ **فافترقا**۔

اور فقہاء کے اختلاف سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ سحری کھانا نمودار ہونے سے قبل احتیاطاً بند کردیا جائے اور انتشار واستطار نمایاں ہونے سے قبل نماز فجر نہ پڑھی جائے اور بس اب امید کہ اس گفتگو سے انتشار واستطار اور فجر مستطیر (صبح صادق) فجر مستطیل (صبح کاذب) سب کا معیار واضح ہوجائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱/۱۴۰۴ھ

انگلینڈ کے بعض مقامات میں اوقاتِ نماز کے تعین کا طریقہ:

۱- برطانیہ اور انگلینڈ دونوں چھوٹے سے جزیرے ہیں، یہاں پر سردیوں میں ۱۶ رگھنٹے ۱۵ منٹ (سوا سولہ گھنٹہ) کی راتیں ہوتی ہیں اور گرمیوں میں دن ۱۶ رگھنٹہ ۴۳ رمنٹ کا ہوتا ہے، اور سورج کی رفتار جنوب کی طرف سے ہوتی ہے، نمازوں کے اوقات کی تعیین میں دقت ہوتی ہے، (ابتداء اوقات کیا ہیں اور آخری اوقات کیا ہیں) عموماً موسموں کی خرابی کی

۱- ہذا حدیث متفق علی صحتہ اخرجہ مسلم (شرح السنۃ ۲/۳۰۰ حدیث ۴۳۵، مطبوعہ المکتب الاسلامی، ترمذی کتاب الصوم باب ماجاء فی بیان الفجر حدیث ۷۰۶) (مرتب)۔

وجہ سے بادلوں کی وجہ سے سورج نظر نہیں آتا خصوصاً سردیوں میں سورج کہیں کہیں نظر آتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا، اس سلسلے میں حکم شرعی کیا ہے، ظہر کی نماز کا وقت دن کے گھنٹوں کے حساب سے شمار کیا جائے، یا سایہ کو دیکھ کر؟

۲- سری نمازیں دن کے کتنے گھنٹے حصہ میں پڑھنی چاہئے اور سورج غروب ہونے سے کتنے گھنٹے پہلے پڑھنی چاہئے، سردیوں میں دن ۸ ر گھنٹہ اور گرمیوں میں ساڑھے سولہ گھنٹہ کا ہوتا ہے، مستحب اوقات کیا ہیں اور اوقات مکروہہ جماعت کے لئے کون سے ہیں؟

۳- (الف) گرمیوں میں دن ساڑھے سولہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ہوتی ہے، مغرب کی نماز ۹ ر بجکر ۲۳ ر منٹ پر ہوتی ہے، جون، جولائی، اگست، ان دنوں میں مغرب کی نماز کے کتنی دیر بعد عشاء کی نماز پڑھنی چاہئے، یہاں کے ماہر اوقات وموسمیات نے شفقِ احمر غائب ہونے کا وقت مغرب کے بعد ۲ گھنٹہ ۸ منٹ پر بتایا ہے، اس حساب سے ۹ ر ۲۳ میں ۲ ر ۱۰ شامل کرلیں تو عشاء کا وقت ۱۱ ر بجکر ۴۰ منٹ پر ہوتا ہے، کسی امام کے نزدیک جلدی سے ان راتوں میں عشاء کا وقت کب شروع ہوتا ہے، ہندوستان کے لیے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بعد غروب عشاء کے لیے ایک گھنٹہ ر ۲۰ منٹ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ۳۷ منٹ رکھا ہے، میرے خیال سے یہ جزیرہ چھوٹا ہے اور سورج کے طلوع وغروب میں ساڑھے سات گھنٹے لگتے ہیں اور اطراف میں ہر طرف دریا ہی دریا ہیں، اور سرخی کبھی تو پوری رات نظر آتی ہے غائب نہیں ہوتی، تو عشاء کا وقت کتنے گھنٹہ میں ہوتا ہے؟ اور یہ جگہ ۵۲ عرض البلد پر واقع ہے (۵۲ ڈگری) عشاء کے وقت کے لیے شفقِ احمر کا غائب ہونا ضروری ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں پر عشاء کا وقت نہیں ہوتا، حالانکہ ساڑھے سات گھنٹہ کی رات ہوتی ہے۔

(ب) ماہِ رمضان میں یہ راتیں بہت چھوٹی ہوں گی، نماز وغیرہ سے فارغ ہونے سے پہلے ہی صبح صادق ہوجائے گی، لہٰذا ان سب حالات کو مدِنظر رکھ کر جواب عنایت فرمائیں، ورنہ رمضان المبارک میں وقت تنگ ہوجائے گا۔

حافظ محمد موسیٰ ابراہیم (انگلینڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

تمام سوالات پڑھنے کے بعد جوابات نمبروار درج ہیں، امید کہ باعثِ تشفی ہوں گے۔

۱- ہاں ظہر کی نماز کا وقت گھنٹوں سے شمار کیا جائے ظہر کا وقت زوالِ شمس یعنی آفتاب ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے (۱)۔

۱- "أول وقت الظهر إذا زالت الشمس" (ہدایہ اولین ر ۸۱ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

اور زوالِ شمس اس وقت سے ہوتا ہے جب پورے دن (طلوع شمس سے غروب تک) کی مقدار کا نصف اول ختم ہو کر نصف ثانی شروع ہوتا ہے، پس جب پورے دن کا نصفِ اول ختم ہو کر نصف ثانی شروع ہو جائے تو زوال ہو گیا، وقت ظہر شروع ہو گیا، نماز ظہر پڑھ سکتے ہیں، سایہ اصلی ظاہر ہو یا نہ ہو، سایۂ اصلی کا اعتبار شروع وقت ظہر میں نہیں ہوتا، اگر ہو سکتا ہے تو ختم ظہر میں ہو سکتا ہے (۱)۔

غرض زوال وقت ظہر میں سایۂ اصلی کا پتہ نہ چلنا تعین وقت ظہر میں مضر نہیں، آفتاب کے طلوع اور غروب ہونے کی درمیانی مقدار کے گھنٹوں کے اعتبار سے دو برابر حصے کر لیے جائیں اور جب پہلا حصہ ختم ہو کر دوسرا حصہ شروع ہو جائے تو زوال کا وقت شروع ہو جائے گا، اس میں ظہر پڑھنا بلا شبہ جائز رہے گا، خواہ آفتاب کی حرکت کسی رخ پر اور کسی سمت اور کسی انداز سے بھی ہو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لہٰذا آپ نے جس حساب سے ظہر کا وقت نکال کر نماز ظہر پڑھنا متعین فرمایا ہے وہ صحیح ہے، سایہ اصلی کا اس وقت سوال ہی نہیں بلکہ ۸ رگھنٹہ ۲۳ رمنٹ پر ہو جائے گا۔

۲۔طلوع شمس سے غروب شمس تک کی پوری مقدار کا تقریباً اخیر حصہ حنفیہ کے معمول میں عصر کا وقت شمار ہوتا ہے، لیکن اصفرار شمس اس مقدار کے آتے آتے ہو جاتا ہے اس سے قبل (ربع آخر یوم میں) بھی پڑھ سکتے ہیں، بلکہ اصفرار شمس کی کراہت سے بچنے کے لیے اسی وقت پڑھ لینا چاہیے، تفصیل کے لیے ماہنامہ دارالعلوم نومبر ۱۹۶۹ ءملاحظہ فرمائیے۔

۳-(الف) شفق احمر ختم ہونے سے قبل کسی امام کے نزدیک عشاء کا وقت نہیں ہوتا (۲)، البتہ جب رات صرف ڈیڑھ گھنٹہ کی ہوتی ہے اور ہر طرف دریا کے پانی کی وجہ سے پوری رات یا بہت دیر تک سرخی نظر آتی ہے تو وہ سب سرخی شفق "احمر" نہ ہوگی، شفق احمر اس سرخی کا نام ہے جو آفتاب کے افق مغرب میں ہونے کی وجہ سے ہو اور آفتاب افق میں رات کے آٹھویں حصہ $\frac{1}{8}$ سے زیادہ عموماً نہیں رہتا، جہاں افق سے باہر نکلا مغرب کا وقت ختم ہو کر عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے رات کا صرف آٹھواں حصہ مغرب کا وقت شمار ہوتا ہے۔

جس موسم میں جتنی بڑی رات ہو اس کا آٹھواں حصہ اس دن کا مغرب کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب رہتا ہے، اس

۱- "وآخر وقتها عند أبي حنيفةؒ إذا صار ظل كل شئي مثليه سوى فئي الزوال" (ھدایہ اولین ۸۱/ کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۲- "(وأول وقت المغرب منه أي غروب الشمس إلى قبيل غروب الشفق الأحمر على المفتي به، وهو رواية عن الإمام وعليها الفتوىٰ، وبها قالا لقول ابن عمرؓ: الشفق الحمرة وهو مروى عن أكابر الصحابةؓ وعليه اطباق أهل اللسان" (طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۹۵ کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

لیے غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا قول آپنے بھی اسی قسم کا تحریر فرمایا ہے، آپ کے علاقہ میں افق کی مقدار اس سے بھی کم ہوتی ہے بلکہ جوں جوں قطب کے قریب والے تو درجہ بدرجہ اس سے بھی پہلے پڑھ سکتے ہیں۔

غرض ہر جگہ کی رات کا تقریباً آٹھواں حصہ $\frac{1}{8}$ مغرب کا وقت شمار ہو کر اس کے بعد کا وقت عشاء کا وقت شمار ہو سکتا ہے، ماہر موسمیات کی تحدید کی رعایت کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ چیزیں علامت کے درجہ میں ہیں اصل علت نہیں ہیں: اس طرح پر وہاں غروب شمس ۹ ربجکر ۳۲ رمنٹ ہونے پر بھی عشاء کا وقت شروع ہو سکتا ہے اور عشاء اس کے بعد پڑھ سکتے ہیں، اور اگر رات چھوٹی ہونے کی وجہ سے شب بیداری عامۃً وعادۃً دشوار ہو تو نماز میں قرأت کے اندر کچھ اختصار کر لیا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(ب) تراویح میں اگر پورا قرآن پڑھنے سے تنگی وقت ہو تو کم پڑھا جائے، حتی کہ "الم تر کیف" سے پڑھ لینا کافی ہوگا (۱)، فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

برطانیہ کے قدیم اوقات صلوۃ پر عمل کرنا:

برطانیہ میں قدیم تقویم بگراٹھارہ یا بارہ ۱۲ ڈگری وغیرہ حساب وکتاب سے جو جنتری تیار ہوتی ہے اس پر اجماع عملی ہے جو مجملہ حجت شرعیہ سے احقر نے ابتداء وقت عصر کے متعلق گذشتہ سال مشاہدہ کیا اور اس کا غلط ہونا مشاہدہ سے ثابت ہوا اور تقریباً تمام مواضع میں اس کی اصلاح کر لی گئی ہے۔

تاریخ	وقت عصر پرانی تقویم میں	صحیح وقت عصر	فرق
یکم جنوری	۲-۵۰	۲-۹	۴۱
یکم اپریل	۵-۵۳	۵-۳۵	۱۸
یکم جولائی	۷-۱۸	۶-۵۲	۲۶ منٹ
یکم اکتوبر	۵-۹	۴-۴۷	۲۲ منٹ

۱- "واختار بعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل أي البدائة منها ثم يعيدها، والسنة الختم فيها مرة" (شامی، ۱/۴۷۵، کتاب الصلوۃ)۔

اسی طرح ابتداء فجر وانتہائے شفق کے متعلق بھی بعض علماء دین نے تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مروجہ وقت قدیم تقویم میں غلط ہیں بلکہ یہ تو داخل فجر کا وقت ابتداء فجر نہیں اور تقریباً تمام علماء اس کے قائل ہیں اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جب قدیم اوقات صلوۃ کا غلط ہونا ثابت ہو گیا مشاہدہ سے، تو کیا اس تعامل پر عمل درست ہے؟

اجماع عمل کے حجت شرعیہ ہونے میں کس کو انکار ہوسکتا ہے لیکن تعامل اگر غلط بنیاد پر ہو اور اس کا واقعی طور پر غلط ہونا ثابت ہو جائے تو اس پر کس طرح عمل جائز ہے جیسا کہ مواجہہ قبلہ میں تو اختلاف قابل برداشت ہے باعتبار اجماع عملی کے مگر صریح انحراف ہو تو اس کی اصلاح واجب ہے مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں۔

البتہ اگر کسی بلد کی عام مساجد کے متعلق قوی شبہ ہو جاتا ہے کہ وہ سمت قبلہ سے اس درجہ منحرف ہیں کہ نمازیں درست نہ ہوں گی تو ایسی صورت میں اس کا اتباع نہ کیا جائے (۱)۔

اسی طرح یہاں بھی اب جب قطعی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ پرانے وقت میں اور تحقیق کے بعد کے وقت میں کافی فرق ہے تو عمل کس طرح اس تعامل پر درست ہے؟

دوسری بات قطع نظر ورجات کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ برطانیہ میں بعض ایام ایسے ہیں جن میں شفق ابیض غائب نہیں ہوتی ہے یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ تمام فقہاء احناف ایک زبان ہیں جہاں شفق غائب نہیں ہوتی وہاں طلوع فجر ہوتی ہے تو کس طرح یہ باور کیا جائے کہ برطانیہ میں طلوع نہیں ہوئی اور ۱۶ رشعبان ۱۴۰۲ھ کے فیصلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ طلوع فجر نہیں ہوتی اس کو تسلیم کرنے کی صورت میں تمام فقہاء کی تغلیط لازم آتی ہے جو کہ محل غور ہے۔

نیز جب بیاض غروب نہیں ہوتی، البتہ اندھیرا ہو جاتا ہے گویا طلوع شمس تک بیاض رہتی ہے، البتہ غروب وقبل طلوع کے بیاض زیادہ ہوتی ہے اور درمیان شب میں اغلب سیاہی ہوتی ہے مگر جہت بدلتی ہے احقر نے ۲۵ رمضان کو مشاہدہ کیا جس سے یقین ہو گیا کہ بیاض نہار ہے۔ اس طرح رمضان کی مختلف تاریخوں میں مشاہدہ کیا۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ تعامل اگر نص کے خلاف ہو تو حجت نہیں اور قدیم تقویم جو مبنی ہے اصول ہیت پر کس طرح قابل عمل رہے گی۔

اور جب وقت موجود ہے پھر ۱۶ر رمضان کے فیصلہ کے مطابق تقدیر کس طرح جائز ہو گی۔

بہر حال عرض ہے ۱۶ رشعبان کے فیصلہ کی بنیاد جس کے آگے عرض ہے کہ جب شفق ابیض غائب نہیں ہوئی تو ابتداء

۱- جواہر الفقہ ۱/ ۲۵۳۔

فجر نہیں اور جب ابتداءً نہیں تو تقویم جائز ہے، حالانکہ یہ کسی کا قول نہیں، بلکہ کتب احناف وشوافع کی عبارات اس بات پر دال ہیں کہ باوجود عدم غیبوبت شفق طلوع فجر ہوتی ہیں اور تقدیر کل وقت کے فقدان کی صورت میں جائز ہے نہ کہ جز اول کے اشتباہ کی صورت میں یہ تمام مناقشات اس لئے عرض ہیں کہ صحیح تک پہنچ سکوں۔

مفتی یوسف (۱۸؍ مس ڈل روڈ سوٹ پلی، ہا ئکلی ۵ ۲ ۷ ج)

الجواب وبالله التوفيق:

پوری تحریر بار بار اور بغور پڑھی ماشاء اللہ بہت توجہ ومحنت سے لکھی گئی ہے، بہت علمی حقائق ونکات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم واخلاص میں برکت دے وقبولیت عطا فرمائے، اور فلاح دارین سے نوازے۔

پہلی بات یہ عرض ہے کہ ۱۶؍ شعبان کے کل فیصلہ کی اور من وعن احقر نے تصدیق نہیں کی ہے، بلکہ اخیر مضمون کی جس میں نماز کے اوقات کا اندازہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، بشرطیکہ وہاں کا تعارف اس کے خلاف اور اس کے مزاحم نہ ہو اور بس۔

اس مسئلہ مجوزہ کی بابت کیا عرض کروں اپنا علم ہی کیا ہے محض امتثالاً للامر جو کچھ ذہن میں دیانۃً آرہا ہے عرض ہے مسئلہ مواجہت قبلہ فی الصلوۃ کی بنیاد بھی مشاہدہ ہی پر ہے، مثلاً جب تک عین کعبہ آنکھوں کے سامنے اور مشاہد ہو اس وقت تک عین کعبہ کی مواجہت فی الصلوۃ شرط ہے (۱)، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص محض حطیم کی مواجہت اس طرح کرے کہ کعبۃ اللہ کی جانب مواجہت بالکل نہ ہو تو نماز نہ ہوگی (۲)، اور جب عین کعبۃ مشاہد نہ ہو اور مسجد حرام مشاہد ہو تو اس وقت عین مسجد حرام کی مواجہت فی الصلوۃ شرط ہوتی ہے اور جب عین مسجد حرام بھی مشاہد نہ ہو تو جہت مسجد حرام کی مواجہت شرط ہوتی ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مواجہت قبلہ کی بنیاد بھی مشاہدہ ہی پر ہے اور جب مشاہدہ بالکل نہ ہو سکے تو اس وقت مواجہت فی الجملہ کا

۱- "فإن كان قادراً يجب عليه التوجه إلى القبلة إن كان في حال مشاهدة اللكعبة فإلى عينها أى أى جهة كانت من جهات الكعبة حتى لوكان منحرفاً عنها غير متوجه الى شئ منها لم يجزيقوله تعالىٰ (فول وجهک شطر المسجد الحرام وحيث ماكنتم فولوا وجوهكم شطره) سورة البقره الآية ۱۴۴، وفي وسعه تولية الوجه إلى عينها فيجب ذلک" (بدائع الصنائع ۱/ ۳۰۸، مکتبہ زکریا دیوبند) (مرتب)۔

۲- "ولو صلى مستقبلا لوجهه الى الحطيم لايجوز كذا في المحيط" (الفتاوی الہندیۃ ۱/ ۶۳، باب الشروط الصلاۃ۔ الفصل الثالث فی استقبال القبلۃ، مکتبہ دار الکتاب دیوبند) (مرتب)۔

حکم (۱) عائد ہوتا ہے اور اس پر اجماع عملی منعقد ہے اور اس اجماع پر عمل واجب ہے۔

باقی اس میں یہ شرط بھی ضروری التسلیم ہے کہ اگر کسی خطہ کی عام مساجد بھی جہت قبلہ سے اس طرح منحرف ہو جائیں کہ مواجہت فی الجملہ بھی حاصل نہ ہو اور حجت شرعیہ سے یہ انحراف ثابت و متحقق ہو جائے تو اس وقت وہاں کے رائج اجماع کا حکم ختم ہو کر تحقیق واقعہ کے مطابق حکم شرعی ہو جاتا ہے، پس یہی حال و حکم مسئلہ زیر نظر و مجوزہ کا بھی ہوگا کہ جس شخص کے نزدیک مشاہدہ صحیحہ شرعیہ سے اجماع متعارف کا عمل غلط ہونا حجت شرعیہ سے ثابت ہو جائے اس شخص پر اس اجماع کا حکم متوجہ نہ ہوگا، بلکہ اپنے مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کے مطابق عمل کرنا ضروری رہے گا، اور یہی حکم ان لوگوں کو بھی ہوتا ہے جن کے طلوع غروب اور طلوع فجر صادق وغیرہ کے اوقات اس مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کے مطابق ہوں اور یہ مطابقت حجت شرعیہ سے ثابت ہو باقی تمام برطانیہ والوں کے لئے صرف اس خطہ کے ایک مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کو معیار قرار دیکر تمام برطانیہ کے لئے معمول بہا بنالینا شرعاً صحیح نہ ہوگا، اس لئے تھوڑی تھوڑی مسافت پر طلوع و غروب اور طلوع فجر صادق کے اوقات میں تفاوت فاحش غیر معتدل و غیر منتظم ہوتا ہے، جیسا کہ وہاں کے طلوع فجر صادق کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، ہاں اگر ہر خطہ و بلد کے طلوع و غروب و طلوع فجر صادق کے اوقات کا مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کر کے ان اوقات کو صرف اس خطہ کے لئے معیار قرار دیا جائے گا تو یہ ہو سکتا ہے اور پھر اگر وہ معیار اجماع متعارف کے خلاف ہوں تو وہاں والوں پر اس اجماع متعارف کا حکم متوجہ نہ ہوگا، بلکہ اپنے مشاہدہ کے مطابق عمل کرنا شرعاً ضروری ہو جائے گا، اس لئے یہ مشاہدہ صحیحہ شرعیہ حجیت اجماع متعارف کے حجیت سے شرعاً قوی تر و اقوی ہوگی، البتہ چونکہ برطانیہ میں بہت سے مقامات و خطے ایسے مشاہدہ میں آتے ہیں کہ وہاں سالہا سال فضا متغیم و ناصاف رہتی ہے، بسا اوقات آفتاب کیا آسمان بھی نظر نہیں آتا، ایسے مقامات و خطہ میں طلوع و غروب وغیرہ کے اوقات کا صحیح مشاہدہ ہونا بے حد دشوار و متعذر رہتا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں پر اجماع متعارف کا حکم متوجہ رہے گا، اور اسکے مطابق عمل کرنا شرعاً لازم رہے گا، جب تک کہ مشاہدہ شرعیہ صحیحہ سے یا ان دلائل شرعیہ جو کہ اجماع سے اقوی ہیں اجماع متعارف کے خلاف شرعاً ثابت نہ ہو جائے اور وہی حکم حال اقرب البلاد اقرب الایام اعدل الایام وغیرہ کے ذریعہ سے طلوع و غروب وغیرہ کے اوقات کی تعیین کا بھی ہوگا کسی ایک خطہ یا بلاد کے اوقات کے اعتبار سے ثابت شدہ اوقات کو پورے برطانیہ کے

۱- "والفرض بغير المشاهد إصابة وجهها أي الكعبة هو الصحيح، قال الطحطاويؒ تحت قوله (اصابة جهتها): فالمغرب قبلة لأهل المشرق وبالعكس والجنوب قبلة" لاهل الشمال وبالعكس فالجهة قبلة كالعين توسعة على الناس كما في القهستاني، حتى لوازيل المانع لايشترط أن يقع استقباله على عين القبلة كما في الحلبي وهو قول العامة وهو الصحيح؛ لأن التكليف بحسب الوسع" (طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱/ ۱۱۵، باب شروط الصلاۃ، مکتبہ اشرفیہ دیوبند) (مرتب)۔

لئے معیار و معمول بہا نہیں بنا سکتے ہیں اگر بنا سکتے ہیں تو صرف اسی خطہ و مقام کے لئے کہ جہاں پر اسکا مشاہدہ صحیحہ شرعیہ ہو جائے - **هذا ماعندی من الشرع الشريف، فإن كان صحيحاً فمن عند الله وإن كان خطأ فمن نفسی وما أبرئ نفس** - فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۲/ ۱۴۰۴ھ

برطانیہ میں صبح صادق کی تحقیق:

تمہید:

محکمہ موسمیات نے شفق کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱- سیول شفق ۶ / درجہ والی شفق، اس کو شفق احمر سے تعبیر کرتے ہیں، اس وقت رات کے آثار کم ہوتے ہیں، چند بڑے تارے نظر آتے ہیں۔

۲- بحری شفق: ۱۲ درجہ والی شفق، یعنی شفق ابیض کا ابتدائی اور متوسط درجہ۔

۳- سبت شفق: ۱۸ درجہ والی شفق ابیض کا آخری درجہ جس کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے۔

جو ممالک ۵۰ سے ۵۸ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں وہاں شفق دیر سے غائب ہوتی ہے اور صبح صادق جلدی ہوتی ہے، موسم گرما کے بعض مہینوں میں غروب شفق اور صبح میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے، بطور مثال ۵۴ عرض البلد کے طلوع و غروب کا نقشہ یہ ہے: طلوع آفتاب: ۵: ۳۵- ۰۴: غروب آفتاب ۴۱- : دن کی مقدار -۶- ۱۷- اور صبح صادق ۳۵- ۱- ۲۱ مئی سے ۳۱ جولائی تک بحری شفق غائب ہوتے ہی پوری رات شفق پر اجالا رہتا ہے۔

سوال نمبر (۱)

جو ممالک ۵۵ سے ۵۸ عرض البلد پر ہیں وہاں شفق ابیض اور صبح صادق میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے جب ان اوقات میں رمضان آتے ہیں تو تراویح و سحری وغیرہ کے مسائل بھی بہت غور طلب ہو جاتے ہیں، یعنی جہاں شفق ابیض اور صبح صادق میں فاصلہ ہی نہیں ہوتا وہاں سحری کب ختم کی جائے؟

سوال نمبر (۲)

"درمختار" میں ایک حساب لکھا ہے: صبح صادق کے وقت کے بارے میں کہ جتنے گھنٹہ کی رات ہو اس کا ساتواں

حصہ صبح صادق ہوگا، کیا یہ حساب صحیح ہے؟ نیز مولانا تھانویؒ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں لکھا ہے کہ ہیئت کے قاعدہ سے طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک سحری کھاسکتے ہیں، تو کیا ان اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے جن دنوں شفق ابیض غائب نہیں ہوتی ہے تو صبح صادق میں آفتاب طلوع ہونے کا جو وقت ہے اس سے سوا گھنٹہ پہلے صبح صادق کا تصور کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز جن ایام میں سورج افق سے ۱۸ ڈگری نیچے ہوتا ہے تو صبح صادق بہت آگے بڑھتی ہے مثلاً اگست کی پہلی تاریخ میں ۳۶-۱ ہے تو دوسری کی ۴۹-۱ ہے اور تیسری کی ۵۹-۱ ہے چوتھی کو ۷-۲، اتنی جلدی صبح صادق آگے بڑھتی ہے، اور یہاں علم ہیئت والے کمپیوٹر وقت یہی بتلاتے ہیں، تو کیا اس پر عمل کرنا ضروری ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

سوال نمبر (۳)

مثلین کے بعد غروب تک سردیوں میں صرف پون گھنٹہ کا فرق رہتا ہے، تو کیا حنفی المسلک مثل ثانی میں نماز عصر ادا کرسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تمہید:

پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہئے کہ دینِ اسلام دینِ فطرت ہے، کما ورد: ''**الدين الفطرة**'' اس کے احکام سادہ اور فطری اصول پر ہوتے ہیں، تاکہ ہر انسان خواہ دیہاتی ہو یا شہری عالم ہو یا جاہل، خواہ سمندری علاقہ کا ہو خواہ پہاڑی علاقہ کا ہو، جو بھی ہو اگر وہ احکام پر عمل کرنا چاہے اور اپنے معبودِ حقیقی سے رابطہ قائم کرنا چاہے تو فطری اصول اور سادہ انداز سے کرسکے، بقاعدہ: ''**الدين يسر**'' (۱) اور باشارۂ نصوص ''**وللعالمين نذيرا**'' (۲)، ''**وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين**'' (۳)، اور ایک حدیث پاک میں ہے: ''**نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب**'' (۴)، ان سب آیات وروایات واحادیث سے احکام اسلام فلسفیانہ موشگافیوں اور علوم ہیئت کے دقائق پر دائر نہ ہوں گے اور ان کا مدار یہ چیزیں نہ ہوں گی، بلکہ ادلۂ اربعہ شرعیہ سے جو حکم نکلے گا وہی شرعاً معتبر ہوگا۔

۱- عن أبی ہریرۃؓ عن النبی ﷺ قال: ''الدین یسر'' بخاری مع الفتح ۱/۹۳۔
۲- سورۂ فرقان: ۱۔
۳- سورۂ انبیاء: ۱۰۷۔
۴- صحیح البخاری ۱/۲۵۶۔

انہی وجوہ کی بنا پر ثبوت رویت ہلال میں ہوائی جہاز پر اڑ کر دیکھنے کا یا دوربین سے دیکھنے کا اعتبار نہیں ہے، اور نہ اس پر مدار ثبوت ہے خاص کر صیام رمضان کے مسئلہ میں، اس کو احقر اپنے رسالہ ''ریڈیو اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ ثبوتِ رویت ہلال کا شرعی حکم'' میں بہت واضح طور سے مدلل ومفصل بیان کر چکا ہے، اس کا مطالعہ فرمالیا جائے، اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ مسئلہ مجوث عنہا کا مدار اشیاء مذکورہ فی السوال پر نہیں بلکہ نص قرآنی: "**وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل**" الخ(۱) پر، اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ خیط ابیض، خیط اسود سے متبین ہو جائے پھر اس کے بعد رک جاؤ، اور روزہ رات آنے تک پورا کرو محض خیط ابیض کے وجود کو مدار نہیں رکھا گیا، بلکہ خیط ابیض کے تبین کو مدار رکھا گیا ہے، ظاہر ہے کہ نفس خیط ابیض کا وجود اول وہلہ روشنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر اس کو مدار نہ رکھ کر اس کے تبین کو رکھا گیا، دونوں، یعنی نفسِ خیط ابیض اور اس کے تبین کا فرق احادیث پاک اور ائمہ ہدیٰ کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ مسلم شریف اور ترمذی شریف کی حدیث ہے: "**عن سمرة بن جندب قال: قال رسول الله ﷺ: لايمنعكم من سحور كم أذان بلال ولا الفجر المستطيل ولكن الفجر المستطيل في الأفق**" (۲) حدیث بالا میں صرف فجر نہیں فرمایا گیا، بلکہ مستطیل کی قید بڑھادی گئی ہے جس کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ اولیت حقیقیہ بیاض کی مراد نہیں بلکہ اس کا استطار وانتشار مراد ہے، فقہاء کرام نے اسی کو بیاض منتطیر اور منتشر سے تعبیر کیا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ "طحطاوی علی المراقی" میں حضرت امام محمدؒ سے اس کی تصریح موجود ہے کہ محض لمعہ بیاض کی اولیت حقیقیہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس کے انتشار کا اعتبار ہے جب بیاض میں انتشار پیدا ہو جائے تو اس وقت سحری بند کرنا چاہئے۔ اب معلوم نہیں ماہر فلکیات ۱۸ ڈگری پر جس بیاض کا ذکر کرتے ہیں اس سے کیا مراد لیتے ہیں، ظاہر یہی ہے کہ اپنے فن کے قاعدہ کے مطابق بیاض کی اولیت حقیقیہ (لمعہ) مراد لیتے ہوں گے اور ایسی مبہم بات بھی مدار حکم نہیں بن سکتی، اس لیے بھی مدار ان چیزوں پر نہیں، بلکہ مدار خیط ابیض کے تبین پر ہوگا اور یہ تبین تمہید میں ضابطے اور اصول کے مطابق کسی آلۂ رصد گاہی وغیرہ سے نہ ہوگا، بلکہ عیاناً دیکھنے سے ہوگا۔

۱- خلاصہ یہ نکلا کہ جن دنوں میں آسمان صاف رہے ان دنوں میں بجلی وغیرہ کے قمقموں کی حد سے باہر جا کر خود مشاہدہ کیا جائے اور جس وقت بیاض (خیط ابیض) کا تبین وانتشار مشاہدہ ہو جائے اس وقت کو منتہاء کہنا چاہئے اور اسی وقت

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

۲- ترمذی شریف ۱/۸۸ کتاب الصوم۔

سے روزہ کی ابتداء کی جائے۔

اگر اپنے یہاں اس مشاہدہ کا موقع نہ آئے تو اطراف کے کسی قریبی مقام سے اس کا مشاہدہ کیا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۲-اگر یہ بھی نہ ہو سکے کہ وہاں کا بھی مطلع صاف نہیں رہتا تو پھر میدانی علاقہ کے منتہائے سحر کا اعتبار کیا جائے۔ میدانی علاقوں کے منتہائے سحر کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ میں آتا ہے کہ سحری کھانے میں تاخیر کرنا افضل ہے، "كما في الصحاح عن زيد بن ثابت رضى الله عنه قال: "تسحرنا مع رسول الله ﷺ، ثم قمنا إلى الصلوٰة، قال قلت: كم كان قدر ذلك قال: قدر خمسين اٰية" (۱)، اور انہی احادیثی بنیادوں کی بنا پر فقہ کی معتبر کتابوں مثلاً شامی وغیرہ میں لکھا ہے کہ سدس آخر لیل میں (رات کے آخری چھٹے حصہ میں) سحری کھانا افضل ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے آخری چھٹے حصہ تک صبح صادق جو منتہائے سحر ہے، نہیں ہوتی اس کے بعد ہوتی ہے اور حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے بھی اس کے قریب قریب لکھا ہے کہ کل رات کا ساتواں حصہ فجر کا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے قبل کا حصہ رات اور سحری کھانے کا وقت شمار ہوگا، ممکن ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اس مذکورہ بنیاد (سدس لیل آخر) سے استدلال کیا ہو یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی متدل حضرت کا ہو۔ بہر حال میدانی علاقوں کے لیے حضرتؒ نے جو فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور استفتاء ہذا میں اس کا حوالہ بھی صحیح دیا ہے۔ باقی ''درمختار، شامی'' میں یہ چیز نہیں ملی، البتہ روایت ودرایت سے ایسی بات نکلتی ہے۔

الحاصل انہی اصولِ ثلاثہ مذکورہ کے مطابق عمل کیا جائے کہ جب اپنے علاقہ میں اور اس کے اطراف کے علاقوں میں اس خیط ابیض کا تبین مشاہدہ اور تحقق نہ ہو تو میدانی علاقہ کے منتہائے سحر کا اعتبار کیا جائے اور اسی کے اعتبار سے سحری کھانا بند کیا جائے، **''هذا ما عندى من الشرع الشريف فإن كان حقا وصحيحا فمن الله، وإلا فمن نفسي وما أبرئ نفسي من الخطاء''۔**

۳-اگر صورتِ مذکورہ میں آفتاب کی ٹکیہ اتنی کمزور اور متغیر ہو جاتی ہے کہ اس پر نگاہ پڑنے سے نگاہ گھبراتی نہیں، بلکہ ٹکی رہتی ہے تو ایسی صورت میں مثلِ اول میں بھی عصر کی نماز ادا کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ترمذی شریف ۸۸/۱، کتاب الصوم۔

تیز رفتار ہوائی جہازوں میں اوقات نماز وروزہ کا حکم:

تیز رفتار ہوائی جہازوں میں اوقات نماز اور سحر وافطار کے متعلق کس طرح وقت معلوم کرکے ادا کریں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس استفتاء کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احقر کا ایک مضمون مغربی ممالک میں نماز روزہ کے خصوصی احکام پر مشتمل ماہنامہ دارالعلوم کے ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے، غالباً جناب کے وہاں موجود ہوگا اس کو اگر نہ دیکھا ہو تو تنقیدی نگاہ سے دیکھ لیں، اگر صحیح ہو تو فمن اللہ اور غلط ہو تو فمن نفسی مطلع فرمائیں شکرگزار ہوں گا، کیونکہ اس سے مجھے اپنے لیے بھی صحیح علم کا فائدہ ہوگا۔

پھر اس کے بعد عرض یہ ہے کہ آفتاب کی رفتار کی برابر تیز رفتار سواری سے مغرب کی جانب سفر کیا جائے تو جو وقت روانہ ہونے کا ہے وہی وقت راستہ میں برابر قائم رہے گا، مثلاً ظہر پڑھ کر روانہ ہوا تو جہاں بھی پہنچیں گے یہی وقت ملے گا، اس صورت میں تو کوئی اشکال ہی نہیں ہوگا وہیں ٹھہر کر پھر جو اوقات نماز کے جس طرح یہاں ابتداءً آتے وہاں آئیں گے، نمازیں پڑھتے رہیں گے، اگر اسی رفتار کی سواری پر بجائے مغرب کے مشرق کی طرف چلیں تو پورے لیل ونہار کی گردشِ آفتاب جو چوبیس گھنٹہ میں پوری ہوتی تھی، صرف بارہ گھنٹہ میں طے ہوجائے گی اور جو فاصلہ نمازوں میں سفر سے پہلے تھا وہ نصف ہوجائے گا، مثلاً عصر ومغرب میں اگر دو گھنٹہ کا فاصلہ تھا تو وہ اب صرف ایک گھنٹہ کا اور پورے چوبیس گھنٹہ (لیل ونہار) میں جو پانچ نمازیں پڑھی جاتی تھیں اب وہ دس ہوجائیں گی اس میں بھی شرعاً کوئی قباحت نہ ہوگی، اسی طرح اگر یہ سفر بجانب مشرق اسی سواری سے ہو جس کی رفتار آفتاب کی رفتار سے زیادہ مثلاً دوگنی ہو تو یہ مجموعہ (لیل ونہار) صرف چھ گھنٹہ میں ہوگا اور نمازوں کا فصل بھی اسی مقدار سے کم ہوجائے گا، مثلاً عصر کی نماز کا فصل اس صورت میں بجائے دو گھنٹہ کے صرف نصف گھنٹہ رہ جائے گا اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، نمازیں اسی مقدار والے فصل سے پڑھتے رہیں گے یہاں تک کہ سواری کی تیز رفتاری کے باعث یہ فصل بین الصلوٰتین کم ہوتے ہوتے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ طہارت وغیرہ مقدماتِ صلوٰۃ کی تکمیل کے بعد فرض نمازیں بھی ادا کرنے کا وقت نہ ملے تو وہ نمازیں ساقط ہو کر اس کے بعد والی نماز کی ادائیگی متوجہ ہوجائے گی اور ان کی قضا واجب ہوگی جیسا کہ فاقد اوقات کے مقامات میں فقہاء کرام فرماچکے ہیں۔

البتہ زیادہ اشکال اس صورت میں ہوگا کہ اس تیز رفتار سواری پر جس کی تیز رفتاری آفتاب کی رفتار سے مثلاً دوگنی ہو

مثلاً عصر پڑھ کر جانب مغرب سفر شروع کریں تو کچھ درجہ جا کر ظہر کا وقت ملے گا پھر آگے بڑھتے ہی جائیں تو آفتاب ظہر میں آجائے گا پھر بڑھتے جائیں تو آفتاب پورب کی جانب ڈھلتا ہوا محسوس ہوگا پھر سفر ختم نہ کریں، بلکہ سفر جاری ہی رکھیں تو پورب سمت میں آفتاب عصر کے وقت میں جیسا ہوتا ہے ویسا محسوس ہوگا اور محسوس ہوگا کہ آفتاب پورب کی جانب غروب ہورہا ہے پھر پورب کی جانب غروب ہوکر وقت مغرب ہوکر وقت مغرب محسوس ہوگا پھر کچھ دیر بعد وقت عشاء محسوس ہوگا پھر کچھ دیر بعد صبح صادق پچھم سے طلوع ہوتی نظر آئے گی، یہاں تک کہ وقت فجر نمایاں ہوجائے گا، پھر کچھ دیر بعد پچھم کی جانب سے آفتاب طلوع ہوتا نظر آئے گا یہاں تک کہ سارا نظام شمسی ہی درہم برہم نظر آئے گا اور اشراط ساعت میں آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے کی جو روایت ہے سامنے آجائے گی، اس وقت کے لیے اصل میں نماز و روزہ کے احکام کیا ہوں گے جو شخص گھڑی دیکھ کر چلے گا وہ زیادہ الجھن اور اشکال میں مبتلا ہوگا۔

البتہ جو لوگ بغیر گھڑی وغیرہ دیکھے اور بغیر اوقات کے چلتے وقت لحاظ کئے ہوئے سفر کریں گے وہ شاید فضا میں پہنچ کر سمتوں کا پتہ نہ چلا سکیں گے اور ان کے نزدیک پورب پچھم اتر دکھن کچھ نمایاں و تمیز نہ ہوگا شاید ان کو الجھن پیش نہ آئے، یہ الگ بات ہوگی۔ بہر حال اس وقت کے مسائل صوم و صلوۃ زیادہ پیچیدہ ہوکر نمایاں ہوں گے، احقر کی اس تحریر سے اجمالاً ہر شق و مثال کا جواب بھی نکل سکتا ہے، کام کی کثرت اور فرصت میں نہ ہونے کے سبب اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ عرض کر سکا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور حاضری سے بھی معذور رہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حالات میں بھی احقر کے نزدیک نصوص قرآنی اور احادیث نبویہ کی رو سے کوئی الجھن یا خلجان نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

ہوائی جہاز، ٹرین اور پانی کے جہاز میں نماز ادا کرنے کا حکم؟

ٹرین میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو کیا استقبالِ قبلہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نیز ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز میں بھی نماز ادا کرنا درست ہے یا نہیں اور قبلہ رخ ہونا ضروری ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ہاں ریل میں بھی نماز پڑھنے کا حکم ہے(۱)، البتہ اگر یقین ہو کہ وقتِ نماز باقی رہتے ہوئے فلاں جگہ اتنی دیر ٹھہرے گی کہ اتنی دیر میں نماز پڑھ سکوں گا تو اس وقت تک مؤخر کردے، اور اگر مسافر شرعی ہے تو کم از کم فرض و وتر پڑھ لیا کرے۔

ریل کے اندر ہی اگر پڑھنا پڑے تو تحریمہ باندھتے وقت قبلہ رخ کا پتہ لگا لے، خواہ قطب نما کے ذریعہ یا کسی

۱- (ریل میں نماز ادا کرنا جائز ہے، اس لیے کہ ریل مثل سریر موضوع علی الارض کے ہے۔"وإن لم يكن طرف العجلة على الدابة جاز لو واقفة لتعليلهم بأنها كالسرير (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۱/۴۷۱ کتاب الصلوٰۃ)قال الشامي تحت قوله: (لو واقفة) كذا قيده في شرح المنية، ولم أره لغيره، يعني إذا كانت العجلة على الأرض، ولم يكن شئي منها على الدابة، وإنما لها حبل مثلاً تجرها الدابة به تصح الصلوٰة عليها، لأنها حينئذٍ كالسرير الموضوع على الأرض، ومقتضى هذا التعليل أنها لو كانت سائرة في هذه الحالة لا تصح الصلوٰة عليها بلا عذر، وفيه تأمل، لأن جرها بالحبل وهي على الأرض لا تخرج به عن كونها على الأرض، ويفيده عبارة التا تارخانية عن المحيط، وهي: لو صلى على العجلة، إن كان طرفها على الدابة جازت وهي تسير تجوز في حالة العذر لافي غيرها وإن لم يكن طرفها علي بمنزلة الصلوٰة على السرير أهـ فقوله: وإن يكن الخ يفيد ما قلنا؛ لأنه راجع إلى أصل المسئلة، وقد قيدها بقوله: "وهي تسير" ولو كان الجواز مقيدا بعدم السير تقييده به، فتأمل" (فتاویٰ شامی ۱/۴۷۱، مطلب في الصلوٰة على الدابة) اگر چہ ٹرین میں نماز پڑھنے والے کو یہ امید ہو کہ وقت کے باقی رہتے ہوئے نیچے اتر کر نماز پڑھ سکتا ہے، تب بھی ریل میں پڑھنا جائز ہوگا، کیونکہ عذر نماز کے ابتدائے وقت میں معتبر ہے، اگر چہ آخیر وقت میں عذر کے زائل ہوجانے کی امید ہو: "بقي شئي لم أر من ذكره، وهو أن المسافر إن عجز عن النزول عن الدابة لعذر من الأعذار المارة وكان على رجاء زوال العذر قبل خروج الوقت كالمسافر مع ركب الحاج الشريف، هل له أن يصلي العشاء مثلاً على الدابة أو المحمل في أول الوقت إذا خاف من النزول، أم يؤخر إلى وقت نزول الحجاج في نصف الليل لأجل الصلوٰة؟ والذى يظهر لي الأول، لأن المصلي إنما يكلف بالأركان والشروط عند إرادة الصلوٰة والشروع فيها، وليس لذلک وقت خاص، ولذا جاز له الصلاة بالتيمم أول الوقت وإن كان يرجو وجود الماء قبل خروجه، وعللوه، بأنه قد أداها بحسب قدرته الموجودة عند انعقاد سببها، وهو ما اتصل به الأداء اهـ ومسئلتنا كذلک" (فتاویٰ شامی ۱/۴۷۱ مطلب في الصلوٰة على الدابة) لیکن ایسی حالت میں انتظار کرنا آخر وقت استحباب تک مستحب ہوگا؛ وندب لراجيه رجاءً قويا أخر الوقت المستحب ولو لم يؤخر وتيمم وصلي جاز إن كان بينه وبين الماء ميل وإلا لا" (الدر المختار علی ہامش الشامی ۱/۱۶۶، باب التیمم)۔ نیز اگر کھڑے ہوکر پڑھنا بھی کسی عذر کی بنا پر نا ممکن ہو تو بیٹھ کر پڑھنا درست ہے: "أو وجد لقيامه الما شديداً صلى قاعداً كيف شاء على المذهب، (الدر مختار باب صلاة المريض) صلى الفرض في فلک جار قاعدا بلا عذر صح لغلبة العجز وأساء، وقالا: لايصح إلا بعذر وهو الأظهر برهان" (الدرالمختار مع الشامي ۱/ ۵۱۱ باب صلوٰۃ المریض)، اور اگر کسی مجبوری مثلاً کثرت اژدہام کی بنا پر بیٹھ کر رکوع، سجود بھی نا ممکن ہو تو پھر اشارہ سر سے نماز پڑھے: "وإن تعذر أداها قاعداً ويجعل سجوده أخفض من ركوعه" (الدر المختار مع الشامی ۱/۵۰۹ باب صلوٰۃ المریض)(مرتب)۔

مسلمان سے پوچھ لے۔پھر نماز شروع کردے اور پڑھ لے، کیونکہ ٹرین جلدی جلدی اتنا رخ نہیں بدلتی کہ مواجہت فی الجملہ بھی فوت ہوجائے، ہاں جہاں ایسا ہو وہاں ذرا ٹھہر کر شروع کرے۔اسی طرح ہوائی جہاز میں اور پانی کے جہاز میں بھی مذکورہ بالا طریقوں سے جہت قبلہ وغیرہ معلوم کر کے نماز ادا کریں۔

ہوائی جہاز پر بھی نماز جائز ہوتی ہے جس طرح ریل وغیرہ کی سواری میں جائز ہوتی ہے، اس لیے کہ وضع الجبهة على الارض میں ارض کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ بطور عموم مجاز کے وہ چیز مراد ہے جس پر پیشانی ٹک سکے۔اس عموم مجاز کا ایک فرد سطح ارض بھی ہے اور ایک فرد ریل سجدہ وغیرہ کی جگہ بھی ہے پس جس طرح چلتی ہوئی کشتی پانی پر ہونے کے باوجود سجدہ کی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ اس پر سجدہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ریل پر اور ہوائی جہاز پر ہر جگہ ایسی جگہ ہوتی ہے جس پر پیشانی رک جاتی ہے خواہ بلا واسطہ یہ جگہ ہو جیسا زمین پر نماز پڑھنے میں یا کشتی میں یا پانی کے جہاز میں اور ہوا میں پرواز کی حالت میں جب کہ سجدہ قبلہ متعین معلوم ہوسکے خواہ قوی سے یا کسی معتمد کے بتانے سے، نیز جہاز بھی بالواسطہ زمین قرار دیا جائے گا جس طرح سمندری جہاز کا زمین پر ہونا بالواسطہ شمار کر کے علماء نے اس پر جواز صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔اسی طرح یہاں بھی صرف ہوائی جہاز سے ایک واسطہ زمین اور جہاز کے درمیان ہوا کا بڑھ جائے گا، پس جو دلائل اس جہاز پر جواز صلوٰۃ کے ہیں وہی دلائل یہاں بھی رہیں گے، کیونکہ ہوا بھی مثل پانی کے ایک جسم قوی ہے صرف پانی کی طرح دکھائی نہیں دیتی۔

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

ہوائی جہاز میں نماز کے جواز کی تفصیلی بحث (۱):

سمندری جہاز میں نماز ادا ہونے کی تفصیل:

سمندری جہاز کشتی کے حکم میں ہے، اور کشتی مثل دابہ کے ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، صاحب ہدایہ وغیرہ کے

۱- ہوائی جہاز میں اڑتے ہوئے نماز یں، یعنی فرائض وواجبات ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات عدم جواز کی طرف گئے ہیں، اور ان کا مستدل یہ ہے کہ سجدہ کے معنی ہیں: "وضع الجبهة على الأرض" یعنی سجدہ کے تحقق کے لیے چہرے کا زمین پر رکھنا شرط ہے، اور یہ قید ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کی بنا پر فوت ہوجاتی ہے، لہذا اگر کسی نے ہوائی جہاز میں نماز ادا کی تو واجب الاعادہ ہوگی، ان کے بالمقابل دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا درست ہے، اور علی الأرض کی قید کوئی منصوص نہیں ہے کہ مسئلہ کی بنیاد ہی اس پر رکھ دی جائے، بلکہ چونکہ سجدہ کی یہی عام کیفیت ہوتی ہے، اس لیے یہ معنی سجدہ کے اہل لغت نے بیان کردیے اور یہ کہنا ہوگا کہ جیسے رکوع ایک خاص رکن ہے، اسی طرح سجدہ بھی ایک خاص رکن

بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کو مثل دابہ کے نہیں سمجھتے، اور اس میں نماز بلاعذر جائز ہے(۱)۔

ہے اور ان کی ادائیگی کی صورتیں ہر مکان کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہوں گی، چونکہ سجدہ عام طور پر زمین پر ہی پیشانی ٹیک کر کیا جاتا ہے، اس لیے ''الارض'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

شریعت کا اصل منشاء یہ ہے کہ سجدہ کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز ہو جس پر پیشانی ٹک سکے، جس طرح کشتی میں نماز ادا کرنا جائز ہے، حالانکہ کشتی اور زمین کے درمیان بے پناہ پانی کا فاصلہ ہوتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ زمین کی طرح ہوائی جہاز پر بھی نماز ادا کرنا درست رہے گا اور اعادہ کی ضرورت نہ ہوگی، چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن جزیریؒ نے ہوائی جہاز کو پانی کے جہاز کا حکم دیا ہے، موصوف فرماتے ہیں: ''ومثل السفينة القطر البخارية والطائرات الجوية ونحوها'' (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۲۰۶)۔

مزید فقہی عبارات ملاحظہ ہوں:

''قال العلامة القهستاني في شرح مختصر الوقاية: والسجود لغة الخضوع وشرعاً وضع الجبهة على الأرض وغيرها. انتهى. وفي البحر شرح الكنز تحت قوله: وكره بأحدهما أو بكور عمامة، والأصل أنه كما يجوز السجود على الأرض يجوز على ماهو بمعنى الأرض مماتجد جبهته حجمه وتستقر عليه، وتفسير وجدان الحجم أن الساجد لو بالغ لايتسفل رأسه أبلغ من ذالك، انتهى وفي الوقاية في اخر باب صفة، فإن سجد على كور عمامته أوفاضل ثوبه أو شئي يجد حجمه وتستقر عليه الجبهة جاز، وإن لم تستقر لا يجوز، انتهىٰ فالمركب الهوائي وإن كان مركبامن اشياء صلبة بحيث تستقر عليه الجبهة ولا تنتقل بالتسفيل تجوز السجدة عليه والظاهر أنه ملحق بالدابة كالسفينة السائرة والموقوفة بالشط الغير المستقرة على الأرض، فإنها ملحق بالدابة كما يستفاد من ''رد المحتار'' قبيل سجدة التلاوة فالصلوٰة المكتوبة على المركب الهوائي لاتجوز بدون العذر كما هو حكم الصلوٰة على الدابة والسفينة السائرة، وهل يلزم التوجه إلى القبلة ههنا كما في السفينة أولا كما في الدابة؟ والظاهر أنه يلزم؛ لأن المركب الهوائي بمنزلة البيت كالسفينة، فإن لم يمكنه يمكث عن الصلوٰة إلاإذا خاف فوت الوقت لماتقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته''۔

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنے میں تفصیل یہ ہے کہ جب تک ہوائی جہاز زمین پر کھڑا ہے یا زمین پر چل رہا ہے اس وقت تک وہ ریل کے حکم میں ہے، اس پر بالاتفاق نماز جائز ہے، لیکن جب وہ پرواز کر رہا ہو تو اس حالت میں بھی عذر کی وجہ سے نماز جائز ہے، اگر کھڑے ہو کر ہوائی جہاز میں نماز پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر، ورنہ بیٹھ کر ادا کرے، ہوائی جہاز میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے، اگر قبلہ کے رخ کا علم نہ ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو تحری کر کے نماز ادا کرے، اگر بالفرض بعد میں اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، اگر درمیانِ صلوٰۃ رخ پھر جائے تو اپنا رخ بھی بدل لے (از طرف)(مرتب)۔

۱- دیگر علماء نے تصریح کی ہے کہ وہ مثل دابہ کے ہے اور اس میں نماز بلاعذر جائز نہیں، راجح یہی ہے کہ وہ مثل دابہ کے ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کشتی میں بلاعذر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کو درست قرار دیتے ہیں اور صاحبین رحمہما اللہ بغیر عذر کے بیٹھ کر نماز ادا کرنے کو صحیح نہیں کہتے، اس اختلاف میں صاحبینؒ کا مسلک راجح ہے۔

یہ حکم جب ہے جب کشتی چل رہی ہو اور اگر کنارے پر بندھی کھڑی ہو تو اس وقت مثل ارض کے حکم ہوگا، نیز اس میں استقبال قبلہ بھی ضروری ہے، اگر علم نہ ہو تو تحری کر کے نماز پڑھ لے، غلطی واقع ہونے کی صورت میں اعادہ واجب نہیں ہے۔

''ومن صلى في السفينة قاعداً من غير علة أجزأه عند أبي حنيفةؒ، والقيام أفضل وقالا: لايجزئه إلامن عذر، لأن القيام مقدور عليه، فلا يترك إلا لعلة، وله أن الغالب دوران الرأس وهو كا لمتحقق إلا أن القيام أفضل، لأنه أبعد عن شبهة الخلاف،

مغرب کے وقت کی ابتداء وانتہاء:

غروب آفتاب سے کتنی دیر بعد عشاء کی اذان ہونی چاہئے اور مغرب کی نماز کتنی دیر بعد تک اور رہتی ہے اور کتنی دیر بعد قضاء ہوجاتی ہے۔

مقصود حسن (امام نئی مسجد موضع بھجری ضلع مظفر نگر)

الجواب وباللہ التوفیق:

عشاء کی اذان دینے میں احتیاط یہ ہے کہ غروب سے سوا گھنٹہ کے بعد ہی ہو، اگر کسی معذوری سے نماز مغرب شفق احمر کے غروب ہونے سے پہلے نہ پڑھ سکا تھا تو شفق ابیض کے غروب ہونے تک پڑھ لے تو قضاء نہ کہیں گے اور شفق ابیض کی مقدار عموماً سوا گھنٹہ تک بعد غروب رہتی ہے، اس کے بعد پڑھنا قضاء شمار ہوجائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/۱۴۰۴ھ

والخروج أفضل ما أمكنه؛ لأنه أسكن لقلبه، والخلاف في غير المربوطة، والمربوطة كالشط هو الصحيح" (الہدایہ مع فتح القدیر ۱/۴۶۱ باب صلوٰۃ المریض) (مرتب)۔

"صلى الفرض في فلک جارقاعداً بلا عذر صح لغلبة العجز وأساء، وقالا: لايصح إلابعذر وهو الأظهر برهان. والمربوطة في الشط كالشط فى الأصح والمربوطة بلجة البحر إن كان الريح يحركها شديدا فكالسائرة وإلا فكالوا قفة، ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت. قال الشامي تحت قوله: (وأساء) أشار إلى أن القيام أفضل، لأنه أبعد عن شبهة الخلاف، والخروج أفضل إن أمكنه؛ لأنه أسكن لقلبه، بحروشرح المنية، (قوله وهو الأظهر) وفي الحلية بعد سوق الأدلة: والأظهر أن قولهما أشبه، فلاجرم أن مافى الحاوى القدسي: وبه نأخذ (قوله: والمربوطة فى الشط كالشط) فلا تجوز الصلوٰة فيها قاعداً اتفاقاً. وظاهر مافي الهداية وغيرها الجواز قائما مطلقا: أى استقرت على الأرض أو لا، وصرح في الإيضاح بمنعه في الثاني حيث أمكنه الخروج إلحاقالها بالدابة نهر. (إلى قوله) وعلى هذا ينبغي أن لا تجوز الصلوٰة فيها سائرة مع إمكان الخروج إلى البر" (فتاویٰ شامی ۱/۵۱۲ مطلب فى الصلوٰة فى السفينة)۔

مذکورہ بالا عبارت سے چند مسائل اور معلوم ہوئے، کشتی اگر کنارے پر بندھی کھڑی ہو اور پرسکون حالت میں ہو اور کھڑے ہوکر نماز ادا کی جاسکتی ہو، یا یہ ہو کہ باہر نکل کر نماز ادا کرسکتا ہے تو کشتی میں نماز درست نہ ہوگی الا یہ کہ ساحل پر نکلنا ممکن نہ ہو، کشتی اگر چل رہی ہو اور کھڑے ہوکر نماز ادا نہیں کی جاسکتی تو بالاتفاق بیٹھ کر نماز ادا کی جاسکتی ہے، نیز کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے کی بنا پر سر چکراتا ہو تو بالاتفاق بیٹھ کر نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ استقبال قبلہ از اول تا آخر ضروری ہے، اگر درمیان میں رخ بدل جائے تو اپنا رخ بھی بدل لے (مرتب)۔

چاند پر نماز اور استقبال قبلہ کا حکم؟

حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ آج کل لوگ چاند پر اتر کر رہنے کی باتیں کرتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے؟

بفرض محال اگر آدمی چاند پر سکونت اختیار کر لے تو کیا وہاں پر نماز پڑھنا صحیح ہوگا اور کس طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر جگہ مل جائے تو جماعت بھی کر سکتے ہیں ورنہ تنہا تنہا پڑھ لیں قضاء نہ کریں۔ قبلہ نما رکھ کر قبلہ معلوم کر سکتے ہیں ورنہ تحری کر کے سمت قبلہ متعین کر لیں۔ اگر تحری میں غلطی بھی واقع ہو جائے اور تحری کر کے سمت قبلہ متعین کر لیں تو نماز ادا ہو جائے گی، "وأينما تولوا فثم وجه الله" (۱) پر عمل ہو جائے گا۔

سیٹ سے علیحدہ ہو کر کسی خالی جگہ میں قیام و رکوع و سجدہ کے ساتھ نہ پڑھی جائے تو سیٹ ہی پر بیٹھے اشارہ سے رکوع و سجدہ کر کے پڑھ لیں، پھر زمین پر اتر کر فرض کا اعادہ کر لیں چاند کیا زہرہ و مریخ وغیرہ پر جانا رہنا ممکن ہے، اس میں شرعاً کوئی مانع نہیں ہے اور وہاں نماز پڑھنا بھی صحیح ہوگا، بلکہ وہاں بھی نماز پڑھنے کا حکم اور وجوب اسی طرح باقی رہے گا اور نماز قبلہ رخ ہی پڑھنی ہوگی، قبلہ نما رکھ کر یا کسی اور ذریعہ سے، ورنہ تحری کر کے قبلہ متعین کریں گے اور جس طرح یہاں نماز فرض ہے اسی طرح وہاں بھی فرض رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہ، مفتی دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید، دارالعلوم دیوبند

تعیین قبلہ کی صحیح شکل:

۱-ہمارے موضع میں ایک قدیم مسجد ہے جس کی توسیع و تعمیر کا کام شروع کیا گیا تھا، دوران کام قبلہ رخ کی جانچ کرنے کے لیے قبلہ نما آلہ سے جانچ کی گئی تھی جس کے لحاظ سے حالیہ مسجد ۹/ڈگری پر مسجد رہے، یہاں کے مقامی علماء کہتے

۱- سورۂ بقرہ: ۱۱۵۔

ہیں کہ بیدر کے لئے دس ڈگری پر قبلہ ہونا چاہئے بعض فرماتے ہیں کہ سات تا دس ڈگری پر مسجد رہے تو نماز درست ہوسکتی ہے، لہٰذا آپ جواب قطعی تحریر فرمائیں۔

۲-نیز یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ حالیہ مسجد کا رخ اگر غلط ہے تو آج تک اس میں پڑھی گئی نمازوں کا کیا حشر ہوگا آیا صحیح ہوئی یا نہیں؟ مسجد کس ڈگری پر ہونی چاہئے مطلع فرمائیں۔بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کا یہ جملہ (۱) حالیہ مسجد ۹رڈگری پر ہے۔

(۲) ضلع بیدر کے لیے ۱۰رڈگری پر قبلہ نما ہے۔

اولاً تو بالکل مبہم اور غیر واضح ہے، جب تک مسجد کی اتر دکھن کی لمبائی کی مقدار معلوم نہ ہو اس فرق سے کسی مقدار کا تعین نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً چونکہ حکم شرعی کا مدار ان جدید آلات وحسابی دقائق میں نہیں ہوتا، اس لیے اس پر کوئی کلام بے سود اور بے نتیجہ ہوگا، اس لیے (۲) کے متعلق اس حیثیت سے گفتگو بھی نظر انداز کر کے اس کے حکم شرعی کے متعلق کی گئی ہے۔

جواب استفتا سے قبل یہ چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں:

دین اسلام دینِ فطرت ہے: ''نحن أمة أمية لانكتب ولا نحسب'' أوكما قال عليه السلام (۱) اسلام کے احکام اس فطرت کے مطابق بالکل سیدھے سادے ہوتے ہیں، علم ریاضی وہندسہ کے حسابی دقائق پر موقوف نہیں ہوتے اور نہ ان آلاتِ جدیدہ قطب نما، قبلہ نما پر احکام شرعیہ کا مدار ہوتا ہے، مگر یہ سب چیزیں محض تخمین وتسکین ومددگار کے درجہ میں ہوتی ہیں اور یہ بداہۃً بھی ظاہر ہے، ان آلات کے علم ہونے سے قبل اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر افریقہ وروم وفارس وغیرہ تمام ممالک میں اس طرح پہنچ گیا تھا، تمام مساجد بھی بن چکی تھیں اور بغیر ان آلات کے بنیں اور آج تک اسی طرح معتبر وقائم ہیں۔

اب اس کے بعد جواب بحکمِ شرعی لکھا جاتا ہے:

۱-مسئلہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف جب آنکھوں کے سامنے اور معائن ہو تو عینِ کعبہ کی مواجہت شرط ہوتی ہے اور

۱- الصحیح للبخاری ۱/۲۵۶۔

جب بیت اللہ شریف آنکھوں سے اوجھل نظروں سے غائب ہو تو محض سمتِ قبلہ اور جہت قبلہ کی مواجہت فی الجملہ کافی ہوتی ہے(۱)، اور بیت اللہ سے جتنی دوری ہوجاتی ہے مواجہت فی الجملہ میں توسیع ہوتی جاتی ہے اور مواجہت فی الجملہ کا مفہوم یہ ہے کہ چہرہ سے خواہ ناک کے سیدھے یا چہرہ کے کسی حصہ سے اگر سیدھا خط نکال دیا جائے تو سیدھا بیت اللہ شریف تک پہنچ جائے تو مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجائے گی اور جدید حساب کی رو سے ایک دو ڈگری کا فرق صحتِ صلوٰۃ میں مخل اور مضر نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سمت قبلہ کی بحث:

۱- کیا ایک مسافر مہمان یا سیاح کے لئے جائز ہے کہ بلادعوت کسی تعمیر شدہ مسجد یا کسی مسلمان کے گھر میں قطب نما (قبلہ نما) کو حجت بنا کر قبلہ کی سمت کی تصحیح کرے۔

۲- کسی مقام اور کعبے کے درمیان جس رخ سے فاصلہ قریب ترین ہو اسی سمت قبلہ ہوگا عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے مگر آج جو آدمی ایک مقام پر مسجد تعمیر کر رہے ہیں اور اصول پر یعنی قریب ترین فاصلے کی طرف قبلہ مقرر کر کے محراب بنادیں اگر آج سے بیس سال بعد کچھ نئے آلات سے یہ دریافت کیا جائے کہ ایک اور سمت سے جو کہ پہلے سے برعکس تو نہیں، لیکن اگر پہلی مغرب تھی تو یہ مشرق نہیں، بلکہ مغربی جنوب ہے مسجد کا کعبہ سے فاصلہ قریب ترین ہے کیا اس صورت میں سابقہ محراب اور رخ قائم رکھا جائے یا تبدیل کر دیا جائے۔

ابراہیم ہمدانی (کیلی فورنیا، یو، ایس، اے)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- ایسی صورت میں اس کو خود وہاں کے ذمہ داروں سے مشورہ کے بغیر کوئی تغیر و تبدیلی کر ڈالنا درست نہیں، بلکہ اس شخص پر لازم ہے کہ پہلے یہ دیکھ لے کہ مسجد کا انحراف کتنا ہے صرف اتنا انحراف ہو جس سے مواجہۃ فی الجملہ بھی حاصل ہوجاتی

۱- ”فللمکي إصابة عینها ولغیره أي غیر معاینها إصابة جهتها بأن یبقی شيء من سطح الوجه مسامتاً للکعبة أو لهوائها، بأن یفرض من تلقاء وجه مستقبلها حقیقة في بعض البلاد، خط علیٰ زاویة قائمة إلی الأفق ماراً علی الکعبة، وخط آخر یقطعهٗ علی زاویتین قائمتین یمنة ویسرة“ منح“ (الدرالمختار علی ہامش الشامی ۱/۲۸۷ کتاب الصلوٰۃ)(مرتب)۔

ہے جب تو سکوت کرے۔ ہاں اگر اتنا زیادہ انحراف ہے جس سے مواجہت مسجد حرام فی الجملہ بھی حاصل نہیں ہے تو اس مسجد کے ذمہ داروں اور سمجھ دار مصلیوں سے ذکر کرے پھر ان کے مشورے سے وہاں کے معتمد علماء سے فتوی لیکر اس کے مطابق جس تبدیل وتغیر کی ضرورت ہو اتفاق و اتحاد سے کرے خود رائی ہرگز نہ کرے اسی طرح اگر کسی مسلمان نے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ متعین کر رکھی ہے اور اسکا قبلہ منحرف پائے تو اس میں بھی یہی مذکورہ بالا تفصیل ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ اس صورت میں عام نمازیوں سے یا عام مسلمانوں سے مشورہ کی حاجت نہیں، بلکہ اس گھر کے ذمہ داروں سے مشورہ لے کر استفتاء کرے پھر اس فتوی کے مطابق اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو کرنا ہو کرے، ہاں مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ خود اپنی نماز پڑھنی ہو اور وہاں کوئی صحیح قبلہ رخ بتانے والا نظر نہ آئے تو فقط اپنی تحری اور اس تحری کی قطب نما وغیرہ کے مطابقت کے بعد نماز پڑھ لینا کافی اور جائز ہوگا (۱)، مواجہت فی الجملہ کا مفہوم۔ جواب ۲ کا ضمنی نمبر "ب" کے اندر آگے آرہا ہے۔

۲- جناب نے جو کچھ لکھا اور سمجھا ہے تقریباً صحیح سمجھا اور لکھا ہے جواب نمبر ا کے اندر درج کی ہوئی تفصیل و قیود و شرائط کے مطابق اتحاد و اتفاق کے ساتھ تبدیل وتغیر کر دیا جائے گا اس کی نظیر مسجد ذو قبلتین موجود ہے، البتہ خود رائی وغیرہ کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہ ہوگا (۲)۔

تمام حوالجات کے ساتھ مدلل و مکمل جواب تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک رسالہ درکار ہے اور اس کی گنجائش ان اوراق استفتاء میں نہیں ہے اس لئے مختصر مگر اس انداز سے لکھدیا جاتا ہے کہ آسانی سے پوری بات سمجھ میں آجائے۔ اس کے لئے پہلے چند باتوں کا بطور تمہید ذکر کر دینا ضروری ہے۔

الف- مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب تک کعبۃ اللہ شاہد اور نگاہوں کے سامنے ہو تو عین کعبہ کا استقبال ضروری ہوتا ہے اور جب عین کعبہ شاہد نہ ہو، لیکن مسجد حرام شاہد ہو تو مسجد حرام کا استقبال ضروری ہوتا ہے (۳)، اور جب مسجد الحرام بھی شاہد اور نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو مسجد حرام کی سمت کا رخ کرنا اور مواجہت کر لینا اور وہ بھی مواجہت فی الجملہ کر لینا کافی ہو جاتا ہے،

۱- "وان اشتبهت عليه القبلة وليس بحضرته من يسأله عنها اجتهد وصلى كذا في الهداية" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۶۴)۔

۲- (اس لئے کہ جہت کعبہ کی طرف رخ کرنا نماز کے لئے شرط ہے، لقوله تعالى: فول وجهک شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره (بقرۃ: ۱۴۴) نیز تحویل قبلہ سے متعلق حدیث کے اخیر میں ہے: فصلى رجل معه العصر ثم مر على قوم من الأنصار وهم ركوع في صلاة العصر نحو بيت المقدس، فقال: هو يشهد أنه صلى مع رسول الله ﷺ وانه قد وجه إلى الكعبة قال فانحرفوا وهم ركوع (سنن الترمذی ابواب الصلاة باب ما جاء في ابتداء القبلة حدیث ۳۴۰) (مرتب)۔

۳- "وفي التجنيس: من كان بمعاينة الكعبة فالشرط إصابة عينها، ومن لم يكن بمعاينتها فالشرط إصابة جهتها وهو المختار" (البحر الرائق ۱/ ۴۹۵) (مرتب)۔

حتی کہ اگر صحیح سمت کا پتہ کسی وجہ سے نہ چلے اور نہ کوئی صحیح بتانے والا ملے تو ستاروں وغیرہ سے اندازہ لگا کر اور تحری کر کے یا آلات وغیرہ سے مدد لیکر اور تحری کر کے جس رخ وسمت پر دل قرار پائے اس رخ پر تحریمہ باندھ کر نماز پڑھ لے، کیونکہ ان سب صورتوں پر مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجاتی ہے "ولله المشرق والمغرب فأينما تولوا فثم وجه الله"(۱) جو اصلی حکم ہے اس پر عمل ہوجاتا ہے اور یہ سب احکام تقریباً مذہب کی تمام ہی کتابوں میں درج ہے جو معتبر ہیں(۲)۔

ب-کعبہ شریف کی لمبائی چوڑائی صرف ۲۲x۲۸ کے لگ بھگ ہے اور مسجد قباء و مسجد نبوی کی لمبائی چوڑائی یقیناً اس سے (۲۲x۲۸) سے زیادہ ہے۔ نیز مسجد نبوی کے دائیں بائیں مدینہ طیبہ کی دیگر مساجد جو دور رسالت میں تعمیر ہوئیں۔ ان سب میں بھی تمام مقتدی ایک ہی خط پر صف بستہ کھڑے ہوتے تھے ظاہر ہے کہ ان میں صرف بعض ہی مقتدی سے اس خط پر عین کعبہ کی مواجہت کا امکان ہے اور باقی تمام مقتدیوں میں عین کعبہ کی مواجہت متصور نہیں ہوسکتی، اس کے باوجود سب کے حق میں مواجہت کعبہ تسلیم کی گئی یہ عمل مواجہت قبلہ فی الجملہ کافی ہونے پر کھلی دلیل ہے۔

ج-پھر دور صحابہ و تابعین میں بہت دور دراز مقامات تک صحابہ و تابعین پہنچے، مثلاً فارس و روم، بلکہ افریقہ کے بڑے بڑے جنگلات کے آگے پہنچ گئے اور تقریباً ہر جگہ مسجدیں بنائیں اور بربر کے علاقہ کی صرف ایک مسجد کے سوا جس کی جہت کعبہ غیبی آواز پر عین کعبہ کے رخ پر بنائی باقی سب مسجدیں یا تو اپنے سامنے والی آبادی کی مسجدیں جس رخ وسمت پر بنی تھیں اسی رخ وسمت پر بنائیں یا پھر جہاں بڑے بڑے ریگستان یا غیر آباد جنگلات یا سمندر و پہاڑ حائل ہوئے وہاں محض ستاروں کے اندازے پر تخمینہ و تحری کر کے یا اس دور کے آلات و حسابات کے اصول پر سمت قبلہ متعین کر کے بنائیں، بلکہ ایک مسجد جس خط پر بنایا اس کے دائیں بائیں سو سو پچاس پچاس میل کے فاصلے پر بھی اسی خط پر سمت قبلہ تسلیم کر کے اور مسجدیں بھی بنائیں یہ بھی کھلی دلیل ہے کہ صرف مواجہت قبلہ فی الجملہ شرعاً مطلوب ہے۔

د- مواجہۃ فی الجملہ کا مفہوم۔ لفظ مواجہ وجہ (چہرہ) سے ماخوذ ہے پیشانی کے اوپر اگے بال کی جڑ سے تھوڑی کے نیچے تک کا اور دونوں کانوں کے قریب تک کا حصہ ہے یہ حصہ دائرہ نما ہوتا ہے جس میں بیچ میں ابھار اور ہر طرف ڈھلاؤ اور

۱- سورۂ بقرہ:۱۱۵۔

۲- "ومن كان خارجاً عن مكة فقبلته جهة الكعبة، وهو قول عامة المشائخ هو الصحيح، هكذا في التبيين، وجهة الكعبة تعرف بالدليل، والدليل في الأمصار والقرى المحاريب التي نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فإن لم تكن فالسؤال من أهل ذلك الموضع، وأما في البحار والمفاوز فدليل القبلة النجوم، هكذا في فتاوى قاضي خان" (فتاویٰ عالمگیریہ ۱/ ۶۳) (مرتب)۔

نیچا ہوتا ہے اور اسکی صورت مثلاً یہ ہوگی اگر اس طرح کھڑا ہوا جائے کہ اس دائرۂ وجہ کے کسی بھی حصہ سے اگر کوئی خط مستقیم آگے کو نکلے اور وہ سیدھا مسجد حرام کے کسی بھی حصہ تک یا بیت اللہ کے اوپر جو عرش معلّٰی تک ہے اس کے کسی حصہ تک پہنچ جائے تو مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجائے گی اور "من حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام" (۱)، کا مفہوم صادق آکر نماز کی ادائیگی صحیح ہوجائے گی اور یہی مواجہۃ فی الجملہ شرعاً مطلوب ہے اور یہی مواجہۃ فی الجملۃ جس مسجد میں حاصل ہوجائے گی اس مسجد کا قبلہ صحیح متصور ہوگا اور اس کا بدلنا اور متغیر کرنا ضروری نہیں ہوگا (۲)۔

ھ- زمین مع پانی کے کروی ہے اور اس میں ایک جگہ کعبہ ہے جس کو اللہ تعالی نے تمام عالم کا قبلہ و مرکز قرار دیا ہے اور قبلہ سے مراد کعبہ کی یہ عمارت نہیں ہے بلکہ وہ حصہ ہے جس پر یہ عمارت ہے وہ حصہ اور اس کے مقابل جتنا حصہ تحت الثری تک ہے وہ اور پھر اس کے مقابل جتنی فضا و عرشِ معلّٰی تک ہے وہ سب قبلہ گاہ عالم اور تجلی باری تعالی کا خصوصی مورد ہے، اسی کی طرف سارے عالم کا رخ پھیر دیا ہے اور یہ عمارت اس پر نشانی و علامت ہے اور اس کے ساتھ ملصق ہے اس لئے یہ بھی محترم او رواجب الاحترام ہے اور کعبہ کو کعبہ اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی حصہ زمین کو پانی کے اوپر ظاہر کیا اور ابھارا پھر اس کے بعد اللہ نے اپنی قدرت و حکمت سے جتنا چاہا پھیلایا او ر بڑھایا پھر اسی طرح جہاں جہاں اور جتنا حصہ زمین کا چاہا پانی کے اوپر ابھارا اور پھیلایا" كما اشار اليه قوله: إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة مباركا" (۳)،غرض اللہ نے اسی حصہ کو تمام عالم کا قبلہ قرار دیکر تمام جنات و انسان کو اسی کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا آیت کریمہ "ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره" (۴) میں دیا ہے اور "فول وجهك" اور "فولوا وجوهكم" میں مواجہت فی الجملہ مراد لیا ہے (۵)، جیسا کہ احادیث صحاح سے

۱- سورۂ بقرہ: ۱۴۹۔

۲- "لأن وجه الإنسان مقوس فمهما تأخر يميناً أو يساراً عن عين الكعبة يبقى شيء من جوانب وجهه مقابلا لها" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۱۰۹، ۱۱۰)۔

۳- سورۂ آل عمران، "وبكة لغة في مكة عند الأكثرين،... وقيل: بكة موضع المسجد ومكة البلد بأسرها وأصلها من البك بمعنى الزحم .... وذهب أكثر أهل الأخبار أن الأرض دحيت من تحته" (تفسیر روح المعانی ۳/۸، ۹) (مرتب)۔

۴- (سورہ بقرہ: ۱۵۰)، نیز "ولكل وجهة" کی تفسیر میں مذکور ہے: أو لكل قوم من المسلمين جهة وجانب من الكعبة يصلي إليها جنوبية أو شمالية أو شرقية أو غربية (تفسیر روح المعانی تفسیر جزء ثانی ص ۲۱) (مرتب)۔

۵- أي ليس المراد بالقبلة الكعبة التي هي البناء المرتفع على الأرض ولذا لو نقل البناء إلى موضع آخر وصلى إليه لم يجز بل تجب الصلاة إلى أرضها كما في الفتاوى الصوفية عن الجامع الصغير (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۱۱۴)۔

بھی معلوم ہوتا ہے اور تعامل صحابہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔اور مزید وضاحت ذیل کے نقشے سے ہوگی۔

و- زمین کے کروی ہونے کی وجہ سے کعبہ شریف سے خط مستقیم پورب جانب کو سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ جتنا پورب بڑھتا جائے گا کروی ہوتا جائیگا، اسی طرح کعبہ شریف سے جو خط مستقیم سطح ارض وسمندر پر پچھم جانب کو چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ یہ دونوں خط (خط غربی وشرقی) نصف دائرہ کے ایک نقطہ پر آپس میں ملکر ایک مکمل دائرہ بنا دیں گے۔

اسی طرح کعبہ شریف سے جو خط مستقیم اتر کی جانب سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا اور جو خط مستقیم کعبہ شریف سے دکھن کی جانب سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا یہاں تک کہ یہ دونوں (جنوبی و شمالی) بھی نصف دائرہ کے ایک نقطہ پر آپس میں ملکر دائرہ بنا دیں گے اور یہ نقطہ بعینہ وہی نقطہ ہوگا جو خط غربی وشرقی کو آپس میں ملا کر ایک مکمل دائرہ بنا چکا ہے پس اس نقطہ پر چاروں سمت (پچھم، پورب، اتر، دکھن) سے کعبہ شریف کا فاصلہ برابر ہوگا اور اس نقطہ پر جو شخص اس پر نماز پڑھ سکتا ہو تو وہ جس طرف چاہے رخ کر کے نماز پڑھ لے مواجہۃ فی الجملہ حاصل ہو کر اس کی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

البتہ اس جگہ سے ذرا ہٹ جانے پر یہ حکم نہ رہے گا۔ مثلاً اس جگہ سے اگر خط غربی کی طرف ہٹے گا تو اس کو پورب رخ نماز پڑھنا لازم ہو جائے گا اب اگر وہاں کوئی مسجد کسی وجہ سے پچھم رخ پر بنی ہوگی تو اس کا قبلہ بدل کر پورب رخ بنالینا لازم ہو جائے گا، کیونکہ پچھم رخ میں مواجہت فی الجملہ بھی حاصل نہ ہوگی اور دیدہ و دانستہ پچھم ہی رخ نماز پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی اسی طرح اس جگہ سے اگر خط شرقی کی طرف ہٹے گا تو اس کو پچھم رخ پر نماز پڑھنا لازم ہوگا اب اگر وہاں کوئی مسجد کسی وجہ سے پورب رخ بنی ہوئی ہو تو اس کا قبلہ بدلکر پچھم رخ کر لینا ضروری ہوگا کیونکہ پورب رخ میں مواجہۃ فی الجملہ بھی حاصل نہ ہوگی اور نماز نہ ہوگی۔

اسی طرح اس نصف دائرہ کے مرکزی نقطہ سے اگر اتر ہٹے گا تو اس کو دکھن رخ قبلہ بنانا واجب ہوگا اور اگر دکھن سے ہٹے گا تو اتر رخ قبلہ بنانا ضروری ہو جائے گا۔ اور خلاف ورزی کرنے میں نماز نہ ہوگی اسی طرح جو مسجدیں یا جو لوگ ان دونوں دائروں کے درمیان واقع ہوں گے انکو بھی مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل کرنے میں انہی ضمنی نمبروں میں ذکر کئے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرنا لازم ہوگا، یعنی اس طرح نماز پڑھنا ہوگا یا مسجد بنانا ہوگا کہ جتنے خط مستقیم وجہ مصلی سے نکل کر سمت قبلہ کی طرف چلیں ان میں سے کم از کم ایک خط مستقیم سیدھا مسجد حرام کے کسی حصہ تک یا بیت اللہ کے اوپر عرشِ معلیٰ تک بیت

اللہ کے محاذی جو فضا ہے اس کے کسی حصے تک پہنچ جائے اور یہی مفہوم ہے سوال کے اس جملہ کا (کہ کسی مقام اور کعبہ کے درمیان جس رخ سے فاصلہ قریب ترین ہوا سی سمت قبلہ ہوگا)، کیونکہ اس خط مستقیم پر اس مقام اور کعبہ کے درمیان کا فاصلہ کمتر ہوگا اور بیت اللہ قریب تر ہوگا۔

ز-: کعبہ کی عمارت جس بقعہ پر واقع ہے اس بقعہ کو جب اللہ تعالی نے پانی کے اوپر تمام زمین ابھارنے سے پہلے ابھارا اور نمودار کیا اور اس کو مرکز عالم بنایا پھر حصۂ بقعہ کو اور اس کے محاذی حصے کو تحت الثری تک اور اس بقعہ سے اوپر اس بقعہ کے محاذی فضا کا حصہ عرش معلیٰ تک اپنی خصوصی توجہ کا مورد بنا کر اس کو معظم و محترم بنایا اور تمام عالم کا قبلہ قرار دے دیا اور "ولله المشرق والمغرب فأينما تولوا فثم وجه الله" (۱) کا اصل حکم موجود ہوتے ہوئے (جسکا ثمرہ اب بھی تحری قبلہ وغیرہ کے موقع پر ظاہر ہوتا ہے) اسکے بجائے صرف اسی قبلہ عالم کی جانب تمام انسانوں اور جناتوں کو نماز پڑھنے کا حکم دے دیا تا کہ اس تجلی گاہ عالم کی عظمت اور احترام ہمیشہ باقی اور محفوظ رہے، نیز اس لئے کہ مصلی کی یہ ایک رنگی اور وحدت اشارہ کرے گی وحدت عقیدہ پر اور وحدت عقیدہ دلیل ہوگی وحدتِ ذات پر اور اس کی توحید پر اور یہ عین محمود و مطلوب ہے ان سب باتوں کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہر نماز میں اور ہر جگہ عین کعبہ کی مواجہۃ فرض ہوتی، مگر ہر جگہ سے عین کعبہ کی مواجہۃ متعذر اور دشوار ہی نہیں بلکہ بسا اوقات انسانی قابو سے باہر تھی، اس لئے اللہ نے اپنے قانون: "لا يكلف الله نفساً الا وسعها" (۲) اور "الدين يسر" (۳) کے مطابق ہر جگہ و ہر مقام سے عین کعبہ کی مواجہت فرض نہیں رکھا، بلکہ محض کعبہ کے مشاہد ہونے تک محدود رکھا اور کعبہ کے غیر مشاہد ہونے کی صورت میں صرف مواجہۃ فی الجملہ کی فرضیت قائم فرمادی تا کہ یک رنگی عمل بھی باقی رہے اور احترام و اعزاز بقعہ مبارکہ بھی محفوظ و حاصل رہے۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد اصل سوال کا جواب خود بخود نکل آیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

خلاصۂ جواب: کسی خطہ و مقام پر جب کوئی نئی مسجد تعمیر کرنا ہو تو پہلے یہ دیکھیں کہ اس خطہ کے قدیم مساجد کا رخ کیا

۱- (سورہ بقرہ:۱۱۵)، نیز درمختار میں ہے: "والمعتبر في القبلة العرصة لا البناء فهي من الأرض السابعة إلى العرش"، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: "ليس المراد بالقبلة الكعبة التي هي البناء المرتفع على الأرض ولذا لو نقل البناء إلى موضع آخر وصلى إليه لم يجز بل تجب الصلاة إلى أرضها" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۱۱۴) (مرتب)۔

۲- سورۂ بقرہ:۲۸۶۔

۳- "عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: إن الدين يسر ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا وبشروا واستعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱/ ۹۳، حدیث ۳۹) (مرتب)۔

ہے، اگر ان کے رخ سے مواجہۃ فی الجملہ حاصل ہوتی ہے اس سے اختلاف مذموم اور مخالفت نا درست ہوگی، بلکہ انہی مساجد کے رخ پر اس نئی مسجد کا قبلہ ومحراب رکھیں، یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی قدیم مسجد کا قبلہ نئے آلات سے دریافت کے بعد بالکل برعکس ومتضاد تو نہیں ہے، بلکہ محض دائیں بائیں (شمالا یا جنوبا) کچھ منحرف ہے تو یہ دیکھ لیں کہ اگر اس انحراف کے باوجود مواجہۃ القبلہ فی الجملہ حاصل ہے جب تو کوئی تبدل وتغیر اس کے محراب وقبلہ میں نہ کریں، کیونکہ اس صورت میں عمل کی یک رنگی محفوظ نہ رہے گی اور یک رنگی حد شرع میں رہتے ہوئے قائم رکھنا عند اللہ مطلوب ومحمود ہے، اور مقصود ہے (۱)، ہاں اگر انحراف اتنا زیادہ ہو کہ مواجہۃ فی الجملہ بھی باقی نہ رہے تو اس کی اصلاح کرنا اور محراب وقبلہ بدل کر مذکورہ طریقہ پر صحیح رخ پر قائم کر دینا ضروری ہو جائیگا دور دراز مقامات پر مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم کرنے کا ایک طریقہ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپاس وغیرہ کسی آلہ کے ذریعہ سے عین کعبہ کی مواجہت معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جس خطہ میں جس خط پر نماز پڑھی جارہی ہے اس خط کے کسی حصہ پر عین کعبہ سے اگر ایک خط مستقیم آکر زاویتین قائمتین بنا دیتا ہے تو اس پورے خطہ کا مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہونا تسلیم کرلیا جائے گا اور اس کی صورت، مثلاً یہ ہوگی

عین کعبہ

زاویتین قائمتین

(خط مستقیم جس پر لوگ نماز پڑھتے ہیں یہ ہے اور اس پر سب مصلی کو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہوگی)

اور یہ ضابطہ کعبہ شریف کے ہر چہار سمت میں یکساں وبے خطر جاری ہوگا وہ خط مستقیم جس کے کسی حصہ پر عین کعبہ سے خط مستقیم آکر زاویتین قائمتین پیدا کرتا ہے کعبہ مکرمہ سے جتنا دور رہوگا اتنا ہی زیادہ طویل ہوگا اور جتنا قریب ہوگا اسی قدر چھوٹا ہوگا، اسی طرح جو ممالک وجزائر کعبہ شریف سے بہت ہی دور واقع ہیں ان ممالک میں مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم کرنے کے لئے فقہائے کرام نے کچھ اور ضابطے بھی لکھے ہیں، مثلاً جو ممالک کعبہ شریف سے پورب بہت دور واقع ہیں، جیسے ہندوستان اور اسکے پورب منتہائے نصف دائرہ تک تمام ممالک خواہ وہ نصف دائرہ امریکہ میں واقع ہوان کے لئے یہ دو ضابطے بھی مواجہۃ قبلہ معلوم کرنے کے ہوسکتے ہیں۔

۱- ''أی شرطه الله تعالی لاختبار المكلفين، لأن فطرة المكلف المعتقد استحالة الجهة عليه تعالى تقتضي عدم التوجه في الصلاة إلى جهة مخصوصة، فأمرهم على خلاف ما تقتضيه فطرتهم اختبارا لهم هل يطيعون أولا كما في البحر'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۱۰۸)(مرتب)۔

ضابطہ(۱) یہ کہ مسجد پچھم رخ ہو اور قبلہ کی دیوار اس خط مستقیم پر واقع ہو جو قطب شمالی سے نکل کر قطب جنوبی پر جاتا ہے یا قطب جنوبی سے نکل کر سیدھا قطب شمالی پر جاتا ہو، بعینہ یہی ضابطہ دور دراز کے اور ممالک کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو کعبہ شریف سے پچھم جانب واقع ہوں، جیسے الجیریا وغیرہ اور اسکے پچھم منتہائے نصف دائرہ تک تمام ممالک، خواہ وہ نصف دائرہ امریکہ میں کیوں نہ واقع ہو اور مسجد پورب رخ واقع ہو تو جس مسجد کی قبلہ کی دیوار اس خط مستقیم پر واقع ہوگی جو قطب شمالی سے نکل کر سیدھا قطب جنوب پر پہنچتا ہے یا بالعکس قطب جنوبی سے نکل کر سیدھا قطب شمالی پر پہنچتا ہے۔

ضابطہ(۲) جو ممالک کعبہ شریف سے پورب بہت زیادہ دوری پر واقع ہیں ان کی مسجد پچھم رخ ہو اور قبلہ کی دیوار بین المغربین واقع ہو، یعنی سب سے بڑے دن میں جس نقطے پر آفتاب غروب ہوتا ہو، اس نقطے کے اور سب سے چھوٹے دن میں جس نقطہ پر آفتاب غروب ہو اس نقطہ کے درمیان بغیر کسی انحراف کے قبلہ کی دیوار واقع ہو تو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل تسلیم ہوگی۔

آفتاب غروب ہونے کے انہیں دونوں نقطوں کو فقہاء مغربین کہتے ہیں بعینہ یہی ضابطہ دور دراز کے ان ممالک و جزائر کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو کعبہ شریف سے پچھم واقع ہوں، جیسے الجیریا وغیرہ اور اس کے پچھم منتہائے نصف دائرے تک کہ تمام ممالک، خواہ نصف دائرہ امریکہ پر کیوں نہ واقع ہو اور مسجد پورب رخ ہو صرف فرق یہ ہوگا کہ مسجد کی قبلہ کی دیوار بین المغربین واقع ہونے کے بجائے بین المشرقین واقع ہو، یعنی سب سے بڑے دن میں جس نقطہ پر آفتاب طلوع ہوتا ہے اس نقطے کے اور سب سے چھوٹے دن میں آفتاب جس نقطہ پر طلوع ہوتا ہے اس نقطہ کے درمیان واقع ہو تو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہو جائے گی۔

فقہائے کرام آفتاب طلوع ہونے کے ان دونوں نقطوں کو مشرقین سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو لوگ کعبہ شریف سے دکھن جانب واقع ہیں وہ لوگ قطب شمالی سے یا اور ستاروں سے اندازہ لگا کر مواجہۃ قبلہ فی الجملہ کا پتہ لگا سکتے ہیں اور جب کعبہ سے اتنے دور دراز فاصلہ پر واقع ہوں جہاں سے قطب شمالی نیچے پڑ جانے کی وجہ سے نظر نہیں آئے تو وہاں قطب جنوبی سے اندازہ لگا سکتے ہیں یا کمپاس وغیرہ آلہ کے ذریعے سے عین کعبہ کی مواجہہ معلوم کرنے کے بعد دیکھیں کہ اگر عین کعبہ سے اگر کوئی خط مستقیم نکل کر اس خط کے کسی حصہ پر آکر زاویتین قائمتین بنادیتا ہے تو مواجہت فی الجملہ بلاشبہ حاصل ہو جائے گا۔

جو لوگ کعبہ سے اتر جانب واقع ہیں وہ لوگ قطب شمالی یا دوسرے تاروں سے اندازہ لگا کر مواجھہ قبلہ فی الجملہ

معلوم کرسکتے ہیں یا کمپاس وغیرہ آلات سے عین کعبہ کی مواجہۃ معلوم کرنے کے بعد دیکھیں کہ اگر عین کعبہ سے کوئی خط مستقیم نکل کراس خط کے کسی حصہ پر آکرزاویتین قائمتین بنادیتا ہےتومواجہۃ فی الجملہ بلاشبہ حاصل ہوجائے گی۔

یہی طریقہ ان لوگوں کے لئے مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم ومتعین کرنے کا ہے جولوگ شمال مغرب یا شمال مشرق کے گوشوں میں یا جنوب مغرب یا جنوب مشرق کے گوشوں میں آباد ہیں، خواہ کتنے بھی دور ہوں (۱)۔ وھذا آخر ما أردنا بیانہ ھھنا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۱۰/۱۴۰۰ھ

مغرب کے رخ پر بنائی گئی قدیم مساجد کا حکم:

کیا اکثر دینی صحیفوں میں ہم نے پڑھا اور دیکھا ہے کہ قبلہ یعنی کعبۃ اللہ ہمارے ملک ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے رخ کی صریحاً تشریح مذکورہ کتب میں نہیں بتائی گئی ہاں جغرافیائی اور سائنس سے ٹھیک ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے جنوبی ہند کے ٹھیک ''شمال، مغرب'' میں کعبہ واقع ہے اور آج کل کعبہ شریف کا رخ پہچاننے کا مصنوعی آلہ آچکا ہے جس سے ٹھیک رخ پہچانا جاتا ہے۔

غرض جنوبی ہند کے اکثر قدیم مساجد جو تقریباً سوسال قبل کبھی تعمیر کی گئی ہیں ٹھیک مغرب کے رخ پر ہی بنائی گئی ہیں اور آج بھی اسی رخ پر نمازیں پڑھی جارہی ہیں اسلاف کے بزرگوں اور دینداروں کو رخ کعبہ کا ٹھیک پتہ نہ تھا اور انھوں نے اپنی کتب میں ''کعبہ ہند سے مغرب جانب میں واقع ہوتا ہے کے الفاظ پر عمل کیا ہے۔ اس لحاظ سے ساری مسجدیں طرف مغرب پر تعمیر کی گئی ہیں۔ مگر اب کے علماء مسجدوں میں ٹیڑھی صفیں بنانے پر ترجیح دے کر صفیں بالکل ٹیڑھی ہی بنادی گئی ہیں۔ لہذا ہمارے اسلاف جنھوں نے تعمیر مسجدیں کرائی ہیں اب ان کی بے حرمتی اور بدنامی کے علاوہ بڑا عیب اور دھبہ لگا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سوال یہ ہے کہ سابق اور اسلاف کے نیک بزرگوں اور ہماری نمازیں اب تک کی کیا ہوئیں آخر اس کا حل کیا ہے؟ اور قدیم مسجدیں کیا کی جائیں؟ آج کل یہ نیا انقلاب فساد کے نمونہ پر پہنچا ہے کیا کریں؟

احمد سعید عفی عنہ

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۱۰۸/۲-۱۱۳ مبحث فی استقبال القبلۃ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جو مسجدیں قدیم ٹھیک مغرب رخ پر بنائی گئی ہیں ان میں تمام نمازیں بلاشبہ ان سب مسجدوں میں درست ہے۔ نہ صف ٹیڑھی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مسجد کی عمارت گرانے یا بگاڑنے کی ضرورت ہے۔ قبلہ کا رخ مغرب واقع ہونے کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کا قبلہ بین المغربین ہے اور وہ ان تمام قدیم مساجد میں حاصل ہے۔ ہاں جس مسجد کا رخ بین المغربین نہ ہو اس کا قبلہ درست کرلینا چاہیے اور بین المغربین واقع ہونے کا یہ مفہوم ہے کہ سب سے بڑے دن میں مسجد کے جس رخ پر آفتاب غروب ہوتا ہو اس صحن میں آفتاب اور مسجد کے اوتری کنارہ کے بیچ میں ایک نقطہ پر نشان لگادیں پھر اسی طرح سب سے چھوٹے دن میں آفتاب مسجد کے جس رخ پر غروب ہوتا ہے مسجد کے دکھنی کنارہ اور آفتاب کے بیچ میں اتنے ہی فاصلہ پر ایک نشان لگادیں جتنے فاصلہ پر اوتری نشان لگایا تھا پھر دونوں نشانوں کے درمیان ایک مستقیم کھینچ دیں۔ پس اگر یہ خط اور مسجد کے مغربی دیوار کا خط متوازی ہو تو قبلہ بین المغربین حاصل ہے اور نماز بلاشبہ درست ہے (۱)۔

اتنے دور دراز ملکوں میں عین قبلہ کی مواجہہ شرط نہیں ہوتی بلکہ جہت قبلہ کی مواجہت فی الجملہ بھی کافی ہوجاتی ہے۔ لقولہ تعالیٰ "وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطر المسجد الحرام" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۱۲/۱۴۰۱ھ

۱- "عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: ما بين المشرق والمغرب قبلة (سنن الترمذی ۲/۱۷۱، ابواب الصلاۃ حدیث ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴) آپ ﷺ نے یہ اہل مدینہ کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ سے جہت جنوب میں ہے، اس حدیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ دور والوں کے لئے جہت کعبہ کا استقبال ہی کافی ہے)۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۵۰۔

باب الاذان والاقامۃ

۱-ٹیپ ریکارڈر سے یا جوتے پہن کر اذان دینا:

ٹیپ رکارڈر سے اذان دینا، یعنی اذان ٹیپ کرلی جائے اور ہر نماز کے وقت اس کو بجادیا جائے، تو یہ اذان معتبر ہے یا نہیں، نیز جوتے پہن کر اذان دینا کیسا ہے؟۔

۲-مرتکب کبائر کا اذان دینا:

نسبندی کرانے والے، ویڈیو، سنیما دیکھنے والے اور داڑھی منڈانے والے یا ایک مشت سے کم کرنے والے کا اذان دینا کیسا ہے؟

۳-اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا:

اذان کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ٹیپ ریکارڈر سے اذان دینا جائز نہیں، اور نا پاک جوتا پہنے ہوئے اذان دینا مکروہ ہے۔

۲-اپنی رضا وخوشی سے نسبندی کرانے والے، نیز اس کے بعد جن کا ذکر ہے ان کا مؤذن مقرر کرنا ٹھیک نہیں، اس لیے کہ یہ منصب عالی ہے اور ان کے مؤذن مقرر کرنے کو فقہاء نے مکروہ فرمایا ہے، البتہ جب ان کی اذان بکراہت ادا ہو جائے گی تو ان کی اذان پر بنا کر کے جماعت کرلینا صحیح ہو جائے گا۔

۳-اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب یا سنت نہیں اور نفس اباحت میں کلام نہیں، جبکہ ضروری سمجھنے والوں

سے خلط نہ ہو(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمن

منفرد کے لئے اذان واقامت:

اگر اکیلے کسی جگہ ہو جنگل میدان یا سمندر میں ہو نماز کے وقت پر اذان دیکر نماز پڑھنا ضروری ہے یا بغیر اذان دیئے صرف اقامت کہہ کر نماز پڑھ لینا کافی ہے، بعض لوگ صرف مغرب کی نماز اذان دیکر پڑھتے ہیں باقی نمازیں اذان دیئے بغیر صرف اقامت کہہ کر نماز پڑھ لیتے ہیں کیا مسئلہ ہے؟

عبدالستار اسماعیل (شری کونکر ایس، پی، ٹی جبیل الجبیر سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر جنگل ومیدان وغیرہ کسی جگہ میں اکیلے ہوں تو اذان دینا سنت ہے، اس لئے اذان دیکر نماز پڑھنا افضل ہے، باقی اگر بغیر اذان دئے محض اقامت پڑھکر نماز پڑھ لیں جب بھی نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی اس حکم میں نماز مغرب وغیر مغرب سب برابر ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت پر اقامت نہ ہونے کی وجہ:

عورت پر تکبیر اقامت نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

فتح محمد کشمیری (بمقام شاہ پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر)

۱- "المسنون في هذا الدعاء أن لا ترفع الأيدى؛ لأنه لم يثبت عن النبي ﷺ رفعها" (فیض الباری علی شرح البخاری ۲/ ۱۶۳)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس لئے کہ عورت کے ذمہ نماز با جماعت نہیں، بلکہ تنہائی میں نمازیں پڑھنا بہتر ہوتا ہے اور اقامت جماعت کے لئے ہوتی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱۰/۵ھ

بوقت اذان قضاء حاجت کا حکم:

اذان ہوتے وقت بعض لوگ پیشاب و پاخانہ کی فراغت کے لئے منع کرتے ہیں اس کا کیا شرعی حکم ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

جب اذان شروع ہوجائے تو پیشاب پاخانہ میں مشغول ہونا منع ہے، بلکہ باہر ہی رک کر اذان کا جواب دینا چاہئے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۳/۵ھ

۱-مؤذن کا اذان کہنے کے بعد خود جماعت میں شریک نہ ہونا:

مؤذن اذان کے بعد وضو یا سنتوں یا اور کسی کام میں مشغول ہوجاتے ہیں حتی کہ نماز کھڑی ہوجاتی ہے اور جب امام تکبیر تحریمہ باندھ چکا ہوتا ہے، یا ایک رکعت ہوجاتی ہے تو اب یہ مؤذن اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، بلکہ دوسری مسجد میں جا کر تکبیر اولی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں ان کا یہ روزانہ کا معمول ہے، کبھی ظہر کی نماز میں دو منٹ باقی ہوتے ہیں، جبکہ ان کو ٹائم کا بھی علم ہوتا ہے، اس کے باوجود سنتوں کی نیت باندھ لیتے ہیں، جب تک وہ سنتوں سے فارغ ہوتے ہیں اتنے میں نماز

۱- ''ویکرہ تحریماً جماعۃ النساء ولو فی التراویح'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/۳۰۵) (مرتب)۔

۱- ''ولا ینبغی أن یتکلم السامع فی خلال الأذان والإقامۃ ولا یشتغل بقراءۃ القرآن ولا بشیئ من الأعمال سوی الإجابۃ'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۵۷) اور اگر آدمی بیت الخلاء میں ہے تو وہ اذان کا جواب نہیں دے گا، ''وأجمعوا أن المتغوط لا یلزمہ الرد فی الحال ولا بعدہ'' (البحرالرائق ۱/۴۴۹) (مرتب)۔

کی دو تین رکعتیں نکل جاتی ہیں، اب اس صورت میں بھی یہ نماز چھوڑ کر دوسری مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، نیز ظہر کی اور فجر کی سنتوں کو نماز سے پہلے پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہوں گی ہی نہیں، لہذا ان کا یہ علم کہاں تک درست ہے اور ان کے لئے کون سی صورت بہتر ہے بیان فرمائیں۔

۲-اقامت کون کہے؟

مؤذن صاحب مغرب کی اذان دے کر لوٹتے ہیں تو تکبیر کوئی دوسرا مقتدی پڑھ دیتا ہے، یہ روزانہ کا معمول ہے۔ موذن صاحب بعد میں خفاء ہوتے ہیں اور کہتے تکبیر مؤذن کا حق ہے آپ حضرات ایک دومنٹ انتظار کرلیا کریں، لہذا شریعت کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ کیا واقعی یہ مؤذن کا حق ہے اور اس کے لئے انتظار کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔صورت مسئولہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر جماعت کا وقت مقرر ہے اور جماعت اسی وقت مقررہ پر ہوتی ہے تو مؤذن صاحب کا سنتوں میں مشغول رہ کر جماعت چھوڑ دینا جائز نہیں، بلکہ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر ظہر کی سنت ہے تو اگر دوسری رکعت پوری ہونے کے قریب ہے تو دو رکعت پر سلام پھیر کر جماعت میں شریک ہو جائے، اور اگر تین رکعت پڑھ چکا ہے تو چاروں رکعت بعجلت پوری کر کے جماعت میں شریک ہو جائے، ورنہ سنتوں کی نیت توڑ کر جماعت میں شریک ہو جائے اور جماعت نہ چھوڑے، ورنہ گنہگار ہوگا،"(**قوله خلافا لما رجحه الكمال)حيث قال: وقيل: يقطع على رأس الركعتين وهو الراجح......ثم اعلم أن هذا كله حيث لم يقم إلى الثالثة، أما إذا قام إليها وقيدها بسجدة ففي رواية النوادر يضيف إليها رابعة ويسلم، وان لم يقيدها بسجدة قال في الخانية: لم يذكر في النوادر واختلف المشائخ فيه، قيل :بتمها أربعا ويخفف القرأة**" (۱)۔

اسی طرح اگر فجر کی سنتوں میں غالب گمان ہو کہ سنت پڑھ کر جماعت مل جائے گی جب تو سنت کہیں کنارے پر پڑھ کر فرض میں شریک ہو جائے، ورنہ سنت چھوڑ دے اور فرض میں شریک ہو جائے۔ پھر سنت ظہر فرض کے بعد اور سنت فجر آفتاب طلوع ہونے کے بعد راجح قول میں پڑھے تو ترک کا گناہ نہ ہوگا،"**وإذا خاف فوت ركعتي الفجر الاشتغالة بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل، وإلا بأن رجا ادرك ركعة في ظاهر المذهب، وقيل:**

۱- ردالمحتار ۱/۴۹۷۔

التشهد......ولا يتركها، بل يصليها عندباب المسجد" (۱)**"وقال محمد: أحب إلي أن يقضيها إلى الزوال كما في الدرر،قيل: هذا قريب من الاتفاق......وقال: لا يقضي، وإن قضى فلا بأس به"** (۲)۔

پس مؤذن کا سنت میں مشغول رہ کر جماعت چھوڑ دینااور دوسری مسجد میں چلاجانا مکروہ تحریمی ہےاور سخت گناہ ہے،اور جس مسجد میں اذان دے اس کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جاکر نماز پڑھنا فقہاء نے مکروہ تحریمی لکھاہےاور اس پر سخت نکیر وارد ہوئی ہے،اور نکیر کی صورت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ایسی قبیح حرکت ہے کہ جیسے کوئی لوگوں کو کھانے کی دعوت دیکر بلائے اور جب لوگ کھانا کھانے کے لئے آویں تو یہ دعوت دینے والا غائب ہوجائے یہ عنداللہ سخت مبغوض اور ممنوع ہے، پس اگر یہ صورت اذان دیر میں دینے سے پیش آگئی ہےتو اس پر لازم ہے کہ مقررہ وقت سے اتنا قبل دے کہ مستقل نمازی آکر طہارت ووضو، سننِ رواتب پڑھ کر اطمینان سے تکبیر اولی پالیں، جب دوسرے نمازی اتنا وقت پاجائیں گے تو مؤذن کیوں نہ پائے گا،پس اگر اتفاقیہ تاخیر اذان میں ہوگئی ہے جب تو قابلِ رعایت ہوگا۔ورنہ اس تاخیر کی عادت کرے گا تو واجب العزل ہوگا اور اس کو ہٹا کر دوسرا مستعد مؤذن مقرر کرلینا چاہئے، کیونکہ اذان کی گڑبڑی اور عدم پابندی وقت سے جماعت کا نظم بھی گڑبڑ ہوسکتا ہے،اسی طرح اگر جماعت کا وقت مقرر نہ ہو، یا اس کا انتظام نہ ہو تو جماعت منظم نہ ہوگی اور سارے ہی اہل محلّہ عنداللہ ماخوذ ومجرم ہوں گے اور جماعت کا نظم برقرار وقائم رکھنا ضروری ہوگا، ورنہ سارے اہل محلّہ گنہگار ہوں گے۔

اور اگر جماعت کا وقت مقرر ہے، مگر امام سے وقت کی صحیح پابندی نہ ہوتی ہو اور اسی عدم پابندی سے مذکورہ بالا خرابیاں آسکتی ہیں تو امام سے بھی کہدیا جائے کہ پابندی اوقات کریں وہ بھی اگر نہ مانیں تو ان کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔

۲-مغرب کی نماز میں مؤذن کے اذان خانہ سے جماعت گاہ تک آنے میں اتنی دیر نہیں ہوتی کہ وقت مکروہ آجائے یا اس سے نماز میں کراہت آجائے،اس لئے مؤذن کے پہنچنے اور تکبیر شروع کرنے کا انتظار کرنا چاہئے اور جب مؤذن کو کسی دوسرے کی تکبیر پڑھنے سے رنج ہوتا ہے تو پھر کسی کو موذن پر سبقت کرنا درست نہ ہوگا۔**"من أذن فهو يقيم"** (۳) کے قاعدے سے تکبیر میں سبقت نہ کرنا چاہئے۔مؤذن کو ناگواری نہ ہو تو مضائقہ نہیں،**"أقام غير من أذن**

۱- الدرالمختار ص ۸۸، ۴ باب ادراک الفریضۃ۔

۲- ردالمحتار ۱/ ۴۸۲۔

۳- أخرجہ احمد ۴/ ۱۶۹، فی مسند زیاد الصدائی، وابوداؤد ۱/ ۱۴۲، حدیث نمبر (۵۱۴)،ترمذی ۱/ ۳۸۳ (حدیث نمبر:۱۹۹)،ابن ماجہ ۱/ ۲۳۷، حدیث نمبر ۷۱۷)(مرتب)۔

بغيبته أى المؤذن لا يكره مطلقا، وإن بحضوره كره أن لحقه وحشة" (۱)،"(قوله: كره إن لحقه وحشة)أى لم يرض به......الأفضل أن يكون المؤذن هو المقيم أى لحديث من أذن فهو يقم" (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مائک سے اذان دینا:

کیا مائک سے اذان پڑھنا بدعت ہے، نیز اس سے اذان کا فریضہ ادانہیں ہوگا تشفی بخش جواب سے نوازیں۔

۲- جدید آلات کا استعمال:

بعض مولوی حضرات کا (جو زمانہ آدم سے تعلق رکھنے والے ہیں) فتویٰ ہے کہ تمام جدید آلات کا استعمال، مثلاً گھڑی ٹیلیفون وغیرہ بدعت ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- اہل سائنس کی تحقیق کے مطابق لاؤڈ سپیکر کی آواز متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے، البتہ اس میں آواز بلند ہوجاتی ہے اوراذان میں رفع صوت مطلوب بھی ہے، کما فی البحر: **"يرفع للترغيب الوارد في الحديث في رفع صوت المؤذن لا يسمع مدى صوت المؤذن إنس ولا جن ولا مدرالا شهد له يوم القيامة"** (۳)، اس لئے کہ اس میں اذان بلا کراہیت جائز ہے۔

۲- ہر جدید آلہ کا استعمال ناجائز اور بدعت نہیں ہے، بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ جو آلات لہولعب کے لئے موضوع ہیں ان کا استعمال ناجائز ہے اور جو نہ لہولعب کے لئے موضوع ہوں اور نہ ہی ان کا استعمال لہوولعب میں متعارف ہوگیا ہو، ان کا استعمال جائز ہے، مزید تفصیل (امداد الفتاویٰ ۱/ ۸۴۰) پر ملاحظہ ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

۱- الدر المختار۔
۲- رد المختار ۱/ ۲۶۵۔
۳- البحر ۱/ ۳۶۶۔

اذان دینے کے لئے وضوضروری نہیں:

اذان دینے کے لئے وضو کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اذان دینے کیلئے وضوء کرنا ضروری نہیں البتہ ہمیشہ بلاوضواذان دینا اچھا نہیں ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

۱-اندرون مسجد اذان دینا:

''فتاویٰ قاضیخاں،تبیین الحقائق''اور''فتاویٰ عالمگیری''وغیرہ کتب فقہ میں یہ عبارت ہے:''وينبغي أن يوذن على المئذنة وخارج المسجد ولا يؤذن في المسجد'' (۱)۔تو کیا آج کل مسجد کے برآمدہ کی یا مسجد کے بغل کی کوٹھری میں اسپیکر سے جو اذان دیتے ہیں وہ مناسب نہیں ہے،جبکہ اذان کا مقصد پوری طرح حاصل ہو رہا ہے کیا اسپیکر سے عین مسجد میں اذان دیجائے تو مکروہ ہے؟ تمام جوابات مفصل مدلل کتابوں کے حوالے سے ارقام کیا جائے ان مسائل میں یہاں ایک شخص نے آج کل ایک فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔یہ صاحب اپنے آپ کو شیخ الحدیث اور مفتی بھی بتاتے ہیں۔

۲-جمعہ کی اذان ثانی کا صحیح محل:

۱-جمعہ کے روز اذان ثانی رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد کے اندر منبر کے نزدیک ہوتی تھی یا مسجد کے باہر دروازے پر ہوتی تھی۔

۲-حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کہاں ہوتی تھی کیا یہ صحیح ہے کہ ہشام بن عبدالملک سے پہلے تک اذان ثانی مسجد کے باہر دروازے پر ہوتی تھی اور ہشام بن عبدالملک نے اذان ثانی کو مسجد کے اندر منبر کے نزدیک منتقل کیا،جیسا کہ ابن الحاج مالکی نے المدخل (ج ۲ ص ۲۱۲) میں لکھا ہے اور مولانا عبدالحیؒ لکھنوی نے حاشیہ وقایہ (ج ۱ ص ۲۰۲) میں اس کو صحیح تسلیم کیا ہے،کیا ابن الحاج کا بیان صحیح ہے؟

۳-ہندوستان میں مولانا احمد رضا وغیرہ کے اختلافات اٹھانے سے قبل تک اذان ثانی کے سلسلہ میں تمام بلاد

۱-　فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۷۸۔

عرب وعجم میں مسلمانوں کا ایک تعامل رہا ہے۔

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-"وينبغي أن يوذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن في المسجد" کا ترجمہ عربی میں یہ ہے کہ "يندب أن يوذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن ندباً في المسجد"۔

اردو ترجمہ یہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اذان میذنہ پر یا خارج مسجد دی جائے مسجد کے اندر اذان دینا مندوب وبہتر نہیں ہے، یعنی ینبغی کا معنی "مستحب" نہیں ہے اور نہ "لا یوذن" کے معنی "لا یجوز" کے ہیں، ورنہ دور صحابہ وتابعین میں کبھی کوئی اذان اندرون مسجد نہ دیجاتی، حالانکہ اذان خطبہ ہشام بن عبدالملک کے دور سے جو دور تابعی یقیناً اور دور صحابہ بھی فی معنی کہا جاسکتا ہے۔ برابر مسجد میں متوارث طور پر بلانکیر چلی آئی ہے(۱)۔

اور مسجد سے باہر میذنہ وغیرہ پر دینے کا اور مسجد کے اندر نہ دینے کا استحباب اس وجہ سے ہے کہ اذان میں جہاں تک ہو سکے آواز بلند کرنا اور دور تک پہنچانے کی سعی کرنا اور زیادہ سے زیادہ غائبین کو اعلام کرنا مطلوب شرعی ہے، جیسا کہ ابوداؤد شریف وغیرہ صحاح ستہ وغیرہ کی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمات اذان خواب میں عبداللہ بن زید کو فرشتہ نے بتلایا، مگر سرکار دو جہاں ﷺ نے اذان حضرت بلالؓ سے "إنه أندى صوتا منك" (۲) کہہ کر دلوائی اور اس ارشاد نبوت کی وجہ سے موذن کا جہر الصوت ہونا افضل کہا گیا اور کیوں اس لئے تا کہ دور تک آواز پہنچے اور اعلام کامل ہو اور اسی وجہ سے جب حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں مسلمان کثیر ہو گئے تو حضرت عثمان غنیؓ نے جو اذان زائد کہلوائی تو اس کو مقام زوراء جو ایک بلند مقام تھا کہلوائی اور تمام صحابہ کرام نے اس کے جواز پر اجماع کر لیا، پس معلوم ہوا کہ میذنہ وغیرہ مقصود بالذات نہیں ہے اور نہ اندرون مسجد اذان کہنا ممنوع وناجائز ہے، بلکہ یہ محض اسوجہ سے ہے کہ میذنہ وغیرہ سے اعلام غائبین کامل ہوگا اور اندرون مسجد سے اعلام غائبین ناقص ہوگا، پس اب اس آلہ (لاؤڈ اسپیکر) کیوجہ سے یہ اکمال واہتمام بغیر میذنہ کے بھی ہوتا

۱- "ويؤذن ثانياً بين يديه أي على سبيل السنية" (رد المحتار على الدر المختار ۳/ ۳۸، وفي البحر: بذلك جرى التوارث (البحر الرائق ۲/ ۲۷۴) (مرتب)۔

۲- سنن ابوداؤد ۱/ ۵،۱۳، کتاب الصلاۃ باب کیف الأذان حدیث ۴۹۹، حدیث طویل ہے متعلقہ حصہ یہ ہے: "فلما أصبحت أتيت رسول الله ﷺ فأخبرته بما رأيت، فقال إنها لرؤيا حق إن شاء الله فقم مع بلال فالق عليه ما رأيت فليؤذن فإنه أندى صوتاً منك...." الحدیث (مرتب)۔

ہے اور اندرونِ مسجد سے بھی ہوتا ہے، جبکہ مائک اوپر منارہ وغیرہ پر رکھدیا جائے، لہٰذا اب یہ اعتراض کہ مائک باہر رہتے ہوئے بھی اندرونِ مسجد ممنوع ہے یا مکروہ ہے صحیح نہ ہوگا، بلکہ جس شکل میں اعلام غائبین اچھی طرح ہوگا اور آواز دور دور تک پہنچے گی وہ اولیٰ وافضل عندالشرع شمار ہوگی (۱)۔

۱۔ منبر کے سامنے مسجد کے دروازہ پر ہوتی تھی (۲)۔

۲و۳۔ حضرت عثمان غنیؓ کے شروع دورخلافت تک یہی طریقہ رہا پھر جب لوگ زیادہ ہوگئے تو حضرت عثمانؓ نے ایک اور اذان کا (اعلام غائب کے لئے) مقام زوراء پر شروع فرمایا (۳) اور یہ طریقہ ہشام بن عبدالملک تک چلتا رہا کہ یہ اذان مقام زوراء پر ہوتی رہی پھر ہشام بن عبدالملک نے اس اذان کو جو عندالخطبہ باب مسجد پر دیجاتی تھی منبر کے قریب شروع کرادی چونکہ ہشام بن عبدالملک کا دور خیرالقرون ہے (۴)، اس لئے اس کو بدعت یا گمراہی یا خلاف شرع نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس دور خیرالقرون سے اب تک بلا اختلاف یہ اذان اندرون مسجد بین یدی المنبر یا بین یدی الامام ہوتی چلی آرہی ہے اور یہ تواتر عملی ہے، مولوی احمد رضا خانصاحب کے اختلاف سے اس تواتر میں کچھ قباحت وخرابی نہ آئے گی، بلکہ اس تواتر عملی جو اجماعی درجہ میں قریب تر پہنچ چکا تھا اس کی مخالفت کی قباحت خود مولوی احمد رضا خانصاحب پر عائد ہوگی (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- حالات کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہی ہے" وقال ابن سعد بالسند إلی أم زید بن ثابت: کان بیتی أطول بیت حول المسجد، فکان بلال یؤذن فوقه من أول ما أذن إلی أن بنی رسول اللهﷺ مسجده فکان یؤذن بعد علی ظهر المسجد، وقد رفع له شیئ فوق ظهره" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۵۴) (مرتب)۔

۲- ابوداؤد باب النداء یوم الجمعہ (حدیث ۱۰۸۸، عن السائب بن یزید قال: "کان یؤذن بین یدی رسول اللهﷺ إذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد، وأبی بکر وعمرؓ، ثم ساق نحو حدیث یونس"، اور وہ حدیث ۱۰۸۷ ہے) (مرتب)۔

۳- "فلما کان خلافة عثمان وکثر الناس أمر عثمان یوم الجمعة بالأذان الثالث، فأذن به علی الزوراء، فثبت الأمر علی ذلک" (ابوداؤد حدیث ۱۰۸۷، نیز صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/ ۳۹۳ حدیث ۹۱۲، ۹۱۳) (مرتب)۔

۴- ہشام بن عبدالملک کی وفات ۱۲۵ھ میں ہے، اور وہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ مقرر ہوا تھا (البدایہ والنہایہ ۸/ ۳۹۹) (مرتب)۔

۵- "وإذا صعد الإمام المنبر جلس وأذن المؤذن بین یدی المنبر بذلک جری التوارث" (ہدایہ ۱/ ۱۵۱) (مرتب)۔

زوال سے قبل جمعہ کی اذان وسنت کی ادائیگی:

یہاں سعودی میں جمعہ کے روز زوال سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جمعہ کی اذان جامع مسجد میں دے دی جاتی ہے، اب اگر کوئی شخص زوال سے پہلے جمعہ کی چار رکعت سنت پڑھے تو جائز ہے یا نہیں جبکہ زوال ہونے کے بعد فوراً ہی خطیب خطبہ پڑھنا شروع کردیتا ہے سنت پڑھنے کے لئے پہلے وقت ہی نہیں ملتا، جبکہ خطبہ جاری رہتا ہے اسکے بارے میں اگر زوال سے پہلے پڑھے تو جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جمعہ کے دن بھی زوال سے پہلے کی اذان معتبر نہیں اس طرح زوال سے پہلے جمعہ کی سنت پڑھنا بھی صحیح نہیں، جمعہ کی سنت بھی زوال کے بعد پڑھے زوال سے پہلے جو سنت پڑھی جائے گی وہ کافی نہ ہوگی، زوال کے بعد پھر پڑھنی پڑے گی، پس اگر کوئی شخص جمعہ کے دن زوال سے پہلے آجائے اور نماز پڑھنا چاہے تو نفل کی نیت سے پڑھے، پھر جب زوال ہو جائے سنت جمعہ کی پڑھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

مسجد کے مائک سے دنیاوی کاموں کا اعلان کرنا درست ہے یا نہیں:

مسجد کے مائک سے دنیاوی امور کے اعلانات وغیرہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جولاؤڈ اسپیکر یا مائک ان دنیاوی کاموں کے اعلان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اگر وہ اسپیکر یا مائک مسجد پر وقف شدہ سے خریدا گیا ہے جب تو اس اسپیکر و مائک سے صرف مسجد کے کام کا اعلان کرنا درست رہے گا، جیسے اذان اور وعظ و نصیحت کا کام باقی دنیاوی کسی کام میں اس کا استعمال کرنا کرایہ لیکر بھی جائز نہ ہوگا، اور اگر یہ اسپیکر اور مائک وغیرہ مسجد کے پیسے سے نہیں خریدا گیا ہے اور اس کے استعمال میں مسجد میں وقف شدہ بیڑی بھی استعمال نہیں کی جاتی، بلکہ ان سب کاموں میں خرچ کرنے کی نیت سے خریدے گئے ہیں کہ اس سے اذان بھی ہوگی اور یہ سب اعلانات بھی ہوں گے تو اس صورت میں

اسپیکرو مائک سب عین مسجد سے الگ امام کے کمرہ میں یا کسی اور جگہ جو مسجد سے متصل ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/۱۴۰۴ھ

اذان سن کر مسجد نہ جانے والا کیا کافر ہے؟

زید نے نماز کی اذان سنی نماز کے لئے جانے میں دو چار منٹ کی دیر ہوگئی زید نے بکر سے کہا کہ میں تو کافر ہوگیا ہوں بکر نے کہا کہ کیوں زید نے جواب دیا، اس لئے کہ میں اذان سنکر فوراً نماز پڑھنے نہیں گیا دریافت یہ ہے کہ زید کافر ہوا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

لغو جملہ بول گیا جو ہر گز نہ بولنا چاہئے لیکن کافر نہیں ہوا ہے آئندہ ایسے جملہ بولنے سے احتیاط واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۹/۸۵ ۱۳ھ

بچے کے کان میں اذان کا حکم:

یہاں دبئی میں اسپتال کے قانون کے مطابق بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد اذان دینے کی ممانعت ہے اور تین چار روز کے بعد جب چھٹی ہوتی ہے تب اذان دی جاتی ہے، کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بچہ پیدا ہونے کے بعد نماز پنجگانہ کی اذان کی طرح بلند آواز سے اذان دینا ضروری نہیں ہے، بلکہ سنت یہ ہے کہ بچہ جب آلائش وگندگی سے پاک کرلیا جائے تو اس کو قریب کرکے پہلے دایاں کان سامنے کرکے کلماتِ اذان صرف ایسی آواز سے کہدیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے، پھر اسی طرح بایاں کان سامنے کرکے اقامت کے کلمات ایسی آواز سے کہہ دیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے اور بس۔ ''عن أبي رافع قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسن بن علي رضي الله عنه حين ولدته فاطمة بالصلوٰة ،رواه الترمذی وأبوداؤد، وقال الترمذی: هذا

حدیث حسن صحیح"(۱)۔

اور یہ صورت قانون ہسپتال کے خلاف بھی نہ ہوگی اور سنت بھی ادا ہو جائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- وفی شرح السنة عن عمر بن عبد العزیز کان یؤذن فی الیمنی ویقیم في الیسریٰ إذا ولد الصبی، قلت: وقد جاء في مسند أبي یعلی الموصلی عن الحسین مرفوعاً: من ولد له ولد فأذن فی اذنه الیمنی وأقام في اذنه الیسریٰ لم تضره أم الصبیان. کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۴/ ۳۶۰)(مرتب)۔

باب ارکان الصلوۃ وواجباتہا وسننہا ومکروہاتہا ومفسداتہا

ہر رکعت میں دو سجدے فرض ہیں:

عید گاہ مبارک شاہ شہید گورکھپور میں عید کی نماز میں سب سے آخری صف والے بہت سے مقتدیوں نے دوسری رکعت میں مکبرین کی آواز نہ سننے کی وجہ سے صرف ایک سجدہ کیا بعد نماز امام صاحب سے دریافت کیا گیا تو موصوف نے فرمایا کہ جن مقتدیوں نے دوسری رکعت میں صرف ایک سجدہ کیا ان کی بھی نماز تبعاً للامام ہوگئی ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض نہیں، کیا امام صاحب کا فرمانا صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تبعاً للامام مقتدی کی نماز اسی حد تک صحیح ہوتی ہے۔جس حد تک مقتدی سے شرائط وفرائض وارکان اصلیہ میں سے کوئی چیز فوت نہ ہوئی ہو۔اور غلطی محض ایسی ہو جس کی تلافی کا انجبار فقط سجدۂ سہو سے ہوسکتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے۔اس لئے کہ یہاں سجدہ ثانیہ فوت ہوگیا ہے اور سجدہ ثانیہ بھی مثل سجدہ اول کے فرض ہے، کما فی البحر "**والمراد من السجود والسجدتان فأصله ثابت بالکتاب والسنة والإجماع**" (۱/۵۱۱)۔الطحطاوی "**ویفترض السجود المراد منه الجنس أی السجدتان**" (۱)۔

اسی طرح نماز عیدین سے ایجاب سجدہ سہو کے سقوط پر بھی قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ سقوط ازدحام کی وجہ سے عام مصلیوں کی نماز کو فساد سے بچانے کے لئے ہے، "**والسهو فی صلاة العید والجمعة والمکتوبة والتطوع سواء والمختار عند المتأخرین عدمه فی الولیین لدفع الفتنة**" (۲) اور وہ بھی اسی حد تک جب تک محض ایسی غلطی

۱- البحر الرائق ص ۱۲۵ وص ۱۲۷۔

۲- درمختار علی ہامش ردالمحتار ۱/۵۰۵۔

ہو جس کا انجبار سجدہ سہو سے ہوسکتا ہے، ورنہ اگر فرض فوت ہوجائے یا فساد صلوٰۃ کا خطرہ ہو تو حکم سقوط متوجہ نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ "درمختار، ردالمحتار، بحر" وغیرہا نے بحث کرکے واضح کردیا ہے، اس لئے امام موصوف کا یہ فرمانا کہ نماز ان کی بھی صحیح ہوگئی، صحیح نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۰/ ۲/ ۹۲ ۱۳ ھ

پوری زندگی کی عافیت کی دعاء مانگنا کیسا ہے؟

ایک شخص اپنی پوری زندگی کی عافیت کی دعاء مانگتا ہے تو آیا یہ جائز ہے یا حرام ہے، ایک عالم صاحب نے "درمختار" میں "کتاب الصلوٰۃ" کے حوالہ سے حرام قرار دیا ہے جو اردو میں طبع شدہ ہے، اگر حرام ہے تو کیوں حرام ہے؟ مع دلائل وضاحت مطلوب ہے؟ اللھم إنی أسئلک العفو و العافیة" کے تحت تو جائز ہے؟

حکیم وصی احمد (مالک علیگڑھ دواخانہ گورکھپور، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ جو چیزیں عادۃً مستحیل نہ ہوں ان کی دعا صرف اولیا کو ضرورت شرعی کے ماتحت مانگنا جائز ہے، جیسے ایسی بہت سی دعائیں انبیاء علیہم السلام اور بعض اولیاء کرام سے مانگنا منقول وثابت ہے، باقی عوام کو ایسی دعاء مانگنا درست نہیں۔

اور جو چیزیں عقلاً یا شرعاً محال ہوں یا ممنوع بنص صریح ہوں ان کی دعاء مانگنا جائز نہیں، اسی طرح جن چیزوں کا تحقق یقینی اور منصوص بنص صریح ہے، ان کے متحقق نہ ہونے کی دعاء مانگنا جائز نہیں ہے، جیسے موت کا وقوع، پل صراط سے گذرنے کا وقوع اور میدان محشر کی سختی اور حساب وکتاب وغیرہ کا وقوع ضروری ہے، کوئی ایسی دعاء مانگے کہ یا اللہ مجھ کو موت ہی نہ آئے یا ہمیشہ ہمیشہ میری یہ زندگی باقی رہے۔ اس قسم کی دعائیں مانگنا ناجائز وحرام ہے، اور بڑی گستاخی ہے۔

یہ سب تفصیلات فقہ کی اکثر کتابوں اور احادیث میں مروی اور منقول ہیں، قبیل المطلب فی الدعاء المحرم (درمختار علی ہامش الشامی ۱/ ۳۵۰) میں "ویحرم سوال العافیة مدی الدھر" بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابداً آلابا دتک عافیت کا اور خیر مستمر کی دعاء مانگنا حرام ہے، اس لئے کہ اس میں موت و مابعد الموت کے واقعات کے وقوع کا عدم تحقق مانگنا ہے جو

ناجائز وحرام ہے۔

مدی الدھر کے معنی ابد آلاباد کے ہوں گے تاکہ تمام روایات میں انطباق حاصل ہوجائے نیز دھر کے معنی بہت سے آتے ہیں، ''قاموس'' میں: "الامد الممدود، أبد، الوسه'' کے مذکور ہیں اور مفرداتِ امام راغب میں ہے: (دھر) "الدھر فی الأصل اسم لمدۃ العالم من مبتدأ وجودہ إلی انقضائہ''(۱)۔

امام راغب فن لغت کے امام ہیں، ان کی تشریح سے معلوم ہوا کہ ''دھر'' کے اصلی معنی پورے عالم کائنات کے وجود سے لیکر انقضاء وجود تک اور بقیہ معنی عرفی یا مرادی حسب مقام ہوتے ہیں اور اسی بناء پر نہایہ ابن کثیر (۱/۳۸) میں دھر کے معنی "الدھر اسم للزمان الطویل ومدۃ الحیاۃ الدنیا" (۲) کے بھی لئے ہیں اور ''بیضاوی شریف'' میں آیت کریمہ: "ھل أتی علی الإنسان حین من الدھر" (۳) میں "حین من الدھر'' کی تفسیر "طائفۃ محدودۃ من الزمان الممتد فی غیر النہایۃ'' کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی دھر کے اسی اصلی معنی (مدت غیر نہایت) کو لیا ہے، یہی "إلی أبد الآباد'' کے معنی مراد لئے جائیں گے، اس لئے ''درمختار'' کی عبارت: "ویحرم سوال العافیۃ مدی الدھر الخ'' (۴) کا مطلب یہ ہوگا کہ ابد الآباد تک کے لئے یا پورے قیام عالم تک کے لئے عافیت کی دعاء مانگنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ دعا نصوص صریحہ کے خلاف ہے اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ موت بھی واقع نہ ہو، احوالِ برزخ اور قیام محشر اور پل صراط سے گذرنا وغیرہ سب سے بچاؤ ہوجائے یا یہ سب کچھ پیش نہ آوے، حالانکہ ان سب کا پیش آنا یقینی ہے۔

اور سوال میں ذکر کردہ دعاء (پوری زندگی کی عافیت کی دعاء) میں موت ومابعد الموت کے حالات کے پیش نہ آنے کی دعاء نہیں ہے، کیونکہ موت پر زندگی ختم ہوجاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت سے پہلے پہلے جتنی زندگی ہو وہ عافیت سے گذرے اور یہ دعاء جائز ہے اور اس میں اسی قسم کی تاویلیں ہوں گی جو مندرجہ ذیل احادیث اور روایات میں ہیں:

۱-''اللھم إنی أسئلک من الخیر کلہ ماعلمت منہ وما لم أعلم'' (۵)۔

۲-''اللھم إنی أسئلک العفو والعافیۃ فی دینی ودنیای وأھلی ومالی''(۶)۔

۱- مفردات للراغب۔
۲- نہایہ لابن کثیر ۱/۳۸۔
۳- سورۂ دہر:۱۔
۴- شامی ۱/۳۵۰۔
۵- حصن حصین بحوالہ مسند احمد ابن حنبل۔
۶- حصن حصین بحوالہ ابوداؤد۔

۳-''یا حی یا قیوم برحمتک أستغیث أصلح لی شان کله'' (۱)۔

۴-''اللهم أسئلک العافية من کل بلية واسئلک دوام العافية'' (۲)۔

۵-''اللهم إنی أسئلک العافية من جميع البلاء وأسئلک تمام العافية دوام العافية'' (۳)۔

۶-''اللهم إنی أسئلک العفو والعافية والمعافاة الدائمة فی الدنيا والأخرة '' (۴)۔

لہذا ''ویحرم سوال العافیة مدی الدهر'' کی عبارت کے تحت یا اسی قسم کی مخالفت کے تحت دعاء کی اور عبارتوں کے تحت داخل کر کے اس دعاء کو حرام یا ناجائز کہنا صحیح نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۷/۲/۱۳۹۷ھ

موضع قدمین سے سجدہ گاہ کی بلندی کس قدر درست ہے؟

قدمین سے کسی قدر بلندی پر سجدہ بلاعذر درست ہے یا نہیں؟ اگر سجدہ گاہ ایک بالشت یا اس سے اونچائی میں کم ہو تو اس پر سجدہ بحالت عذر درست ہے یا نہیں، اگر سجدہ گاہ ایک بالشت یا اس سے زیادہ بلندی پر ہے تو مطلقاً جائز ہے یا نہیں؟

فقہ کی عبارتوں میں ''إلا بزحمة'' کے تحت ایک ہی نماز میں ایک مصلی کا دوسرے مصلی کی پشت پر سجدہ کرنا درست قرار دیا گیا ہے، اس پر قیاس کرتے ہوئے مساجد میں خطیب کے وہ ممبر جو ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر واقع اور اینٹ اور سمنٹ سے پختہ بنے ہوئے ہیں جن کا ہٹانا زحمت سے خالی نہیں تو کیا اس پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ جب کہ بعض فتاویٰ ایسے موجود ہیں کہ ایسی جگہ پر قطع صف کے طور پر وہ جگہ خالی چھوڑ دی جائے اس پر سجدہ نہ کرنا چاہئے، تو پھر ''إلا بزحمة'' کے تحت پشت مسجود بھی تو ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر ہے، اس کی تخصیص کیوں ہے؟ اور ''إلا بزحمة'' میں وہ منبر وغیرہ کیوں نہیں داخل ہیں؟

صفات اللہ اعظمی (بلاقی پورہ، مئو)

۱- مناجات مقبول بحوالہ حزب الاعظم۔

۲- قربات عنداللہ بحوالہ حزب اعظم۔

۳- بحوالہ حزب اعظم۔

۴- ماثبت بالسنۃ وغیرہ وغیرہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اعلیٰ بات تو یہ ہے کہ موضع سجود موضع قدمین ہی کے سطح پر ہو وضع قدمین سے کچھ اونچا ہوجائے تو ایک بالشت تک کی اونچائی مع الکراہت جائز رہتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس سے بھی جہاں تک ہو احتراز کیا جائے اور اگر موضع سجود ایک بالشت سے بھی زیادہ اونچا ہو جائے تو جائز نہیں (۱)۔

البتہ "الا بزحمة" سے ایک بالشت کی اونچائی سے کچھ زائد اونچائی کا استثناء کیا گیا ہے۔ کمافی الدر: "وان سجد للزحام علی ظهر ......مصل صلوته التي هو فيها جاز للضرورة، وان لم يصلها...... لا" (۲)، اس استثناء میں دو قید ہیں، ایک تو زحمت اور زحمت کا مطلب یہ ہے کہ مصلی اتنے زیادہ ہوں کہ صفیں اتنی قریب قریب کرنی پڑیں کہ پچھلے مصلی کو اگلے مصلی کی پشت پر سجدہ کئے بغیر چارہ نہ ہو اور صورت مسئولہ میں ایسا نہیں اور زحمت و بھیڑ نہیں کہ پچھلے مصلیوں کو اگلے مصلیوں کی پشت پر سجدہ کرنا لازم ہو رہا ہو، یہاں صرف دو مصلی جو منبر کے محاذات میں ہوں گے صرف ان کو سجدہ علی الارض کرنے کا موقع نہیں ملے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ کو زحمت پر قیاس کر کے "الا بزحمة" کے تحت داخل کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ جس طرح اسطوانہ وغیرہ حائل ہونے سے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے، جگہ چھوڑنا ہوگا اور جس طرح حیلولۃ اسطوانہ سے انقطاع صف مضر نہیں ہوتا، اسی طرح یہ انقطاع بھی قادح فی الصلوٰۃ نہ ہوگا۔

دوسری چیز اس استثنائی حکم میں علیٰ ظہر مصلی صلوۃ ہو "فیہا" کی قید ہے۔ اس قید کا احترازی ہونا اغلب ہے، جیسا کہ شامی کی تحقیق سے مترشح ہوتا ہے، کیونکہ تمام متون اس قید کو ذکر کرتے ہیں۔ صرف قہستانی نے اس قید کو ذکر نہیں کیا، یا اطلاق کو اختیار کیا، مگر "عقود رسم المفتی" میں قہستانی کو یہ مرتبہ فقہاء محققین نے نہیں دیا ہے کہ ان کو اہل ترجیح کا منصب دیا جائے، اسی طرح ظہر مصل صلوتہٗ کے علاوہ صورتوں میں ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر جواز سجدہ کا حکم مشکل ہوگا، پس صورتِ مسئولہ میں اس ممبر کے حصہ پر سجدہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

علاوہ ازیں اس صورت میں اور اتنی اونچائی میں سجدہ کا تحقق فی الجملہ اور حکمی سجدہ کا تحقق بھی مشتبہ ہو جائے گا، اور سجدۂ حقیقی یا حکمی یا فی الجملہ بہر حال رکن اصلیہ میں داخل ہوتا ہے اس لئے بھی اس کی گنجائش نہ دی جانی چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- کمافی الدر علی هامش الشامی ۳۳۸/۱۔

۲- الدر المختار ۳۳۸/۱۔

نماز، زکوۃ اور روزہ چھوڑنے والوں کے لئے شریعت میں کون سی سزا ہے؟

شریعت اسلامیہ تارک نماز تارک زکوۃ اور تارک صوم کے لئے بالترتیب کون کون سی حد مقرر کرتی ہے یعنی اگر اسلامی حکومت بروئے کار ہو تو فسق کے مذکورہ بالا معاملات میں کیا تعزیری کارروائی کرے گی۔ فتوی مع استشہاد کتاب وسنت عنایت فرمایا جائے۔

احمد کمال معرفت حضرت مولانا انعام الحق صاحب (جعفر آباد کورکھپور)

الجواب وبالله التوفيق:

”في الدر المختار على هامش الشامي(۱/۲۳۵) قبيل مطلب فيمايصير الكافر مسلما من الأفعال۔ وتاركها عمداً مجانة...... يحبس حتى يصلي...... وقيل يضرب حتى يسيل منه الدم وعند الشافعي يقتل بصلاة واحدة حدًا وقيل كفراً وقبل ذلک باسطروالصوم كالصلوة على الصحيح، وتحته في الرد: قال أصحابنا: لا يقتل بل يعزر أو يحبس حتى يموت أويتوب (قوله وعند الشافعي يقتل) وكذا عند مالك واحمد، وفي رواية عن احمد: وهي المختارة عند جمهور أصحابه أنه يقتل كفراً“(۱)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ نماز اور روزہ دونوں کے تارک عمداً کا حکم ایک ہی ہے اور وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو یہ ہے کہ قید کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ تائب ہو کر نمازی ہو جائے یا مر جائے اور بعض فقہاء نے تعزیر جسمانی کا حکم دیا ہے کہ مارا جائے یہاں تک کہ جسم سے خون بہہ جائے اور حضرت امام مالک وشافعی واحمد رحمہم اللہ کے نزدیک قتل تک کیا جا سکتا ہے بلکہ حضرت امام احمد بن حنبل کا مسلک مختار تو یہ لکھا ہے کہ فقط ایک نماز کے تکاسلاً ترک پر قتل کیا جا سکتا ہے تارک زکوۃ کے معاملہ میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ اموال دو طرح کے ہوتے ہیں۔(۱) اموال ظاہرہ (۲) اموال باطنہ، اموال باطنہ سے مراد ہے سونا چاندی یا ان کا زیور یا نقد یا سامان تجارت جو گھر میں رہتا ہو ہاں جب کہیں باہر بھیجا جائے تو وہ اموال ظاہرہ میں شمار ہو جاتا ہے۔

”كما في ردالمحتار (۲/۳۴) هي النقود وعروض التجارة إذا لم يمر بها على العاشر؛ لأنها

۱- شامی ۱/۲۳۵۔

بالإخراج تلتحق بالأموال الظاهرة"۔ اموال ظاهرہ میں حکم یہ ہے کہ اس کی زکوۃ سلطان یا نائب سلطان کے جبراً لے لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے(۱)۔

"والمفتی به التفصیل إن کان فی الأموال الظاهرة یسقط الفرض؛ لأن للسلطان أو نائبه ولایة آخذها (إلی قوله)، وإن کان فی الباطنة لا (۲)(رد المحتار ص ۲۵) وفی الدر علی هامش الرد ص ۲۵ ج ۲ وفی التجنیس المفتی به سقوطها فی الأموال الظاهرة لا الباطنة (۳) (وفی ص ۲۴) أخذ البغاة والسلاطین الجائر زکوة الأموال الظاهرة کالسوائم والعشر والخراج لا إعادة علی أربابها إن صرف الماخوذ فی محله الآتی ذکره، وإلا یصرف فیه فعلیهم فیما بینهم وبین الله إعادة غیر الخراج (۴) (والمراد من فیما بینهم وبین الله الدیانة أی یصرف دیانة لا قضاء)" ۔

فی الهدایة(۱۶۶/۱)لأن له مطالبا وهو الإمام فی السوائم ونائبه فی أموال التجارة وفیه فی (ص ۱۷۳) إذا أخذ الخوارج صدقة سوائم لا یثنی علیهم ..... إذا نوی بالدفع التصدق علیهم سقط عنه، وکذا ما دفع إلی کل جائر وتحته فی العنایة: وکذلک السلطان إذا صادر رجلا وأخذ منه أموالا فنوی صاحب المال الزکوة عند الدفع سقطت عنه الزکوة (۵)،ان عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال ظاہرہ ہر وہ مال ہے جو گھر سے باہر ریل میں ڈاکخانہ میں بینک وغیرہ میں رہتا ہو، چاہے بشکل نقد ہو یا بشکل عروض وسامان ہو اور چاہے مویشی و پیداوار غلہ وغیرہ ہو، سب اموال ظاہرہ ہیں، اور اس کی زکوۃ حکومت شرعیہ جبراً لے سکتی ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی امیر ظلماً بھی لے لے اور دینے والا دینے کے وقت تصدق کی نیت کر لے تو دینے والا بری الذمہ ہو جائے گا اور یہ حکم اموال ظاہرہ میں مطلقا ہے اور اموال باطنہ میں یہ قضاء ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۲۱۵/۳۔
۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۲۱۷/۳۔
۳- الدرالمختار مع ردالمحتار ۲۱۷/۳۔
۴- الدرالمختار مع ردالمحتار ۲۱۵/۳۔
۱- عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۱۵۰/۲۔

نماز میں رفع یدین کا شرعی حکم:

حضور مقبول ﷺ نے اپنے وصال کے وقت آخری نماز اور حضرات خلفاء راشدین اور جمیع صحابہ کرام اور دسویں صدی کے ائمہ کرام کی سنت رفعِ یدین اہل حدیث ثابت کررہے ہیں اور سنتِ موکدہ، بلکہ واجب کے امام سبکیؒ کے نزدیک بتاکر بلا رفع یدین نماز کو باطل کہتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

واقعی جو حضرات اہل حدیث ہیں اور جن کو علم حدیث پر عبور ہے اور مزاج میں عدل وانصاف رکھتے ہیں وہ ایسی باتیں ہرگز نہیں کہہ سکتے، جو اس میں مذکور ہیں۔

بعض لوگوں کو اس روایت سے دھوکہ لگ گیا ہے جس میں یہ زیادتیاں درج کردی تھیں، حالانکہ یہ زیادتیاں غلط عند المحدثین ہیں، پھر اس مغالطہ کو یہاں پیش کرکے اتنا بڑا دعوی کردیا ہے اور یہ حقیقت اس کے خلاف ہے، جیسا کہ خود بخاری ومسلم اور تمام کتب صحاح کی روایت سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اوائل زمانہ میں قریب قریب ہر خفض ورفع کے وقت لوگوں نے رفع یدین فرمایا ہے، پھر آہستہ آہستہ حسب ہدایت نبوی ﷺ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت تکبیر تحریمہ کے وقت کے سوا میں متروک ہوگیا اور اسی بات پر تمام خلفاء راشدین اور تمام عشرہ مبشرہ اور جمہور صحابہ تکبیر افتتاح کے وقت کے علاوہ تمام انتقالات میں رفعِ یدین نہیں کرتے تھے، اسی مضمون کی روایات عام طور سے صحاح میں ملیں گی۔

اگر اس مدعی کو اپنے دعوے میں اصرار ہے تو صحیح سند کے ساتھ صحاح کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں اس کے متضاد کوئی روایت ایسی پیش کردے جو مذکورہ بالا مفہوم کے لئے ناسخ بن سکے۔

اگر نہیں پیش کرسکتے ہیں تو ایسی غافلانہ جرأت کا کیا انجام ہوسکتا ہے، اس کو ذرا سوچ لیں اور اگر مزید بصیرت کے لیے تفصیل دیکھنی ہو تو ''آثار سنن'' کی تعلیقات کا جو شوق نیموی مرحوم کی ہے، نیز ''اعلاء السنن'' کا مطالعہ فرمالیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز میں رفع یدین کا حکم:

میں کوئی عالم یا حافظ نہیں ہوں ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ ہوں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کر چکا ہوں لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے باپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا اور آج سعودی عرب میں مقام جدہ میں ایک معمولی سے روزگار پر ہوں، حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی نماز کے صحیح ارکان کی ادائیگی نہیں کرتا۔اس کی نماز اس کے منھ پر طمانچہ ہے اور وہ شخص اتنا گنہگار ہے جتنا کہ ایک بے نمازی بھی نہیں ہوگا اور یہی ڈر دل میں بیٹھ گیا ہے کہ جو نماز میں ادا کرتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط، میں آج تک امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا رہا ہوں۔لیکن ہم اس میں رفع یدین نہیں کرتے ہیں آمین زور سے نہیں کہتے، لیکن یہاں پر میں بہت سے عربی باشندوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ رفع یدین کرتے ہیں، آمین سے عربوں کی مسجدیں گونج اٹھتی ہیں، اس لئے میں نے بخاری شریف کا سہارا لیا، تا کہ صحیح حدیث صحیح نماز کا طریقہ معلوم ہو سکے، کیونکہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے محدث تھے، علامہ زہری کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری کو خواب میں دیکھا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے جاتے ہیں یعنی امام بخاری سنت نبویہ کے پورے عامل تھے، ایک قدم بھی سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف رکھنا نہ چاہتے تھے، لیکن جب میں نے رفع یدین کا بیان (صفحہ ۳۶۴ بخاری شریف پارے جلد اوّل) پر دیکھا وہاں حدیث نمبر (۷۸۳ اور ۷۸۴) سے پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ رفع یدین کرتے تھے، پھر ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کیوں چھوڑ رہے ہیں ان کی نماز اور ہماری نماز میں فرق محسوس ہوتا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

اصل مسئلہ سمجھنے سے قبل چند باتیں سمجھ لینا ضروری ہے:

پہلی بات یہ کہ جتنی صحیح حدیثیں ہیں وہ سب کی سب صرف بخاری شریف میں منحصر نہیں ہیں، اس کو خود حضرت امام بخاریؒ نے فرمایا ہے، بلکہ اور بہت سی حدیثیں صحیح ہیں اور وہ بخاری شریف میں نہیں ہیں اور وہ سب مدار مذہب ہیں۔چنانچہ حضرت امام بخاریؒ کو خود تین لاکھ صحیح حدیثیں مع سند و متن کے زبانی یاد تھیں ان میں اپنی شرط کے تحت پہلے ایک لاکھ کو چھانٹا اور اپنی شرط کے مطابق صرف چھ ہزار بخاری شریف میں جمع فرمایا، اس میں بھی مکررات نکال دیں تو صرف ساڑھے چار ہزار ہی حدیثیں بچتی ہیں، اس لئے تمام صحیح حدیثوں کا انحصار محض بخاری شریف میں سمجھنا فن حدیث سے ناواقفیت سے ناشناسی ہے، البتہ چونکہ امام موصوف نے اپنے علم کے مطابق بہت محتاط طریقہ اختیار فرمایا ہے، اس لئے اصح الکتب بعد کتاب اللہ

البخاری کہا جاتا ہے اور انہیں احتیاطوں کے ثمرہ میں سے وہ ثمرہ بھی ہے جو آپ نے خواب کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، حالانکہ خواب کسی کے نزدیک حجت شرعی نہیں۔

دوسری بات: صحیح حدیث جہاں بھی ہے وہ خواہ بخاری شریف کے علاوہ میں ہو اس سے حکم شرعی ثابت ہو جاتا ہے اور یہ چیز تمام امت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ ہے اس لئے بھی اس انحصار کا تخیل غلط ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام بخاری کے استاد کے استاد کے استاد میں سے ہیں، یعنی امام بخاریؒ کے استاذ حضرت امام احمد ابن حنبلؒ اور ان کے استاذ حضرت امام شافعیؒ اور ان کے استاذ حضرت امام محمدؒ اور ان کے استاذ حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں اور حضرت امام بخاریؒ سے تقریباً سو ۱۰۰ برس قبل زمانہ خیر القرون کے ائمہ ھدی میں سے ہیں، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے جتنے اساتذہ ہیں ان میں سے ایک کے بارے میں بھی طعن وجرح کا شبہ کرنا درست نہیں، بخلاف حضرت امام بخاریؒ کے اساتذہ میں بعض کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے طعن بھی کیا ہے، اس لئے جو حدیث حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ثابت ہو جائے وہ باتفاق محققین محدثین احادیث بخاری سے افضل واعلیٰ ہوتی ہے۔

چوتھی بات:۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ بہت ثقہ اور بہت محتاط اور ممتاز ہیں، مگر ائمہ اربعہ امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ امام شافعی امام احمد بن حنبلؒ سے فائق انکو محققین نے نہیں قرار دیا، بلکہ ائمہ مجتہدین (ائمہ اربعہ) کو فائق وبرتر قرار دیا، اس لئے حضرت امام بخاریؒ کو ائمہ اربعہ سے افضل وفائق قرار دینے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا جمہور امت کے نظریہ کے خلاف ہوگا۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ امام مالک، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ رحمہم اللہ نے کتاب وسنت کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اس کو تمام امت نے حق اور صحیح قرار دیا ہے اور ان کے مجتہدات کو بھی برحق کہا ہے اور سبکو اہل حق میں شمار کیا ہے اور اس لئے جو شخص خود مجتہد نہ ہو، اس پر ان حضرات کے بتلائے ہوئے معنی کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے اور اس خودرائی کو ناجائز وحرام کہا ہے، اگر ایسا نہ کرے گا تو بہت سی معصیت میں اور بہت سی حرام باتوں میں مبتلا ہو جائے گا اور دین تماشا بنکر رہ جائے گا۔

چھٹی بات: یہ ہے جو شخص خود مجتہد نہ ہو اور ان ائمہ میں سے کسی امام کی اتباع کر رہا ہے اس کے لئے لازم وضروری ہے کہ تمام مسائل (اصولی وفروعی) میں صرف اس ایک امام سے رجوع کرے اور صرف اس کے بتائے ہوئے معنی پر عمل کرے، ورنہ خبط عشواء کرے گا اور بہت سے معاملات میں حرام کے ارتکاب کا مجرم ہو جائے گا اور تلفیق بالمحرم میں مبتلا ہو کر

اپنے بہت سے عبادات تک کو برباد کر ڈالے گا، اور دین اسطرح کھلونا اور تماشہ بن جائے گا، جس طرح پانچویں بات میں کہا گیا ہے۔ "ھکذا یؤخذ من البخاری کتاب المناسک تحت باب اذا حاضت المرأۃ بعد ما فاضت (۱) وایضاً یؤ خذ من شرحہ" فتح الباری "تحت ھذا الحدیث، وایضاً من رسالۃ ثمرات الأوراق أو غیرھا"۔

ساتویں بات:۔ یہ ہے کہ مذکورہ تینوں باتوں میں ائمہ کے اندر اختلافات صرف اولویت وافضلیت کا ہے، کوئی امام دوسرے کے قول وفعل کو ناجائز یا مکروہ نہیں کہتا، بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک احادیث صحیحہ سے اس کا افضل ہونا ثابت ہے، لہذا کسی کا ان مسائل مذکورہ میں سے کسی مسئلہ کو ضروری سمجھنا اور نہ کرنے والوں پر نکیر کرنا یا طعن وتشنیع کرنا ناجائز وغلط ہوگا، ان ضروری گذارشات کے بعد آپ کے تینوں اشکالات کا الگ الگ ازالہ کیا جاتا ہے:

۱۔ پہلا مسئلہ تکبیر اولی کے علاوہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کا ہے، اس سلسلہ میں "بخاری شریف" (ج ۱ ص ۱۰۲) میں صرف دو ۲ روایتیں منقول ہیں۔

ایک روایت حضرت ابن عمرؓ کی ہے اور دوسری ابو قلابہؒ کی ہے، دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ان روایات سے زیادہ سے زیادہ رفع یدین کا وجود ملتا ہے، مگر اس پر دوام ہمیشگی نہیں ملتی، اس لئے کہ امام بخاریؒ نے خود جزء رفع یدین میں تعلیقاً روایت نقل فرمائی ہے کہ تکبیر اولی کے بعد رفع یدین نہیں ہے، نیز ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت موجود ہے کہ ایک شخص کو تکبیر اولی کے علاوہ رکوع میں جاتے آتے رفع یدین کرتے دیکھا تو منع فرمایا اور کہا کہ یہ عمل پہلے تھا بعد میں ترک ہو گیا اور خود ابن عمرؓ سے بھی اس کے برخلاف صحیح سند کے ساتھ اور دوسری صحیح حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عمرؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے، چونکہ ترک شئی فعل شئی سے بعد میں ہوتا ہے اس لئے ترک والی روایات بعد کی ہوگی اور راجح ہو جائے گی، اور اس کو حضرت ابن زبیرؓ منع کرتے وقت یہی پیش نظر رکھ کر رفع یدین کرنے سے منع فرمایا تھا اور اسی وجہ سے احناف تکبیر اولی کے علاوہ اور موقعوں میں رفع یدین کے ترک کو اولی وافضل کہتے ہیں اور اس کی تائید میں دوسری بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں اور مثلاً حضرت ابن مسعودؓ کی روایت جو بالکل صحیح سند سے "ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف" سب میں موجود ہے، الفاظ یہ ہیں: "قال عبداللہ بن مسعود ألا أصلّی بکم صلاۃ رسول اللہ ﷺ فصَلیٰ فلم

۱۔ "عن عکرمۃ أن أھل المدینۃ سألوا ابن عباس عن امرئۃ طافت ثم حاضت قال لھم تنفر قالوا: لا نأخذ بقولک وندع قول زید قال: اذا قدمتم المدینۃ، فاسئلوا فقدموا المدینۃ فسئلوا" (بخاری ۱/ ۲۳۷) (مرتب)۔

یرفع یدیه إلا فی أول مرة'' (۱)۔

ترجمہ: (یہ ہے کہ فرمایا ابن مسعودؓ نے کہ کیا میں تم لوگوں کو حضور علیہ کی نماز پڑھ کر نہ دکھلا دوں اس کہنے کے بعد نماز پڑھی اور رفع یدین صرف تکبیر اولی میں کیا بعد میں نہیں کیا) اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رفع یدین صرف تکبیر اولی کے وقت ہوگا بعد کے انتقالی حالت میں نہ ہوگا اور مثلاً حضرت براء بن عازبؓ کی صحیح سند سے روایت ہے جس کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

''أن رسول اللہ ﷺ کان إذا افتتح الصلوۃ رفع یدیه قریب من أذنیه ثم لایعود''(۲)۔

ترجمہ: (حضور علیہ جب نماز شروع کرتے ہوئے تکبیر کہتے تو ہاتھ اٹھاتے تھے پھر کسی وقت نہ اٹھاتے) اور مثلاً مسلم شریف حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

''خرج علینا رسول اللہ ﷺ، فقال: مالی أراکم رافعی أیدیکم، کأنها أذناب خیل شُمسُ اسکنوا فی الصلوۃ'' (۳)۔

ترجمہ:۔ (حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں (ہم لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک) ہم پر حضور علیہ تشریف لائے اور فرمایا کہ ہمیں کیا ہوا ہے کہ میں تم لوگوں کو مجل گھوڑوں کی دم کی طرح (نماز میں) ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہوں، نماز میں سکون سے رہو) اس روایت میں: ''**خرج علینا**'' اور'' **اسکنوا فی الصلوۃ**'' کالفظ قرینہ ہے کہ اس سے وہ روایت مراد نہیں جو جماعت کی نماز کا سلام پھیرتے وقت مقتدیوں کو سلام پھیرتے ہوئے ہاتھ اٹھاتے حضور علیہ نے دیکھا اور فرمایا کہ ''**مالی أراکم الخ** ''اسلئے کہ اس روایت میں نہ تو'' **خرج علینا**'' ہے اور نہ تو ''**اسکنوفی الصلوۃ** ''ہے، پھر اسی طرح حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ وابن الزبیرؓ وغیرہ سے بھی تکبیر اولی کے علاوہ رفع یدین نہ ہونا مروی ہے، غرض جب تمام مرویات باب پر نظر کی جاتی ہے تو افضل اور بہتر یہی نکلتا ہے کہ تکبیر اولی کے علاوہ اور کسی وقت رفع یدین نہ کرنا ہی افضل ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۹/ ۱۴۰۳ھ

۱- رواہ ابوداؤد فی سننہ کتاب الصلاۃ باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع ۱/ ۱۰۹ قدیمی، والترمذی فی جامعہ أبواب الصلاۃ، باب رفع الیدین عند الرکوع ۱/ ۳۵ (مرتب)۔

۲- ابوداؤد کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر (۷۴۹) (۱/ ۲۰۰)۔

۳- (باب الأمر بالسکون فی الصلاۃ، کتاب الصلاۃ ۱/ ۱۸۱ قدیمی، رواہ الطحاوی فی شرح معانی الآثار باب التکبیر للرکوع والتکبیر للسجود ۱/ ۱۶۲،

سر اور جہر کی حد:

سری نماز میں امام کو کتنی آواز سے قرأت کرنی چاہئے اور جہری میں کتنی؟ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ سری میں اتنے زور سے پڑھے کہ خود کان میں آواز پہنچے، کیا صرف زبان ہلانے سے اور مخرج نکالنے سے نماز نہیں ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

امام کرخیؒ کی تخریج کے مطابق محض تصحیح حروف کے ساتھ ادائیگی بھی کافی ہے، خواہ اس کی آواز کانوں تک نہ پہنچے اور امام ہندوانی کی تخریج کے مطابق اس طرح پڑھے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے اور دونوں تخریجیں درست ہیں، البتہ زیادہ علماء و مشائخ ہندوانی کے ساتھ ہیں، اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ اس طرح پڑھیں کہ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلند آواز سے آمین کہنا:

دوسرا آمین کے بارے میں دیکھا وہ بھی بخاری شریف جلد اول کے صفحہ (۱۷۲) اور (۱۷۳) پر حدیثیں موجود ہیں، حدیث نمبر ۷۸۳، اور ۸۳۸۔

امام کا بلند آواز سے آمین کہنا اس پر بھی آمین بلند آواز سے کہنے کی حدیثیں موجود ہیں، پھر ہم امام ابوحنیفہؒ والوں کو زور سے آمین کہنے پر کیوں روکا جاتا ہے؟۔

عامر تاج الدین دبیر (جدہ سعودی عربیہ)

اشرفی دیوبند، ابوداؤد فی کتاب الصلوۃ باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع نحوہ، الترمذی فی أبواب الصلاۃ ۲۵۷ عن ابن مسعود نحوہ) (مرتب)۔

۱- ”اعلم أنهم اختلفوا في حد وجود القرأة على ثلثة أقوال: فشرط الهندواني والفضلي لوجودها: خروج صوت يصل إلى أذانه، وبه قال الشافعي، وشرط بشر المريسي وأحمد: خروج الصوت من الفم، وإن لم يصل إلى أذنه، لكن بشرط كونه مسموعاً في الجملة، حتى لو أدنى أحد صماخه إلى فيه يسمع، ولم يشترط الكرخي وأبوبكر البلخي السماع، واكتفيا بتصحيح الحروف۔ واختار شيخ الإسلام وقاضي خان وصاحب المحيط والحلواني قول الهندواني، كذا في معراج الدراية إلى قوله وأن ماقاله الهندواني أصح وأرجح لاعتماد أكثر علمائنا عليه“ (فتاویٰ شامی ۵۹/۱ ۳ کتاب الصلوۃ باب القرأۃ) (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

آمین بالجھر کا جو مسئلہ ہے اس سلسلہ میں صرف ابوہریرہؓ اور ابن الزبیرؓ کی روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ سے دو روایت ہے، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امام "غير المغضوب عليهم ولا الضالين" کہے تو تم لوگ آمین کہو اس روایت سے امام یا ماموم کا یا خود حضور ﷺ کا یا کسی کا آمین جہرا کہنا معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ولا الضالين" کے بعد آمین کہنے کا وقت ہے۔

اس وقت امام آمین کہتا ہے اس وقت تم لوگ بھی آمین کہو، اس لئے کہ اس وقت ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں، پس جسکی آمین ملائکہ کی آمین کے مطابق ہو جائے گی اسکی خطائیں معاف ہو جائیں گی۔

اور یہی روایت اصل ہے، اسی کی تعبیر حضرت ابوہریرہؓ اپنی دوسری روایات: "إذا أمن الإمام فأمنوا" میں فرما رہے ہیں اور اگر دونوں روایتوں کو اصل مستقل ارشاد نبوی ﷺ تسلیم کرلیا جائے۔ جب بھی ان دونوں سے آمین کہنے کا محض ثبوت ملتا ہے، اس کے جہراً یا سراً کہنے کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ تیسری روایت جس میں ہے "امن ابن الزبير ومن وراه حتى ان للمسجد لرجة" اس سے آمین کے جہراً کا ثبوت ملتا ہے، لیکن یہ حضور ﷺ کا قول یا فعل نہیں ہے، بلکہ حضرت ابن الزبیر اور دوسرے صحابہؓ کا ہے، لہذا دوسری مرفوع قولی حدیث پر اس کو ترجیح نہ ہوگی۔ اور دوسری حدیث کی کتابوں سے جو حضور ﷺ کا عمل "مدبها صوته" نقل کیا جاتا ہے تو "مدبها صوته" جس طرح جہراً ہوتا ہے، اسی طرح سراً بھی ہوتا ہے، اس لئے یہ روایت بھی آمین بالجہر پر نص نہ ہوگی بخلاف اس کے وہ صحیح روایت جس میں حضور صلی اللہ کا عمل "و خفض بها صوته" منقول ہے وہ البتہ آمین بالسر پر نص ہے، اس لئے حنفیہ سراً آمین کہنے کو افضل قرار دیتے ہیں، دوسرے حنفیہ سراً آمین کہنے کو افضل قرار دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ آمین دعا ہے، جیسا کہ حضرت عطاء نے خود بھی اسکی تصریح کی ہے کہ آمین دعا ء ہے اور دعاء کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے: "ادعوا ربكم تضرعاً وخفية" (۱)، یعنی دعا سراً کہنے کا حکم ہے اور قرآن کا حکم سب پر بالا ہے، اس لئے بھی حنفیہ آمین بالسر کے قائل ہیں اور سراً آمین کہنے کو افضل کہتے ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۹/ ۱۴۰۳ھ

۱- سورۂ اعراف: ۵۵۔

نماز میں آمین آہستہ یا بلند آواز سے کہنا:

یہاں بعض لوگ نماز میں الحمد کی سورت کے آخر نماز میں آمین زور سے بلند آواز سے کہتے ہیں، ان سے جب کہا جاتا ہے کہ آمین آہستہ سے کہو تا کہ کسی کو تکلیف نہ ہو تو حدیث کی کتاب "ابوداؤد شریف" کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ آمین بلند آواز سے کہتے تھے اور مسجد نبوی گونج اٹھتی تھی۔ اور یہی حکم ہے، آمین آہستہ کہنے کی کوئی حدیث ہے ہی نہیں، اگر ہو تو دکھلاؤ، تو براہ مہربانی صحاح ستہ کی کتابوں میں سے آمین آہستہ کہنے کے جواز میں چند حدیثیں لکھوا کر بھیجئے!

الجواب وبالله التوفيق:

جس طرح صحاح ستہ میں جس درجہ کی حدیث آمین زور سے کہنے کی مروی ہے، اسی طرح اسی درجہ کی حدیث آہستہ کہنے کی مروی ہے۔

ایک کے راوی شعبہ ہیں تو دوسرے کے راوی سفیان ہیں، دونوں ایک درجہ کے مستند ہیں، اسی طرح جس درجہ کی حدیث مسجد گونج جانے کی مروی ہے، اسی درجہ کی حدیث اتنی بلند آواز سے آمین کہنے کی مروی ہے کہ عورتوں کی صف تک آواز پہونچتی تھی، بالکل اسی درجہ کی دوسری حدیث صحیح بھی موجود ہے کہ ایسے آہستہ کہتے تھے کہ صرف قریب کی صف کا، بلکہ بعض مرتبہ صرف قریب کا آدمی محسوس کرتا تھا کہ آپ نے آمین فرمایا، صحاح کی ان احادیث میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینا اور محض ایک کو لازم پکڑ لینا سخت دشوار ہے اور ادھر قرآن پاک میں وارد ہے: **"ادعوا ربكم تضرعاً وخفية"** (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے تضرع کے ساتھ اور خفیہ طور پر دعا کرو، آمین بھی دعاء ہے، اس لیے کہنا پڑے گا کہ اصل تو آمین آہستہ سے ہی کہنا ہے۔

اور حضور ﷺ تعلیماً للامۃ ان مختلف طریقوں سے کبھی کبھی کر لیا کرتے تھے، نہ کہ ان مذکورہ طریقوں میں سے محض ایک طریقہ سے ہمیشہ بلند آواز سے یا مد صوت کے ساتھ ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ نے کبھی بلند آواز سے آمین نہیں کہی، اسی طرح تمام بڑے صحابہ میں سے کسی نے حضور ﷺ کے بعد ہمیشہ بلند آواز سے آمین نہیں کہی۔

ان بڑے صحابہ کے ہمیشہ آمین آہستہ کہنے سے معلوم ہو گیا کہ سرکار دو عالم ﷺ کا ان مذکورہ اور مختلف انداز سے

۱- سورۂ اعراف: ۵۶۔

کہنا محض تعلیماً للامۃ تھا اور اصل طریقہ قرآن پاک میں بیان کردہ حکم کے مطابق آہستہ ہی ہے، اس لیے حنفیہ اسی آہستہ طریقے سے کہنے کو ترجیح دیتے ہیں، ورنہ احادیث شریفہ میں تضاد ٹکراؤ ماننا پڑے گا، حالانکہ احادیث سب صحیح ہیں اور من اللہ وحی غیر متلو ہیں، ان میں تضاد وتخالف ماننا جائز نہیں، کیونکہ قرآنِ پاک میں صاف طور سے اس تضاد واختلاف کی تردید کی اطلاع موجود ہے، فرمایا گیا ہے: "ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً" (۱)، اس لیے اختلاف کو جو بظاہر احادیث میں نظر آتا ہے اپنی کوتاہی فہم سے مان کر اسی میں جمع کرنے کی صورت کو لازم پکڑا جائے گا اور حنفیہ کا مسلک اس کے مطابق ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قنوت نازلہ فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم:

ما حكم القنوت في صلوة الصبح عند المذاهب الأربعة، وهل يجوز للحنفي المذهب إذا صلى إماماً أن يقنت وما حكم إذا صلى الحنفي مأموماً وقنت الإمام"۔

محمد شفیق الرحمن خاں (مسجد زید بن ثابتؓ شارع کیدا داری الشرخ الصناعیة دولة الکویت)

الجواب وبالله التوفيق:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دعائے قنوت وہ اماً صرف نمازِ وتر میں ہے، نماز فجر میں نہیں ہے، اگر فجر میں ہے تو وہ قنوتِ نازلہ کی دعا ہے جو صرف نازلہ کے وقت پڑھی جاتی ہیں نہ کہ ہمیشہ (۲)۔

۱- سورۂ نساء: ۸۲۔

۲- "ولا يقنت لغيره إلا لنازلة فيقنت الإمام في الجهر، وقيل: في الكل، قال الشامي: يوافقه مافي البحر والشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية: وإن نزل بالمسلمين نازلة قنت الإمام في صلاة الجهر، وهو قول الثوري وأحمد رحمهما الله إلى قوله: شرعية االقنوت في النوازل مستمرة، وهو مجمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته عليه السلام، وهو مذهبنا وعليه الجمهور، قال الحافظ أبو جعفر الطحاوي: إنما لايقنت عندنا في صلوة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية، فلا بأس به، فعله رسول الله صلي الله عليه وسلم، وأما القنوت في الصلوات كلها للنوازل فلم يقل به إلا الشافعي. (فتاوى شامي باب الوتر والنوافل، ۲/ ۲۵۱)۔

"أن النبي ﷺ كان لايقنت إلا إذا دعي علي قوم أو دعي لقوم" (نصب الراية باب صلوة الوتر والنوافل ۲/ ۱۳)، حنفیہ کی ایک اور دلیل حضرت ابو مالک اشجعی کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

اسی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک نمازِ فجر میں ہمیشہ دعاءِ قنوت پڑھنا ثابت نہیں ہے، اس لیے حنفی امام کو نمازِ فجر میں دعاءِ قنوت نہ پڑھنا چاہئے، ہاں اگر مقتدیوں میں حضرات شوافع یا ایسے لوگ ہوں جو دعاءِ قنوت پڑھتے ہوں تو ایسے وقت میں اس امام کو درست ہے کہ قومہ میں قومہ کی دعائیں جن کا عام طور سے قومہ میں پڑھنا ماثور ہے، اس طرح سست رفتاری سے پڑھے کہ توقف اور تفکر کی خرابی بھی نماز میں نہ آئے اور اس درمیان میں یہ حضرات اپنی دعاءِ قنوت بھی پڑھ لیں اور جب حنفی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھے جو اس میں دعاءِ قنوت پڑھنے کا قائل ہو تو خاموش کھڑا رہے اور رکوع وغیرہ سارے ارکان امام کے ساتھ ادا کرتا رہے(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا:

صبح کو فجر کی نماز جو دعاءِ قنوت نازلہ پڑھی جاتی ہے اس کا پڑھنا کیسا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ عام بلیات ومصائب کو اپنے رب العزت کی مدد سے دفع کرنے کی نیت سے پڑھنا جائز ہے(۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

"قلت: لأبي يا أبت إنك قد صليت خلف رسول الله صلي الله عليه وسلم وأبي بكر وعثمان: وعلي بن أبي طالب ههنا بالكوفة نحواً من خمسين سنة أكانوا يقنتون؟ قال: أي بني! أعجبنى "محدث" (نصب الرایۃ ۲/ ۹ کباب فی ترک القنوت) (مرتب)۔

۱- "ويأتي الإمام بقنوت الوتر لا الفجر، لأنه منسوخ، قال الشامي: فصار كما لو كبر خمساً في الجنازة حيث لايتابعه في الخامسة بل يقف ساكتاً مرسلا يديه قال الشامي وقيل: يقعده وقيل: يطيل الركوع وقيل يسجد إلى أن يدركه في شرنبلاليه (فتاوىٰ شامی ۱/ ۴۴۹، باب الوتر والنوافل) ،هكذا فى كتب المعتبرة للفتاوىٰ عند الأحناف كالرد، والدرر والبحر وغيرهما" (مرتب)۔

۲- "وقال الحافظ أبو جعفر الطحاويؒ: إنما لا يقنت عندنا فى صلاة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية، فلا

بارش یا تاریکی کی وجہ سے دونمازوں کوایک ساتھ پڑھنا:

وهل يجوز للحنفي ان يجمع بين الصلوٰتين جماعة للمطر أو الغيم أو الظلم أرجو الإفادة التامة للسوال المذكور ولكم جزيل الشكر منا والسلام۔

محمد شفیق الرحمٰن خاں (مسجد زید بن ثابتؓ شارع کیداواری الشرخ الصناعیۃ دولۃ الکویت)

الجواب وبالله التوفيق:

جمع حقیقی بین الصلوتین حنفیہ کے نزدیک صرف دوموقعوں پر جائز ہے: ایک موقع عرفات کا ہے کہ نویں ذی الحجہ کو عرفات میں امام الحج کی معیت میں جماعت سے پڑھے تو عصر کی نماز کو مقدم کرکے ظہر کے ساتھ ہی پڑھ لے اور امام الحج یا امیر الحج کے ساتھ نہ پڑھے تو، خواہ جماعت سے پڑھے یا تنہا پڑھے، جمع نہ کرے، بلکہ دونوں نمازوں کی وضاحت ظہر اور عصر کو اپنے اپنے وقت ہی میں پڑھے، دوسرا موقع مزدلفہ کا ہے، مزدلفہ میں مغرب کو مؤخر کرکے عشاء کے وقت میں پڑھے، خواہ جماعت سے پڑھے یا تنہا، ہر حال میں جمع کرے۔

ان دوموقعوں کے علاوہ اور کسی بھی موقعہ میں جمع حقیقی نہ کرے، اس لیے کہ جمع کرنا آیتِ کریمہ: ''إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً'' (۱) کے خلاف ہے اور جتنی حدیثیں ان دونوں موقعوں کے علاوہ مطر وغیم وغیرہ میں جمع کی ہیں سب اخبارِ آحاد یا غیر متواترہ ہیں اور اخبار غیر متواترہ سے تغیر وتبدل کتاب اللہ پر جائز نہیں اور اس وجہ سے ان دونوں موقعوں کے علاوہ تمام موقعوں میں جمع سے محض جمع صوری مراد لے کر جمع بین الروایات کرتے ہیں، اس لئے صرف ان دونوں موقعوں میں احناف جمع حقیقی کے قائل ہو گئے (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بأس به فعله رسول اللهﷺ'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۴۴۹)۔

۱- سورۂ نساء: ۱۰۳۔

۲- اس مسئلہ سے متعلق روایات درج ذیل ہیں: عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللهﷺ: من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر'' (ترمذی شریف ۱/۳۹۳ كتاب الصلوٰة باب الجمع بين الصلوتين)۔

فسادات کے موقع پر قنوت نازلہ اور آیت کریمہ پڑھنا:

☆ نماز فجر میں جو قنوت نازلہ آج کل پڑھا جارہا ہے اور عشاء کی نماز کے بعد آیت کریمہ پڑھ کر سب لوگ ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں۔ ایک شخص دعاء کراتا ہے اور دوسرے اس پر "آمین" پکارتے ہیں، اس طریقہ کے بارے میں مسائل سے نوازیں کہ کس طرح صحیح ہے؟ "لا إله إلا أنت سبحانک إني كنت من الظلمين" ● تک پڑھی جائے یا: "فاستجبنا له ونجينه من الغم، وكذلک ننجي المؤمنين" ● (۱) تک پڑھی جائے۔

دہلی وغیرہ بطور اشتہار کے بہت سی دعائیں چھپ کر شائع ہورہی ہیں کہ موجودہ دور میں ان کو پڑھیں۔ لہذا آپ بھی تحریر فرمادیں کہ کس دعاء کا ورد کیا جائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

یہ سب طریقے بھی صحیح ہیں۔ صرف کمی یہ ہے کہ ان باتوں کے ساتھ اپنے گناہوں سے توبہ شریعت کے مطابق نہیں کرتے، آیت کریمہ محض: "إني كنت من الظلمين" تک بھی صحیح توبہ کے ساتھ پڑھنا کافی ہے۔

نیز آج کل کثرت سے درود شریف کا ورد اور اس دعاء "اللّٰهم إنا نجعلک في نحورهم، ونعوذبک من شرورهم" کا ورد کثرت سے چلتے پھرتے رکھیں۔ اتنا بھی بہت کافی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۵/۱۴۱۱ھ

مختلف قسم کے مصلوں کا شرعی حکم:

(۱) آپ کی خدمت میں کاغذ کا مصلی پیش کیا جارہا ہے، اس طرح کے مصلے کاغذ پر چھپتے ہیں اور معلوم ہوا کہ کسی مقام پر مسلمان اس کو دسترخوان کی جگہ استعمال کرکے کوڑا کرکٹ کے ڈبے وغیرہ میں پھینک دیتے ہیں۔

(۲) کپڑے کی چادروں کی صورت میں چھپتے ہیں اور کئی مقام پر مسجد کے منتظمین مسجد کی صفوں میں بچھاتے ہیں

"قال محمد: بلغنا عن عمر بن الخطاب أنه كتب في الأمان فيها هم أن يجمعوا بين الصلوتين ويخبرهم أن الجمع بين الصلوتين في وقت واحد كبيرة من الكبائر" (موطا امام محمد/ ۱۲۹-۱۳۰ باب الجمع بين الصلاتين في السفر والمطر ما صلى رسول الله بغير ميقاتها) (مرتب)۔

۱- سورہ انبیاء: ۸۷-۸۸۔

جن پر لوگوں کے پاؤں لامحالہ پڑتے رہتے ہیں اور لوگ ان پر بیٹھ بھی جاتے ہیں اور جوتے بھی رکھتے ہیں۔

(۳) مخمل کے کپڑے کی صورت میں بنے ہوئے ہوتے ہیں جو عام طور پر مسلمان اپنی اپنی انفرادی نمازوں کے وقت گھروں میں اور مساجد میں امام کی امامت کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ اس پر بہ نسبت کاغذ اور چادروں کے بیت اللہ شریف کی تصویر زیادہ نمایاں ہے۔

(۴) یعنی مصلی کی چادریں تیار کرنے والے صاحب نے بتایا ہے کہ ان کو سعودی تجار سے جو آرڈر ملتے ہیں تو وہ تاکید کرتے ہیں کہ بیت اللہ کی تصویر والا عکس داہنی جانب ہو اور یہ کہ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کی تصویر والی چادریں بنا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ بائیں جانب والی تصویر گنبد خضراء کی نہیں ہے۔اس سلسلے میں ایک جماعت کہتی ہے کہ ایسے مصلے جائز و درست ہیں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسے مصلے باپ دادا یعنی عرصہ دراز سے استعمال ہوتے آئے ہیں اور کئی بزرگان دین کو بھی استعمال کرتے دیکھا گیا ہے، جبکہ دوسری جماعت دلائل کی بناء پر اس کے استعمال کو مکروہ و ناجائز بتاتی ہے اور بعض تو شرک و حرام تک بتا دیتے ہیں، براہ کرم تفصیل سے اس کا جواب مع حوالہ جات کے تحریر فرمائیں۔

(۵) اگر کسی مسجد کے منتظمین اپنے امام کو استعمال کرنے پر مجبور کریں اور ضد کریں تو اس امام کو کیا کرنا چاہئے اور یہ کہ ایسی صورت میں ایسے مصلوں کی کیا حقیقت کیا حیثیت کیا مقام رہے گا اور یہ کہ ایسے ضدی منتظمین کے بارے میں شرعی کیا حکم ہوگا، براہ کرم یہ بھی بتائیں کہ اسلام میں ایسے مصلوں کی کیا حقیقت ہے کیا حیثیت ہے اور کیا مقام ہے۔

بندہ ابراہیم باوا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس مصلی کو بغور دیکھا آجکل جو کعبۃ اللہ شریف کی یا گنبد خضرا کی جو صورت ہے وہ اس مصلی میں نہیں، لہذا اس اعتبار سے اس پر نماز کا عدم جواز یا کراہت کی گفتگو ہی ختم ہوگئی (۱)، رہ گیا نماز میں شاغل ہو یہ امر اضافی ہے، بعض کے اعتبار سے ایک چیز شاغل بنتی ہے اور بعض کے اعتبار سے نہیں بنتی مثلاً ایک دیہاتی غریب جس نے کبھی منقش کپڑے نہ دیکھے ہوں اس کے لئے معمولی خوبصورت کپڑا چک وغیرہ بھی شاغل بن جائے گا اور ایک شخص جو برابر منقش کپڑوں میں رہتا ہے یا اس کے سامنے نقش ونگار رہتے ہیں اس کے لئے شاغل نہ بنے گا اور ایسی صورت کا حکم یہ ہوگا کہ جس کے لئے شاغل بنے وہ

۱- "أو لغير ذي روح لا يكره" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۴۱۸) (مرتب)۔

استعمال نہ کرے اور جس کے لئے شاغل نہ بنے اس کو استعمال کی اجازت ہوگی، اس لئے سب کے لئے یکساں اور کلی حکم اس صورت میں نہ ہوگا اور نہ افراد کے مجموعہ پر یہ حکم آنا ضروری ہوگا، بلکہ یہ حکم ہر ہر فرد کے لئے الگ الگ اس کے خصوصی مصلی اور احوال کے اعتبار سے ہوگا (۱)۔

جناب نبی کریم ﷺ کی نگاہ مبارک ایسے موقعہ میں شفقۃ علی الامۃ مسائل واحکام کی تبلیغ کی مصلحت سے غریبوں محتاجوں کمزوروں بیماروں کی جانب منجانب اللہ پہنچتی تھی ورنہ آپکی ذات مقدس اس سے کہیں زیادہ اعلی وارفع ہے کہ آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں اور آپ کی نگاہ غیر اللہ میں مشغول ہو باقی چونکہ احکام ومسائل کی تبلیغ وتحریض مطلوب شرعی اور آپکا منصب تھا، اس لئے بھی ہر وقت یہ حکمت پیش نظر رہتی تھی، چنانچہ اس کی مثالیں بہت ہیں، مثلاً مسئلہ یہ ہے کہ۔

(مثال۔۱) جب ایک شخص تنہا نماز پڑھے تو اس کو اپنے نشاط وانبساط کے مطابق ارکان صلاۃ جتنا طویل کر سکے طویل کرنا ہی بہتر واولی ہے اور جب وہی شخص امامت کرے تو حکم یہ ہے کہ کمزوروں بیماروں ضرورتمندوں کی رعایت مقدم کرے اور ہلکی نماز پڑھے چنانچہ بخاری ومسلم میں بھی حضرت ابوہریرہ سے صحیح روایت مروی ہے:" **إذا صلى أحدكم للناس فليخفف، فان فيهم السقيم والضعيف والكبير وإذا صلى لنفسه فليطول ما شاء**"(۲) حالانکہ اس میں نگاہ سقیم وضعیف وکبیر کی طرف پہنچتی ہے اور سقیم ضعیف وکبیر یہ سب غیر اللہ ہیں، مگر چونکہ یہ چیز شرعاً مطلوب ہے، اس لئے محمود ہے اس کا امتثال کمال عبدیت کا اظہار ہے آپ کا عمل مبارک بھی اس حکم کے مطابق تھا آپ تہجد کی نماز پڑھتے تھے تو بہت طویل اور بہت حسین پڑھتے تھے اور "ابو داؤد شریف" میں حضرت عائشہؓ کی طویل حدیث میں "**لا تسأل عن حسنهن وطولهن**"(۳) سے اسی کی طرف اشارہ ہے اور جب آپ امامت فرماتے تھے تو اس کے بارے میں حضرت انسؓ

۱- "عن عائشة رضي الله عنها أن النبي ﷺ صلى في خميصة لها أعلام، وقال: شغلتني أعلام هذه، فاذهبوا بها إلى أبي جهم وأتوني بانبجانيه" (صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث ۶۱)، حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: "وأما بعثه بالخميصة إلى أبي جهم فلا يلزم منه أن يستعملها في الصلوة..... ويحتمل أن يكون ذلک من جنس قوله: "كل فإني أناجي من لا تناجي" (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۱/ ۴۸۳)، نیز امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "ففيه الحث على حضور القلب في الصلوة وتدبر ما ذكرناه ومنع النظر من الامتداد إلى ما يشغل وإزالة ما يخاف اشتغال القلب به وكراهية تزويق محراب المسجد وحائطه ونقشه وغير ذلک من الشاغلات" (شرح نووی ۵/ ۴۴) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/ ۱۹۹ کتاب الأذان باب إذا صلى لنفسه فليطول ماشاء حدیث ۷۰۳، بعض نسخوں میں فان فيهم کے بجائے فان منهم ہے، نیز روایت میں لفظ ضعیف، سقیم پر مقدم ہے، نیز صحیح مسلم میں کچھ الفاظ کے فرق سے مروی ہے (دیکھئے: حدیث ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶) (مرتب)۔

۳- سنن ابو داؤد ۲/ ۴۰ ابواب قيام الليل باب في صلاة الليل حدیث ۱۳۴۱، عن أبي سلمة بن عبد الرحمن أنه أخبره أنه سأل عائشة

سے (خادم خاص) ''بخاری ومسلم'' میں روایت ہے فرماتے ہیں: ''**ما صليت وراء إمام قط أخف صلاة ولا أتم صلاة من النبي ﷺ، وانه كان يسمع بكاء الصبي، فيخفف مخافة أن تفتن أمه**'' (۱)،اس روایت میں بھی کمزوروں اور ضعیفوں کی طرف ذہن گیا اور ان کی رعایت کو مقدم فرمایا اور مثلاً:

(مثال نمبر ۲) مساجد کو مزخرف کرنا نقش ونگار سے مزین کرنا قرب قیامت کی علامت ہے (۲)،اور فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وقف کے پیسے سے نقش نگار بنانا ناجائز ہے اور اپنے ذاتی پیسے سے بنانا غیر مستحسن اور ناپسندیدہ فی الشرع ہے اور قبلہ کی دیوار میں تو اپنے پیسے سے بھی ایسا نقش ونگار بنانا ممنوع ومکروہ ہے (۳)۔

اس علت مطردہ کے تحت یہ حکم خود بخود بھی نکل آیا کہ جو صفیں مساجد میں بچھائی جاتی ہیں ان کا سادہ اور غیر منقش ہونا کم از کم مطلوب شرعی ضرور ہوگا اور خلاف کرنا مکروہ ہوگا۔ پھر اس حکم میں بھی اوپر کی ذکر کردہ مصالح پیش نظر ہوسکتی ہیں کہ مساجد میں ہر مسلمان شریک جماعت ہوسکتا ہے اور عام مسلمانوں میں اکثر وبیشتر غریب ومسکین ہوتے ہیں اور ان مزخرفات کا ان کے لئے شاغل بننا قرین قیاس بھی ہے اس لئے ذہن نبوی علی صاحبہا الصلاۃ کی متابعت میں یہ حکم عام بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی صفیں مکروہ وممنوع ہوں جس طرح دیوار قبلہ کا نقش ونگار مکروہ ہے (۴)، اور غرباء ومساکین کی رعایت مقدم ہو، پس منتظمین وذمہ دار مساجد پر اس حکم کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

اگر کسی مسجد کے منتظمین اس کا لحاظ نہ کریں تو ان کو نرمی وہمدری کے ساتھ مسائل سے واقف کرنا اور سمجھانا چاہئے اگر سمجھ جائیں اور اصلاح فرمالیں اور لحاظ رکھنے لگیں تو فہو المراد ورنہ ضدو زبردستی نہیں کرنی چاہئے نزاع وجدال اختیار نہیں کرنا

زوج النبي ﷺ: كيف كانت صلاة رسول الله ﷺ في رمضان؟ فقالت: ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة يصلي أربعاً فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي أربعاً فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي ثلاثاً قالت عائشة رضي الله عنها فقلت: يا رسول الله أتنام قبل أن توتر؟ قال يا عائشة! إن عينيّ تنامان ولا ينام قلبي (مرتب)۔

۱– صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/ ۲۰۰ کتاب الأذان باب من أخف الصلاۃ عند بکاء الصبی حدیث ۷۰۸، ولفظه: ما صليت وراء إمام قط أخف صلاة ولا أتم من النبي ﷺ وان كان يسمع بكاء الصبي، فيخفف مخافة أن تفتن أمه، نیز صحیح مسلم حدیث ۱۹۲ بمعناہ) (مرتب)۔

۲– عن أنس أن النبي ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتى يتباهى الناس في المساجد (سنن ابو داؤد ۱/ ۱۲۳ کتاب الصلاۃ باب فی بناء المساجد حدیث ۴۴۹) (مرتب)۔

۳– ''ومحمل الكراهة التكلف بدقائق النقوش ونحوه خصوصاً في المحراب أو التزيين مع ترك الصلوات (فتح القدير ۱/ ۳۶۸)، قال المصنف في الكافي: وهذا إذا فعل من مال نفسه، أما المتولي فإنما يفعل من مال الوقف ما يحكم البناء دون النقش فلو فعل ضمن حينئذ لما فيه من تضييع المال'' (البحر الرائق ۲/ ۶۵) (مرتب)۔

۴– ''ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها خصوصاً في جدار القبلة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۴۳۱) (مرتب)۔

چاہئے، بلکہ ہمدردی کے لہجہ میں مسئلہ بتا کر خاموش ہوجانا چاہئے مسئلہ صاف صاف اور اخلاص سے بتا کر اختلاف وشقاق و نزاع وجدال سے بچنے اور بچانے کے لئے خموش ہوجائے انشاء اللہ عنداللہ براءت ذمہ ہوجائے گی پھر جو مواخذہ مطالبہ وغیرہ منجانب اللہ ہوگا وہ صرف منتظمین و ذمہ داروں تک محدود رہے گا(۱)۔

رہ گیا ائمہ کا ایسے موقعہ پر کیا رویہ ہونا چاہئے انکا رویہ بھی یہی ہونا چاہئے جو ابھی ذکر ہورہا ہے، رہ گئی ان کی نماز اگر وہ اپنے مصلی کو شاغل دیکھتے ہوں تو اس کو اس طرح بھی حل کر سکتے ہیں کہ اپنا سادہ رومال اپنے مصلی پر ڈال کر اپنے کو بچالیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۰ھ

نوٹ:۔ جو روایات جناب نے نقل فرمائی ہیں وہ اولا تو از قبیل فضائل ہیں فضائل پر احکام ومسائل کی بنا نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مقصد اولی ترغیب وتحریض ہوتی ہے تاکہ عمل کرنے کا شوق پیدا ہوکر عمل کرنا سہل اور آسان ہوجائے اور نسبتِ احسان پیدا کرنے کی استعداد وصلاحیت حاصل ہوجائے۔

ثانیاً: ایسی روایات اکثر باب تربیت اور اصلاح سے متعلق ہوتی ہیں، اسی کی وجہ سے مشائخ ومصلحین ایسی روایت لاکر رذائل باطنہ ومکائد خفیہ کی اصلاح فرماتے ہیں جس سے سالک باطن کی تربیت باحسن وجوہ ہوتی ہے، نیز یہ حالات تقوی کے اعلی مراتب پر فائز ہونے کے بعد اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس لئے بھی ان چیزوں کو عام وکلی حکم نہیں قرار دیا جائے گا۔

امید ہے کہ ان مختصر جملوں سے ان روایات کے مفاہیم ومحامل اور مصادیق بھی واضح ہوجائیں گے جو باعث طمانیت قلب بھی بنیں گے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "ادع إلى سبيل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين" (سورۂ نحل:۱۲۵)۔

۱- فاتحہ اور سورت کے درمیان وقفہ کی حد:

امام صاحب کے ختم سورہ فاتحہ اور ضم سورہ کے درمیان کتنی دیر تک وقفہ اور سکوت رہنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

۲- حنفی امام کے لئے دوسرے ائمہ کے مسائل کا اتباع کرنا:

کوئی حنفی عالم دیگر ائمہ ثلثہ کے مسائل کے تابع بن کر امامت کرے تو بہتر ے اختلاف مسائل حنفیہ کے کتنے مواقع اور مسائل میں نماز فاسد ہو جاتی ہے، اس مسئلے میں دلیل ضرور چاہیے، ورنہ یہاں نا قابل مسموع ہوگا خاص کر حنفی امام شافعی مسائل کے تابع بن کر نماز ادا کر سکتا ہے یا نہیں۔

مولوی شبیر احمد میرٹھی

الجواب وبالله التوفيق:

۱- بعد فاتحہ آمین کہنے اور ضم سورہ کے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے اور اطمینان سے سانس لینے اور اطمینان کرنے کے بقدر وقفہ وسکوت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس سے زائد بغیر ضرورت طبعی وشرعی کے سکوت ووقفہ کرنا مذموم ہے کبھی مکروہ کبھی موجب سجدۂ سہو ہوگا۔ ان سب مسائل کی تفصیل اردو کتب فقہ مثلاً ''علم الفقہ، بہشتی ثمر و بہشتی زیور وتعلیم الاسلام مصنفہ حضرت مفتی کفایت اللہ'' میں موجود ہے، ان کتابوں کا مطالعہ کریں (۱)۔

۲- حنفی امام کو دوسرے ائمہ کے مقلدین کے مسائل کا اتباع کرنا تو درست نہیں البتہ امامت وطہارت وغیرہ کے مسائل میں حنفی رہتے ہوئے اس طرح عمل کرے کہ دیگر ائمہ کے مسلک ومسئلہ کے مطابق بھی عمل ہو جائے اور اختلافات ائمہ سے بھی محفوظ رہیں اور نماز میں ہر مسلک کے لوگوں کی رعایت ہو جائے مثلاً سورہ فاتحہ سے قبل آہستہ سے ہر نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا اور سورہ فاتحہ کے بعد آہستہ سے آمین اور ضم سورہ سے پہلے آہستہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اسی طرح سانس کھینچ کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ لینا جس سے وہ لوگ جو خلف الامام سورہ فاتحہ پڑھنا چاہتے ہوں سورہ فاتحہ جلدی جلدی پڑھ لیں۔ یا مثلاً نماز فجر کی دوسری رکعت کے رکوع کے بعد قومہ میں تسمیع اور تحمید کے علاوہ قومہ کی اور جو دعائیں احادیث میں وارد ہیں ان کو بھی پڑھ لیں، تا کہ وہ مقتدی جو اس میں قنوت نازلہ پڑھنا چاہتے ہوں پڑھ لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ

۱- ''وانه يجب أن لا يؤخر السورة عن قرائة الفاتحة.... وقيده فى فتح القدير، بأن يكون مقدار ما يتأدى به ركن عن قرائة الفاتحة'' (البحر الرائق ۲/۱۲۶، نیز دیکھئے: بہشتی زیور سجدہ سہو کا بیان مسئلہ ۹، وبہشتی ثمر/۸۷)(مرتب)۔

ایسے حنفی امام کو جن کے پیچھے دیگر ائمہ کرام کے مقلدین بھی شریک ہوں رعایت کرنا چاہئے (۱)، باقی تمام ایسے مسائل کی تفصیل فتوی سے حل ومعلوم نہیں ہوسکتی ان مسائل کی تفصیل دیکھنا ہوتو اردو زبان کی غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار یا ردالمختار، البحر الرائق کا باب الامامہ مطالعہ کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۰/۰۸/۲۳ھ

بچوں کا گھٹنا کھول کر نماز پڑھنا:

ہمارے بڑے لڑکے کی عمر ساڑھے آٹھ برس اس سے چھوٹے کا سات برس ہوا میں ان لوگوں کو مسجد میں ہر روز لے جاتا ہوں۔ وہ لوگ گھٹنوں کے اوپر پائجامہ پہن کر جاتے ہیں، نمازی لوگ ان کا ران دیکھنے سے گنہگار ہوں گے؟ کئی مولوی صاحب مجھے کہا بچہ ہے ان کے لئے کوئی حکم نہیں ہے، نابالغ ہے۔

محمد اسحاق، تھائی لینڈ

الجواب وبالله التوفيق:

جب بچے سات برس کے ہوجائیں تو ان کو نماز پڑھنے کا حکم ہے، اس لئے اچھا کرتے ہیں کہ ان کو مسجد میں لے جاتے ہیں، البتہ ایسا تہبند یا پائجامہ یا کپڑا پہن کر مسجد میں جانا چاہیے جس میں گھٹنا چھپا رہے، قرآن پاک میں ہے: **"یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا یحب المسرفین"** (۲)، اور جو لباس خود پہننا منع ہو، اس کو بچوں کو پہنانا منع ہے جس نے اس کے خلاف کہا غلط کہا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۸/۱۱ھ

۱- "فی التاتارخانیة عن الحجة: ینبغی للإمام أن یحترز عن ملامسة النساء ومواضع الاختلاف ما استطاع" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۳۴۰) (مرتب)۔

۲- سورۂ اعراف: ۳۱

۳- "فإن ماحرم لبسه وشربه حرم إلباسه وإشرابه" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/ ۵۲۲) (مرتب)۔

نماز فجر میں مقتدی کا لحاظ کرتے ہوئے چھوٹی سورت پڑھنا:

صبح کی نماز میں آج کل کے مقتدیوں کے لحاظ سے چھوٹی سورتیں پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

فجر کی نماز میں طوال مفصل جس کی مقدار تخمیناً چالیس آیت سے لے کر ساٹھ آیت تک ہے اوراس کی مقدار رات کے چھوٹے بڑے ہونے، نیز مصلیوں کے نشاط و رغبت و کثرت اشتغال کے اعتبار سے کم وبیش ہوتی ہے اور یہ مقدار طوال مفصل کی مسنون ہے، کسی مقتدی کے لحاظ سے اتنا کم نہ کردے کہ سنت ترک ہوجاوے کم سے کم مقدار سنت کی یہ ہے کہ دونوں رکعتوں کی قرأت ملا کر چالیس آیت ہوجائیں، بلاضرورت صحیحہ اس سے کم نہ کرے کہ خلاف سنت ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا:

ناف کے نیچے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کا حکم کونسی حدیث میں ہے، حضور علیہ السلام نے کبھی ناف کے نیچے ہاتھ نہیں باندھے۔ اور ہے تو کون سی حدیث ہے صراحت کیجئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

تحت السرہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کی حدیث ابوداؤد نسخہ ابن عربی میں موجود ہے، بہتر ہے کہ "بذل المجھود شرح ابوداؤد مطبوعہ کتب خانہ یحیوی سہارنپور" میں دیکھ لیا جائے، نیز مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ میں بھی موجود ہے، ابوداؤد کی روایت

۱- "وسنتها في الحضر أن يقرأ في الفجر في الركعتين بأربعين أو خمسين آية سوى فاتحة الكتاب" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۷۷) "ولا يزيد على القراءة المستحبة ولا يثقل على القوم ولكن يخفف بعد أن يكون على التمام والاستحباب كذا في المضمرات ناقلاً عن الطحاوي" (ایضا ۱/ ۷۸) (مرتب)۔

کا متن حسب ذیل ہے: "عن أبي وائل عن أبي هريرة أخذ الكف عن الكف في الصلوة تحت السرة" (۱)، اسی طرح ابوبکر ابن ابی شیبہ کی عبارت حسب ذیل ہے: "ليضع يمينه على شماله في الصلوة تحت السرة"، اسی طرح ابو داؤد میں اس مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل روایت بھی موجود ہے: "عن جرير الظبي عن أبيه قال رأيت علياً يمسك شماله بيمينه على الرسغ فوق السرة" (۲)، اس حضرت علی کی روایت میں فوق سے مراد اتصالاً علی فوق السرۃ ہے نہ کہ فوق منفصلا جیسا کہ قرآن کریم کی آیت: "إني أراني أحمل فوق رأسي خبزاً" (۳) "وجعل فيها رواسي من فوقها" (۴) میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۰۴/۱۴۰۲ھ

دوران نماز دنیوی ضرورتوں کا خیال آجانا:

ایک آدمی اگر نماز پڑھ رہا ہو اور اسی اثنا میں اس کو دنیوی کاموں اور ضرورتوں میں سے کوئی اس کے ذہن نشین ہوجاوے مثلاً بیوی بچے اور اس کے علاوہ دیگر امور خارجہ کام تو اس کا کیا حکم ہے آیا اس کی نماز مکمل طور سے ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

حالت نماز میں دنیاوی کام اور ضرورتوں کے ذہن نشین ہوجانے سے نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن نمازیوں کو چاہئے کہ ایسے خیالات بذات خود ذہن میں نہ لائے ہاں اگر خود بخود آجائیں تو صحت صلاۃ کے منافی نہیں ہے (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۸ شعبان ۸۵ ۱۳ھ

۱- بذل المجہود ۲/ ۲۲۔
۲- بذل ۲/ ۲۴۔
۳- سورۂ یوسف: ۳۶۔
۴- سورۂ حم السجدہ: ۱۰
۵- "في الفتاوى: ولو تفكر في صلاته فتذكر حديثاً أو شعراً أو خطبة أو مسئلة يكره ولا تفسد صلاته هكذا في السراج الوهاج" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۰۰) (مرتب)۔

نماز میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال:

ایک مسجد میں یہاں امامت کراتا ہوں اور نماز میں لاؤ ڈاسپیکر استعمال نہیں کر رہا ہوں اور حضرت والا نے بھی برطانیہ کے سفر میں دیکھا ہوگا کہ ائمہ مساجد اس کو نمازوں میں استعمال کر رہے ہیں، اور دلیل میں اس بات کو پیش کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال کے اندر جو عقائد مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی کتاب "آلات جدیدہ" میں لکھے ہیں وہ یہاں مفقود ہیں، مثلاً بجلی کا چلا جانا قریب قریب مساجد کا ہونا وغیرہ صرف خشوع وخضوع اور سلف صالح کی سنت کے خلاف ہے، اس کے باوجود آپ نے بھی جمعہ وعیدین میں مساجد میں اس کا استعمال دیکھا ہوگا نیز ایک عالم صاحب کہہ رہے ہیں کہ آلۂ مکبر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دور تک پہنچانا بناء محراب وبناء گنبد سے زیادہ آسان ہے اور بناء محراب وبناء گنبد بلانکیر مدت مدیدہ سے رائج ہے اور اس سے بھی رفع صوت امام مقصود ہے تو حضرت والا سے گذارش ہے کہ ان باتوں کا دلائل سے جواب دیں۔

ایس اے بوڑیات (۴۔ سا رتھ کنگ اسٹریٹ باٹلے F17 یورک شائر، انگلینڈ)

الجواب وبالله التوفيق:

اعلی بات تو یہی ہے نماز فرض بلا لاؤ ڈاسپیکر کے بالکل سادہ طریقہ پر ادا کی جائے، اس لئے کہ امام کی قرأت کا سننا ہر مقتدی کے حق میں واجبات صلوۃ میں سے نہیں ہے، بلکہ استماع وانصات واجب ہے اور وہ بغیر اس آلہ کے بھی حاصل ہے، نیز اس لئے کہ خشوع وخضوع جو نماز کی روح ہے وہ بھی اس صورت میں بدرجہ اتم حاصل ہوتی ہے اور اس کے تحصیل کی ترغیب بلکہ فی الجملہ تاکید بھی ہے اور آلہ مکبر الصوت میں بجلی نہ بھاگنے کی صورت میں عموماً فوں شوں گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ وغیرہ کی آوازیں نکل آتی ہیں جو خشوع خضوع میں یا کم از کم یکسوئی اور توجہ الی الصلوۃ میں مخل ضرور ہو جاتی ہیں جن سے بچنا یا بچنے کی تدبیر کرنا بلاشبہ مقاصد تکمیل صلوۃ میں سے ہے رہ گئی یہ بات کہ آلۂ مکبر الصوت نماز میں استعمال کرلیا جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

تو ابتداء میں اپنے اکابر نے نماز نہ ہونے کا فتوی دیا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے ابتدائی فتاویٰ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالہ "التحقیق الفرید فی تقریب الصوت البعید" اور اس کے قبل کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد جب اپنے اکابر میں بھی دو رائیں نظر آنے لگیں اور نماز جائز کہنے والے حضرات کے اس فرمانے سے کہ لاؤ ڈاسپیکر کے

انبوبوں سے نکلنے والی آواز بعینہ متکلم کی ہی آواز ہوتی ہے جو بڑھ کر نکلتی ہے۔صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایسی صورت میں نماز جائز ہو جانا چاہئے تو مانعین جواز کے نزدیک بھی اپنی رائے میں تردد پیدا ہو گیا اور حضرت تھانویؒ ہی کے آخر زمانہ میں عدم جواز کے قائلین کے نزدیک یہ رائے ٹھہری کہ اس آلہ کے ماہرین سے تحقیق کر لی جائے جو آوازیں اس سے نکلتی ہیں بعینہ متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے تو جواز صلوۃ کا فتوی دے دیا جائے، جیسا کہ ''رسالہ التحقیق الفرید'' کے بعد فتاوی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت تھانویؒ کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ اس تحقیق میں تین ماہرین میں سے دو کی تحقیق یہ ہوئی کہ بعینہ متکلم کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہوئی مگر ان دو ماہرین میں سے ایک غیر مسلم تھا، اس لئے متفق علیہ فیصلہ جواز کا نہ ہو سکا پھر حضرت تھانویؒ کا وصال ہو گیا بعد میں یہ چیز محقق ہو گئی کہ اس میں جو آواز نکلتی ہے وہ صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہوتی، بلکہ متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے۔

توحضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ اور حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ وغیرہم تمام اکابرین کے نزدیک متفقہ طور پر بلا کراہت اس سے جواز نماز کا فتوی ہو گیا شیخ الاسلام نمبر میں بھی حضرت مدنیؒ کا فتوی جواز کا شائع ہو چکا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ بلا ضرورت اس کا استعمال مستحسن نہیں ہے باقی اگر کوئی استعمال کرے تو نماز بلا کراہت ادا ہوگی البتہ اس کا لحاظ ضروری رہے گا کہ لاؤڈ اسپیکر بہت عمدہ قسم کا ہوتا کہ اس میں سے بے موقعہ فون شون کر یہہ آواز نہ نکلے تاکہ خشوع خضوع وغیرہ فوت نہ ہو ورنہ اس کا استعمال مکروہ ہوگا اس طرح اگر بجلی بھاگ جانے کا یا آلہ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو اور مجمع بڑا ہو کہ امام کی آواز پیچھے تک پہنچنے میں شبہ ہو تو مکبرین کا انتظام رکھنا بھی ضروری رہے گا، تاکہ ایسے وقت میں نماز خراب نہ ہو اور چونکہ زمانہ سلف میں اس آلہ کا وجود ہی نہ تھا اس لئے انکی سنت کی مخالفت وموافقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور محراب ومنبر بنانے سے رفع صوت امام مقصود نہیں، بلکہ محراب سے امام کے جائے قیام کو واضح کرنا مقصود ہوتا ہے اور منارہ سے مسجد کی عمارت کا اعزاز واکرام مقصود ہوتا ہے اور اس کا نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ مطلوب شرعی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۴/۲/۲۸ھ

جلسۂ استراحت کا حکم:

نماز پڑھتے وقت طاق رکعت یعنی پہلی رکعت ہونے پر اور تیسری رکعت کے دونوں سجدہ کر کے با قاعدہ طور پر بیٹھ کر اٹھنا چاہئے یا نہیں؟ اس بارے میں بھی بخاری شریف کی جلد اول میں صفحہ (۱۸۲ پر حدیث ۸۲۸ اور ۸۲۹) یہ دونوں (حدیثیں) ملیں۔ جن میں طاق رکعت میں بیٹھنے کا حکم ملا ہے، لیکن یہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسئلے ہیں جنکا تفصیل سے لکھنا مجھ جیسے ناواقف کے لئے مشکل ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری نماز مکمل طور پر صحیح ہو، اس میں کوئی بات کی ادائیگی میں کمی نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت پر عمل کرنا چاہتا ہوں، اس لئے آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ میں ان میں سے کونسا طریقہ اپناؤں بخاری شریف والا یا آج تک جس امام کی تقلید کرتے آیا ہوں۔

عامر تاج الدین دبیر (جدہ سعودی عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ ثانیہ کے بعد پہلے بیٹھ جائے پھر اٹھے، یعنی جلسۂ استراحت کرنے کا ہے، اس سلسلہ میں بخاری شریف میں صرف ایک روایت حضرت مالک بن الحویرثؓ کی ہے کہ حضور ﷺ نماز کی طاق رکعتوں میں دوسرے سجدہ کے بعد سیدھے بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہوتے یہ روایت پوری نہیں ہے پوری روایت میں "لا تبادرونی فانی قد بدنت" بھی موجود ہے، جیسا کہ امام ابن القیم نے "زاد المعاد" میں اس زیادتی کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ جلسہ اصلی حکم نہیں، بلکہ بوجہ ضعف پیری آپ نے ایسا کیا ہے چنانچہ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"يدل على أن تلك كانت لعلة، لأن ذلك الجلسة للاستراحة، والصلوة غير موضوعة لتلك" (۱)۔

اور یہی مذہب امام مالک واحمد کا بھی ہے کہ یہ حضرات جلسۂ استراحت نہیں کرتے تھے، اس کے علاوہ امام ترمذی نے "ترمذی شریف" میں حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ حضور ﷺ کا ہمیشہ کا معمول "**كان النبي ﷺ ينهض على صدور قدميه**" نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے، لہذا حنفیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جلسۂ استراحت حضور ﷺ کا ہمیشہ کا معمول یا مقصود فی الصلوۃ نہیں تھا، بلکہ بوڑھاپے وغیرہ عارض کی وجہ سے اتفاقی تھا اور

۱- رواہ الترمذی فی جامعہ ابواب الصلوۃ، باب کیف النھوض من السجود ۱/۸ سعیدی۔

اگر کوئی آج بھی کسی علت یا ضعف کی وجہ سے کرے تو مکروہ نہ ہوگا، باقی عادۃ افضل یہی رہے گا کہ بلا عذر جلسۂ استراحت نہ کیا جائے امید کہ اتنی گفتگو سے آپ کی تسلی ہوجائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۹/ ۱۴۰۳ھ

۱-صلوٰۃ با جماعت کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعاء کا حکم:

صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، کیا اس کو بدعت کہنا صحیح ہے؟ دلائل واضحہ کی روشنی میں حل فرمادیجئے؟

۲-سورہ یسین ختم کرنے کا معمول بنانا:

اگر کسی دینی ادارہ میں علم وعمل اور امور مدرسہ کی ترقی کے پیش نظر اوقات مدرسہ کے علاوہ سورہ یسین شریف ختم کرانے کا معمول رہے تو کیا یہ عمل بدعت میں شامل ہوگا یا کار حسنہ میں، واضح فرمادیجئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-"عن أنس رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال: ما من عبد يبسط كفيه في دبر كل صلوٰة يقول: اللهم إلهي وإله إبراهيم وإسحق ويعقوب وإله جبرئيل وميكائيل وإسرافيل أسئلک أن تستجيب دعوتي فإني مضطر وتعصمني في ديني، فإني مبتلي وتنالني برحمتک، فإني مذنب وتنفي عن الفقر، فإني متمسكين إلا كان حقا على الله أن لا يرد يديه خائبتين (عمل اليوم والليلة)" (۱)،

روایت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا مشروع ومسنون ہے، بدعت کہنا صحیح نہیں ہے۔

۲-سورۂ یٰسین شریف قلب قرآن ہے،"عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: إن لكل شئ قلبا وقلب القرآن يسن" (۲) اس کا پڑھنا بطور معمول اور وظیفہ حصولِ مقصد کے لئے معین ہے، لہذا یہ عمل بدعت نہیں، بلکہ بہتر

۱- عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی مکتبہ دارالبیان/ ۷۲، حدیث نمبر ۱۳۸، عن أنس بن مالک عن النبي ﷺ أنه قال: مامن عبد......الخ (مرتب)۔

۲- مشکوۃ المصابیح مع شرح الطیبی ۴/ ۲۵۴، کتاب فضائل القرآن، رواہ الترمذی، والدارمی حدیث نمبر (۲۱۴۷) (مرتب)۔

ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۲۱/ ۱۴۱۱ھ

بعد نماز فرض جہری دعا:

یہاں مختلف قسم کی غیر مشروع رسموں میں سے چند چیزیں ایسی ہیں جن کی میں نے لوگوں کو یہاں نہ صرف پابندی کے ساتھ پیروی کرتے دیکھا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں اور مختلف قسم کے جواز اس کے عذر میں پیش کرتے ہیں جو خود ہی قابل مذمت ہیں، مگر یہاں چونکہ صاحب علم لوگ یا تو نہیں یا ہیں تو پھر لائق اعتماد نہیں (مختلف وجوہات کی بنا پر علم اور عمل میں ایک دوسرے کے متضاد اور سنت رسولؐ سے بیزاری کا عملاً اظہار) انہیں وجوہات کی بنا پر میں آج آپ سے رجوع ہو رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ ان سوالوں کا جواب قرآن حدیث رسول وفقہ وغیرہ کی معتبر روایتوں سے بیان فرمائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔

سوال:۔ یہاں ہر فرض نماز اور نماز جمعہ کے فوراً بعد اور سنتوں سے قبل امام اور مقتدی بہت ہی بلند آواز کے ساتھ ذکر میں مجموعی طور پر مشغول ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے جو حضرات سنتوں کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں ان کی نمازوں میں بہت خلل پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد آیۃ الکرسی سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھنے کی بہت فضیلت آئی ہے۔ مجھے اس سے ذرہ برابر بھی انکار نہیں، لیکن میں نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ان فرض نمازوں میں جن کے بعد سنتیں نہ ہوں ان اذکار میں مشغول ہوں اور سنتیں پڑھ کر غالباً میں نے درمختار میں نماز کے بیان میں یہ اشارہ پڑھا تھا اور جہاں تک بلند آواز اور لاؤڈ اسپیکر پر مجموعی طور پر ان کا اذکار کا پڑھنا کسی بھی صورت سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) نماز عید سے قبل عید گاہ (اگر چہ یہاں کوئی مستقل عید گاہ نہیں ہے کسی بڑے ہال میں انتظام کیا جاتا ہے) میں لاؤڈ اسپیکر پر مجموعی طور پر تکبیرات پڑھی جاتی ہیں دونوں عیدوں کے موقع پر براہ کرم اس کے متعلق حدیث وفقہ سے مع اختلاف مذاہب حنفی، شافعی وغیرہ مطلع فرمائیے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) آپ کا خیال صحیح ہے ان فرض نمازوں کے بعد جن کے بعد سنتیں نہیں ہیں سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا پڑھنا

ثابت ہے اور وہ بھی جہراً نہیں، بلکہ سراً۔ ہر فرض نماز کے اور نماز جمعہ کے بعد جہراً اس کا التزام بدعت اور "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد أو كما قالؐ "(۱) میں داخل ہے اور حسن تدبیر سے اس کی اصلاح ضروری ہے۔

(۲) مذکورہ فی السوال طریقہ سے جہراً نماز عیدین سے قبل تکبیرات پڑھنا ثابت نہیں اس کا بھی حکم وہی ہے جو نمبر ا کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳ھ

بعد نماز اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

ملک بنگال کے مفتی فیض اللہ نے فتویٰ مناجات بعد صلوٰۃ نام کی ایک کتاب چھپوائی ہے از اول تا آخر انہوں نے بعد نماز مناجات میں ہاتھ اٹھانے کو بدعت سیئہ ثابت کیا ہے کہتے ہیں فرائض نماز کے بعد یا تنہا فرض یا نفل وتر ہو یا تراویح ختم نماز کے بعد امام دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے اور مقتدی تبعاً للامام ہاتھ اٹھاتے ہیں اور آمین کہتے ہیں یہ بدعت سیئہ ہے کسی بھی حدیث سے مرفوع ہو یا موقوف حتی کہ حدیث ضعیف، بلکہ موضوع حدیث بھی اس بارے میں کہیں بھی نہیں ہے نہ نبی ﷺ نے ہاتھ اٹھایا، نہ صحابہ نے، نہ تابعین نے، نہ زمانہ سلف صالحین ائمہ مجتہدین میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے، نہ فقہی کتابوں میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، ہاں ادعیہ ماثورہ مثلاً اللّٰھم أنت اللہ وغیرہ کا پڑھنا ثابت ہے، مگر انفرادی حیثیت سے ہے، لہذا دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا غلو فی الدین اور شرعی حد سے تجاوز ہے، لہذا سب کو چاہئے کہ فرداً فرداً بغیر ہاتھ اٹھائے ہوئے ان دعاؤں کے پڑھنے پر اکتفاء کریں، ہاتھ اٹھانا عبث اصل ہے، بعض فقہاء نے بغیر کسی دلیل نقلی محض قیاس اور استنباط سے ایسی دعاء کو مستحب بتایا ہے، کوئی حدیث قولی یا فعلی اپنے استدلال پر نہیں دیا ہے، حدیث میں جو دبر الصلوۃ کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب آخر الصلوٰۃ ہے، جیسے دبر اللیل کے معنی آخر اللیل کے آتے ہیں، صحابہ کرام نے نبی علیہ السلام کے جزو حالات نقل فرمائے ہیں مگر کسی صحابی سے ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی علیہ السلام نے بعد فرائض صلوٰۃ کبھی بھی ہاتھ اٹھایا ہو، لہذا مناجات

۱- بخاری ۱/۱۷۳، کتاب الصلح مطبع اصح المطابع، مسلم ۲/۷۷، کتب خانہ رحیمیہ۔ "حاصل الكلام في هذا المقام أنه قال في الخلاصة ولايكبر يوم الفطر اه فافادأن الخلاف في اصل التكبير لا في صفة وأن الإتفاق على عدم الجهربه، ورده في فتح القدير، بأنه ليس بشئ إذلا يمنع من ذكر الله في وقت من الأوقات، بل من إيقاعه على وجه البدعة وهو الجهر لمخالفة قوله تعالىٰ واذكر ربك في نفسك فيقتصر على مورد الشرع وهو الأضحى لقوله تعالىٰ واذكروا الله في أيام معدودات" (شامی ۱/۷۷۷، مطبوعہ عثمانیہ) (مرتب)۔

مروجہ قرون متاخرہ کا تعامل تو ہوسکتا ہے، مگر قرون ثلثہ کا تعامل ہرگز نہیں ہوسکتا، لہذا اس دور کے علماء اگر دعا میں ہاتھ اٹھاتے ہیں تو یہ انکا اپنا ذاتی فعل ہے جو کہ سند نہیں ہے۔ تعامل سلف حجت تعامل خلف حجت نہیں ہے۔

نورالایضاح اور مراقی الفلاح میں جو اس کو مسنون کہا ہے اس کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل نہ کسی مجتہد سے منقول محض ایک رائے ہے جو قابل عمل سند نہیں ہے امام تیمیہ اس بارے میں فرماتے ہیں: **"دعاء الامام و المامومين جميعا عقيب الصلوة فهو بدعة لم يكن على عهد النبي ﷺ"** (۱)، نیز مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود (ص ۱۳۸) میں کہتے ہیں:

"وأما ما يفعله بعض الإمام من رفع اليدين في الدعاء عند دعاء جماعة من أئمة الشافعية والحنفية بعد الصلاة فلا وجه له"، نیز مولانا انور شاہ کشمیری (فیض الباری ۱۶۷/۲) میں لکھتے ہیں: **"واعلم أن الأدعية بهذه الهيئة الكذائية لم يثبت عن النبي ﷺ ولم يثبت عنه رفع الأيدي دبر الصلاة في الدعوات"** (۲)، نیز مولانا محمد یوسف بنوری نے جامع ترمذی کی شرح (جامع السنن ۴۰۹/۳) میں فرماتے ہیں:

شہروں میں یہ بات رائج ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی طور سے دعاء مانگتے ہیں حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کبھی کبھار کے لئے بھی ایسی دعا کا ثبوت نہیں ہے چہ جائیکہ ہمیشہ ایسا کرلیا، ہاں البتہ فرائض کے بعد تواتر کے ساتھ بہت سی دعائیں ثابت ہیں مگر وہاں نہ ہاتھ اٹھانا ہے نہ ہیئت اجتماعیہ لاہور کے مشہور عالم علامہ ابوالقاسم رفیق دلوری اپنی کتاب عماد الدین ص ۲۹۷ پر لکھتے ہیں الغرض فرض نماز کے سلام کے بعد امام اور اس کے مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا بدعت سیئہ ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی اپنے مجموعہ فتاوی (۱۶/۱) (۳) پر لکھتے ہیں یہ طریقہ جو فی زمانناً مروج ہے کہ بعد سلام رفع یدین کے ساتھ دعا مانگنا اور مقتدی آمین کہتے ہیں یہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں نہ تھا یہ سب دلیل اور علماء

۱- فتاوی ابن تیمیہ ۱/ ۱۸۴۔

۲- "إلا أقل قليل ومع ذلك ورد فيه ترغيبات قولية والأمر في مثله أن لا يحكم عليه بالبدعة فهذه الأدعية في زماننا ليست بسنة بمعنى ثبوتها عن النبي ﷺ وليست ببدعة بمعنى عدم أصلها في الدين" (فیض الباری علی صحیح البخاری ۱۶۷/۲) یہ فیض الباری کی پوری عبارت ہے، جس کے ذکر سے مولانا فیض اللہ صاحب کا یہ ایہام کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی اس کی بدعت کے قائل ہیں دور ہو جاتا ہے، چنانچہ فیض الباری میں آگے مذکور ہے: فإن التزم أحد منا الدعاء بعد الصلاة برفع اليد فقد عمل بما رغب فيه (ﷺ) وان لم يكثره بنفسه فاعلم ذلك. اھ (فیض الباری علی صحیح البخاری ۱۶۷/۲)۔

۳- (۲۳۸/۱) بہ سلسلہ تحقیق محمل حدیث ثوبانؓ: ولا یوم قوما فیخص نفسه بدعوة دونهم... الحدیث (سنن ترمذی حدیث: ۳۵۷)۔

امت کے اقوال کو نقل کر کے مولانا فیض اللہ نے ملک میں انتشار کی صورت پیدا کر دی ہے امت مسلمہ گروہ درگروہ ہو گئے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے، لہذا سوال یہ کہ اکابر امت عامۃ المسلمین نیز علماء حرمین شریفین اجتماعی حیثیت سے بعد فرائض نماز ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں اور عام طریقہ سے مساجد کے ائمہ بھی کر رہے ہیں گویا اجماع امت کی سی کیفیت اور حالت پائی جاتی ہے تو نا درست مکروہ او ربدعت سیئہ ہے؟ جیسا کہ مولانا فیض اللہ کا قول ہے یا درست ہے جیسا کہ علماء امت کا عمل ہے، مولانا تھانوی نے اس خاص مسئلہ پر ایک رسالہ استحباب الدعوات کی تالیف فرمائی ہے امید کہ بغور سوال ملاحظہ فرما کر تفصیل سے آگاہ فرمائیں گے، تا کہ رفع شر ہو سکے، نیز ہم لوگ "**اتبعوا السواد الأعظم**" اور "**لا تجتمع أمتي على الضلالة**" (۱) اور تعامل حرمین شریفین، نیز اجماع امت ہونے کی وجہ سے ہم سب عمل کرتے رہیں یا مولانا موصوف کے مطابق دعاء میں ہاتھ اٹھانے کو ترک کر دیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بعد نماز مناجات میں ہاتھ اٹھانے کو بدعت کہنا یا یہ کہنا کہ کسی حدیث سے ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں غلط ہے، صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ابن ماجہ کے استاذ ابن السنی نے جو بہت بڑے محدث ہیں انھوں نے اپنی کتاب "عمل الیوم واللیلہ" (ص ۷۳ تا ۱۴) مختلف حدیثیں روایت کی ہیں، مثلاً ایک حدیث یہ ہے جو حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ جس نے ہر نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھ خدا کے سامنے پھیلا کر یہ کہا: "**اللھم إلھي وإله ابراھیم واسحق ویعقوب وإله جبرائیل ومیکائیل واسرافیل علیھم السلام أسئلک أن تستجیب دعوتي، فاني مضطر وتعصمني في دیني، فإني مبتلى وتنالني برحمتک، فاني مذنب وتنفي عن الفقر، فاني متمسکن**" (جو شخص ہاتھ اٹھا کر ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھ لے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی اپنے او پر ضروری فرما لیتے ہیں کہ اس کے دونوں ہاتھوں کو خائب وخاسر ونامراد واپس نہ کریں (۲)، پس جب روایت سے یہ بات ثابت ہو گئی تو اب یہ

۱– رواہ الترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ مع شرح الطیبی ۱/ ۳۳۸، کتاب الإیمان حدیث نمبر ۱۷۳ ام ۱۷۴ (مرتب)۔

۲– عمل الیوم واللیلہ لابن السنی مکتبۃ دار البیان / ۲ ۷ حدیث ۱۳۸، ابتدائے حدیث اس طرح ہے: "عن أنس بن مالک عن النبي ﷺ أنه قال: ما من عبد بسط کفیه في دبر کل صلاۃ ثم یقول: اللھم ..... فإني متمسکن إلا کان حقا على اللہ عزوجل أن لا یرد یدیه خائبین"۔

کہنا کہ ثابت نہیں ہے یا یہ کہنا کہ بدعت ہے یا اس کے مقابلہ پر "بذل المجہود یا فیض الباری" وغیرہ سے کوئی عبارت نقل کرنا غیر مفید و بے محل ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بعد نماز دعا آہستہ یا بلند آواز سے مانگی جائے؟

جماعت کی فرض نماز کے بعد دعا مانگی جاتی ہے وہ دعا بآواز مانگنا چاہئے یا آہستہ مانگنا چاہئے کیونکہ قرآن کی آیت ہے۔

"ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة الخ" (۱) (لوگو! اپنے پروردگار سے عاجزی اور چپکے چپکے دعا مانگا کرو) اس آیت کریمہ کی تحت دعا مانگی جائے یا آواز سے مانگی جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

دوسری آیت کریمہ میں خفیہ دون الجہر بھی وارد ہے اور بعض آیت کا بیان ہوتی ہے اس لئے آیت کریمہ محولہ میں دعا محض سراً ہی کے اندر محصور نہ ہوگی بلکہ دعاء کی اصل بین الجہر والمخافتہ وارد ہوگی اور اختیار دونوں کا ہوگا جیسا کہ "درمختار علی ھامش الشامی" میں تصریح ہے: "**الدعا یکون بین الجھر والمخافة کذا اعتمدہ الباجی فی کنز العفاۃ**"، باقی یہ بات الگ ہے کہ نفس دعا میں افضل کیا ہے اس میں تفصیل ہے اور اس کے بیان کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش ہے ہاں فرض یا جماعت کے بعد دعاء کا افضل طریقہ لکھ دیا جاتا ہے کہ امام کو افضل تو یہی ہے کہ آہستہ دعا مانگے اور مقتدی بھی آہستہ آہستہ آمین کہیں، "**ادعوا ربکم تضرعا وخفیة**" (۲)، لیکن اگر سامعین کو متوجہ رکھنے یا دعاء کے کسی بعض جزء کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کچھ جہر کے ساتھ بھی کل دعا یا بعض دعا جہر سے مانگ لی جائے تو خلاف سنت اور قابل اعتراض بات نہ ہوگی۔ "**إذا دعا بالدعاء المأثور جھراً ومعه القوم أیضا لیتعلموا الدعاء لابأس به**" (۳)۔

۱- سورۂ اعراف:۵۶۔

۲- سورۂ اعراف:۵۵۔

۳- الفتاوی الہندیہ ۳۱۸/۵۔

(تنبیہ) اگر پوری تحقیق دیکھنی مطلوب ہو تو "رسالہ استحباب الدعوات عقیب الصلوٰت" اردو مطالعہ کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ

۱-قبول دعاء کا افضل طریقہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ سے جو دعاء مانگی جائے تو حضور رسیدنا ومولانا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے طفیل سے مانگی جائے، کیونکہ ہم حنفی الاعتقاد لوگوں کا یہ یقین کامل ہے کہ بطفیل حضور ﷺ دعاء کی مقبولیت یا ایصال ثواب سے جو بلا طفیل حضور ﷺ دعاء مانگی جائے یا ایصال ثواب پہنچایا جائے فرق ہے جو طریقہ افضل و بہتر ہے اس کی ہدایت کی جائے۔

۲-سجدہ توبہ کا کیا طریقہ ہے؟

سربسجود ہو کر درگاہ خداوندی بے نیاز میں گناہوں سے توبہ کرنا اور معافی مانگنا اور دعاء مانگنا از روئے قرآن وحدیث کوئی نقص تو نہیں ہے، ان دونوں باتوں سے مطمئن فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جی ہاں صحیح ہے سرور عالم ﷺ کے وسیلہ اور طفیل سے دعاء زیادہ قبول ہوتی ہے اور دعاء کا یہی طریقہ افضل اور بہتر ہے (۱)۔

۲-جائز تو یہ بھی ہے، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو رکعت نفل بہ نیت صلوۃ توبہ نہایت حضور دل سے پڑھے، پھر بعد سلام بیٹھے بیٹھے عجز و نیاز کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی مانگے فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

۱- "ويحسن التوسل بالنبي الى ربه" (ردالمحتار ۹/۵۷۹، مکتبہ زکریا دیوبند) (مرتب)۔

۱-نماز با جماعت کے بعد اجتماعی فاتحہ پڑھنے کا حکم:

ساؤتھ افریقہ میں عام طریقہ رائج ہے کہ نماز با جماعت کی تکمیل کے بعد امام جماعت سے فاتحہ پڑھایا کرتا ہے، اس سوال پر فقہاء، چاروں اماموں اور علماء کا کیا فیصلہ ہے؟ کیا یہ ہونا چاہئے کہ فقہاء اس طرح با جماعت فاتحہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور اگر جماعت کی اکثریت اس طرح کے پڑھنے کی خواہش رکھتی ہے تو کیا فقہی قانون پڑھنے کو روا رکھے گا، اکثریت کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح فاتحہ پڑھنے کو روا رکھے گا؟

۲-اسلام میں جو چیزیں ممنوع نہیں وہ جائز ہیں، کیا یہ اصول صحیح ہے؟

مسلمانوں کا ایک طبقہ اس اصول میں یقین رکھتا ہے کہ جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے، دوسرے طبقہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن پاک اور سنت کے احکام سے ثابت نہیں ہے وہ بدعت ہے، یہ طبقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ہم لوگوں کو عبادت کے صرف ان طریقوں اور ذریعوں پر بھروسہ کرنا چاہئے، جو کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے سکھائے ہیں، ہم کو ان کے اندر قطع وبرید کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہم ان میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں رکھتے، جس سے ہم اللہ کی معرفت حاصل کریں، اور اللہ سے تعلق حاصل کریں، اس معاملہ میں جو بھی تبدیلی کی جائے گی وہ بدعت ہے اور ہر ایک بدعت ضلالت ہوگی۔ اس طبقہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ جو بھی بات ممنوع نہیں ہے اس کو لے لیا جائے اور اللہ تعالی سے تعلق قائم کرنے کے نئے طریقہ اختیار یا ایجاد کئے جائیں۔

۳-عبادت میں جہاں آپ ﷺ نے سکوت فرمایا اس کو دین سمجھنا کیسا ہے؟

کیا قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کچھ اہم معاملات میں سکوت فرمایا ہے، خصوصاً عبادات کے میدان میں؟

آخری عرض آنکہ اگر ہمیں اجازت حاصل ہو کہ وہاں ہم اپنے طور پر بڑھاتے جائیں جہاں ہمارے نبی ﷺ نے سکوت فرمایا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم بڑھاتے ہی چلے جائیں یہاں تک ہم اس طرح پر اسلام کی روح کو برباد کر بیٹھیں، کیونکہ ہم بہر حال انسان ہی ہیں اور غلطی کر سکتے ہیں، اور یہ تمیز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے کہ ہمارے لئے اچھا کیا ہے؟ اور گناہ آلود کیا ہے؟ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کو وحی آتی تھی اور ہمیں نہیں آتی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر جماعت فاتحہ سے فاتحہ مروجہ مراد ہے تو بدعت ہے اور اگر نفس اجتماعی دعاء ثانی مراد ہے تو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن اس کو لازم وضروری قرار دینا، اس کا رواج دینا، اہتمام کرنا کہ جو شریک نہ ہو اس پر نکیر کرنا، طعن وتشنیع کرنا ناجائز ہے، اگر ایسا ہے تو یہ طریقہ والتزام واجب الترک ہوگا، اور بدعت شمار ہوگا۔

۲-دین میں اور بالخصوص عبادات میں یہ اصول کہ (جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں وہ جائز ہے) صحیح نہیں، یہ ایک مغالطہ ہے، صریح اور صحیح حدیث: "من أحدث في أمرنا ماليس منه فهو رد، وفي رواية، فهو مردود" (۱) کے تحت بدعت ہے اور خود یہ اصول بھی مستحدث ہے اور دوسرے طبقہ کا عقیدہ صحیح اور مطابق فرمان رسول ﷺ ہے۔

۳-ہاں قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ دین میں اور عبادات کے میدان میں محض اپنی سمجھ سے کوئی ایسی چیز بڑھادی جائے جس کے بارے میں ہمارے نبی ﷺ نے سکوت فرمایا ہو، یہ طریقہ دین میں زیادتی اور ناپسندیدۂ باری تعالیٰ ہوگا اور بارگاہ شریعت اور بارگاہ عزاسمہ میں خطرناک قسم کی گستاخی ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

حنفی مقتدی کا فجر کی دوسری رکعت میں دعا پڑھنا:

امام فجر کی فرض نماز کی دوسری رکعت میں بھی رکوع کے بعد کھڑے ہوکر دعا مانگتے ہیں حنفی مسلک کے مقتدی کو دعا مانگنا کیسا ہے؟

شفیع احمد الاعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

فجر کی نماز میں جب امام رکوع کے بعد (قومہ میں) کھڑے ہوکر دعا مانگیں تو حنفی مقتدی بھی ان کی اقتداء میں خموش

۱-　مشکوۃ المصابیح/ ۲۷۔

کھڑے رہیں اور اگر جی پڑھنے کا بہت چاہتا ہے تو آہستہ آہستہ دل میں آمین کہتے رہیں باقی زبان سے کچھ نہ کہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز کے بعد کی دعا کیا جزء نماز ہے؟

نماز کے بعد کی متصل دعا کیا نماز ہی کا ایک جز ہے اور امام کے ساتھ دعا مانگے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی ہے۔

بعض امام عصر اور صبح میں سلام پھیرنے کے بعد مصلی پر کافی دیر تک بیٹھے وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں کبھی کبھی آدھ گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے کے بعد دعا شروع کرتے ہیں ایسی حالت میں کچھ مقتدی تنگ آکر تنہا دعا مانگ کر چلے جاتے ہیں جسے امام موصوف قطعی ناجائز اور نماز کی خرابی کا باعث بتاتے ہیں آپ کے نزدیک کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق

نماز فجر اور عصر کے بعد انصراف الی المصلین یا داہنے یا بائیں کر کے امام بیٹھ جائے اور سبحان اللہ اور الحمد للہ کی تسبیحات تینتیس ۳۳ تینتیس ۳۳ مرتبہ پڑھ کر ذرا طویل دعا مانگے ایسا کرنا سنت ہے، لیکن یہ سب امور نماز کا جز نہیں کہ ان کے چھوڑ دینے سے نماز ہی نہ ہو یا نفس نماز میں کوئی خلل واقع ہو جائے امام موصوف کا اس نماز کو قطعی ناجائز وغیرہ کہنا صحیح نہیں ہے (۲) اور امام کا اس مقدار مسنون مذکور سے اتنی تطویل کرنا کہ مقتدی اکتا جائیں مکروہ ہے، اس طریقہ کو ترک کرنا چاہئے (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”ويأتي المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعي يقنت بعد الركوع، لأنه مجتهد فيه لا الفجر؛ لأنه منسوخ بل يقف ساكتاً على الأظهر مرسلاً يديه“ (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۴۴۶) (مرتب)۔

۲- ”عن أبي سعيد قال قال رسول اللهﷺ: مفتاح الصلاة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم ولا صلاة لمن لم يقرأ بالحمد وسورة في فريضة أو غيرها“ (سنن الترمذی ۲/۳، کتاب الصلاۃ باب ما جاء فی تحریم الصلاۃ وتحلیلہا حدیث: ۲۳۸) (مرتب)۔

۳- ”تنبيه لو زاد على العدد: قيل يكره، لأنه سوء أدب“ (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۲۴۷) (مرتب)۔

کن نمازوں میں گھوم کر دعا مانگنی ہے اور کن نمازوں میں نہیں:

۱۔فجر اور عصر کی نماز کے بعد جو گھوم کر دعا مانگی جاتی ہے اس کی وضاحت فرماویں۔

۲۔ظہر ومغرب اور عشاء وجمعہ کے بعد کیوں گھوم کر دعاء مانگی نہیں جاتی ہے اس کی بھی وضاحت کریں۔

۳۔ظہر ومغرب اور عشاء اور جمعہ کی نماز کے بعد گھوم کر دعاء مانگنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

۴۔زید نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور گھوم کر دعاء مانگی بکر نے اعتراض کیا کہ سوائے دو وقت کے اور وقت میں گھوم کر دعاء نہیں مانگی جاتی ہے زید نے جواب دیا کہ ہر نماز کے بعد دعاء مانگی جاسکتی ہے ہمارے پاس ثبوت ہے کسی کتاب کا نام بتلایا مگر ہم کو کتاب کا نام یاد نہیں ہے اس کے بعد عمرو نے ایک فتوی کی شکل میں پیش کیا جس میں یہ اوپر سوال لکھا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں بھی یہ ہے کہ جس نماز کے بعد سنت مؤکدہ ہوں نہ پھرے اور جواب شروع ہی میں یہ لکھا ہے کہ امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو قطعاً سنت نہیں ہے اور اس کا ترک یعنی بعد سلام بقبلہ رو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالا جماع مکروہ ہے جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعاء ومناجات بھی بالا جماع جائز ہے نیچے یہ بھی تحریر ہے کہ فقہ کی کتاب میں یہ نہیں کہ جس نماز کے بعد سنت ہے اس کے بعد امام کو قبلہ سے پھرنا ہی منع ہے، ہاں فصل طویل کو ناپسند فرماتے ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱)فجر اور عصر کی جماعت کے سلام کے بعد امام کا دائیں یا بائیں طرف سے مصلیوں کی طرف گھوم جانا اور پھر کچھ دیر تسبیحات وغیرہ پڑھکر دعاء مانگنا سنت ہے (۲و۳و۴) فجر وعصر کے علاوہ اور نمازوں میں حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں بلکہ سلام کے بعد فوراً قبلہ رخ ہی بیٹھے بیٹھے ہلکی دعاء مانگ کر سنتوں میں مشغول ہوجانا حضور علیہ السلام کا اکثر معمول شریف تھا(۱)۔

اور یہی ان نمازوں میں سنت ہے اس کے خلاف سنت نبوی کا خلاف ہوگا، ہاں چونکہ سنت مؤکدہ نہیں ہے، اس لئے اگر کبھی اتفاق سے کوئی گھوم جائے تو ناجائز کا مرتکب نہیں کہا جائے گا، مگر اس کی عادت نہیں ڈالنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱-	دیکھئے: ردالمحتار ۲/ ۲۴۷، باب صفۃ الصلاۃ مکتبہ زکریا۔

چشمہ لگا کر نماز ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

چشمہ لگا کر نماز ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ بہت سے لوگوں اور علماء کرام تک کو چشمہ لگائے ہوئے نماز ادا کرتے دیکھا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

درست ہے، بشرطیکہ سجدہ وغیرہ کرتے وقت ڈھیلا ہونے سے نہ الجھے، ورنہ اتار دینا چاہئے (ا)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، مفتی دارالعلوم دیوبند

نمازی کے آگے سے ہٹنے کا حکم؟

اگر میں کسی نمازی کے بالکل آگے بیٹھا ہوا ہوں اور وہ نمازی نماز میں مشغول ہے، تو اگر میں اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ جانا چاہوں تو کیا ہٹ سکتا ہوں؟ کیا بیٹھے رہنا اور نمازی کے نماز ختم کرنے کا انتظار کرنا اولیٰ ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں بیٹھے رہنا اور ختم نماز کا انتظار کرنا اولیٰ ہے، اور ہٹ جانا بھی درست ہے، البتہ اگر نمازی دائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہے تو اس کے بائیں جانب سے ہٹے اور اگر بائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہے تو اس کے دائیں جانب سے ہٹے اور اگر بالکل ہی محاذات میں ہو تو ہر طرف سے ہٹ سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ا- فی نفسہ عینک لگانا جائز ہے، لیکن فعل عبث ہونے کی بنا پر نماز میں مکروہ ہے، البتہ جو لوگ بینائی کے کمزور ہونے یا کسی عارض کی بنا پر عینک (نمبری) لگانے کے عادی ہیں، ایسے لوگوں کے حق میں نہ یہ فعل عبث ہوگا اور نہ مکروہ ہوگا، اس لیے کہ ایسے عادی لوگوں کو بغیر عینک سکون واطمینان حاصل نہیں ہوتا، اور فقہ کا یہ ضابطہ بھی مسلم ہے: "الضرورات تبیح المحضورات" (الاشباہ والنظائر/ ۱۰۸) (مرتب)۔

۱-نمازی کے آگے سے گذرنے کی حد:

نمازی کے آگے کتنا فاصلہ رکھ کر گذرا جاسکتا ہے؟

۲- پلنگ پر نماز ادا کرنا:

۲-پلنگ پر فریضۂ نماز کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی ایسا فولڈنگ پلنگ ہو جس پر پلاسٹک یا سوت کی نواڑ ہے تو کیا اس پر فریضہ کی ادائیگی ہوسکتی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-میدان میں اور بڑی مسجد میں جو تقریباً ۶۰ ہاتھ چوڑی اور ۶۰ ہاتھ لمبی ہو تو تین صف کے بعد سے مصلی کے آگے سے گذر سکتے ہیں، ورنہ آگے سے نہ گذرنا چاہئے، "ومرورمارفي الصحراء أوفي مسجد كبير بموضع سجوده في الأصح"(۱)، "وحجه في النهاية والفتح أنه قدر مايقع بصره على المار لوصلي بخشوع أي راميا ببصره إلى موضع سجوده......(قوله في مسجد صغير)هو أقل من مستين ذراعا وقيل أربعين وهو المختار"(۲)۔

۲-پلنگ اتنا ڈھیلا نہ ہو کہ رکوع سجدہ وغیرہ انتقالات صلوتیہ میں پریشانی ہو تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ چارپائی پاک ہو یا اس پر پاک کپڑا ہو۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دوسرے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں نماز:

ایک مسجد باہمی جھگڑے اور خاص طور پر امام کے ساتھ ذاتی اختلافات کی بنا پر بنائی گئی جب کہ پہلے سے یہاں مسجد موجود تھی اور سارے گاؤں کے لوگ اس میں نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ جہاں دوسری مسجد بنائی گئی ہے وہ آدھی زمین

۱- الدرالمختار۔

۲- ردالمحتار ۱/۴۲۶۔

ایک دوسرے شخص کی ہے جو مسجد بنانے کے صرف اس لئے حق میں نہیں تھا کہ یہ تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے گی مگر بنانے والوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور یہ کہا کہ ہمیں مسئلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم مسجد بنا کر چھوڑیں گے چنانچہ مسجد بن گئی اور جسکی زمین دبائی گئی تھی وہ اب بھی ناراض ہی ہے، ایسی صورت میں اس نوتعمیر مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ اس کے بننے سے گروہ بندی ہوئی ہے اگر کبھی پورا گاؤں آپس میں میل جول کر لے باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں تب اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں یا پھر بھی زمین والے کی رضامندی ضروری ہوگی، براہ کرم اس مسئلے کا شافی جواب مرحمت فرمائیں، عنداللہ ماجور ہوں گے۔

عبدالسلام (نندیرا، راجستھان)

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد جھگڑے اور ذاتی اختلاف کی بنا پر بنانا ناجائز فعل ہوگا اور سخت گناہ کا کام ہوگا، اسی طرح دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت ومرضی سے بنالینا بھی ناجائز اور حرام فعل کا ارتکاب ہوگا۔

البتہ جب مسجد بن گئی اور اپنے اور غیروں نے سب نے اس کو مسجد سمجھ لیا اور مسجد کہہ دیا تو اس میں شعائر اللہ ہونے کی شان پیدا ہو گئی اس کو اب گرانا اور مسمار ومنہدم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اب ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کر کے، دونوں مسجدوں کو آباد کرنے کی کوشش کی جائے (۱)، اور جس کی زمین پر بغیر اس کی اجازت ومرضی کے مسجد بنالیا ہے اس سے اجازت حاصل کیا جائے اور اجازت چاہے مفت دے یا قیمت لے کر دے جس طرح دے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس شخص پر بھی ضروری ہے کہ اجازت دیدے، خواہ معاوضہ لے کر ہو یا بلا معاوضہ لئے ہو (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۴ھ

۱- "وفي شرح المنية للحلبي: بنى مسجدا في أرض غصب لا بأس بالصلاة فيه" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۴۴)۔

۲- "ولو ضاق المسجد على الناس وبجنبه أرض لرجل توخذ أرضه بالقيمة كرها، كذا في فتاوى قاضي خان" (فتاوی عالمگیریہ ۲/۴۵۶)۔

۱- نماز فجر پڑھنے کے بعد وقت کے ختم ہوجانے کا علم ہو تو کیا کیا جائے؟

صبح کی جماعت کے بعد علم ہوا کہ نماز کا وقت نہیں تھا، اب آیا نماز کا اعادہ کیا جاوے یا اسی نماز پر اکتفاء کرلیا جائے۔

۲- نماز فجر پڑھنے کے دوران سورج کا طلوع ہوجانا:

ابر یا وقت کی لاعلمی سے صبح کی نماز پڑھنے کے دوران سورج طلوع ہوگیا ہے، ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

۳- نماز عصر کے بعد قضا یا نفل نماز پڑھنا:

عصر کی نماز کے بعد مغرب سے پہلے قضاء نماز یا نفل نماز ادا کرسکتے ہیں یا کہ نہیں۔ بہشتی زیور میں عصر کے بعد قضاء نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

۴- فوت شدہ نماز کی ادائیگی سے قبل وقتیہ نماز پڑھنا:

زید پانچوں وقت نماز پڑھتا ہے ایک روز کسی وجہ سے اس کی دو وقت کی نماز قضا ہوگئی، مثلاً ظہر کی یا عصر کی اب وہ ان دو قضاء نماز کو ادا کرنے سے پہلے مغرب پڑھ سکتا ہے، جب کہ اس کے سامنے مغرب کی جماعت کھڑی ہورہی ہے یا اس کو پہلے قضاء نماز ادا کرنی ہوگی۔

۵- جماعت ہوجانے کے بعد آنے والے افراد کس طرح نماز پڑھیں:

مسجد میں عشاء کی نماز ہوچکی ہے جماعت کے بعد سات آدمی ایک گھنٹہ بعد جمع ہوتے ہیں اب یہ چند افراد الگ الگ نماز پڑھیں، یا جماعت بنا کر بہتر کیا ہوگا۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) اس صورت میں اعادہ نماز کا واجب ہے، کیونکہ وہ نماز نہیں ہوئی ہے (۱)۔

۱- "عن عقبة بن عامر الجهني قال: ثلاث ساعات كان رسول اللهﷺ ينهانا أن نصلي فيهن أو نقبر فيهن موتانا، حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب" (سنن الترمذی ۳/۳۴۰ کتاب الجنائز، باب ماجاء فی کراہیۃ الصلوۃ علی الجنازۃ عند طلوع الشمس حدیث: ۱۰۳۰)، "فإن كانت الصلاة فرضاً أو واجبة فهي غير صحيحة" (البحر الرائق ۱/۴۳۳)۔

(۲) اعادہ ضروری ہے (۱)۔

(۳) بہشتی زیور میں صحیح لکھا ہے قضاء نماز پڑھ سکتے ہیں نفل نہیں پڑھ سکتے ہیں (۲)۔

(۴) اگر وہ صاحب ترتیب ہے تو پہلے اس کو قضاء نمازیں پڑھنی ضروری ہے (۳)، اگر صاحب ترتیب نہیں ہے تو مغرب کی نماز میں شریک ہوجائے، پھر قضاء نمازیں پڑھے (۴)۔

(۵) مسجد میں جماعت ثانیہ کی اجازت نہیں (بشرطیکہ وہ مسجد شارع نہ ہو) ایسی صورت میں مسجد سے متصل سہ دری یا کوئی جگہ ہو تو وہاں جماعت کرلیں، ورنہ تنہا تنہا پڑھیں (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

فجر کی جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد سنت پڑھنا:

صبح کی نماز فرض کی جماعت شروع ہوگئی اس کے بعد پہنچے ہوئے نمازی وضو سے فارغ ہوکر دو رکعت سنتیں ضرور پڑھتے ہیں چاہے ان کو پچھلی رکعت ملے نہ ملے قعدہ آخرہ بھی ملنا کافی سمجھتے ہیں اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ایک عالم کہتا ہے کہ جماعت کی نماز کی تکبیر شروع ہونے کے بعد سنتوں کو پڑھنا ناجائز ہے وقت نہیں رہتا ہے جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے۔

۱- ''لأن وقت الفجر كله كامل فوجبت كاملة فيبطل بطرو الطلوع الذي هو وقت فساد'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۳۳)۔

۲- ''واعلم أن الأوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب، والثاني: ما بين الفجر والشمس، وما بين صلاة العصر إلى الاصفرار .... والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التي ذكرناها من غير كراهة'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۳۴)۔

۳- ''الترتيب بين الفائتة والوقتية وبين الفوائت مستحق، كذا في الكافي، حتى لا يجوز أداء الوقتية قبل قضاء الفائتة كذا في محيط السرخسي'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۲۱)۔

۴- ''ويسقط الترتيب عند كثرة الفوائت، وهو الصحيح هكذا في محيط السرخسي، وحد الكثرة أن تصير الفوائت ستاً بخروج وقت الصلاة السادسة'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۲۳، نیز ردالمحتار ۲/ ۵۲۶)۔

۵- ''ويكره تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد محلة، لا في مسجد طريق أو مسجد لا إمام له ولا مؤذن'' (الدر المختار مع ردالمحتار ۲/ ۲۸۸)، ''عن أبي يوسف أنه إذا لم تكن الجماعة على الهيئة الأولى لا تكره وإلا تكره، وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة، كذا في البزازية'' (ردالمحتار ۲/ ۲۸۹) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مفتی بہ قول یہی ہے کہ جب تک نماز فجر کے تشہد ملنے کا ظن غالب ہو سنتیں پڑھ کر شریک جماعت ہو البتہ جس جگہ جماعت ہو رہی ہے وہاں نہ پڑھے بلکہ کہیں کنارے پیچھے الگ ہٹ کر پڑھ لے مثلاً کوئی سہ دری ہو یا حوض کے پیچھے یا باب مسجد کے کسی گوشہ میں یا باہر مسجد سے کوئی جگہ ہو وہاں پڑھ کر شریک جماعت ہو(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- دستیاب شدہ کپڑے میں نماز:

دستیاب شدہ کپڑے میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۲- چوری والے کپڑے میں نماز:

چوری کیے ہوئے لباس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

۳- عشاء کی فرض نماز تنہا پڑھنے والے کے لئے وتر باجماعت پڑھنا:

جس شخص نے عشاء فرض جماعت کے ساتھ ادا نہیں کی اب وہ وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- دستیاب شدہ کپڑے سے کیا مراد ہے، اگر مراد جائز طریقہ سے ہوتا ہے تو جائز ہے، ورنہ جیسا ویسا حکم مال (۲)۔

۲- نا جائز ہے اور اگر پڑھ لی جائے گی تو بکراہت ادا ہوگی (۳)۔

۱- "وإذا خاف فوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل، وإلا بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب وقيل: التشهد... لا يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا وإلا تركها" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۵۱۰)۔

۲- "المتيمم في السفر اذا وجد من الماء قدر مايكفي يغسل اعضاء الفريضة مرة مرة ولوغسل على وجه السنة لايكفيه انتقض تيممه هو المختار كذا في الخلاصة" (ہندیہ ۱/ ۳۰، باب التیمم، مکتبہ دار الکتاب) (مرتب)۔

۳- لوتركها الكل هل يصلون الوتر بجماعة فليراجع کے ذیل میں طحطاوی میں یوں ہے: قضيته التعليل في المسئلة السابقة

۳-اپنے فرض پڑھ لینے کے بعد مقتدی بھی شریک ہوسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۴ھ

نماز سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

عام طور پر یہ دیکھا جارہا ہے کہ لوگ نمازوں سے فارغ ہوکر خصوصاً صلوٰۃ عیدین سے مسجد میں امام صاحب سے اور خود مقتدیان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں یہ کس حد تک درست ہے؟

محمد مظہر پاشا (حیدرآباد دکن)

الجواب وبالله التوفيق:

مطلقاً نماز کے بعد بالالتزام مصافحہ یا معانقہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے (۱)، اس لئے حتی الامکان اس عمل سے بچنا ضروری ہے، لیکن ابتدائی ملاقات کسی نماز کے بعد فوراً ہورہی ہو تو اس صورت میں گنجائش ہے کہ مصافحہ یا معانقہ کیا جاسکتا ہے۔ ''کما قال علیه السلام: ما من مسلمین یلتقیان فتصافحا إلا غفر لهما قبل أن یتفرقا'' (۲)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز میں سورہ فاتحہ دوبار پڑھنے سے سجدہ سہو:

بھول کر نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کوئی شخص دوبار پڑھ دے یا تشابہ لگنے کی وجہ سے سورۃ فاتحہ کی دو تین

بقولهم لانها تبع ان یصلی الوتر بجماعة فی هذه الصورة لانه لیس تبع للتراویح ولا العشاء عند الامام انتهی حلبی (الطحطاوی علی الدر ۱/ ۲۹۷، المکتبة العربیة کانسی روڈ کوئٹہ) (مرتب)۔

۱- ''ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط: أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض'' (شامی ۱/ ۳۳۶، مرتب)۔

۲- (ابوداؤد نے ان الفاظ میں اس حدیث کو روایت کی ہے: ''مامن مسلمین یلتقیان فیتصافحان إلا غفرلهما قبل أن یفترقا'' (بحوالہ جمع الفوائد ۳/ ۲۹۶، کتاب الأدب) (مرتب)۔

آیتوں کو چند بار پڑھ دے تو کیا اس سے نماز میں کوئی خرابی لازم آئے گی اور کیا سجدہ سہو کرنا ہوگا۔

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں سجدۂ سہو کرنا لازم ہوجائے گا(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حالت سفر میں قصر:

زید ایک دیندار شخص ہے جو عالم نہیں مگر کثرت مطالعہ کے باعث وسیع تر دینی معلومات رکھتا ہے وہ اس بات کا قائل ہے کہ مسافر بحالت سفر نماز میں قصر کا پابند نہیں ہے بلکہ یہ اسکی مرضی واختیار پر موقوف ہے اور دلیل میں آیت کریمہ۔

"**فلیس علیکم جناح أن تقصروا من الصلوۃ إن خفتم أن یفتنکم الذین کفروا** "(۲) کو پیش کرتا ہے۔اولا "**لا جناح علیکم** " کا صیغہ وجوب کے لئے نہیں ہے دوسرے ان خفتم کی قید بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ قصر صلوۃ موقوف بالشرط ہے، کیا زید کا یہ عقیدہ وعمل درست ہے، اہل سنۃ والجماعت میں ایسا بھی کوئی مذہب ہے؟

محمد فروز عالم

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت کریمہ "**لا جناح علیکم** "نہیں ہے بلکہ "**لیس علیکم جناح الخ**" ہے، سورۂ نساء کی آیت ہے ملاحظہ فرمالیجئے۔دوسری بات یہ ہے کہ آیت کریمہ مطلق نہیں ہے جب کہ زید نے مطلق سمجھ کر مفہوم بیان کیا، بلکہ یہ آیت مقید ہے بغیر سفر کے بھی بوقت خوف قصر کرنا درست ہونا چاہیے، بلکہ بغیر سفر شرعی بھی ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں جانے سے قصر ہونا چاہیے اسی طرح دو رکعت والی نماز بھی قصر کرکے صرف ایک رکعت پڑھنے کا جواز نکلنا چاہیے، حالانکہ ان

۱- "فلو قرأها في ركعة من الأوليين مرتين وجب سجود السهو لتأخير الواجب وهو السورة ،كما في الذخيرة وغيرها، وكذا لو قرأ أكثرها ثم أعادها كما في الظهيرية"(ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۵۲،فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۷۱)(مرتب)۔

۲- سورۂ نساء:۱۰۱۔

باتوں کا کوئی قائل نہیں۔پس جب آیت کریمہ مقید ہے تو قید کو من قبل الشارع معلوم کرنا ضروری ہے،اس طرح یہ آیت کریمہ تفسیر قصر میں مجمل بھی ہے،ورنہ جس طرح جو چاہتا قصر کر لیتا حالانکہ اس کا بھی کوئی قائل نہیں،نہ صحابہ میں،نہ ائمہ میں الغرض اس قید کی تشریح اور اس اجمال کی تفسیر دونوں مشکوۃ نبوت سے معلوم کرنا ہوگا اور روایات میں بخاری ومسلم اور دیگر کتب صحاح وغیر صحاح سب میں تفصیل وتفسیر وتقیید کی صورتیں مذکور ہیں اس کا پابند ہونا پڑے گا۔چنانچہ مسلم شریف (۱) میں یعلی بن امیہ کی حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سوال کہ یارسول اللہ اب تو فتنہ کا خوف نہیں ہے اب تو قصر نہ کرنا چاہیے حضور ﷺ نے جواب دیا کہ یہ قصر بحالت سفر اللہ تعالی کی جانب سے بندہ پر تحفہ ہے اس کی قدر کی جائیگی۔اور سفر شرعی میں قصر ہی کیا جائیگا، چنانچہ حضور ﷺ نے سفر شرعی میں ہمیشہ قصر ہی فرمایا ہے کبھی اتمام نہیں فرمایا ہے اسی طرح حضرت صدیق اور حضرت عمرو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ہمیشہ سفر شرعی میں قصر ہی فرمایا ہے اور حضرت عثمانؓ نے جو کبھی اتمام کیا ہے اور لوگوں نے اعتراض کیا ہے تو جواب میں فرمایا کہ میں نے یہاں ''تأ ھل'' کرلیا ہے،اس لئے مجھے گنجائش ہے وغیر ذالک۔اس لئے جمہور ائمہ قصر کو ضروری قرار دیتے ہیں صرف حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اتمام کی بھی اجازت دیتے ہیں اور وہ اس میں منفرد ہیں،مزید تفصیل اگر مطلوب ہو تو ہدایہ کی شرح فتح القدیر (۲) اور رد المحتار شامی۔وغیرہ ''باب صلوۃ المسافر'' میں مطالعہ فرمالیجئے یہاں مزید تفصیل وبسط کی گنجائش نہیں ہے،امید کہ اتنی تقریر سے تشفی ہوجائے گی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مسلم شریف ۱/ ۲۴۱،کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا،مطبع رحیمیہ دیوبند۔

۲- فتح القدیر ۱/ ۳۹۵ دار عالم الکتب السعودیہ۔الرد المحتار مع الدر ۲/ ۶۰۳،مکتبہ زکریا دیوبند۔

باب الامامة

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، ٹیلیویژن اور ٹیلیفون کے ذریعہ اقتداء اور ان سے سنی گئی آیت سجدہ سے سجدہ کے وجوب کا حکم شرعی:

بذریعہ ٹیلیفون، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو کے ذریعہ اقتداء کرنا صحیح ہوگا؟

عبدالقیوم میرٹھی (متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفیق:

ٹیپ ریکارڈ، گراموفون وغیرہ جن میں متکلم کی آواز بعینہ نہیں آتی، بلکہ متکلم کی آواز کی نقل آتی ہے، صدائے باز گشت کی طرح تو ان سے آیت سجدہ سننے کی بنا پر نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگا اور نہ ہی ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا صحیح ہوگا (۱)۔

البتہ ٹیلیفون میں متکلم کی آواز بعینہ آسکتی ہے، مثلاً ایسا ٹیلیفون ہو کہ جس میں بولنے والے کی صورت بھی نظر آتی ہو اور وہ بولتا ہوا نظر آتا ہو تو اس کی آیت سجدہ کی تلاوت پر سجدۂ تلاوت کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اسی طرح اس آلہ کے توسط سے بھی یقین ہو کہ یہ آواز بولنے والے کی آواز ہی ہے، جب بھی سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہو جائے گا، ورنہ واجب نہ رہے گا۔

رہ گیا ریڈیو، اس میں اکثر بیان کرنے والے کی تقریر و آواز ٹیپ کر لی جاتی ہے اور پھر اسی کو نشر کرایا جاتا ہے، پس اگر ایسا ہونے کا ظن غالب ہو تو اس کی آواز پر سجدۂ تلاوت کرنا لازم نہ رہے گا۔

۱- "ویؤیدہ قولہ: ولا تجب إذا سمعها من طیر هو المختار، وإن سمعها من الصدی لاتجب علیه، كذا فی الخلاصة" (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۱۲۸) "لا تجب بسماعه من الصدی والطیر" (الدر المختار علی الشامی ۱/ ۵۱۷، باب سجود التلاوة) اور جب سجدۂ تلاوت بھی واجب نہیں ہوگا تو اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ درست نہیں ہوگا (مرتب)۔

ہاں جب بولنے والا بغیر ان وسائل کے خود بول رہا ہے اور آیت سجدہ کی تلاوت کرے تو اس کی آیت سجدہ کی تلاوت کرنے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوجائے گا۔"**يجب بسبب تلاوة آية (إلى قوله) بشرط سماعها فالسبب التلاوة وإن لم يوجد السماع، كتلاوة الأصم، والسماع شرط في حق غير التالي أوبشرط الائتمام أي الاقتداء بمن تلاها، فإنه سبب لوجوبها أيضاً**"(۱)،اور ریڈیو میں متکلم کی بعینہ آواز اور ٹیپ کی آواز میں موقعہ استعمال کا فرق مدلل طور پر ہوجاتا ہے، اسی کے اعتبار سے عمل کرے، اور یہی تفصیل وتدقیق ٹیلی ویژن سے آواز سنائی دینے میں ہے اور اسی تفصیل کے مطابق تحقیق کرکے عمل کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-امام کس کو بنایا جائے؟

ہمارے یہاں دو مولوی صاحب ہیں ایک نے تو کسی لڑکی کو بھگا کر شادی کی ہے پھر طلاق دے دی اور ثانی نکاح بھی کرلیا ایسی لڑکی سے جس کو حد جاری ہوسکتی ہے۔اور دوسرے مولوی صاحب ہیں جنکے حق میں کسی قسم کی بدنامی نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں میں کس کی امامت افضل ہے، یعنی نماز پڑھنا پیچھے اول کو ثانی کے سلف پر اور ثانی کو اول کے سلف پر جائز ہے، دونوں مولوی صاحب کی موجودگی میں مطلقا لڑکی بھگا کر شادی کرنے والی سلف پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اکثر فقہاء کس طرف گئے ہیں جواب قرآن واحادیث وفقہ سے دیں اور خدا بزرگ سے نعمت دارین حاصل کریں۔

۲-مسجد میں امامت کا حق کس کو ہے؟

ہمارے یہاں ایک مسجد وقف کی ہوئی ہے۔وقف کرنے والے کے اولاد میں سے ایک مولوی صاحب ہیں جو امام کے قائل بھی نہیں ہیں، برابر ایک اور مولوی صاحب کا اعتبار ہے، لیکن وقف کرنے والے کے لڑکے مولوی صاحب یوں کہتے ہیں کہ چونکہ مسجد میرے باپ دادا کی وقف کی ہوئی ہے، اس لئے امامت کا حق مجھے ہے کسی کی ملکیت میں مسجد بنایا تو اس مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ جائز یا ناجائز۔

بشیر احمد

۱- الدر المختار مع الشامی ۱/۴،۵۱۴، باب سجود التلاوۃ۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-دوسرا مولوی جس کے بارے میں کوئی بدنامی نہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر ہے(۱)۔

۲-وقف کرنے کے بعد چیز وقف کرنے والے کی ملک سے نکل جاتی ہے اور خاص اللہ کی ملک شمار ہوتی ہے پھر اللہ کے حکم کے مطابق جو شخص امامت کا زیادہ مستحق ہوگا اور اس کو امامت کا حق زیادہ ہوگا۔واقف کی اولاد اگر ایسی نہ ہو تو اس کے بجائے دوسرا شخص جو امامت کا اہل ہو اس کو ترجیح ہوگی،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

امام شافعی ہو اور مقتدی حنفی ہو یا اس کے برعکس ہو تو نماز کس طرح پڑھیں؟

۱-ہم یہاں دبئی میں ہندو پاک کے مسلمان حنفی ہیں اور یہاں عرب ممالک میں اکثریت شافعی لوگوں کی ہے،اس لیے نماز وغیرہ میں زیادہ تر شافعی مسلک کے طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے،اس وقت یہاں غروب چھ بجے ہوتا ہے اور حنفی وقتِ نماز عصر ساڑھے چار بجے ہوتا ہے،لیکن شوافع کی اکثریت کی وجہ سے عصر کا وقت پونے چار بجے ہوتا ہے،یعنی غروب سے سوا دو گھنٹے قبل ہوتا ہے۔

اس صورت میں حنفی کی اقتداء شافعی امام کے پیچھے وقت پر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۲-اکثر مساجد میں امام حنفی ہیں وہ بھی شافعی وقت پر نماز عصر کی امامت کراتے ہیں،ان کے پیچھے شافعی اور حنفی مقتدیوں کی نماز صحیح ہو سکتی ہے؟

۳-حنفی شخص شافعی وقت پر اذان سن کر فوراً منفرد نماز ادا کر سکتا ہے؟اذان غروب سے ڈھائی گھنٹہ قبل ہوتی ہے۔

۴-اگر اس طریقہ پر نماز نہیں ہوتی تو حنفی لوگ کیا کریں،کیونکہ اگر حنفی وقت پر نماز با جماعت ہونے لگے اور تمام حنفی لوگ جو تعداد میں وطنی شافعی لوگوں سے زیادہ ہیں،اپنی الگ جماعت کریں تو فتنہ کا اندیشہ ہے،ایسے ماحول میں کیا کیا جائے؟

۵-اگر شافعی وقت پر حنفی کی عصر ہو سکتی ہے تو اگر کسی حنفی کی ظہر باقی ہے تو کیا اس سے پہلے ادا کر سکتا ہے؟ہم نے معتبر حنفی علماء سے دریافت کیا۔گجرات کے ایک معتبر حنفی نے ہم سے زبانی صاف انکار کیا تھا کہ اس طرح نماز صحیح نہ ہوگی۔

۱- "قلت وسيذكر الشارح عند المؤيد بالجواز لو غيره أصلح" (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۲۸۴، مکتبۂ زکریا)(مرتب)۔

ہاں اگر نفل کی نیت سے عصر کے فرض میں شامل ہوں گے تو نفل ہو جائے گی اور حنفی وقت پر نماز عصر ادا کرنا لازمی ہے۔ دوسرے مولانا صاحب نے بتلایا کہ میں خود شافعی وقت پر ادا کرتا ہوں اس کی گنجائش نکلتی ہے آپ فیصلہ فرمائیں۔

۶- نمازِ فجر میں رکعت میں عرب حضرات قنوتِ نازلہ پڑھتے ہیں، بعض امام بعدِ قراءت اور بعض قومہ میں، اس کے بارے میں حنفی امام و مقتدی کیا کریں؟

۷- جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد شافعی امام تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں، اس وقفہ میں مقتدی الحمد شریف پڑھتے ہیں اس وقت حنفی مقتدی کیا کرے؟ کیا حنفی امام شافعی مقتدیوں کی رعایت کرسکتا ہے اور اتنا خاموش رہ سکتا ہے، کیونکہ اگر امام چھوٹی سورت پڑھتا ہے تو مقتدی الحمد پوری نہیں پڑھ سکتے۔

۸- تراویح میں نہایت مختصر قعدہ اخیرہ کیا جاتا ہے، جس میں مقتدی درود شریف و دعا نہیں پڑھ سکتے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد فوراً دوسری رکعت شروع ہو جاتی ہے، کیا مقتدی اپنے طور سے درود شریف و دعا کے بعد سلام پھیر کر امام کی نماز میں تھوڑی تاخیر سے مثلاً الحمد کے ختم تک شامل ہوسکتا ہے؟

۹- رمضان المبارک میں شافعی حضرات وتر با جماعت ادا کرتے ہیں اور دو رکعت ایک سلام سے اور ایک رکعت دوسرے سلام سے، تو کیا ان کی اقتدا حنفی کرسکتے ہیں؟

۱۰- عیدین کی نماز کی نیت سے پتہ چلتا ہے کہ شافعی حضرات سنت کی نیت کرتے ہیں اور ہم حنفی واجب کی، اس طرح ہماری نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

۱۱- جمعہ کے خطبہ ثانی اور عیدین میں اہتمام سے مقتدی ہاتھ اٹھا کر آمین کہتے ہیں، کیا یہ ہمارے لیے جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

نوٹ: پہلے فقہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں پھر اصل جواب نقل ہوگا:

۱- ''وقت الظهر من زواله أي ميل ذكاء عن كبد السماء: إلى بلوغ الظل مثليه وعن مثله وهو قولهما وزفر والأئمة الثلاثة رحمهم الله، قال الإمام الطحاوي: وبه نأخذ. وفي غرر الأفكار وهو المأخوذ به، وفي البرهان: وهو الأظهر، لبيان جبرئيل، وهو نص في الباب وفي الفيض: وعليه عمل الناس اليوم، وبه يفتى'' (۱)۔

۱- الدر المختار علی هامش الشامی ۱/ ۲۴۰ کتاب الصلوۃ۔

۲-"قال الشامي تحت قوله: وعليه عمل الناس اليوم: أى في كثير من البلاد، والأحسن مافي السراج عن شيخ الإسلام أن الاحتياط أن لايؤخر الظهر إلى المثل، وأن لايصلي العصر حتى يبلغ المثلين إلى قوله وانظر هل إذا ألزم من تأخيره العصر إلى المثلين فوت الجماعة يكون الأولى التأخير أم لا. والظاهر هو الأول، بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الإمام تأمل، ثم إلى قوله: لوكان إمام محلته يصلي العشاء قبل غياب الشفق الأبيض فالأفضل أن يصليها وحده بعد البياض" (۱)۔

جواب سوال:

۱-احناف کے مفتی بہ قول وقت سے پہلے حنفی کا اقتدا کرنا مفتی بہ قول کے خلاف ہوگا، بحوالہ عبارت (۲)۔

۲-عبارت (۱-۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حنفی اس میں حضرت امام طحاویؒ کی اتباع کرتا ہو اور ان کے قول کے مطابق صاحبین کے قول کو کہ وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کا ایک قول ہے، راجح سمجھتا ہو، جیسا کہ صاحب "غرر الافکار و برہان وفیض" نے سمجھا ہے، وہ اگر امامت کرے یا اقتدا کرے تو نکیر نہیں کی جاسکتی۔

اور باقی احناف جو امام کے ظاہر قول کو اور جمہور احناف کے مفتٰی بہ قول کو لیتے ہیں اس کا حکم آگے آتا ہے۔

۳-نہیں ادا کرسکتا (۲)۔

۴-اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو نفل کی نیت سے ان کے ساتھ شریک ہوجائیں پھر بعد میں اگر جماعت کرسکیں تو جماعت سے پڑھ لیں، ورنہ منفرداً پڑھ لیں۔

۵-پہلے ظہر پڑھے پھر عصر پڑھے جس جگہ جماعت عصر ہورہی ہو وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ گھر میں یا جہاں مناسب ہو پڑھیں۔اور رفع فتنہ کے لیے ان کی جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں۔

۶-اگر امام حنفی ہے تو قرأت کے بعد نہ پڑھیں، بلکہ قومہ میں پڑھیں (۳)۔ اور حنفی مقتدی آہستہ آہستہ آمین کہتے

۱- الشامی ۱/ ۲۴۰ کتاب الصلوۃ۔

۲- "فحصل أن الإقتداء بالمخالف المراعي في الفرائض أفضل من الانفراد إذا لم يجد غيره، وإلافالاقتداء بالموافق أفضل" (فتاویٰ شامی ۱/ ۳۷۹ کتاب الصلوۃ)۔

۳- (وهل القنوت هنا قبل الركوع أم بعده لم أره، والذى يظهرلي أن المقتدى يتابع امامه، إلا إذا جهر، فيؤمن وأنه يقنت بعد الركوع لاقبله، بدليل ما استدل به الشافعي على قنوت الفجر، وفيه التصريح بالقنوت بعد الركوع حمله علمائنا على القنوت للنازلة ثم رأيت الشرنبلالي في مراقي الفلاح صرح بأنه بعده، واستظهر الحموى أنه قبله والأظهر ماقلناه، (شامی ۱/ ۴۵۱ باب الوتر والنوافل (مرتب)۔

رہیں اور اگر امام شافعی ہو تو جو قومہ میں پڑھے تو حنفی مقتدی بھی آہستہ آہستہ آمین کہتے رہیں اور اگر بعد قرأت پڑھے تو حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

۷-''الف''حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

''ب''حنفی امام اس صورت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اطمینان سے پڑھ کر ختم سورت کرے اور شوافع حضرات سورۂ فاتحہ پڑھیں، اگر کچھ سورۂ فاتحہ باقی رہ جائے تو ختم سورت سے قبل قبل پوری کرلیں۔

۸-حنفی امام کو بھی تراویح کے قعدہ اخیرہ میں التحیات کے ساتھ درود شریف پڑھ لینا چاہئے، درود شریف پڑھنا بھی اہم ہے، اگر کوئی امام جلدی سلام پھیر دے، لیکن مقتدی کو درود شریف پڑھ کر رکعت مل جانے کا ظنِ غالب ہو تو درود شریف پوری کرکے سلام پھیرنا چاہئے۔

۹-حنفی حضرات اپنی جماعتِ وتر بعد میں جہاں مناسب ہو علیحدہ کریں اگر ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونا ہی پڑے تو دو رکعت نفل کی نیت کرکے شریک ہوں اور دوسری رکعت کے سلام پر اپنی یہ نماز ختم کردیں اور پھر مستقل دو رکعت نفل کی نیت کرکے شریکِ جماعت ہوجائیں اور جب امام سلام پھیرے تو اپنی ایک رکعت مثلِ مسبوق کے پوری کرلیں۔

۱۰-ایسی صورت میں بھی حنفیہ کی اقتدا کرلینا صحیح ہے(۱)۔

۱۱-اس طرح دعا کرنا اس موقع پر ثابت نہیں ہے، لہٰذا نہ کریں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر شافعی و حنفی میں مسائل سے زیادہ واقف حنفی ہے، تو اس کی امامت اولیٰ و افضل ہے:

ایک مسجد ہے جس میں مصلی تمام کے تمام شافعی المسلک ہیں جن میں نہ کوئی عالم ہے اور نہ سنتوں کے پابند ہیں اور نہ کوئی داڑھی رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن کریم پڑھتا ہے، نہ مخارج کا پتہ نہ وقف کا بالکل غلط قرآن پڑھتے ہیں، ایک حرف بھی صحیح

۱- ''لكن في وتر البحر إن يقن المراعاة لم يكره أوعلمها لم يصح، وإن شك كره، قال الشامي: أى المراعاة في الفرائض من شروط وأركان في تلك الصلوٰة وإن لم يراع في الوجبات والسنن كما هو ظاهر سياق كلام البحر، وظاهر كلام شرح المنية أيضاً حيث قال: وأما الاقتداء بالمخالف في الفروع كالشافعي، فيجوز مالم يعلم منه مايفسد الصلوٰة على اعتقاد المقتدي عليه الإجماع إنما اختلف في الكراهة فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى، وفي رسالة الاهتداء في الاقتداء لملا علي قاري ذهب عامة مشائخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف، وإلا فلا'' (شامی ۱/۳۷۸ کتاب الصلوٰۃ ۱۲)(مرتب)۔

ادا نہیں ہوتا۔

ایسے لوگوں میں ایک آدمی ہے جو کہ حنفی المسلک ہے، مسائل تجوید وغیرہ سے تھوڑا بہت واقف ہے اور تمام کے تمام شافعی مصلی اس حنفی کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو کیا حنفی شخص امامت کر سکتا ہے؟ اگر ان شافعیوں میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے تو نماز فاسد و باطل ہو سکتی ہے قرآن وغیرہ کے غلط ہونے کی وجہ سے، مثال کے طور پر ضاد، ظ، میں کوئی فرق نہیں، الف، ء، ع، میں کوئی فرق نہیں، ق، ک، خ، میں کوئی فرق نہیں، س، ش، ص، میں کوئی فرق نہیں، ہ، ح، میں کوئی فرق نہیں، ت، ط، میں، ذ، ز، میں ان تمام میں کوئی فرق نہیں ہے، مدلل تحریر فرمائیں۔

بی، ایس موسیٰ بمعرفت، مولوی شفیق الرحمٰن (معلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں شافعی المسلک حضرات اس حنفی شخص کی اقتدا کر سکتے ہیں، بلکہ موجودہ حالت میں یہی بہتر ہے، لیکن اس حنفی شخص کو طہارت اور نماز کے مسائل میں خلافیات کی حدود میں رہتے ہوئے رعایت کرنی چاہئے (۱)۔

"ولو شک شافعي: في اتيان المخالف بالواجبات عند المأموم لم يؤثر في صحة الاقتداء به تحسيناً للظن به توقي الخلاف" (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حنفی کا شافعی کی امامت کرنا:

ایک حنفی مسلک کا عالم شافعی مسجد کا امام ہے جو کہ مسلک شافعی کی رو سے ارکان صلوۃ ادا کرنے کے بعد دوبارہ حنفی مسلک کی روشنی میں تنہا نماز پڑھتا ہے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ پھر ایسے امام کے بارے میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

۱- **"فتحصل أن الاقتداء بالمخالف المراعىٰ في الفرائض أفضل من الإنفراد إذا لم يجد غيره، وإلا فالاقتداء بالموافق أولىٰ. وإذا لم يجد غير المخالف فلا كراهة في الاقتداء به أو الاقتداء به اولىٰ من الإنفراد"** (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح کتاب الصلوۃ ۲۲۱/۱) (مرتب)۔

۲- تحفۃ المنھاج بشرح المنہاج لابن حجر ۲۲۱/۱ (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر سب مقتدی شافعی ہوں اور صرف امام حنفی ہوں تو ایسے اعمال میں جو حنفی مذہب میں نماز کے اندر نا جائز ہیں ان میں رعایت جائز نہیں اور جو اعمال نماز میں حنفی مذہب نا جائز نہیں ہیں اور شافعی مذہب میں ان کے بغیر ان کی نماز خراب ہو جاتی ہے تو رعایت ضروری ہے اور جن اعمال کے بغیر شوافع حضرات کی نماز خراب نہیں ہوتی اور حنفی مذہب میں وہ نا جائز نہیں ہے ان اعمال میں ان کی رعایت نہ کرنا افضل واولی ہے اور رعایت کر لینے کی ہی گنجائش ہے ان اصول کے مطابق عمل کرے تو امام پر کوئی وزر نہیں ہے، ورنہ جیسا عمل ہوگا ویسا حکم ہوگا باقی فرض ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ تنہا بھی پڑھنا جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حنفی، شافعی کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں:

ایک مسجد جس میں مصلی تمام کے تمام شافعی المسلک ہیں جس میں نہ کوئی عالم ہے اور نہ کوئی مولوی، نہ سنت کا پابند ہے اور نہ کوئی داڑھی رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن صحیح پڑھتا ہے، نہ مخارج کا پتہ نہ وقف کا بالکل غلط قرآن پڑھتے ہیں ایک حرف صحیح ادا نہیں ہوتا ایسے لوگوں میں ایک آدمی ہے جو کہ حنفی مسلک پر ہے مسئلہ مسائل وتجوید وغیرہ سے تھوڑا بہت واقف ہے اور تمام کے تمام شافعی مصلی اس حنفی کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہیں کیا حنفی شافعی کی امامت کر سکتے ہیں باوجود کہ شافعی المسلک میں سے کوئی شخص نماز پڑھاتا ہے تو نماز فاسد وباطل ہو سکتی ہے قرآۃ وغیرہ کی غلطی ہونے کیوجہ سے مثال کے طور پر ض، ظ میں کوئی فرق نہیں، خ، ق، ک میں کوئی فرق نہیں س ش میں کوئی فرق نہیں ہے، الف، ع میں کوئی فرق نہیں ہے ہ ح میں کوئی فرق نہیں ہے ت ط میں ذ ز میں ان تمام میں کوئی فرق نہیں مع الدلائل تحریر فرمائیں۔

معرفت مولوی شفیق الرحمٰن (دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں شافعی المسلک حضرات اس حنفی شخص کی اقتداء کر سکتے ہیں بلکہ موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے لیکن ان حنفی صاحب کو طہارت ونماز کے مسائل میں خلافیات کی حدود شرع میں رہتے ہوئے امامت کرنی چاہئے، "فتحصل

أن الاقتداء بالمخالف المراعي في الفرائض أفضل من الانفراد إذا لم يجد غيره، والا فالاقتداء بالموافق أولى" (۱)"وإذا لم يجد غير المخالف، فلا كراهة في الاقتداء به والاقتداء به، أولى من الإنفراد (۲)،ولو شک شافعي في إتيان المخالف بالواجبات عند المأموم لم يؤثر في صحة الاقتداء به تحسينا للظن في توقي الخلاف" (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۲/۲۳ھ

۱-غیر متشرع حافظ کی اقتداء:

ایک حافظ غیر متشرع کی اقتداء نماز تراویح میں کرنا افضل ہے؟ یا ایک پابند شرع غیر حافظ کی اقتداء میں نماز تراویح افضل ہے؟۔

۲-جس کی بیوی پردہ نہ کرتی ہو اس کی امامت:

اگر امام کی بیوی شوہر کی تنبیہ کے باوجود غیر مرد سے بے پردہ ہو کر گفتگو کرتی ہے، نیز عوام الناس سے پردہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے تو ایسے امام کی اقتداء میں از روئے شرع محمدی علیہ ﷺ کسی قسم کی کراہیت وغیرہ تو نہیں اگر ہے تو آپ کراہیت کو بالبسط تحریر فرمائیں۔

۳-امام کے ذمہ ایسا کام سپرد کرنا جس سے اس کی تحقیر ہو:

آج کل کے اس دور پر خطر میں مقتدیان حضرات امام مساجد کو اس شرط پر رکھتے ہیں کہ اس سے مسجد کی نگرانی مسجد میں جھاڑو دینا اور پانی گرم کرنا، نیز مسافروں کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ وغیر لازم کر دیتے ہیں اور اگر کبھی ان امور میں سہو اور تسہیل امام نے برتا تو اہل محلہ ان امام پر حاکمانہ حکم کرتے ہیں تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز کے اندر کوئی کراہیت تو نہیں؟ اگر ہے تو بالتفصیل جواب سے نوازیں۔

شفیق احمد (مسجد انصاریان قصبہ اسوڑہ غازی آباد یوپی)

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۳۰۳ وفیہ فالاقتداء بالموافق أفضل" بدل "أولى"۔

۲- حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، الطبعۃ الثالثۃ بالمطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق/۲۰۴۔

۳- تحفۃ المحتاج شرح المنہاج لابن حجر ۱/۲۲۱۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-غیرمتشرع کی تشریح کے بعد اس نمبر کا جواب منقح ہو سکے گا۔

۲-شوہر کی تنبیہ اور ممانعت کے باوجود اگر بیوی بے پردہ رہتی ہے تو اس سے اس امام کی امامت میں فتور وخلل یا کراہت واقع نہ ہوگی (۱)۔

۳-امام مقتدا ہوتا ہے اس میں مقتدائیت کی شان ہوتی ہے اس کے سپرد ایسا کام کرنا (جس میں اس کی شان مقتدائیت ختم ہو یا اس کام کی وجہ سے عوام کے نزدیک تحقیر وغیرہ ہو) ٹھیک نہیں۔اگر بوجہ غربت ونا داری کے یہ سب کام کرنا منظور بھی کرلے تو اس کی ذمہ داری یا اس کا جو کچھ بھی اثر ہوگا اس کی ذمہ دار قوم اور مقتدیان مسجد ہوں گے،اس لئے ایسے کام سے امام کو بری کرکے دوسرا شخص ایسے کام کے لئے ملازم رکھ لینا چاہیے(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۱ھ

نسبندی کرنے والے کی امامت:

جو شخص جان بوجھ کر نسبندی کرائے اس کی امامت کیا ہے حرام یا مکروہ؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جان بوجھ کر ایسا کرانا ممنوع وحرام ہے۔ایسے شخص کی امامت مکروہ تحریمی ہوتی ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''عن أبی ہریرةؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الصلاة المکتوبة واجبة خلف کل مسلم براً کان أو فاجراً وإن عمل الکبائر ''(سنن ابوداؤد ا/ ۱۶۲ کتاب الصلاۃ باب امامۃ البر والفاجر حدیث ۵۹۴) نیز تنبیہ اور حتی الوسع بیوی کی حرکت پر نکیر سے وہ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوگیا، اس کی وجہ سے اس کو فاسق نہیں کہا جائے گا، ''له امرأة فاسقة لا تنزجر بالزجر لا يجب تطليقها كذا في القنية'' (فتاوی عالمگیریہ ۵/ ۳۷۲)(مرتب)۔

۲- ''إن الأصل أن بناء الإمامة علی الفضیلة والکمال ''(البحرالرائق ا/ ۲۰۲)۔

آیت سجدہ نہ کرنے والے امام کی اقتداء:

غالباان حضرات کے نزدیک (یعنی عمانی) سجدہ تلاوت سنت ہے، اور ائمہ مساجد نماز کی تلاوت میں آیت سجدہ بھی پڑھتے ہیں تو ہم حنفی ان کی اقتداء کرتے ہیں، ایسی حالت میں کیا ان کی اقتداء درست ہے اور ہم گنہگار نہیں ہوں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب وہ لوگ آیت سجدہ نماز میں تلاوت کر کے سجدہ نہ کرتے ہوں تو حنفی مقتدی کو چاہئے کہ فوراً اسی وقت سجدہ نہ کریں، بلکہ جب وہ نماز ختم کر کے سلام پھیریں تو حنفی اپنا سجدۂ تلاوت کر کے سلام پھیریں، اور جتنی آیات سجدہ انہوں نے اس نماز میں تلاوت کی ہیں اتنے سجدے کر کے سلام پھیریں اور ان کے ساتھ ہی سلام نہ پھیریں، ورنہ نماز تو ہوجائے گی باقی سجدۂ تلاوت نہ کرنے کا گناہ بھی ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۴/۱۴۰۲ھ

رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والے کی امامت:

توہین رسول اللہ ﷺ کرنے والے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں، خواہ وہ اہانت کسی قسم کی ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

توہین رسول ﷺ تو نعوذ باللہ کفر ہے مسلمان باقی نہیں رہے گا، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا سوال ہے اور کون مسلمان اس کی جرأت کرسکتا ہے؟

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ بغیر وجہ شرعی کے کسی مسلمان کی طرف یہ نسبت معمولی گناہ نہیں ہے، اگر یہ صحیح تہمت نہ ہوئی تو وہ توہین لوٹ کر اسی متہم کرنے والے پر آئے گی اور وہی اس جرم کا مورد بن جائے گا جس کو وہ دوسروں پر تھوپنا چاہتا تھا۔

ایسی باتیں کہنا بڑے خطرے کا مقام ہے، متہم کرنے والے کو بھی اپنی خیر منانی چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قرآن صاف نہ پڑھنے والے حافظ کے پیچھے تراویح وشبینہ:

۱۔ زید تراویح میں قرآن کریم سناتا ہے، لیکن اس طرح پڑھتا ہے کہ حروف کٹ جاتے ہیں مقتدیوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے اور زید کے مقابلہ میں دوسرا حافظ ایسا پڑھتا ہے کہ سمجھ میں آتا ہے اور حروف نہیں کٹتے ہیں۔
صورت مسئولہ میں زید کا قرآن شریف سنانا مقتدیوں کے لئے تراویح میں جائز ہے یا کہ نہیں سوال یہ ہے کہ مقتدی اب زید کا قرآن شریف سنیں یا اس کے مقابلہ میں دوسرے حافظ صاحب کا سنیں جس کے حروف نہیں کٹتے ہیں۔
۲۔ ایسا شبینہ سنا جس میں قرآن کریم کے حروف کٹتے ہوں اور سمجھ میں بھی نہ آتا ہو تو کیا جائز ہے کیا ایسا شبینہ پڑھنا باعث ثواب ہے اور جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ زید کے مقابلہ میں دوسرا حافظ جو صحیح وصاف پڑھتا ہے اس کا سنیں۔
۲۔ ایسا شبینہ جس میں قرآن پاک صاف وصحیح نہ پڑھا جاوے، جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۸۵ ۱۳ھ

بغیر ڈاڑھی والے کی امامت:

۱۳/رمضان ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جو حافظ صاحب تراویح پڑھا رہے ہیں ان کے پیچھے تراویح پڑھنا حرام ہے، کیونکہ ان کو داڑھی مونچھ نہیں ہے اس کے بعد انہوں نے اپنی تراویح کا علیحدہ انتظام کیا، الم ترکیف سے پڑھنا شروع کیا نتیجہ یہ کہ کچھ لوگ قرآن چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں زیادہ تعداد بغیر داڑھی والوں کی ہے، بعض دفعہ فرض جماعت پڑھانے کے لئے بغیر داڑھی والا فرض پڑھا دیتا ہے، اس لئے آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہ حنفی، شافعی، حنبلی کے تحت ارسال فرما دیں، کیونکہ میرے ساتھیوں میں تینوں مسلک کے لوگ ہیں۔
سوال یہ ہے کیا بغیر داڑھی والے کی امامت میں فرض نماز یا تراویح پڑھنا جائز ہے؟

محمد ارتقاع خان شروانی (پوسٹ بکس ۴۲ ادہران سعودی عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

بے شمار احادیث صحیحہ میں ڈاڑھی رکھنے اور مونچھ کٹانے بلکہ چھوٹی سے چھوٹی رکھنے کی بہت سخت تاکیدیں وارد ہیں اور اس کے خلاف پر مذمتیں وارد ہیں یہاں پر بطور نمونہ محض چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں، مثلاً بعض روایات صحاح ستہ میں ہے: ''أوفروا اللحي واحفوا الشوارب'' بعض میں ہے: ''أنهكوا الشوارب واعفوا اللحي'' اور بعض میں ہے: ''قصّوا الشوارب واعفوا اللحي''، اور بعض میں ان کلمات کے ساتھ: ''وخالفوا المشركين'' اور بعض میں: ''وخالفوا الأعاجم'' بھی ہے(۱)۔

چنانچہ عجمیوں اور مشرکوں میں عموماً ان کا مذہبی شعار دیکھا جاتا ہے۔ ڈاڑھی منڈانے کا اور مونچھ بڑھانے کا اور اسی اعتبار سے مونچھ کٹانے اور منڈانے کو اور ڈاڑھی بڑھانے کو اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے، بعض روایات میں ''عشر من الفطرة'' اور بعض میں ''خمس من الفطرة'' (۲) فرمایا گیا، اور ان سب میں ڈاڑھی بڑھانے کو ضرور شمار کیا گیا ہے، اور فطرہ کے معنی جبلّہ سلیمہ کے ہیں یعنی صحیح فطرت انسانی کا بھی تقاضا یہی ہے، کہ مونچھیں ختم کی جائیں یا کٹائی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے، نیز بعض روایات صحاح میں اسی خصلت (مونچھ چھوٹی سے چھوٹی رکھنا یا بالکل کٹا دینا اور ڈاڑھی بڑھانا) کو فطرۃ انبیاء بتایا گیا (۳)۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خصلت تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت اور طریقہ مسلوکہ ہے، جو یقیناً محبوب عند رب العالمین کی شکل ہے۔

انہی روایات کی بناء پر تمام فرق اسلامیہ کا سوائے بعض روافض وبعض خوارج کے یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ صورت

۱- ڈاڑھی اور مونچھ سے متعلق احادیث صحاح ستہ میں ان الفاظ میں وارد ہیں: ۱- ''خالفوا المشركين، ووفروا اللحى وأحفوا الشوارب، ۲- انهكوا الشوارب واعفوا اللحي'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۱۰ حدیث ۵۸۹۲، ۵۸۹۳)، ۳- ''خالفوا المشركين، احفوا الشوارب وأوفوا اللحى، ۴- جزوا الشوارب وارخوا اللحى، خالفوا المجوس'' (صحیح مسلم حدیث ۵۴، ۲۵۹/۵۵)، ۵- ''احفوا الشوارب واعفوا اللحى'' (صحیح مسلم حدیث ۲۵۹/۵۲، سنن ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی اعفاء اللحیہ حدیث ۲۷۶۳، سنن نسائی ۱۲/۱، احفاء الشارب واعفاء اللحی ۱۲۹/۸، احفاء الشارب، ومسند احمد بن حنبل ۱۶/۲، ''خالفوا زى الأعاجم'' کے الفاظ میں کوئی حدیث نہیں مل سکی)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۳۳۴/۱۰، صحیح مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۴۹، ۲۵۷/۵۰، بلفظ خمس من الفطرۃ اور اس میں ڈاڑھی کا ذکر نہیں ہے، نیز صحیح مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۲۶۱/۵۶، ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب السواک من الفطرۃ حدیث ۵۳ بلفظ عشر من الفطرۃ اور اس میں اعفاء اللحیہ کا بھی ذکر ہے (مرتب)۔

۳- اس کی صراحت صحاح ستہ میں مجھے نہ مل سکی، البتہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے: ''نعم وقع التعبير بالسنة موضع الفطرة في حديث عائشة عند أبي عوانة في رواية.....'' اور بیضاویؒ کا قول نقل کیا ہے: ''هي السنة القديمة التي اختارها الأنبياء واتفقت عليها الشرائع'' (فتح الباری ۳۳۹/۱۰) (مرتب)۔

(مونچھ کٹی یا اس طرح صاف ہو کہ جلد (چمڑا) نمایاں ہو اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہو اسلامی و مذہبی شعار شمار ہے اور یہ الگ بات ہے کہ ڈاڑھی کم سے کم کتنی لمبی اور بڑی ہو اس میں آپس میں کچھ ضمنی اختلاف ہے، مگر ڈاڑھی رکھنا واجب سب کے نزدیک بالاجماع ہے بعض اصحاب ظواہر ظاہر نص کے اعتبار سے کٹوانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے ہیں بالکل چھوڑے رکھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں ایک قول حضرت امام احمد ابن حنبل کا بھی یہی ہے دوسرا قول دیگر ائمہ کی طرح کچھ توسع کا ہے اور اس میں توسع کی بنا ان روایات پر ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ وہ اطراف لحیہ سے کچھ کٹوا کر لحیہ کو مرصّع و جمیل بنا لیتے تھے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں ہے کہ آپ کی ڈاڑھی کثہ (گھنی) (۱) اور مسترسلہ (لٹکی ہوئی) اس طرح پر تھی کہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ڈاڑھی کے بال کٹکر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے یا محض کھونٹی کی طرح ہوں ایسے نہیں تھے، بلکہ مسترسل (لٹکے ہوئے) تھے اس طرح پر کہ پیچھے سے بھی نظر آتے تھے (۲)، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کان کے نیچے بھی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑے اور لٹکے ہوئے تھے، کہ شانۂ مبارک کے اوپر سے بھی لٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے چاہے دو انگل ہو یا تین انگل ہو یا چار انگل مگر لٹکے ہوئے ضرور ہوتے تھے کم وبیش اسی کے اندر تمام ائمہ کا قول دائر ہے، جڑ سے کٹا دینے کا کسی کا مذہب نہیں ہے۔ اور پورے ڈاڑھ (یعنی نیچے کا جبڑا جس کی ہڈی پر نچلے دانت لگے ہوتے ہیں) پر جو بال ہوں وہ سب ڈاڑھی میں شمار ہے۔ اور اس پورے بالوں کا یہی حکم ہے کیونکہ حدیث پاک واعفوا اللحی وغیرہ میں مراد ہی وہ بال ہیں جو لحیین پر اُگے ہوئے ہوں ان ہی روایات کی بناء حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پورے لحیین میں کہیں چار انگل سے کم مقدار بالوں کی نہ ہو اور اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر اور روایت سے ہوتی ہے جس کو فقہاء کرام ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں: **"صح عن ابن عمر راوی هذا الحدیث أنه کان یأخذ الفاضل عن القبضة (إلی قوله) وأما الأخذ منها وهی دون ذلک أی القبضه کما یفعله المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد"** (۳)، اور مونڈانا ذی اعاجم و مشرکین میں داخل ہو کر حرام ہے۔ اور ڈاڑھی مونچھ دونوں کے صفایا سے مخنثین کے مشابہ ہو کر مزید حرمت کا سبب اور باعث مذمت و باعث غضب خداوندی

۱- چنانچہ "کث اللحیہ" کے تحت ملا علی قاری جمع الوسائل فی شرح الشمائل میں لکھتے ہیں: "کث اللحیة" بتشدید المثلثة أی غلیظها وفی روایة کان کثیف اللحیة وفی أخری عظیم اللحیة ذکره میرک" (ص:۴۵) (مرتب)۔

۲- "عن أبی معمر قال: قلنا لخبابؓ: أکان رسول اللہ ﷺ یقرأ فی الظهر والعصر؟ قال: نعم قلنا بم کنتم تعرفون ذاک؟ قال باضطراب لحیته" (صحیح البخاری مع فتح الباری ۲/ ۲۳۲، کتاب الأذان، باب رفع البصر إلی الإمام فی الصلاۃ حدیث ۷۴۶) (مرتب)

۳- ردالمحتار ۲/ ۱۱۳ مطبوعہ مکتبہ زکریا۔

اور بغاوت عن قول الرسول علیہ السلام کے مشابہ ہے، اور درمختار میں فتح القدیر سے نقل کیا ہے: "وأخذ كلها أي حلق كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم" (۱) غرض بارہویں صدی ہجری تک ساری امت محمدیہ ڈاڑھی کو اسلام کا شعار اور سنت انبیاء وسنت رسول اللہ ﷺ اور ضروری قرار دیتی تھی، مگر مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بعض خطہ کے لوگوں نے ڈاڑھی مونڈانا شروع کر دیا اور اس میں پہل اہل مصر نے کیا پھر علماء مستشرقین نے تہذیب مغرب زدگی سے متاثر ہو کر ڈاڑھی کی شرعی حیثیت متبدل ومتغیر کرنا شروع کر دیا حتی کہ ڈاڑھی کو بالکل طبعی وغیر شرعی چیز قرار دینے لگے، اور اس معاملہ میں مکمل چھوٹ دینے لگے یہاں تک کہ علماء اور خطباء اور ائمہ مساجد بھی متاثر ہونے لگے۔ إلاَّ من حفظه الله۔ پھر یہ بلا اس قدر عام ہوگئی کہ عرب کے دیگر ممالک میں بھی عام طور سے پھیل گئی، اور ایک سنت رسول علیہ السلام جو شعار کا درجہ رکھتی تھی، مردہ ہونے لگی، العياذ بالله اللهم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں میں اگر کوئی ایک شخص بھی ایسا ہو، جو مسائل طہارت وصلوۃ سے بخوبی واقف ہو، اور قرآن پاک صحیح پڑھتا ہو اور ڈاڑھی بھی شرعی رکھتا ہو اس کے ہوتے ڈاڑھی مونڈانے والے کو امام بنانا درست نہیں اگر وہ امامت کرے گا تو سب مقتدیوں کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی، ہاں اگر کوئی مقتدی ایسا نہ ہو سب ڈاڑھی مونڈانے والے ہی ہوں، تو یہ حکم نہ ہوگا، بلکہ ان میں کا جو افضل ہو اس کو امام بنا دینا درست ہوگا، یہی حکم تراویح میں بھی امامت کا ہے باقی اقتداء کو بھی مطلقاً حرام کہہ دینا صحیح نہیں ہے (۲)، بلکہ یوں کہیں گے کہ ایسے امام کے پیچھے پڑھنے سے الم ترکیف سے پڑھ لینا بہتر ہوگا، اس وقت جو شخص ڈاڑھی کی سنت کا احیاء کرے گا وہ ان پاک حدیثوں:

"من أحيٰ سنتي عند فساد أمتيّ فله أجر مائة شهيد أو كما قال" (۳) اور "من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي، فإن له من الأجر مثل أجور من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيأً، ومن ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله ورسوله كان عليه من الإثم مثل آثام من عمل بها ولا ينقص من

۱- درمختار مع ردالمحتار ۳۹۸/۳۔

۲- "ويكره تقديم العبد .... والفاسق، لأنه لا يهتم لأمر دينه..... وإن تقدموا جاز لقوله عليه السلام: صلوا خلف كل بر وفاجر" (ہدایہ ۱۰۱/۱، نصب الرایہ ۲۶/۲)، میں اس کی روایت کو دارقطنی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس پر کلام بھی نقل کیا ہے، نیز ابوداؤد کی ایک روایت کا حوالہ دیا ہے جو سنن میں ان الفاظ میں مذکور ہے: "والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براً كان أو فاجراً وإن عمل الكبائر... "الحدیث (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الغزو مع ائمۃ الجور حدیث نمبر ۲۵۳۳، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲۱۰/۱) (مرتب)۔

۳- "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: "من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد" (مشکوۃ مع شرح الطیبی ۴۰۳/۱، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)۔

أوزارهم شيئاً رواه الترمذي وابن ماجة" (۱) (مشکوۃ ص ۳۰) کا مصداق بنے گا، اوران حدیثوں کی فضیلت سے کامران وبامراد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۱۰/ ۱۴۰۰ھ

کیا غیر روزہ دار، روزہ دار کی امامت کرسکتا ہے؟

ا- ایک شخص جو مسجد میں پنجگانہ نماز کی امامت کرتا ہے وہ بوجہ بیماری رمضان کے روزے نہیں رکھتا ہے کیا وہ روزے دار نمازیوں کی امامت کرسکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر امام ایسے مرض کا مریض ہے کہ شرعاً بھی اس کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور اس مرض کی وجہ سے نماز میں کوئی فتور نہیں واقع ہوتا تو اس کی امامت جائز ہے (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

شادی شدہ عورت کا نکاح پڑھانے والے کی امامت:

کوئی شخص جو کہ پیش امام بھی ہو اور ایسا نکاح پڑھا دے جس کی طلاق نہ ہوئی ہو اور مدت عدت بھی پوری نہ ہوئی ہو اور ایسا نکاح دانستہ طور پر امام صاحب پڑھا دیں تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے اور اس کی امامت شرعاً جائز ہے؟

۱- سنن ابن ماجہ ۱/ ۷۶ مقدمہ باب من أحیا سنۃ قد أمیتت حدیث ۲۱۰، اور سنن ترمذی ۵/ ۴۵ کتاب العلم باب ما جاء فی الأخذ بالسنۃ حدیث ۲۶۷۷، دونوں کتابوں میں مروی احادیث کے الفاظ میں فرق ہے معنی ایک ہے، یہاں مذکور حدیث میں دونوں کے الفاظ خلط ملط ہیں، البتہ مشکوۃ میں دوسری والی روایت من وعن ہے (مرتب)۔

۲- "فمن شهد منكم الشهر فليصمه ومن كان مريضاً أو على سفر فعدة من أيام أخر يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر ..." (سورہ بقرہ: ۱۸۵)، اس عذر کی وجہ سے اس پر فسق کا اطلاق نہیں ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر امام نے دیدہ دانستہ بالقصد ایسا نکاح پڑھایا ہے تو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا، امام کو فوراً توبہ کرنا چاہیے اور جب تک تائب نہ ہو جائے اور اس کے حالات سے لوگوں کو اطمینان نہ ہو جاوے اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا۔ اور اگر امام واقعہ نہیں جانتا تھا اس کو دھوکہ دیا گیا تھا تو اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور نہ اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید

امرد صبیح کی تراویح میں امامت کا حکم:

میرے فرزند حافظ محمد آصف خان سلمہ کی عمر پندرہ سال ہے کیا وہ نماز تراویح کی جماعت پڑھا سکتا ہے۔

کم از کم کتنے سال کی عمر میں نماز تراویح کی جماعت پڑھا سکتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

لڑکے کی عمر جب پندرہ سال پوری ہو جائے تو خواہ اور کوئی علامت بلوغت کی ظاہر نہ ہو جب بھی شریعت کے نزدیک بالغ تسلیم کیا جاتا ہے (۲) اور امامت کر سکتا ہے، ہاں اگر لڑکا امرد صبیح اور زیادہ حسین ہے یا دیکھنے میں کم سن معلوم ہوتا ہو (۳) اور مصلیوں میں کوئی دوسرا آدمی امامت کا زیادہ اہل موجود ہو تو اس کی امامت افضل ہے (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "لا يجوز للرجل أن يتزوج زوجة غيره وكذلك المعتدة" كذا في السراج الوهاج (فتاوی عالمگیریہ ۱/۲۸۰) "وتجوز إمامة الأعرابي والأعمى والعبد وولد الزنا والفاسق"، كذا في الخلاصة، إلا أنها تكره هكذا في المعون (فتاوی عالمگیریہ ۱/۸۵) (مرتب)۔

۲- "فإن لم يوجد فيهما شيئ فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۲۵)۔

۳- "وكذا تكره خلف أمرد الظاهر أنها تنزيهية أيضا، والظاهر أيضاً كما قال الرحمتي أن المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة" (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۳۰۱) (مرتب)۔

۴- "هذا إن وجد غيرهم وإلا فلا كراهة" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۳۰۱)۔

ڈاڑھی کتروانے والے کی امامت:

ڈاڑھی کتروانے والے امام کے پیچھے کیا نماز مکروہ ہوتی ہے کیا وہ فاسق کہلاتا ہے۔شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ بحوالہ کتب جواب سے نوازیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

جو شخص ڈاڑھی منڈاتا ہے یا کترواکر ایک مشت سے کم رکھتا ہے اس کے پیچھے نماز بکراہیت ادا ہوجاتی ہے "**لانه في الدر ويكره امامة عبد وفاسق**" (۱)، اور ڈاڑھی کا مسئلہ بہت اہم ہے، ڈاڑھی رکھنا سنت انبیاء ہے اور شعار اسلام میں داخل ہے حدیث شریف میں جو صحیحین میں ہے۔

"**احفوا الشوارب واعفو اللحىٰ**" نیز مسلم شریف میں ہے: "**جزو الشواب واعفو اللحى وخالفوا المجوس**" (شامی ۱۵۵/۲) (۲)۔

اور یہ سب حکم صیغہ امر کے ساتھ ہے جو وجوب کے لئے ہوتا ہے اور درمختار علی الشامی (ص ۱۵۵) میں ہے: "**وأما الأخذ منها وهي دون ذلک (ای القبضة) كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم**" (۳)، ان سب عبارتوں کا مفاد کم از کم اتنا ضرور نکلے گا کہ اس کے مرتکب کے پیچھے نماز بکراہت ادا ہو۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۵/۱۴۰۳ھ

ڈاڑھی منڈانے کا حکم:

داڑھی کا منڈھانا کتنا گناہ ہے؟

مفتی حسن انصاری مقام گڈھی سلیم پور، مراد آباد

۱- البدعۃ خمسۃ أقسام باب الامامۃ ۱/ ۳۷۶ دار احیاء التراث، بیروت وکذا فی الہدایہ کتاب الصلاۃ باب الامامۃ ۱/ ۱۲۲، رشیدیہ، دیوبند۔

۲- مطلب فی الاخذ من اللحیۃ، باب ما یفسد الصوم ۲/ ۱۱۳، نیز روایات کی تخریج چند صفحات قبل گذر چکی ہے (مرتب)۔

۳- مطلب فی الأخذ من اللحیۃ، باب ما یفسد الصوم ۲/ ۱۱۳، دار احیاء التراث، بیروت وکذا فی المرقاۃ ۲/ ۹۱، باب السواک کتاب الطہارۃ۔

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت اور اس سے متعلق چند مسائل:

۱-غیر شرعی داڑھی والے حافظ قرآن جو نماز کے باہر ٹخنہ سے نیچے پتلون بھی اکثر لٹکائے رہتا ہے، سینما بھی دیکھتا ہے، فوٹو بھی مستورات کی مجلسوں تک میں جا کر اتارتا ہو، نماز جماعت بھی اکثر چھوڑتا رہتا ہو، کا امام بن کر نماز فرض اور نماز سنت تراویح پڑھانا کیسا ہے برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مع حوالہ جات کے تفصیلی جواب تحریر فرمادیں جو اشاعت بھی کیا جانے والا ہو۔

۲-ڈاڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟　　　　۳-ڈاڑھی کی شرعی مقدار کیا ہے؟

۴-ڈاڑھی شرعی مقدار سے کم وبیش رکھنا کیسا ہے؟　　　　۵-اور ایسے لوگوں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

۶-غیر شرعی ڈاڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز فرض، نماز سنت تراویح ادا کرنا کیسا ہے، جبکہ شرعی ڈاڑھی والا شخص موجود ہو؟

۷-غیر شرعی ڈاڑھی والے کی اذان وتکبیر کہنا، نکاح پڑھوانا گواہی دینا کیسا ہے، جبکہ شرعی ڈاڑھی والے (خصوصاً اذان وتکبیر کہنے والے) موجود ہوں؟

ابراہیم یوسف باوا رنگون

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: ہر نمبر کا جواب دینے سے پہلے بطور تمہید کے چند باتیں معروض ہیں اس سے مذکورہ نمبروں کا جواب آسانی سے ذہن میں آسکے گا۔

تمہید: بے شمار احادیث صحیحہ میں ڈاڑھی رکھنے کی اور مونچھ کٹانے کی بلکہ چھوٹی سے چھوٹی کر لینے کی بہت زیادہ تاکیدیں وارد ہیں اور اس کے خلاف کرنے پر سخت سخت مذمتیں وارد ہیں یہاں بطور نمونہ محض چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں، مثلاً بعض روایات صحاح میں ہیں: "اوفروا اللحی واحفوا الشوارب" (۱) بعض میں ہے: "أنهكوا الشوارب

۱- عن ابن عمر قال: "قال رسول الله ﷺ: خالفوا المشركين، أو فروا اللحى، وأحفوا الشوارب، وفي رواية: انهكوا الشوارب، و أعفوا اللحى" باب الترجل، کتاب اللباس حدیث نمبر: ۴۴۲۱، مشکاۃ مع شرح الطیبی ۸/ ۲۴۷ والنسائی کتاب الطہارۃ ۱/ ۱۳-۱۵۔

واعفوا اللحی"(۱)،ان دونوں حدیثوں کا مفہوم یہ ہے کہ ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو اس طرح چھوٹی کراؤ کہ جلد کھل کر صاف ہو جائے بعض روایات میں "قصوا الشوارب واعفوا اللحی"(۲) اور بعض روایات میں ان کلمات کے ساتھ: "وخالفوا المشرکین" (۳) اور بعض میں:"خالفوا زی الاعاجم" (۴) اور بعض میں "خالفوا زی المجوس" ہے ،ان روایتوں کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکوں اور غیر مسلم عجمیوں کی مشابہت نہ اختیار کرو، بلکہ اس کی مخالفت کرو۔

چنانچہ عجمیوں اور مشرکوں میں عموماً ان کا مذہبی شعار دیکھا جاتا ہے ،ڈاڑھی مونڈانے اور مونچھ بڑھانے کا اور اسی اعتبار سے مونچھ کٹانے اور مٹانے کو اور ڈاڑھی بڑھانے کو اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے (۵)،بعض روایات میں "عشرة من الفطرة"(۶) اور بعض میں "خمس من الفطرة"(۷) اور بعض میں "من خصال الأنبیاء" اور تقریبا سب میں ڈاڑھی بڑھانے کو ضرور شمار کیا ہے ،اور "فطرہ کے معنی جبلۃ سلیمہ (۸) کے ہیں ،یعنی صحیح فطرت انسانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مونچھیں ختم کی جائیں، یا کٹائی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے ،نیز بعض روایات صحاح میں اسی خصلت (مونچھ چھوٹی سے چھوٹی رکھنا یا بالکل کٹا دینا اور ڈاڑھی بڑھانا) کو فطرت انبیاء بتایا گیا ہے ،جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خصلت تمام انبیاء علیہم السلام کی

۱- حوالہ مذکور۔

۲- مذکورہ حوالہ جات۔

۳- مشکاۃ کتاب اللباس باب الترجل ۸/ ۲۴۷۔

۴- ڈاڑھی اور مونچھ سے متعلق احادیث صحاح ستہ میں ان الفاظ میں وارد ہیں:"خالفوا المشرکین ووفروا اللحی واحفوا الشوارب" (مشکوۃ حوالہ مذکور (مرتب)۔

۵- "وقص اللحیة من صنع الأعاجم وهو الیوم شعار کثیر من المشرکین کالافرنج والهنود ومن لا خلاق له فی الدین من الطائفة القلندریة" (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۲/ ۴)۔

۶- عن عائشة قال: قال رسول الله ﷺ: "عشرة من الطفرة: قص الشارب، واعفاء اللحیة، والسواک، والاستنشاق بالماء، وقص الاظفار وغسل البراجم و نتف الإبط وحلق العانة وانتقاص الماء" (دیکھئے: سنن دار قطنی کتاب الطہارۃ ۱/ ۹۵، موسوعہ اطراف الحدیث ۵/ ۴۳۹)۔

۷- عن أبی هریرة قال: "خمس من الفطرة" الخ (دیکھئے: أوجز المسالک باب ماجاء فی السنۃ فی الفطرۃ، ۱۴/ ۲۲۳، مشکاۃ مع شرح الطیبی کتاب اللباس ۸/ ۲۴۶، ابوداؤد حدیث نمبر ۴۱۹۸، کتاب الترجل ۴/ ۸۴)۔

۸- "کل مولود یولد علی الفطرة ... والمعنی أنه یولد علی نوع من الجبلة والطبع المتهیٔ بقبول الدین، عشر من الفطرة أی من السنة، یعنی سنن الأنبیاء علیهم السلام التی أمرنا أن نقتدی بهم" (النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر ۳/ ۴۵۷ باب الفاء مع الطاء، نیز دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۲/ ۴) (مرتب)۔

سنت اور طریقہ مسلوکہ ہے جو یقیناً محبوب عند رب العالمین شکل بھی ہے۔انہی روایات کی بنا پر تمام فرق اسلامیہ کا سوائے بعض روافض وبعض خوارج کے سب کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ صورت (مونچھ) کٹی یا اس طرح صاف ہو کہ جلد (چمڑا) نمایاں ہو اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہو اور یہ صورت اسلامی اور مذہبی شعار میں شمار ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ڈاڑھی کم سے کم کتنی لمبی اور بڑی ہو اور اس میں آپس میں کچھ ضمنی اختلاف ہے، مگر ڈاڑھی رکھنا واجب سب کے نزدیک بالاجماع ہے، بعض اصحاب ظواہر ظاہر نص کے اعتبار سے کٹوانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے بالکل چھوڑے رکھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں، ایک قول حضرت امام احمد بن حنبل کا بھی یہی ہے، دوسرا قول دوسرے ائمہ کی طرح کچھ توسع کا ہے اور اس توسع کی بنا ان روایات پر ہے جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ وہ اطراف لحیہ سے کچھ کٹوا کر لحیہ کو مرصع اور جمیل بنا لیتے تھے، اور حضور اکرم ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں حوالہ جات ہے کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی کثہ (گھنی) اور مسترسلہ (لٹکی ہوئی) اس طرح پر تھی کہ وہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کے بال کٹ کر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے، یا محض کھونٹی کی طرح ہوں، ایسے نہیں تھے، بلکہ مسترسل (لٹکے ہوئے) تھے، مگر ساتھ ہی حضرت ابن عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ کٹا کر ایک قبضہ (چار انگل کی مقدار) سے کم کرا لینے کو کسی صحابی نے بھی جائز نہیں قرار دیا ہے۔ کما فی رد المحتار ج ۲ ص ۱۱۳، (۱) یعنی ایک قبضہ (مشت) سے جو لوگ کم کرا لیتے ہیں اس کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا ہے۔

اور حضور ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں ہے کہ آپ کی لحیہ مبارکہ (ڈاڑھی مبارک) کثّہ (گھنی) اور مسترسلہ (دراز لٹکی ہوئی) (۲) اس طرح پر تھی کہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ڈاڑھی کے بال کٹ کر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے یا محض کھونٹی کی طرح نہیں ہوتے تھے، بلکہ مسترسل لٹکے ہوئے تھے اور پیچھے سے بھی نظر آتے تھے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ کان کے نیچے بھی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑے اور لمبے ہوتے تھے کہ شانہ مبارک کے اوپر سے بھی لٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے چاہے دو انگل ہو یا تین انگل ہو یا چار انگل ہو، مگر لٹکے ہوئے اور دراز ضرور ہوتے

۱- "وأما الاخذ منها و هي دون ذلک (ای القبضة) كما يفعله المغاربة و مخنثة الرجال فلم يبحه أحد" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۹۸) (مرتب)۔

۲- یہ لفظ کسی حدیث میں نہیں ملا، البتہ بخاری کی اس حدیث سے اس پر دلالت ہوتی ہے: "عن أبي معمر قال: قلنا لخبابؓ أكان رسول اللهﷺ يقرأ في الظهر والعصر قال نعم، قلنا بما كنتم تعرفون ذاک قال: باضطراب لحيته" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۲۳۳، کتاب الأذان باب رفع البصر إلى الإمام في الصلاة حدیث ۷۴۶) (مرتب)۔

تھے۔اور اسی کے اندر اندر تمام ائمہ کا قول دائر ہے، جڑ سے ڈاڑھی کٹا دینے کا یا مونڈا دینے کا کسی کا مذہب نہیں ہے،اور پورے ڈاڑھ پر (یعنی نیچے کا جبڑا جس کی ہڈی پر نچلے دانت لگے ہوتے ہیں) اس پر جو بال ہوں وہ سب ڈاڑھی میں شمار ہیں اور اس پورے بالوں کا یہی حکم ہے، جو ابھی مذکورہ ہوا، کیونکہ حدیث پاک میں صیغہ امر کے ساتھ: "واعفوا اللحی، ارخوا اللحی" وغیرہ حدیثیں وارد ہیں اور صیغہ امر وجوب کے لئے ہونا مسلم ہے اور اس سے مراد وہی بال ہیں جو لحیین پر اُگے ہوتے ہیں (۱)۔

انہی روایات کی بناء پر حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پورے لحیین میں کہیں چار انگل سے کم مقدار بالوں کی کٹا کر نہ ہو، اور اس کی تائید مزید حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر سے بھی ہوتی ہے جس کو فقہاء کرام ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں،"وصح عن ابن عمر راوی هذا الحديث أنه كان يأخذ الفاضل عن القبضة (فقط إلى قوله، وأما الأخذ منها وهي دون ذلك (أي القبضة) كما يفعله المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد" (۲)۔

غرض ڈاڑھی مونڈانا زی اعاجم ومشرکین میں داخل ہو کر حرام ہے ہی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صفایا سے مخنثین کے مشابہ ہو کر مزید حرمت کا سبب اور باعث مذمت وباعث غضب خداوندی اور بغاوت عن قول الرسول علیہ السلام کے مشابہ ہوگا، جیسا کہ شیخ احمد نفراوی مالکی کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے جسکو وہ فقہ مالکی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فما عليه الجند في زماننا من أمر الخدم بحلق لحاهم دون شواربهم لا شك في حرمته عند جميع الأئمة لمخالفة لسنة المصطفى ﷺ ولموافقته لفعل الأعاجم والمجوس" (۳)۔

غرض زمانہ رسالت علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے لے کر برابر ڈاڑھی کے معاملہ میں اسی پر وجوباً عمل ہوتا چلا آ رہا تھا اور کتاب وسنت سے بھی یہی صورت متعین ہو کر اسلامی شعار متعارف ہے،مگر مسلمانوں کے اسباب زوال میں ایک سبب کہئے جو اپنے نحوست اعمال سے پیدا ہوئے کہ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بعض خطہ کے لوگوں نے ڈاڑھی مونڈانا شروع کر دیا، پھر بعض علماء مستشرقین نے تہذیب مغرب زدگی سے متاثر ہو کر ڈاڑھی کی شرعی حیثیت ہی کو متبدل ومتغیر کرنا شروع کر دیا، اور ڈاڑھی بالکل غیر شرعی چیز، بلکہ محض طبعی شئی قرار دینے لگے، اور اس معاملہ میں مکمل چھوٹ دینے لگے، یہاں تک کہ بہت

۱- "اللحية اسم لجميع من الشعر ما نبت على الخدين والذقن" (مجمع بحار الانوار ۴/۴۸۸) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۹۸ س

۳- ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں مصنفہ مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری ۲۶/۔

سے پڑھے لکھے ذی ہوش وذی علم حضرات اور بہت سے خطباء اور ائمہ مساجد بھی متاثر ہونے لگے- الامان والحفیظ- پھر یہ وبا ایشیاء میں غالباً سب سے پہلے مصر میں آئی پھر یہ وبا بلا بن کر اس قدر عام ہوگئی کہ عرب کے دیگر ممالک میں بھی عام طور سے پھیل گئی اور ایک سنت رسول علیہ السلام جو شعار کا درجہ رکھتی تھی وہ مردہ ہونے لگی اور حدیث پاک "من ترک سنتی لم ینل شفاعتی" (۱) او کما قال علیہ السلام کے وبال میں مسلمانوں کو اس وبا نے مبتلا کر دیا اور ترک سنت رسول علیہ السلام کا وبال دنیا اور آخرت دونوں جگہ ذلت ورسوائی ونامرادی وناکامیابی ہے، جیسا کہ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے: "أبغض الناس إلى الله ثلاثة ملحد في الحرم ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق"، رواہ البخاری (۲)، بلکہ ترک سنت گمراہی کے شہر کا دروازہ ہے، حدیث شریف میں ہے، موطا امام مالک میں مروی ہے، "قال رسول الله علیہ السلام تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله" (۳)۔

ترجمہ: یعنی نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک تم لوگ ان دونوں کے مطابق عمل کرتے رہو گے گمراہ نہ ہوسکو گے، ایک کتاب اللہ دوسرے سنت رسول اللہ، ظاہر ہے کہ جب سنت رسول علیہ السلام چھوڑ کر انسان گمراہی کے شہر میں داخل ہو جائے گا تو پھر جتنی بھی گمراہی وذلت ونکبت آوے کم ہے، اللهم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا آمين۔

اس تمہید کے بعد اب استفتاء کے اندر مندرجہ سوالوں کا جواب نمبر وار مذکور ہے:

(۱) ڈاڑھی شرعی ومذہبی شعار ہے اس کی حفاظت کرنا اور اسکو نمایاں رکھنا شرعاً واجب ہے۔

(۲و۳) ڈاڑھی کی شرعی مقدار کم سے کم ایک قبضہ (مشت) ہے جو کم وبیش چار انگل ہوتی ہے اور اس کو برقرار رکھنا واجب ہے۔

(۴) ایسے لوگ واجب کے تارک اور اسلامی ومذہبی شعار کو پامال کرنے والے اور مٹانے والوں کے مشابہ ہوتے ہیں جو عند اللہ نہایت مبغوض ہیں اور انہی وجوہ سے ایسے لوگ عند اللہ فاسق شمار ہوتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کے پیچھے ایسے

۱- ردالمحتار علی الدر المختار ۱/ ۲۲۰، کتب حدیث میں ان الفاظ میں کوئی حدیث نہ مل سکی، البتہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "ومن نكث ذمتي لم ينل شفاعتي ولم يرد علي الحوض" (مجمع الزوائد ۱/ ۱۷۲) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۲/ ۲۱۰، حدیث ۶۸۸۲، ....بغير حق ليهريق دمه (مشکوۃ ص ۲۷) (مرتب)۔

۳- موطا امام مالک مع شرحہ تنویر الحوالک للسیوطی ۳/ ۹۳ (مرتب)۔

لوگوں کی نماز مکروہ ہوتی ہے جو شرعی شکل وصورت رکھنے کے ساتھ ساتھ امامت کے بھی اہل ہوں۔

(۵) جب شرعی ڈاڑھی رکھنے والے امامت کے اہل موجود ہوں یعنی قرآن پاک صحیح پڑھتے ہوں اور طہارت ونماز کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں اور محتاط بھی ہوں تو ایسے شخص کے موجود ہوتے ہوئے غیر شرعی ڈاڑھی رکھنے والے کو امام نہیں بنانا چاہئے۔ ورنہ سب کی نماز بکراہت ادا ہوگی، اور کراہت کے اندر غلظت وشدت میں تفاوت ہو تو یہ الگ بات ہوگی، مثلاً ایک شخص ڈاڑھی مونڈانے کا عادی ہے اور قصداً مونڈاتا رہتا ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے کراہت تحریمی ہوگی اور اس کراہت میں غلظت وشدت باعتبار اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے زیادہ ہوگی جو مونڈاتا نہیں، بلکہ وہ کٹا کر چھوٹی اور غیر شرعی رکھنے کا عادی ہے اور قصداً ایسا کرتا رہتا ہے پھر اس شخص کی اقتداء کرنے میں کراہت کے اندر غلظت وشدت زیادہ ہوگی باعتبار اس شخص کی اقتداء کے جو ایسا کرنے کا عادی نہیں، بلکہ کبھی کبھی بعض اتفاق سے اس سے ایسا ہو جاتا ہے، البتہ ایسے شخصوں کو بھی مستقل عہدۂ امامت دینا اور مستقل امام مقرر کرنا درست نہیں۔

اور اگر شرعی ڈاڑھی رکھنے والا اور امامت کا اہل موجود ہی نہ ہو تو اس وقت انہی میں سے جو زیادہ دیندار اور متبع سنت ہو اسی کو امام بنا کر نماز باجماعت پڑھ لیں جماعت ہرگز ترک نہ کریں، یہی حکم فرض وتر اور تراویح سب کے بارے میں ہے۔

اگر کسی مسجد کا مقرر شدہ امام غیر شرعی ہو، مگر ایسا فاسد العقیدہ ہونا معلوم نہ ہو جس کے پیچھے نماز نہ ہوتی ہو اور اس کا نصب وعزل بھی اپنے اختیار واستطاعت میں نہ ہو، یا کسی اجنبی جگہ پہنچ جائیں جہاں کا امام اسی قسم کا ہو اور نصب وعزل اپنے اختیار میں نہ ہو تو صبر کریں اور حدیث پاک: "**صلوا خلف كل بر وفاجر** او کما قال علیہ السلام" (۱) کے حکم کے مطابق اس کے پیچھے پڑھ لیں جماعت ترک نہ کریں۔

اور اگر اصلاح کرنا چاہیں اور اصلاح کی توقع ہو جب بھی: "**اذهبا إلى فرعون إنه طغى فقولا له قولاً لينا لعله يتذكر أو يخشى**" (۲) کے اصول کو اور: "**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن**" (۳) کے ضابطے کو ہمیشہ سامنے رکھیں اور کبھی اس کو نہ چھوڑیں اور کبھی ایسا طریقہ اختیار نہ کریں جو آپس کے نفاق وشقاق یا اختلاف ونزاع کا باعث بنے ہمیشہ "**لست عليهم بمصيطر**" (۴) کو بھی پیش نظر

۱- سنن الدارقطنی باب صفۃ من تجوز الصلوۃ معہ والصلوۃ علیہ ۲/۵۷ (مرتب)۔

۲- سورۂ طٰہٰ: ۴۴۔

۳- سورۂ نحل: ۱۲۵۔

۴- سورۂ غاشیہ: ۲۲۔

رکھیں۔

(٦) ایسے شخص کو موذن مکبر اور قاضی نکاح مقرر کرنا مذموم ومکروہ ہے باقی متشرع آدمی کے موجود رہتے ہوئے بھی ان کی دی ہوئی اذان وتکبیر سے جو نماز پڑھی جائے گی وہ بلا کراہت ادا ہو جائے گی (١)، اسی طرح ایسے قاضی نکاح کا پڑھایا ہوا نکاح بھی بلا کراہت صحیح ونافذ ہو جائے گا۔

البتہ گواہی کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ جس گواہی میں محض تحمل شہادت کافی ہوتا ہے اس میں ان کا گواہ بننا معتبر ومفید ہوگا، جیسے عقد نکاح کہ اس میں ان کا شاہد بننا معتبر اور کافی ہے۔ کیونکہ یہ گواہی محض عقد نکاح منعقد ہونے کے لئے ہوتی ہے اور محض تحمل شہادت کے درجہ کی چیز ہوتی ہے اور انعقاد نکاح کے بعد صحت نکاح کے نفاذ یا بقاء کے لئے پھر ان شاہدوں کی ضرورت نہیں باقی رہتی، بلکہ شہرت عامہ وتسامع وغیرہ کافی ہوجاتی ہے، باقی یہ الگ بات ہے کہ اس میں بھی دیندار لوگوں کا گواہ بنانا اعلیٰ وافضل بات ہے (٢)، باقی جن معاملات میں تحمل شہادت کے ساتھ ساتھ ادائے شہادت بھی ضروری ہوتی ہے، جیسے رؤیت ہلال کے ثبوت کے لئے شہادت کہ اس میں تحمل شہادت اور ادائے شہادت دونوں چیزیں لازم ہوتی ہیں تو اس میں عادل ہونا یا کم از کم مستور الحال ہونا ضروری ہوتا ہے۔

عادل شریعت کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی صلاح زیادہ ہو اس کے فساد سے اور صواب غالب ہو خطا سے اور سلیم القلب ہو کما فی قاضیخان علی ھامش الہندیہ (٢/٤٦٠) **"إن كان صلاحه أكثر من فساده وصوابه أغلب من الخطأ ويكون سليم القلب يكون عدلاً تقبل شهادته"** (٣) قاضیخاں محض صاحب ترجیح ہی نہیں ہیں بلکہ صاحب تخریج بھی ہیں انہوں نے فساد زمانہ کے پیش نظر امام ابو یوسفؒ کی تحقیق کو قول مفتی بہ میں ترجیح دی ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: **"وعن أبي يوسف إن كان الفاسق وجيهاً ذا مروة جازت شهادته؛ لأن مثله لا يكذب"** (٤)۔

١- "ويكره أذان الفاسق ولا يعاد هكذا في الذخيرة" (فتاوی عالمگیریہ ١/٥٤) (مرتب)۔

٢- "وشرط في الشاهد أربعة أمور الحرية والعقل والبلوغ والإسلام... ويصح (أى النكاح) بشهادة الفاسقين والأعميين" (فتاوی عالمگیریہ ١/٢٦٧ کتاب النکاح)، "الفسق لا يمنع أهلية الشهادة عندنا فينعقد النكاح بحضرته، وإنما يمنع أداء الشهادة لتهمة الكذب" (فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ٢/٤٦٠) (مرتب)۔

٣- فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ٢/٤٦٠، "لأن غير المعصوم لا يخلو عن قليل ذنب فيعتبر فيه الغالب وعن أبي يوسف رحمه الله تعالى ..... لأن مثله لا يكذب" (مرتب)۔

٤- فتاوی قاضی خان بحوالہ بالا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرعی ضابطہ کے مطابق عادل ومستور الحال نہ ہو، لیکن ایسا باوجاہت اور ذی منصب وذی مروۃ ہو کہ جھوٹ بولنے کو اپنے منصب کے خلاف اور اپنی توہین سمجھتا ہو اور واقعۃً ایسا ہی ہو کہ اس سے کذب صادر نہ ہوتا تو اس کی بھی شہادت مقبول ومعتبر ہوگی، اسی طرح اگر مالی معاملات میں اتنا دیانت دار وصاف مشہور رہو کہ اپنے مالی نقصان کے باوجود بھی جھوٹ نہ بولتا ہو تو لایکذب کی علت کے اطراد سے اسکی بھی شہادت مقبول ومعتبر ہوگی۔

تصویر کشی کی شرعی حیثیت اور ترک جماعت پر وعید:

(۷) اس نمبر کا حکم شرعی بھی بعینہٖ نمبر ۵ کا حکم ہے، اور شرعی ڈاڑھی رکھنا اسلامی ومذھبی شعار ہونے کے ساتھ ساتھ واجب ہے، اس کو ہمیشہ مونڈانے یا کتا کر غیر شرعی بنانے یا بنوانے والا ترک واجب پر اصرار کرنے والا اور سنت انبیاء اور سنت جناب مصطفیٰ ﷺ کا مخالف ہوگا جو نہایت خطرناک معصیت ہوگی، پاجامہ یا پتلون یا تہمد قصداً ٹخنہ سے نیچے رکھنا احادیث پاک میں عجمی متکبروں کی خصلت فرمایا گیا ہے (۱) اور حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ جس کے قلب میں رائی کے دانہ کی دال کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں داخلہ تو درکنار جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا اور جنت کی خوشبو ایک ماہ کی مسافت تک پہنچتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے قلب میں ذرا بھی کبر کا شائبہ ہوگا وہ بھی جنت سے ایک ماہ کی مسافت کے فاصلہ سے بھی دور رکھا جائے گا (۲)۔

فوٹو خواہ دستی بنا ہوا ہو یا مشین یا کسی آلہ یا نگیٹیو وغیرہ کسی بھی ذریعہ سے بنا ہو سب کے اعتبار سے مطلقا فرمایا گیا ہے: "أشد الناس عذابا یوم القیمة ألمصورون" او کما قال علیہ السلام (۳) اور ایک حدیث میں ہے کہ تصویر بنانے والے سے آخرت میں کہا جائے گا کہ تصویر تو بنائی اب اس میں روح بھی ڈال دو وہ روح نہیں ڈال سکے گا گرز گرز مارا جائے گا اور اس پر ہمیشہ ہمیشہ یہی عذاب ہوتا رہے گا (۴)، فالأمان والحفیظ ان وعیدوں سے فوٹو اتارنے کے گناہ و

۱- "عن ابن عمرؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: لا ینظر اللہ إلی من جر ثوبہ خیلاء" (صحیح مسلم کتاب اللباس حدیث ۴۲/۲۰۸۵) (مرتب)۔

۲- "عن عبد اللہ عن النبی ﷺ قال: لا یدخل الجنة من کان فی قلبہ مثقال حبة من خردل من کبر، ولا یدخل النار من کان فی قلبہ مثقال خردلة من إیمان" (سنن ابوداؤد ۵۹/۴ کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر، حدیث ۴۰۹۱) (مرتب)۔

۳- صحیح مسلم کتاب اللباس حدیث ۹۸/۲۱۰۹۔

۴- "عن ابن عمرؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: الذین یصنعون الصور یعذبون یوم القیامة یقال لھم: أحیوا ما خلقتم" (صحیح مسلم کتاب اللباس ۹۷/۲۱۰۸) "وفی روایة: من صور صورة فی الدنیا کلف أن ینفخ فیھا الروح یوم القیامة ولیس بنافخ" (صحیح مسلم حدیث ۱۰۰/۲۱۱۰)۔

معصیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے مرتکب کی حیثیت شنیعہ بھی مفہوم ہوتی ہے اور ترک جماعت بلاعذر شرعی کرنے والوں پر جو وعید وعذاب ہے وہ بھی بے انتہا شدید ہے، اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ سرکار دو عالم علیہ السلام نے فرمایا کہ جی میں آتا ہے کہ نوجوانوں کو حکم کروں کہ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائیں اور ترک جماعت کرنے والوں کے گھروں کو ان لکڑیوں سے گھیر کر آگ لگادوں کہ وہ سب اسی میں جل کر خاک ہو جائیں، مگر عورتوں بچوں پر رحم آجانے سے چھوڑ دیتا ہوں (۱) یہ معمولی اظہار غصہ جناب نبی کریم علیہ السلام کا نہیں ہے، اس لئے ان قبیح عادات پر مشتمل انسان کی امامت کا ادنی حکم وہ ہوگا جو نمبر ۵ میں بتلایا گیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۱/۱۴۰۰ھ

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت:

۱۔ ڈاڑھی رکھنا واجب ہے یا مستحب ہے ڈاڑھی منڈانے والا اور کترانے والا اور اس پر اصرار کرنے والا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے ڈاڑھی کتروانے والے کی شہادت شرعاً جائز ہے یا کہ نہیں؟

۲۔ رسول علیہ السلام اور صحابہ اور تابعین کا کیا عمل رہا ہے، کیا ان کا عمل ہمارے واسطے موجب عمل ہے یا کیا ہے؟

۳۔ کیا رسول اللہ علیہ السلام کا اور صحابہ کا عمل ہمارے واسطے موجب اتباع ہے، جبکہ ڈاڑھی رکھنے کے متعلق آپ نے فرمایا ہے ایک مٹھی کی مقدار پر ڈاڑھی رکھنا واجب ہے یا کہ نہیں اس سے کم ڈاڑھی رکھنے والے کی شہادت مقبول ہے یا کہ نہیں فقہاء کا مقدار قبضہ کو متعین کرنا اور اس سے کم ڈاڑھی والے کو مردود الشہادت کہنا یہ فقہاء کا قول امر منکر نا قابل ہے یا کیا، اور ڈاڑھی والے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بے ایمان ہیں جائز ہے یا کہ نہیں یا کہنا حرام ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

ڈاڑھی اسلامی شعار میں سے ایک شعار ہے، حضور اکرم علیہ السلام اور صحابہ و تابعینؒ اور تمام اصحاب خیر القرون میں

۱- ''عن أبي هريرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب فيحطب ثم آمر بالصلوة فيؤذن لها ثم آمر رجلاً فيؤم الناس ثم أخالف إلى رجال فأحرق عليهم بيوتهم والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم أنه يجد عرقاً سميناً أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۱۲۵ حدیث ۶۴۴)، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''فقوله في رواية المقبري: لو لا ما في البيوت من النساء والذرية، يدل على أنهم لم يكونوا كفاراً'' (فتح الباری ۲/۱۲۷)۔

سے کسی کا بھی ڈاڑھی رکھنا محض عادت کے طور پر یا محض طبعی نہیں تھا، بلکہ شرعی حکم ہونے کی حیثیت سے تھا اس پر ہنسنا یا اسکا مذاق اڑانا بڑی ہی خطرناک بات ہے، یہ سب یورپ کی پیداوار ہے، احادیث صحیحہ کثیرہ سے اس کا وجوب ثابت ہے اور محض امت مسلمہ ہی کا شعار نہیں ہے، بلکہ تمام انبیاء سابقین علی نبینا علیہم الصلوۃ والسلام کا شعار اور ان سب کی سنت ہے یہ علماء کی من گڑھت بات یا اختراع نہیں ہے۔

ڈاڑھی منڈانا یا چار انگلی کی مقدار سے کم رکھنا اور اس پر اصرار کرنا فسق ہے، اس سے آدمی اللہ اور رسول کے نزدیک فاسق مردود الشہادۃ ہوجاتا ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ ڈاڑھی ایک قبضہ سے کم نہ رکھنا چاہئے، تمام صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اس مقدار کی سنت پر اجماع ہے اور اجماع صحابہ خود بھی ایک حجت شرعی ہے، ڈاڑھی مذہبی شعار کے ساتھ ساتھ ایک صحیح فطرۃ انسانی بھی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ڈاڑھی منڈانے کو جائز سمجھنا:

یہاں مسلمان ڈاڑھی منڈانا جائز سمجھتے ہیں یہاں تک کہ بڑی بڑی مساجد کے امام وخطیب بھی ڈاڑھی منڈاتے ہیں جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے ایک سنت ہے اور پہلے فرائض کی پابندی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ صورتوں کو نہیں نیتوں کو دیکھتا ہے اگر دل میں رسولؐ اور اللہ کی محبت ہے اور فرائض کی پابندی کرتے ہیں تو بس ہے براہ کرم اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

قطعاً ڈاڑھی منڈانا قطعاً نا جائز ہے، بہت سی صحیح احادیث میں اس کے رکھنے کا حکم وجوب کے صیغہ کے ساتھ ہے، مثلاً فرمایا گیا ہے: "جزوا الشوارب واعفوا اللحی" (۲) یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹو اور ڈاڑھی کو بڑھاؤ یہ حکم رسول اللہ

۱- ڈاڑھی کے وجوب سے متعلق روایات وآثار چند صفحات قبل تخریج وتحقیق کے ساتھ گذر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے (مرتب)۔

۲- اس حدیث کی تخریج گذر چکی ہے (مرتب)۔

علیہ ہے اوراس کا امتثال واجب اورضروری ہے، باطن کے ساتھ ظاہر کی بھی اصلاح اوراس کا مطابق شرع کے ہونا ضروری ہے ،پھر جب یہ لوگ بھی سنت سمجھتے ہیں تو ترک سنت پر جو وعید ہے اس کو بھی انہیں سامنے رکھنا چاہئے حدیث پاک میں ہے:"من ترک سنتی لم ینل شفاعتی" أو کما قال (۱) یعنی سنت ترک کرنے والا شفاعت سے محروم رہے گا اور یہ محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی ۔اللہ تعالیٰ سب کو اتباع سنت کی توفیق مرحمت فرمائیں،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

صفوں میں کجی ہو تو امام کا مصلی کہاں ہو:

مسجد کے صحن میں کجی اکثر آجاتی ہے بائیں طرف بڑھ جاتا ہے اس صورت میں صحن میں جماعت ہو تو مصلی محراب کے سامنے بچھایا جائے یا کہ جہاں جماعت کا بیچ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے صحن میں کجی آجانے کے سبب سے باہر جماعت کرنے کے وقت مسجد کا اندرونی محراب وسط صف میں نہیں آتا ہے تو امام صحن میں اسی جگہ کھڑا ہو جہاں پہلی باہری صف کا وسط واقع ہو(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/۱۴۰۴ھ

امام کو مصلی پر امامت کے لیے کب کھڑا ہونا چاہئے؟

۱-ہمارے یہاں ایک جماعت اقامت میں حی علی الصلوٰۃ پر کھڑی ہوتی ہے اور کچھ لوگ اس کو ناجائز سمجھ کر سختی سے مخالفت کرتے ہیں حتی کہ مخالفین نے اشتہار چھپوا کر تقسیم بھی کیے ہیں۔

۱- ان الفاظ کے ساتھ حدیث نہیں مل سکی ،البتہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں:"ومن نکث ذمتی لم ینل شفاعتی ولم یرد علی الحوض"(مجمع الزوائد ۱/۱۷۲)(مرتب)۔

۲- "وینبغی للإمام ان یقف بازاء الوسط فان وقف فی میمنۃ الوسط او فی میسرتہ فقد اساء لمخالفتہ السنۃ"(عالمگیری ۱/۸۹،مکتبہ رشیدیہ،پاکستان)(مرتب)۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مسئلہ کا ثبوت احادیث کریمہ یا شرح احادیث یا کتب فقہ سے بھی ہے یا نہیں؟

مسئلہ حی علی الصلوۃ کے عاملین مشکوۃ شریف وشرح مرقات واشعۃ اللمعات اور فتاویٰ عالمگیری وشرح وقایہ کی عبارت حتی کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب حوالہ میں پیش کرتے ہیں، آیا ان کتب معتبرہ کے حوالہ جات صحیح ہیں یا نہیں؟ اگر صحیح ہیں تو اس کو ناجائز سمجھنے والے اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب نہ ماننے والے ازروئے شرع وہ حضرات کیا حکم رکھتے ہیں؟

۲-مخالفین فرماتے ہیں کہ علما فرنگی محل کے نزدیک اقامت میں حی علی الصلوۃ پر کھڑا ہونا جائز نہیں ہے، کیا واقعی ان کا قول صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کا شرح وقایہ جلد اول میں حاشیہ پر اس کے جواز پر دلیل لکھنا اور عدم جواز کو مکروہ جاننا کیا معنی رکھتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب امام اور سب مقتدی مصلے پر پہلے سے اس طرح موجود ہوں کہ یا تو صف بھی سیدھی کر چکے ہوں یا صف سیدھی کرنے میں دیر نہ لگے گی اور تکبیر تحریمہ کی فضیلت فوت نہ ہوگی تو ادب یہ ہے کہ لوگ حی علی الصلوۃ پر کھڑے ہوں، قد قامت الصلوۃ پر یا اس کے بعد معا نماز کا تحریمہ بندھ جائے۔

ادب کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پہلے اگر کھڑے ہو جائیں تو مکروہ یا برا نہ ہو، مستحق عتاب ونکیر نہ ہوگا۔

فقہاء نے اس مسئلہ کو اسی ادب کے موقع میں لکھا ہے۔

چنانچہ صاحب ''تنویر الابصار'' اور اس کی شرح ''درمختار'' میں اس طرح ہے: "**والآداب تركه لايوجب إساءة ولا عتاباً كترك سنة الزوائد، لكن فعله أفضل، نظره إلى موضع سجوده حال قيامه، إلى قوله والقيام لإمام ومؤتم حين قيل: حي على الفلاح إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهي إليه الإمام على الأظهر، وإن دخل من قدام قاموا حين وقع بصرهم عليه**" (۱)۔

اسی عبارت کا یہ جملہ: ''**إن كان الإمام بقرب المحراب**" مفہوم بالا کا پورا پتہ دیتا ہے، اس کا حاصل یہ ہوا کہ

۱- الدرالمختار ۱/۴۴۶، ۴۴۷ کتاب الصلوۃ۔

صرف جواز میں کلام نہیں، لیکن اس کو واجب او رضروری قرار دینا کہ جو پہلے کھڑا ہو جائے اس پر نکیر یا طعن وتشنیع کی جائے جیسا کہ اس پر اصرار کرنے والے کرتے ہیں، یہ نا جائز ہے۔

اوراگر امام قرب محراب موجود نہ ہو اور نماز پڑھانے کے لیے پیچھے سے آئے تو جس صف میں آئے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں اور اگر سامنے سے آئے تو جس وقت لوگوں کی نظر امام پر پڑے اور سمجھ لیں کہ جماعت کرانے آرہے ہیں تو امام پر نظر پڑتے ہی سب لوگ کھڑے ہو جائیں، جیسا کہ عبارتِ بالا کے اس جملہ "**والافیقوم کل صف الخ**" سے معلوم ہوتا ہے۔

اوراس میں حکمت یہ ہے کہ فوراً کھڑے ہو جانے میں امام کے مصلے پر پہنچتے تک صفیں سیدھی ہو کر تکبیر اولی میں امام کی معیت بھی مل جائے گی، اور یہی طریقہ جو فقہ کی مذکورہ بالا عبارت میں مذکور ہے جناب سرکار دو جہاں ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے عمل میں ملتا ہے، کتب صحاح حدیث اور غیر صحاح جیسے مسلم شریف، ابو داؤد شریف، اور مصنف عبد الرزاق وغیرہا میں ایسا ہی معمول ملتا ہے، جیسا کہ بذل المجہود (جلد ۱، ص ۳۰۷) میں دفع تعارض بین الروایات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**ویجمع بأن بلالا کان یراقب خروج النبي ﷺ فأول ما یراہ یشرع فی الإقامة قبل أن یراہ غالب الناس، ثم إذا رأوہ قاموا فلا یقوم فی مکانه حتی تعتدل صفوفهم۔**

قلت: ویشهد له مارواہ عبد الرزاق عن ابن جریج عن ابن شهاب: إن الناس کانوا ساعة یقول المؤذن: اللہ أکبر، یقومون للصلوٰۃ، فلا یأتي النبي ﷺ مقامه حتیٰ تعتدل صفوفهم الخ"۔

ان ہی احادیث وروایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلالؓ حضور ﷺ کے نکلنے کے منتظر ومراقب رہتے تھے جیسے ہی حجرۂ مبارک سے پردہ اٹھا اور اندازہ ہوا کہ جماعت کرانے تشریف لا رہے ہیں فوراً تکبیر شروع فرمادیتے تھے اور لوگ بھی کھڑے ہو کر صف سیدھی کرنے میں مصروف ہو جاتے یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ ﷺ حجرۂ مبارک سے نکل کر آ کر مصلے پر بیٹھ جائیں، اس کے بعد مکبر تکبیر شروع کرے اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ اور دوسرے لوگ کھڑے ہوں جیسا کہ آج کل کے بدعتی لوگ کرتے ہیں یہ ان کا من گھڑت طریقہ او رخلاف سنت ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک سرکار دو جہاں ﷺ جماعت کرانے کے لئے نہ نکلتے اس وقت تک لوگ بیٹھے رہا کرتے اور انتظار فرماتے۔

شروع زمانہ میں بعض مرتبہ لوگ پہلے ہی سے کھڑے ہوکر انتظار کرنے لگے تو اس سے روکا گیا، جیسا کہ ابو داؤد شریف کی روایت: ''إذا أقيمت الصلوٰة فلا تقوموا حتیٰ ترونی'' (۱) سے معلوم ہوتا ہے، یعنی ''فلا تقوموا منتظرین للصلوٰة'' (۲)۔

اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور ابھی جماعت میں کچھ دیر ہے یا امام ابھی نہیں آیا ہے یا مکبر نے بغیر امام کی موجودگی کے تکبیر شروع کر دی ہے تو کھڑے کھڑے انتظار نہ کرے کہ یہ فعل مکروہ ہے بیٹھ جائے اور بیٹھ کر منتظرِ صلوٰۃ ہو اور اسی کو مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمۃ نے یا عالمگیری وغیرہ نے لکھا ہے۔

اس تفہیم وتشریح کے بعد تمام روایات فقہیہ وحدیثیہ آپس میں منطبق اور احناف کا صحیح مسلک واضح ہوجاتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محراب کی تعیین اور درِ مسجد کا حکم:

محراب سے مراد کیا ہے؟ کیا مسجد کی ہر در میں جو محراب کنارہتا ہے جس میں لوگ آتے جاتے ہیں محراب کی تعریف میں آتا ہے؟ یا صرف پچھلی دیوار کے درمیان منبر کے قریب جو محراب بنی رہتی ہے صرف وہی محراب ہے وضاحت فرمائیں اور یہ بھی واضح کریں کہ منبر کے قریب کی محراب کے علاوہ مسجد کی دوسری در میں اگر امام کھڑا ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اس کے صحن میں مقتدی کھڑے ہوں تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے۔

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفيق:

قبلہ کی دیوار میں بالکل بیچوں بیچ میں جو محراب نما بنایا جاتا ہے وہ مراد ہے تا کہ امام کے دونوں طرف صفوں کی مقدار برابر رہے، پس اس محراب کو چھوڑ کر اور جگہ یا کسی اور در میں کھڑے ہونے سے اگر امام کے دونوں جانب کی صفیں برابر نہ رہیں

۱- ابوداؤد ۱/ ۸۰۔

۲- شرح ابوداؤد شریف۔

کم وبیش ہوجائیں تو کراہت تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا(۱) اسی طرح اگر کسی در (محراب نما) کے اندر امام کھڑا ہوا اور سب مقتدی باہر یا صحن میں کھڑے ہوں تو اگر چہ تعادل طرفین حاصل ہو مگر اساءت ہوگی اور کراہت کو منجر ہوگی، ورنہ کوئی حرج نہ ہوگا(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

امام کا تنہا محراب میں کھڑا ہونا:

بہت سی مساجد کی تعمیر اس طرح ہوتی ہے کہ پہلی صف کے اندر ہی دیوار قبلہ سے متصل ممبر ہوتا ہے اور دیوار قبلہ سے محراب کا مدور حصہ دیوار قبلہ سے تین چار بالشت آگے باہر کو نکلا ہوا ہوتا ہے عام طور پر مصلی مذکورہ پہلی صف میں بچھایا جاتا ہے اور جماعت کے وقت مقتدیوں کی صفِ اول اس کے بعد ہوتی ہے جو درحقیقت دیوار قبلہ سے صفِ ثانی ہوتی ہے، مگر عموماً جمعہ، عیدین بارش وغیرہ کے وقت نمازیوں کے ازدہام وکثرت اور جماعت خانہ میں جگہ کی قلت کی بنا پر امام کا مصلی ذرا آگے کو محراب کے اندر کردیا جاتا ہے بایں طور کہ امام تو جماعت کے وقت خارج محراب کھڑا رہتا ہے، لیکن اس کا سجدہ محراب کے اندر واقع رہتا ہے اور مقتدی دیوار قبلہ سے متصل ممبر والی صفِ اول میں امام سے ڈھائی تین بالشت پیچھے کھڑے ہوجاتے ہیں جس کی بنا پر زیادہ تعداد میں لوگ جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں۔

ایک صاحب جو دینی جماعت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے یہ مسئلہ بتایا کہ دیوار قبلہ سے متصل ممبر والی صفِ اول مذکور میں جماعت کے ساتھ نیز بغیر جماعت کے انفرادی طور پر دونوں صورتوں میں فرض، واجب، سنت نفل کوئی بھی نماز پڑھنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے جس سے اجتناب کلی بھی ضروری ہے ان کی یہ بات موجب نزاع بنی ہوئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حرمتِ قطعیہ کے ثبوت کے لیے دلیلِ قطعی اور صریح ہونا ضروری ہے، اس لیے قطعاً حرام کہنے والے شخص سے دلیل

۱- ”السنة أن يقوم في المحراب ليعتدل الطرفان ولو قام في أحد جانبي الصف يكره“ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۳۱۰، ۴۱۴) (مرتب)۔

۲- ”وقيام الإمام في المحراب لا سجوده فيه“ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/۴۱۴) اور کراہ اس مسئلہ میں فتح القدیر ۱/۳۵۹ کی بحث بھی دیکھی جاسکتی ہے (مرتب)۔

قطعی وصریح کا مطالبہ ہوگا اگر وہ پیش نہ کر سکے تو اس کی بات قابل اعتناء والتفات بھی نہ ہوگی، اس لیے کہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جس طرح حرام قطعی کہنے والا شخص کہتا ہے، بلکہ مسئلہ اس طرح ہے کہ امام تنہا بالکل محراب کے اندر کھڑا ہو اور مقتدیوں میں سے کوئی اس امام کے ساتھ محراب کے اندر نہ ہو تو بلا ضرورت اس طرح کھڑا ہونا مکروہ ہے اور اگر امام کا نصف قدم بھی محراب کے باہر ہو تو اگر چہ سجدہ وغیرہ سب محراب کے اندر ہو تو قطعاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ بلا کراہت جائز ہے اور یہ مسئلہ فقہ کی کتبِ معتبرہ میں عام طور سے مذکور ہے(۱)۔

اور یہاں یہی صورت ہے کہ امام محراب سے باہر کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ کھڑا ہونا بلا کراہت درست رہے گا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ محراب کا مدور حصہ قبلہ کی اور دیواروں کے اعتبار سے تین چار بالشت آگے باہر کو نکلا ہوا ہے، لہٰذا وہ تمام حصہ مسجد سے خارج ہو گیا اور امام ومقتدی کا مکان الگ الگ اور مختلف ہونے کی وجہ سے اقتدا درست نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ شبہ وارد نہیں ہوتا، کیونکہ فقہاء محققین نے تصریح کی ہے کہ محراب کا یہ حصہ بھی حیز مسجد اور داخلِ مسجد ہی شمار ہوتا ہے، مسجد سے خارج شمار نہیں ہوتا، لہٰذا اختلاف مکان امام و ماموم کا وہم بھی غلط ہو گیا۔

اب رہا مقتدیوں کا صفِ اول میں امام سے صرف ڈھائی تین بالشت پیچھے کھڑا ہونا، یہ عمل چونکہ محض نمازیوں کے ازدحام وکثرت اور جماعت خانہ میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت بھی بلا کراہت جائز رہے گی، مثلاً محولہ عبارت میں بھی آگے جا کر تصریح ہے: **"وإضافة المكان فلا كراهة، وفي الدر المختار على الطحطاوي"** (ص ۴۳): **"وهذا كله عند عدم العذر كجمعة، وعيد، فلو قاموا على الوقوف والإمام على الأرض أو في المحراب لضيق المكان لم يكره، لوكان معه بعض القوم في الأصح، وبه جرت العادة في جوامع المسلمين"**(۲)۔

علاوہ ازیں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ ازدحام وغیرہ کے وقت میں سجدہ بجائے راہوں پر کرنے کے اگلی صف کے مصلیوں کی پشت پر کرنا بلا کراہت جائز ہے، بلکہ خود اپنی ران پر بھی اپنا سجدہ کر لینا ایسی بھیڑ میں بلا کراہت جائز ہے،

۱- "وكره قيام الإمام في المحراب لاسجوده فيه وقدماه خارجه، لأن العبرة للقدم مطلقاً، "قال الشامي": وكذا سواء كان المحراب من المسجد كما هو العادة المستمرة أولا كما في البحر" (فتاویٰ شامی کتاب الصلوٰۃ ۱/۴۳۴) "ويكره قيام الإمام في المحراب لاقيامه خارجه وسجوده فيه" (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح کتاب الصلوٰۃ/۳۹۴)(مرتب)۔

۲- درمختار کتاب الصلاۃ باب بلمفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا ۲/۴۱۵ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت (مرتب)۔

جیسا کہ درمختار (۱) وشامی وغیرہ میں ہے، حالانکہ ان صورتوں میں سجدہ کی بعض سنتیں بھی چھوٹ جاتی ہیں، مگر چونکہ جماعت کی فضیلت اتنی زیادہ ہے اور جماعت اتنی اہم چیز ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے اس کی تحصیل کے لیے اتنی چھوٹ دیدی پھر سوال میں ذکر کردہ صورت میں توان سنتوں کا ترک بھی لازم نہیں آتا ہے، اس لیے یہ صورت بدرجہ اولی اور بلا کراہت جائز رہے گی۔

رہ گیا یہ شبہ کہ مذکورہ صورت میں امام کے بائیں جانب اگر چہ پہلی صف میں بھی کہیں انقطاع تو واقع نہ ہو، لیکن امام کے دائیں جانب کم از کم پہلی صف میں ممبر کے حائل ہونے کی وجہ سے انقطاع صف لازم ہے اور یہ انقطاع بھی باعثِ کراہت ہوسکتا ہے یہ شبہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ (شامی ۱/ ۳۸۳) میں تصریح موجود ہے کہ ممبر کی حیلولت انقطاع صف شمار نہیں کیا جاتا ہے، "کما قال: ویعلم منه بالاولیٰ أن مثل مقصورة دمشق إلی قوله، فلا ینقطع الصف"۔

عربی کی پوری عبارت بوجہ طوالت درج نہیں کی قارئین حضرات خود دیکھ لیں (۲)۔

(۱)　اس عبارت کے دیکھنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلی صف وہی شمار ہوگی جو امام کے پیچھے قدم کی دیوار کے قریب تر صورت مسئلہ میں ہوگی۔

(۲)　صف اول کی جگہ میں بھی جماعت کے وقت کے علاوہ فرض، واجب، سنن ونوافل وغیرہ سب نمازیں بلا کراہت جائز ہیں، اس لیے کہ مسجد بنائی ہی اس لیے جاتی ہے کہ اس میں نماز وغیرہ عباداتِ مقصودہ کی جائیں، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے، پس مسلمان جس جگہ چاہے مسجد کے اندر نماز ادا کرسکتا ہے اس کو روکنا جائز نہیں ہوگا، "الا العارض"، مثلاً جماعت کا وقتِ مقررہ ہو چکا ہے اور کوئی محراب میں یا کسی ایسی جگہ پڑھنا چاہے جہاں پڑھنے سے جماعت قائم نہ ہو سکے تو کہا جائے گا کہ بھائی یہاں مت پڑھو وہاں جا کر پڑھ لو، مسجد کے اندر نماز پڑھنے سے روکنا خطرناک وعید کی زد میں آتا ہے، قال

۱-　"وإن سجد للزحام علی ظهر مصل صلاته التی هو فیها جاز للضرورة إلی قوله بل علی غیر الظهر کالفخذ ین للعذر" (الدر المختار علی الشامی کتاب الصلوۃ ۱/ ۳۳۸) (مرتب)۔

۲-　پوری عبارت اس طرح ہے: "فعلی هذا اختلف في الصف الأول، هل هو ما یلی الإمام من داخلها، أم مایلی المقصورة من خارجها؟ فأخذ الفقیه بالثانی توسعة علی العامة کیلا تفوتهم الفضیلة، ویعلم منه بالأولیٰ أن مثل مقصورة دمشق التی هي في وسط المسجد خارج الحائط القبلي یکون الصف الأول مایلی الإمام في داخلها وما اتصل به من طرفیها خارجا عنها من أول الجدار إلی آخره، فلا ینقطع الصف بنائها، کما لاینقطع بالمنبر الذی هو داخلها فیما یظهر" (کتاب الصلوۃ، شامی ۱/ ۳۸۳) (مرتب)۔

تعالیٰ: "ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه"(۱)،غرض صفِ اول میں بھی اگر جماعت کا وقت ابھی نہ ہوا ہو یا ہو چکا ہو، مگر اس طرح پڑھ رہا ہے کہ اس کی وجہ سے جماعت میں تنگی وغیرہ کوئی خلل واقع نہ ہوگا تو بھی پڑھ سکتا ہے اور اس کو پڑھنے کو حرام قطعی کہنا، بلکہ مسجد کے کسی حصہ میں نماز پڑھنے کو حرام قطعی کہنا سخت اور خطرناک قسم کی جرأت ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا:

امام صاحب عصر اور مغرب کی نماز مسجد کے برآمدہ میں ادا کرتے ہیں اور امام محراب کے اس قدر اندر ہوتے ہیں کہ بالکل نظر نہیں آتے بعض مقتدی کہتے ہیں، اس صورت میں امام صاحب کا اندر کھڑا ہونا، جبکہ باہر جگہ بھی ہے مکروہ ہے، امام صاحب کہتے ہیں کہ اس میں کوئی کراہت نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

برآمدہ میں جماعت ہونے کی صورت میں کم از کم امام کا آدھا قدم برآمدہ کے حصہ میں ہونا چاہئے، تاکہ اختلاف فقہاء سے بچا رہے، ورنہ اسائت وکراہت سے خالی نہ ہوگا، اور اصلاح لازم رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مقتدی کا فرض یا واجب چھوٹ جانا:

اگر مقتدی کا کوئی واجب یا فرض جماعت میں غلبۂ نوم سے یا ضعفِ بصارت سے ترک ہو جاوے تو کیا اس مقتدی کو نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔

۲- امام کا دوبارہ نماز پڑھنا اور مقتدی کو منع کرنا:

اگر عصر کی نماز کسی وجہ سے امام صاحب دوبارہ پڑھیں تو اس جماعت کے کسی بھی مقتدی کو اعادہ کی ضرورت نہیں

۱- سورۂ بقرہ:۱۱۴۔

ہے، بلکہ اور لوگ شامل ہوں یہ مسئلہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، ایک امام نے جب دوبارہ نماز پڑھی تو ان نمازیوں میں سے کسی کو بھی شامل نہ کیا گیا، البتہ اور آنے والے لوگوں کو مقتدی بنا کر جماعت ہوئی۔ آخر یہ مسئلہ کس طرح ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ہاں مقتدی کو اعادہ کرنا ہوگا (۱)۔

۲-بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ مقتدی کی نماز ہوجاتی ہے اور امام کی نہیں ہوتی ممکن ہے یہی صورت رہی ہو اگر امام عالم بالمسائل اور متدین ہو تو اعتماد کیا جاوے ورنہ پھر خود اس سے معلوم کرلیا جاوے، پریشان ہونے کی کیا بات ہے (۲)،

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسبوق کے تکبیر تحریمہ کہہ کر بیٹھنے سے قبل امام نے سلام پھیر دیا:

اگر کوئی شخص مسجد میں آکر وضو کر کے امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا اور امام صاحب قعدۂ اخیرہ میں تھے جب وہ شخص آیا اور نیت ابھی باندھ ہی چکا تھا کہ امام نے سلام پھیر دیا، تو آیا اب یہ نیت توڑ کر دوبارہ تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز پڑھے گا یا اسی پہلی تکبیر تحریمہ ہی پر نماز کی بناء کرے گا اور یہ شخص قعدہ میں امام کے ساتھ شریک نہ ہوسکا تھا۔

الجواب وبالله التوفيق:

حرم صلوٰۃ میں داخلہ تکبیر تحریمہ سے ہوتا ہے، لقوله عليه السلام: "تحريمها التكبير وتحليلها التسليم أو كما قال عليه السلام" (۳)، وكما قال في شرح التنوير: "قال في الحلية عند قول المنية: ولا دخول

۱- "إن المؤتم لو قام ساهياً في القعدة الأولى يعود ويقعد، لأن القعود فرض عليه بحكم المتابعة حتى قال في البحر ظاهره أنه لو لم يعد تبطل صلاته لترك الفرض" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۱۲۶) (مرتب)۔

۲- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۳۴۰۔

۳- السنن للترمذی ۱/۳۲۔

في الصلوٰة إلا بتكبيرة الافتتاح" (۱) جب اس نے تحریمہ نماز اللہ اکبر کہہ کر باندھ لیا تو حرم صلوٰۃ میں داخل ہو گیا اور اس کا تحریمہ منعقد ہو گیا، اور اس کو بحکم، "لا تبطلوا أعمالكم" باطل نہ کرے اور نہ توڑے اور اسی پر اپنی نماز پوری کرے۔

گفتگو جو کچھ ہے صحت اقتداء میں ہے، صحت اقتداء کے لیے منجملہ اور شرائط کے مشارکۃ فی الرکن بھی ہے، درمختار باب الامامۃ میں شرائطِ اقتداء گناتے ہوئے کہتے ہیں: "ومشاركته في الأركان" (۲)، اور یہ مسلم ہے کہ تحریمہ یا تکبیر تحریمہ رکن صلوٰۃ نہیں ہے، بلکہ صرف شرط ہے، محض اتصال بالارکان کی وجہ سے تمام شرائط وارکان ملحوظ ہوتے ہیں۔ پس محض تحریمہ باندھنے سے ابھی مشارکۃ رکن متحقق نہیں ہوئی تھی کہ امام نے سلام پھیر دیا، تو صحتِ اقتداء کی شرائط کہاں پائی گئیں کہ صحت اقتداء کا حکم بھی ہو جائے اور رکن سے مراد رکن اصلی ہے، چنانچہ اسی متن کے تحت علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "أي في أصل فعلها أعم من أن يأتي بها معه أو بعده لا قبله إلا إذا أدركه إمامه فيها (الى قوله) فيصح لوجود المتابعة التي هي حقيقة الاقتداء" (۳)۔

پھر دوسری جگہ مطلب "مهم في تحقيق متابعة الامام" کے تحت فرماتے ہیں: "قال في شرح المنية: لاخلاف في لزوم المتابعة في الأركان الفعلية إذهي موضوع الاقتداء" الخ (۴)۔ پھر طویل ونفیس بحث کے بعد فرماتے ہیں: "والحاصل أن المتابعة في ذاتها ثلاثة أنواع: مقارنة لفعل الإمام مثل أن يقارن إحرامه لإحرام إمامه لركوعه وسلامه لسلامه، ...... ومعاقبة لإبتداء فعل إمامه مع المشاركة في باقية، ومتراخية عنه، فمطلق المتابعة الشامل لهذه الأنواع الثلاثة يكون فرضاً في الفرض وواجباً في الواجب، وسنة في السنة عند عدم المعارض أو عدم لزوم المخالفة" (۵)، اور جہاں جہاں مشارکۃ فی الارکان کی مثال دیتے ہیں قیام کو چھوڑ کر رکوع کی مثال دیتے ہیں، اس لیے کہ رکوع رکنِ اصلی اور لازم ہے اور قیام ویسا نہیں ہے۔ چنانچہ نوافل بعذر میں قیام ساقط ہو جاتا ہے اور بغیر عذر بھی بیٹھ کر پڑھ لینے کی اجازت ہے، بخلاف اور ارکان (رکوع، سجود، قعود) کے، اس لیے محض قیام کی مشارکۃ کو شرائط انعقادِ اقتداء میں کافی نہیں سمجھا گیا ہے، اور اس وجہ سے جمہور علماء کے

۱- ردالمحتار ۱/ ۴۴۷۔
۲- الدرمختار مع الشامی ۱/ ۳۷۰ باب الامامہ۔
۳- فتاویٰ شامی ۱/ ۳۷۰، باب الامامۃ۔
۴- شامی ۱/ ۴۱۶۔
۵- شامی ۱/ ۳۱۷۔

نزدیک (جو محض سلام اول سے خروج مانتے ہیں)، اگر کوئی شخص السلام کے بعد "علیکم" سے قبل بھی امام کو پائے تو اقتداء صحیح نہیں ہوتی، اور صلوٰۃ امام کو پانے والا نہیں مانتے۔

بعض علماء کے نزدیک (جو دونوں سلام سے خروج عن الصلوٰۃ مانتے ہیں) اگر کوئی سلام اول کے بعد سلام ثانی سے قبل امام کو پائے، یعنی قعدہ میں بیٹھ جانے سے امام کو پانے والا مان لیتے ہیں، "کما اشار إلیه لفظ أدرکه في عبادته" (۱)۔

"قوله مرتین الخ هو الأصح وقیل: الثانیة سنة کما في الفتح، ثم الخروج عن الصلوٰة بسلام واحد عند العامة، وقیل: لهما کما في مجمع الأنهر، فلو اقتدیٰ به بعد لفظ السلام الأول قبل علیکم لایصح عند العامة، وقیل: إن أدرکه بعد التسلیمة الأولیٰ قبل الثانیة فقد أدرکه مع الصلوٰة الخ"۔ اور یہیں یعنی "قبل الثانیۃ" کی قید سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب سلام ثانی بھی پھیر دے اور کوئی امام کو پائے تو کسی کے نزدیک اقتداء صحیح نہیں ہوگی، اور یہاں یہی صورت ہے، جیسا کہ سوال کی خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں کسی کے نزدیک اقتداء صحیح نہیں ہوگی، بخلاف اس کے کہ اگر کوئی شخص امام کے سلام اول کے علیکم کے میم کہنے سے قبل امام کو پا گیا، خواہ قعدہ میں نفس قعود ہی کرلیا تو بھی امام کو پا گیا، اور اقتدا بالاتفاق سب علماء کے نزدیک صحیح ہوگئی۔

اور ثمرۂ اختلاف یہ نکلے گا کہ اختلافی صورتوں میں اگر کوئی شخص بناء کرے اور اقتداء کے طور پر نماز پڑھ لے تو وجوب اعادہ کا حکم نہ ہوگا، مگر عبادتِ مفروضہ کا یہ معاملہ ہے، اس لیے احتیاط اولیٰ ہے، تاکہ ادائیگی فرض بالقطع والیقین ہوجائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- وکما فی الطحطاوی ر ۱۳۷، ۱۳۸۔

باب الوتر والتراویح والسنن

وتر میں شافعی امام کی اقتداء:

ا-میرے کیمپ کی مسجد میں شافعی مسلک کے امام نماز پڑھاتے ہیں کچھ مقتدی حنفی مسلک کے بھی ہیں رمضان کے مہینہ میں امام کے پیچھے نماز وتر پڑھنا کیسا ہے، جبکہ نماز وتر میں دوبار امام نیت باندھتے ہیں دو رکعات پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے ہیں۔ پھر ایک رکعت کی نیت باندھتے ہیں، تیسری رکعت کے رکوع کے بعد کھڑے ہوکر دعا بھی مانگتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے نماز وتر پڑھنا جائز ہے تو حنفی مقتدیٰین دو رکعات پوری کرنے پر سلام پھیریں گے کہ نہیں اور تیسری رکعت میں رکوع کے بعد کھڑا ہوکر دعا مانگے کہ نہیں؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وبالله التوفیق:

ا- شافعی مسلک کے امام صاحب ظاہر ومتبادر یہی ہے کہ باب طہارت میں حنفی مسلک کی رعایت فرماتے ہوں گے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے نزدیک مجمع علیہ ترجیح یہی ہے، اس لئے ایسے امام شافعی مسلک کے ہوں جب بھی ان کی اقتداء میں نماز تراویح ونماز فرض دونوں بلا کراہیت درست ہوگی۔ البتہ وتر میں یہ تفصیل ہے کہ اگر دو رکعت پر سلام قطع پھیر کر پھر صرف ایک رکعت کی نیت کرتے ہوں تو وتر کی نماز ان کے پیچھے نہیں پڑھ سکتے، بلکہ اپنی وتر الگ، خواہ اکیلے ہی پڑھنی پڑے الگ ہی پڑھیں، اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک کوئی نماز محض ایک رکعت نہیں اور حدیث شریف میں محض ایک رکعت پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

اور اگر وہ امام صاحب بھی تین رکعت وتر کی بہ یک سلام پڑھیں تو وتر بھی ان کے پیچھے پڑھ لینا بہتر ہوگا۔ اور تین رکعت وتر بیک سلام پڑھنا بھی ان کے نزدیک جائز ہے، اس لئے مطلقاً مخالفت نہیں ہے، بلکہ ممانعت ان کے اس عمل کے

تابع ہے جب وہ وتر مذکورہ فی السوال صورت سے پڑھیں (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وتر کی ایک رکعت نہ ہونے کی وجہ:

وتر کی تنہا ایک رکعت نہ ہونے کیا وجہ ہے؟

فتح محمد کشمیری (بمقام شاہ پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

احادیث میں اسی طرح وارد ہے اور تین رکعت والی روایت زیادہ قابل ترجیح ووثوق ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۰/۱۴۰۱ھ

بیس رکعات تراویح کا ثبوت:

دو مسئلوں میں بعض حنفی مسلک رکھنے والے شکوک و پریشانی میں مبتلا ہیں، جواب احادیث کے ساتھ مرحمت فرمائیے!

حضور سرور کائنات علیہ السلام نے نماز تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھی اور پڑھائی ہیں؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث کہ حضور رمضان و غیر رمضان میں ۱۱ رکعت مع وتر کے پڑھتے تھے۔

اس حدیث کے تحت اہل حدیث حضرات آٹھ رکعت تراویح کو حضور علیہ السلام کی سنت تسلیم کر کے ۲۰ رکعات

۱- ”وصح الإقتداء فيه (الوتر) ففي غيره أولى إن لم يتحقق منه ما يفسدها في اعتقاده في الأصح كما بسطه في البحر بشافعي مثلاً لم يفصله بسلام لا إن فصله على الأصح فيهما (الدر المختار) على الأصح فيهما أى في جواز أصل الإقتداء فيه بشافعي وفي إشتراط عدم فصله“ (رد المحتار على الدر المختار ۲/ ۴۴۴ نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲/ ۶۸، ۶۹) (مرتب)۔

۲- تفصیل کے لئے دیکھئے: (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۳/ ۲۰ وما بعدہا باب الوتر) (مرتب)۔

پڑھنے والوں کو تارکِ سنت اور بدعتی کہتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ نے جب تراویح کی جماعت قائم فرمائی اور حضرت ابی ابن کعبؓ کو امام مقرر فرمایا تھا تو انہوں نے ۱۱رکعت پڑھائی ہے۔

حنفی مسلک والے حضرات امام ابوحنیفہؒ کی روایت پر جو ۲۰رکعت پڑھتے ہیں، وہ خود حنفی اکابر علماء دیوبند کے نزدیک ضعیف ہے، حوالہ میں بحر العلوم استاذ علامہ انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ کا ارشاد نقل کیا ہے، عبارت یہ ہے:

"وأما النبي صلى الله عليه وسلم ،فصح عنه ثمان ركعاتٍ، وأما عشرون ركعة، فهو عنه بسند ضعيفٍ وعلىٰ ضعفه اتفاق" (العرف الشذی)۔

اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ نے اپنی کتاب "اوجز المسالک" (۲۹۷/۱) میں لکھا ہے کہ بیس رکعات تراویح جو حضرت ابن عباس سے مروی ہیں وہ عندالمحدثین مجروح اور ضعیف ہے۔

براہ کرم واضح مدلل جوابات مرحمت فرما کر تشنگی کو دور فرمادیں، تاکہ انتشار ختم ہوجائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

نماز تراویح اس خاص نماز کا نام ہے جس کو سرورِ کائنات ﷺ نے ایک سال رمضان المبارک میں صرف ۳راتوں میں ناغہ دے دے کر پڑھا ہے۔

پہلی بار رات کے ابتدائی حصہ میں صرف تہائی رات تک پڑھا، پھر ناغہ دے کر ایک رات میں آدھی رات پڑھا، پھر ناغہ دے کر ایک رات میں قریب قریب ساری رات پڑھا۔

پھر جب صحابہ کرامؓ کو عام طور سے علم ہوا تو بہت سے صحابہ جمع ہوگئے اور ساری رات مسجد میں حضور ﷺ کا انتظار فرمایا۔ مگر حضور ﷺ تشریف نہیں لائے اور بعد میں فرمایا کہ تم لوگوں کے جمع ہونے کا مجھے علم تھا، مگر مجھے خطرہ ہوگیا کہ کہیں یہ نماز فرض نہ ہوجائے اور آنے والی امت پر بار نہ بنے، اس لیے تمہارے مجتمع ہونے کے باوجود میں نہیں آیا۔

یہاں تک یہ واقعہ متفق علیہ عندالکل ہے، اس کا کوئی منکر نہیں ہے، لہٰذا اس خاص نماز کا تعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے بالکل نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ تو سرکار دوجہاں ﷺ کے رمضان وغیر رمضان میں رات کے اندر نفل وسنت کا جو روزمرہ کا اور عام معمول تھا اس کو بیان فرماتی ہیں، اور وہ بھی اپنا دیکھا ہوا بیان فرمارہی ہیں، نہ کہ آپ ﷺ کے تمام معمولات کا استقصاء فرمارہی ہیں۔

اس لئے عائشہ صدیقہؓ کی مراد نہ تو آٹھ رکعات میں تحدید کرنے کی ہوسکتی ہے اور نہ اس سے کم اور زیادہ کی نفی کرنی ہوسکتی ہے۔

اس روایت سے ۲۰ رکعات تراویح کی نفی پر استدلال کرنا بے محل اور ناواقفیت کی علامت ہوگی۔غرض جب فرض ہوجانے کا خطرہ ختم ہوگیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے اپنے طور پر اور اپنی ذاتی معلومات کے مطابق پورے رمضان میں مختلف رکعات پڑھتے تھے۔

لہٰذا ان حضرات کے مختلف رکعات پڑھنے سے بھی ۲۰ رکعات تراویح کے مدعا میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا، کیونکہ اس اختلاف کا مدار ان کی اپنی اپنی ذاتی رائے پر ہے، نہ کہ کسی بنیادی وحتمی حکم پر ہے۔

پھر جب آپ کے وصال کے بعد فرض غیر فرض سے اور واجب غیر واجب سے خوب متمیز ہوگیا اور خلط واختلاط کا اندیشہ جاتا رہا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اس خواہش رسول ﷺ کو جو خاص ان ۳ راتوں میں پڑھنے کا باعث بنی تھی رائج فرما کر الگ پڑھنے والوں کو بیس رکعات میں جو اصل تعداد تھی منضبط کر کے سب کو ایک نماز باجماعت میں منسلک کردیا اور حضرت ابی بن کعبؓ کو ان کی امامت کے لیے مقرر کردیا اور حضرت ابی ابن کعب ۲۰ رکعات تراویح پڑھانے لگے، پھر اسی پر تمام حضرات صحابہ کا اجماع ہوگیا۔

یہی نہیں، بلکہ جمہور علماء کا یہی معمول ومسلک ہوگیا، چنانچہ ائمہ اربعہ بھی اسی ۲۰ رکعات پر مجتمع ہیں، ان میں سے کسی امام کے نزدیک رکعات تراویح ۲۰ سے کم نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ۲۰ رکعات تراویح کا ثبوت اجماع صحابہؓ سے ہے، جمہور علماء امت کا ۲۰ پر اتفاق کرنے سے ہے اور ائمہ اربعہ کے بیس رکعات پر مجتمع ہونے سے ہے اور یہ تینوں چیزیں ان معترضین کے نزدیک حجت ہیں اور حق ہونے کی دلیل ہیں۔

یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت کی سند کا ضعف یا حضرت ابن عباس کی روایت کی سند کا ضعف بیس رکعات تراویح کے مدعا میں مضر یا مخل نہیں ہوسکتا، کیونکہ مدار ان روایات پر ہے ہی نہیں، بلکہ مدار ان اجماعات پر ہے۔

اسی طرح یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان خاص تین راتوں میں جناب نبی کریم ﷺ نے بیس رکعات ضرور پڑھائی تھی، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو ان اجماعات کا خلاف واقعہ اور کذب پر ہونا لازم آئے گا، اور یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ

صریح اور صحیح حدیث: "لا یجتمع أمتي علی ضلالة" (۱) کے خلاف ہوگا اور یہ باطل ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ الگ الگ پڑھنے والوں کو جب حضرت عمر فاروقؓ نے ایک جماعت میں منسلک کردیا اوران پر حضرت ابی ابن کعبؓ کو امام مقرر کیا توانہوں نے امام ہوکر مع وتر کے صرف گیارہ ہی رکعات پڑھائیں یہ بالکل غلط ہے اور دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اگر ایسا کہنے والوں کو اصرار ہو توصحیح سند کے ساتھ اس کے ثبوت پر دلیل لانا ہوگا اور یہ لانہیں سکتے: "ھاتوا برھانکم إن کنتم صادقین فی دعواکم، ولن تأتوا به أبداً"۔

اور ۲۰ رکعات تراویح پڑھنے والوں کو تارکِ سنت اور بدعتی کہنا بڑا ہی خطرناک جملہ ہے، ایسا کہنے والوں کو اپنا انجام سوچنا چاہئے، اس لیے کہ ۲۰ رکعت تراویح کے اس اجماع میں خلفاء راشدین اور عشرہ مبشرہ اور اجل فقہاء سب ہی ہیں۔ اوران حضرات کی تو بڑی شان ہے، تمام صحابہؓ کی توثیق وفضیلت اوران کے محبت وحق ہونے کی دلیل پر خود قرآنِ پاک ناطق ہے، بلکہ ان کے اس وصف سے متصف ہونے پر اوران کے بابصیرت ہونے پر امت کو متنبہ اور آگاہ کرنے کا حکم ہے مثلاً: "قل ھذہ سبیلی ادعوا إلی اللہ علی بصیرۃ أنا ومن اتبعني" (۲) وغیر ذلک من الاٰیات"۔

پھر احادیث صحیحہ بھی بہت سی اس پر دال ہیں مثلاً:

"علیکم بسنتي وسنة خلفاء الراشدین المھدیین، تمکسوا بھاوعضوا علیھا بالنواجذ" (۳)۔

اور مثلاً "أصحابي کالنجوم بأیھم اقتدیتم اھتدیتم وغیر ذلک" (۴)۔

اور علماء حق کا متفقہ مقولہ ہے: أصحابي کلھم عدول، پس ایسی خطرناک بات کہنے والا سوچے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔

اس معترض کے جملہ سے کس کس کلام کا جھوٹا وکاذب ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ پھر جب یہ اساطین امت تارک سنت وبدعتی اور اہل ضلال ہوں گے تو پھر دنیا میں کون متبع سنت اور اہل حق میں سے ہوگا؟

"أللھم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سیئات أعمالنا واھدنا سبل السلام اٰمین"۔

۱- مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۱/ ۳۳۸ مع شرح الطیبی طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی پاکستان۔

۲- سورۂ یوسف: ۱۰۸۔

۳- مشکوۃ کتاب الایمان باب الاعتصام الکتاب والسنۃ حدیث نمبر ۱۶۵ مع شرح الطیبی، رواہ احمد ابوداؤد الترمذی وابن ماجہ ۱/ ۳۳۰۔

۴- مشکوۃ مع شرح الطیبی کتاب المناقب باب مناقب الصحابۃ رواہ رزین عن عمر بن الخطابؓ ۱۱/ ۲۱۸۔

غرض ایسے جملے بڑے خطرناک ہیں، اس سے باز رہنا اور توبہ کرنا لازم ہے، اور اگر مزید تفصیل دیکھنی ہو تو مصابیح التراویح اور رالرای انجیح اور بیس رکعات تراویح مؤلفہ ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دیکھیں اور اس کا رد کسی رسالہ میں نظر آئے تو مؤلف موصوف کا جواب الجواب دیکھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

رکعات تراویح کا صحیح عدد ایک قدیم حدیثی مسئلہ کی تنقیح وتشریح:

۱- بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ حضور اکرم ﷺ رمضان المبارک میں صرف آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے، جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے بیس رکعات تراویح پڑھنے کو فرمایا صحیح واقعات کون سے ہیں؟

۲- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ نے آٹھ رکعات تراویح پڑھیں اور با جماعت تراویح ادا کرنے سے روکا، ان کا یہ نظریہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عمل کا ہماری رہنمائی کو موجود ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کا حکم منسوخ ہو جانا چاہئے مہربانی فرما کر مندرجہ بالا بیانات پر اپنی رائے اور اپنا نظریہ اور حکم بتائیں۔

حضور ﷺ نے تراویح کی نماز کس طرح پڑھی؟

۳- سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے پہلی تین راتوں میں تراویح مسجد میں پڑھی یہ تراویح کی نمازیں علیحدہ علیحدہ پڑھی گئیں یا جماعت کے ساتھ؟

۴- یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے بعد کو اپنے گھر میں تراویح پڑھی، انہوں نے رکعات کس تعداد میں پڑھیں، اس بارے میں رائیں مختلف ہیں، براہ کرم اس پوزیشن کی توضیح کیجئے اور ماخذ کا حوالہ بھی دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱ و ۲) یہ خیال صحیح نہیں، متفق علیہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک سال جناب نبی کریم ﷺ نے رمضان المبارک میں صرف تین شب میں ناغہ کے ساتھ ایک نئی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی، جس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، پہلی شب میں ثلث رات تک، دوسری شب میں نصف رات تک، تیسری رات میں صبح صادق کے قریب تک، چوتھی شب میں بھی تمام صحابہؓ مسجد میں ساری ساری رات انتظار میں جمع رہے اور آپ تشریف نہیں لائے، صبح کو ارشاد فرمایا کہ مجھے تم لوگوں کا

انتظار میں جمع رہنا معلوم ہے، مگر ڈرا کہ مبادا یہ نماز امت پر فرض ہو جائے اور امت اس پر قابو نہ پائے، بلکہ بار گذرے، اس لئے میں نہیں آیا، پھر اس کے بعد علماء میں اختلاف ہوا کہ وہ نماز کتنی رکعتیں تھیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی نماز بیس رکعت تھی، چنانچہ جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اسی بناء پر آپ کے بعد جب فرضیت کا خطرہ ختم ہو گیا تو صحابۂ کرامؓ اپنے اپنے طور پر پورے رمضان میں بیس رکعت، بلکہ بعض صحابہؓ اس سے زائد بھی پڑھتے رہے، اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ نماز صرف آٹھ رکعت تھی، اگر چہ یہ روایت صحاح کی ہے، مگر یہ خیال کمزور ہے کہ اس کا منشاء حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے رمضان وغیر رمضان میں کبھی آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں، مگر اس روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کا پورے سال بھر کا تہجد کی نماز کا معمول بتلا رہی ہیں، نہ کہ وہ نئی نماز جس کو سرکار دو عالم ﷺ نے صرف تین شب پڑھ کر بند فرمادیا اور جس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا۔

اور اگر آٹھ رکعت والی روایت کو اسی کے لئے تسلیم کر لیا جائے، حالانکہ جمہور صحابہؓ کا معمول حضور ﷺ کے بعد ہمیشہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کا تھا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روایت منسوخ ہے، جن صحابہؓ کو اس کے نسخ کا علم نہ ہوا وہ آٹھ رکعت پڑھتے رہے، اگر وہ منسوخ نہ ہوتی تو جمہور صحابہ کا یہ معمول نہ بنتا، چنانچہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک تراویح بیس رکعت سے کم نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر فاروقؓ نے تو صرف جماعت میں منسلک فرمادیا ہے۔ یہ نئی نماز کی تعداد ایجاداً نہیں کی ہے، **"ھکذا فی مؤطا امام مالک والشامی والفتح والبحر وغیر ذلک"**۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کو منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے، منسوخ ناسخ سے مقدم ہوتا ہے نہ کہ موخر، حضرت عمرؓ کا یہ طریق عمل یقیناً حضور ﷺ کے عمل سے مؤخر ہے، بلکہ اس پر منسوخ کا لفظ بولنا علماء کی اصطلاح سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اسی طرح ایسا نظریہ رکھنے والوں کی یہ بھی کم علمی اور ناواقفیت کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے تراویح باجماعت پڑھنے سے روکا ہے، بلکہ حقیقت وہ ہے جو شروع جواب میں مذکور ہوئی اور وہ عنوان تو پڑھنے کی ترغیب کا اور خود نہ پڑھنے کی دلیل کے بیان کرنے کا ہے۔

(نوٹ) اگر مزید تحقیق اور سیر حاصل بحث دیکھنی مقصود ہو تو اردو رسالہ (رکعات تراویح) مصنفہ حضرت مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمٰن اعظمی کا مطالعہ فرمائیں۔ اور اگر کوئی اس کا رد یا جواب پیش کردہ از جانب مولانا سلیمان اعظمی پیش کرے تو پھر مولانا کا جواب الجواب بھی ضرور دیکھئے۔ انشاء اللہ قاطع نزاع اور کافی ووافی ہوگا۔

۳-باجماعت پڑھی گئی۔

۴-ہوسکتا ہے آپ نے اپنے دولت خانہ پر تراویح کی نماز تنہا پڑھی ہو جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے علاوہ ہو،مگر اس کی یا اس کی رکعت کی تعداد متعین ہو کر منقول نہیں،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۱۲/ ۹۰

تراویح چار چار رکعت ایک سلام سے پڑھنا:

ہمارے یہاں بعض جگہ تراویح کی نماز دو ۲ دو ۲ رکعت کے بجائے چار چار رکعت پانچ سلام کے ساتھ پڑھتے ہیں چار چار رکعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بشیر احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

تراویح کی نماز دو رکعت کی نیت باندھ کر پڑھنا سنت ہے بیس رکعت دس سلام سے پڑھ لے دو ۲ دو ۲ رکعت سے زیادہ ایک سلام سے پڑھنے سے تراویح ادا ہو جائے گی لیکن طریق سنت کے خلاف ہوگا اور طریق سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

بوجہ مجبوری آٹھ رکعت تراویح پڑھنا:

ایک شخص بوجہ کمزوری و بیماری اپنے گھر پر ہی نماز عشاء کے بعد صرف آٹھ رکعت نماز تراویح پڑھنا ہی جائز سمجھتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تراویح کی نماز سنت مؤکدہ بیس رکعتیں ہیں، آٹھ رکعت نہیں اس کو بیس رکعت پڑھنا چاہیے (۱)، بوجہ بیماری یا

۱- "وهي عشرون ركعة، هو قول الجمهور وعليه عمل الناس شرقاً وغرباً" (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۴۹۵)، نعم ثبتت العشرون من زمن عمر في الموطا عن يزيد بن رومان قال كان الناس يقومون في زمن عمر بن الخطاب بثلاث وعشرين ركعة" (فتح القدیر ۱/ ۴۰۷)، نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۲/ ۱۱۷، نیز تعلیق شامی علی البحر/ ۱۱۸) (مرتب)۔

کمزوری مسجد میں نہیں جاسکتا ہے، گھر ہی پڑھ لے، کھڑے ہوکر نہیں پڑھ سکتا، بیٹھ کر ہی پڑھ لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

تراویح کے ہر ترویحہ میں دعا اور حضور علیہ وخلفاء راشدین کا نام القاب کے ساتھ لینا کیسا ہے؟

یہاں پر نماز تراویح کی بیس رکعت اس طرح پڑھی جاتی تھی کہ ہر چار رکعت کے بعد تسبیح سبحان ذی الملک والملوک پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد دعا مانگی جاتی ہے، پھر ایک مختصر تسبیح فضل من اللہ الرحمۃ والمغفرۃ پڑھنے کے بعد دوسرے دوگانے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس طرح پر ہر چار رکعت کے بعد دعا مانگنے کے بعد القابات کے ساتھ حضور علیہ کا نام لیا جاتا ہے آٹھویں رکعت کے بعد القابات کے ساتھ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا جاتا ہے بارہویں رکعت کے بعد حضرت عمرؓ کا نام اور سولہویں رکعت کے بعد حضرت عثمانؓ کا نام اور بیسویں رکعت کے بعد حضرت علیؓ کا نام القابات کے ساتھ ساتھ لئے جاتے ہیں پھر بعد وتر دعا چند لوگ چمن مسجد کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر پیغمبروں کے نام سے چاہتے ہیں، البتہ حضرت آدم علیہ السلام کا نام پہلے لیا جاتا ہے پھر جلیل القدر نبیوں کے نام کے بعد آنحضرت علیہ کا نام پر صلوٰۃ ختم کر دیا جاتا ہے کیا اس طرح تراویح پڑھنے میں کوئی بدعت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ طریقہ سے بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ لیا گیا ہے جو شریعت مطہرہ کے قاعدہ میں درست نہیں ہے اور حد شرع کے خروج کی وجہ سے بدعت ہے، تراویح مسنون طریقہ کے مطابق پڑھنا چاہئے اور مسنون طریقہ وہ ہے جس طریقہ سے صحابہ کرام اور ائمہ کرام ھدیٰ نے پڑھی ہیں، اس کے لئے ''بہشتی ثمر'' اور ''تعلیم الاسلام'' کے رسالے دیکھ لیجئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

تراویح میں ترویحہ کے بعد دعاء:

تراویح میں ترویحہ کی دعا عام طور پر لوگ سبحان ذی الملک الخ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعا ''جامع رموز'' اور ''ردالمحتار'' میں درج ہے، دوسری طرف علماء حق کہتے ہیں کہ کوئی دعا ثابت نہیں درود شریف کلمہ سوم وغیرہ پڑھ لیا جاوے تو صحیح ہے، ''ھدیۃ المصلیین'' نامی کتاب میں اسی طرح درج ہے اور ''جامع الرموز، ردالمحتار'' کا حوالہ دیا ہے۔

یوسف باوا الندنی

الجواب وبالله التوفيق:

''درمختار'' میں ہے: ''ويخيرون بين تسبيح وقراءة وسكوت وصلوة فرادیٰ'' (۱) اور ردالمحتار (ص ۴۷۴) میں ناقلاً عن منہج العباد مذکور ہے: ''قال القهستاني: فيقال ثلث مرات سبحان ذی الملک والملکوت الخ'' (۲) ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ نفس دعا تو ثابت ہو سکتی ہے باقی متعین طور پر کوئی اور خاص دعا ثابت نہیں ''کما يدل عليه لفظه ويخيرون ايضاً''، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ''سبحان ذی الملک الخ'' والی دعا جو عام طور سے رائج ہے، وہ بدعت نہیں، ثابت ہے ہاں اسی کو ضروری سمجھنا یا اس میں حصر کر دینا یہ درست نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

بالتداعی تہجد کی جماعت کا حکم:

تہجد کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا درآں حالیکہ اس میں تداعی ہو بدعت ہے اور ہمارے بعض اکابرؒ کا اس پر عمل ثابت ہے، جیسے حضرت مدنیؒ، جواب دیجئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

تہجد کی نماز با جماعت جب کہ علی سبیل التداعی نہ ہو بدعت نہیں ہے، ''يكره ذلک لو على سبيل التداعي

۱- درمختار مع ردالمحتار ۲/۴۹۶ کتاب الصلاۃ باب الوتر والنوافل۔
۲- ردالمحتار مع درمختار ۲/۴۹۷ تحت قولہ (بین تسبیح)۔

بأن يقتدى أربعة بواحد"(۱)، حاصل کلام یہ کہ اگر امام کے علاوہ چار آدمی ہوں تو مکروہ ہے، ورنہ نہیں، رہا حضرت مدنی رحمہ اللہ کا معمول تو اگر ان کے ساتھ چار آدمی سے کم رہتے تھے تو کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر زیادہ ہوتے تھے تو کہا جائے گا کہ حضرت مدنی تنہا یا صرف دو تین آدمیوں کو لے کر پڑھتے رہے ہوں گے اور لوگ بعد میں شریک ہوتے رہے ہوں گے جن کی امامت کی حضرت مدنی نیت نہ کرتے ہوں گے، اس صورت میں کراہت صرف متاخرین پر ہوگی۔ امام پر نہیں، "وفي التتارخانية: لو لم ينو الإمامة لا كراهة على الإمام" (۲)، "وفي رد المحتار: لو اقتدى به واحد أو اثنان ثم جاءت جماعة اقتدوا به قال الرحمتي: ينبغي أن تكون الكراهة على المتأخرين" (۳)۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تہجد با جماعت پڑھنے میں قوی توجیہ یہ ہے کہ حضرت موصوفؒ بالخصوص اس مسئلہ میں بلا شبہ درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور مجتہد کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے: "إن المجتهد إذا اجتهد في واقعات بحكم يمتنع عليه تقليد غيره فيها اتفاقا" (۴)، اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موصوف پر اپنے اجتہاد و تحقیق کے مطابق عمل کرنا ضروری تھا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

نماز تہجد کی شرعی حیثیت:

ریڈیو کویت نے بتلایا کہ نماز تہجد سرکار دو عالم ﷺ پر فرض تھی مگر امت پر نہیں!

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۲۴/ ریاض، سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

ریڈیو نے پوری بات نہیں بتلائی، یا پوری بات سمجھی نہیں گئی!

پوری بات یہ ہے کہ نماز تہجد حضور ﷺ پر شروع میں فرض تھی اور بعد میں فرضیت منسوخ ہوگئی، جیسا کہ حضرت

۱- الدر مختار ۱/ ۵۲۴۔
۲- الدر مختار ۱/ ۵۲۴۔
۳- شامی ۱/ ۵۲۴۔
۴- شامی نعمانیہ علی الدر ۱/ ۵۱۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے جو "مسلم شریف" وغیرہ میں مروی ہے، ثابت ہے، البتہ آنحضرت ﷺ نماز تہجد ہمیشہ بلاناغہ وبلاترک پڑھتے تھے، اس پڑھنے کو آپ نے اپنی خصوصیت قرار نہیں دی اور نہ کوئی دلیل خصوصیت پر قائم ہے اور جس عمل وعبادت پر آپ ﷺ مواظبت بلاترک فرمائیں وہ کم از کم سنت ضرور رہوتا ہے۔

اس لیے نماز تہجد امت کے لیے بھی سنت کے درجہ میں باقی رہی اور غیر فرض پر نفل، مستحب کا اطلاق کر دیتے ہیں، بعض مواقع میں مستحب کے لفظ سے تعبیر فرمادیا ہے۔

نیز مسلم شریف کی ایک اور حدیث سے تہجد کی سنت کی طرف اشارہ ملتا ہے، (۱) علاوہ ان ترغیبی روایات کے جو خاص تہجد کی فضیلت کے بارے میں مروی ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۲/ ۹۹ ۱۳ھ

اذانِ مغرب اور اس کے فرض کے مابین سنت کا حکم؟

۱- "ما حكم السنة بعد أذان المغرب وقبل الفرض عند المذاهب الأربعة بأنني حنفي المذهب"۔

الجواب وبالله التوفيق:

اذانِ مغرب کے بعد اور فرض سے پہلے ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک سنت نہیں ہے، بلکہ ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک تو مستحب بھی نہیں! حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت اسحاق وبعض اہل ظواہر کے نزدیک دو رکعت تو مستحب ہے اور وہ بھی اس قدر کے ساتھ کہ ان دو رکعت میں مشغول ہونے سے فرض مغرب کی ادائیگی میں تاخیر لازم نہ آئے، ورنہ ادائیگی مکروہ ہو جائے گی اور دلیل میں عبداللہ بن مغفل کی روایت پیش فرماتے ہیں:

۱- "وقوله وصلواة الليل أقول: هي أفضل من صلواة النهار كمافي الجوهرة ونور الإيضاح، وقد صرحت الأيات والأحاديث بفضلها والحث عليها، قال في البحر: فمنها مافي صحيح مسلم مرفوعا: "أفضل الصلوة بعد الفريضة صلوة الليل۔

ثم اعلم أن ذكره صلواة الليل من المندوبات مشئ عليه في الحاوى القدسي، وقد تردد المحقق في فتح القدير في كونه سنة أو مندوباً، لأن الأدلة القولية تفيد الندب، والمواظبة الفعلية تفيد السنية، لأنه صلى الله عليه وسلم إذا واظب على تطوع يصير سنة، إلى قوله، ولذاقال في الحلية: والأشبه أنه سنة" (فتاویٰ شامی ۲/۴۶۰، باب الوتر والنوافل) (مرتب)۔

”عن عبد الله بن مغفل رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: بين كل أذانين صلوٰة أن يتخذها الناس سنة (ثلث مرات) وقال في الثالثة: لمن شاء كراهيتهٔ أن يتخذها الناس سنة“ (۱)۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں بعض روایات میں سندِ معتبر کے ساتھ ''ماخلا صلوٰۃ المغرب'' بھی مروی ہے، جیسا کہ اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے:

”إن رسول الله ﷺ قال: إن بين كل أذانين ركعتين ما خلا صلوٰة المغرب أو كما قال عليه السلام “(۲)۔

اگر کوئی متن کی سند پر جرح کرے، مگر مجموعہ حسن لغیرہ ہوکر قابلِ استناد، قابلِ استدلال بلاشبہ مسلم ہے، اس لیے یہ حکم نمازِ مغرب کے علاوہ کا ہے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت کے عموم میں نمازِ مغرب کو شامل بھی مان لیا جائے تب بھی ”لمن شاء“ کی تخییر کی رو سے اس روایت سے بہت سے بہت محض اباحت واجازت یا عدمِ کراہت نکل سکتی ہے، نہ کہ ترغیب وتحریص یا ندب واستحباب وغیرہ۔

لہٰذا دعوائے استحباب یا سنت پھر بھی صحیح نہ ہوگا اور یہ اباحت یا اجازت اور عدم کراہت اس وقت نکل سکتی ہے جب ان دو رکعت میں مشغولیت کی وجہ سے صلوٰۃِ مغرب کی ادائیگی میں وقتِ اولیٰ سے تاخیر لازم نہ آئے اور اشتباک نجوم کی قباحت کا خطرہ نہ پیش آئے، ورنہ کراہت لازم آجائے گی اور اباحتِ مطلقہ ختم ہوجائے گی۔ فافہم وتدبر۔

اشتباک نجوم کے تاخیر کردینے کی کراہت کا بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے: مثلاً حضرت ابوایوبؓ کی روایت ہے: ''قال رسول الله ﷺ: لايزال أمتي بخير أوقال: على الفطرة مالم يؤخروا المغرب إلى أن تشبك النجوم“(۳)۔

اور مثلاً حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایت ہے: ”كنا نصلي المغرب مع رسول الله ﷺ فينصرف أحدنا وأنه ليبصر مواقع نبله“(۴)۔

۱- بخاری شریف ۱/ ۱۵۷ کتاب التہجد باب الصلوٰۃ قبل المغرب وأخرجہ أبو داؤد في سننہ ۱/ ۱۸۶ تحت باب الصلوٰۃ قبل المغرب) (وھکذا في الترمذي ۱/ ۲۶ أیضاً کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۲- بیہقی، دار قطنی ۲/ ۲۶۴ کتاب الصلوٰۃ (مرتب)۔

۳- ابوداؤد، باب وقت المغرب ۱/ ۶۰۔

۴- متفق علیہ الصحیح للبخاري ۱/ ۷۹۔

اور مثلاً سلمہ بن اکوعؓ کی روایت ہے: "**كان النبي ﷺ يصلي المغرب ساعة تغرب الشمس إذا غاب حاجبها**" (۱)۔

ان روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کا یقین ہو جانے کے بعد جہاں تک جلد ہو سکے نمازِ مغرب اس طرح اور جلدی ادا کر لی جائے کہ اشتباکِ نجوم کی قباحت سے محفوظ رہے، اشتباکِ نجوم غروب آفتاب کے ۱۰/ ۱۲ منٹ کے بعد سے ہی شروع ہو جاتا ہے "**كما هو شاهد رأي العين**" پس جب آفتاب غروب ہوتا ہوا نظر آئے جب تو غروب ہوتے ہی اذان دیدینا بحدیث نمبر (۳) درست ہو جائے گا اور اگر ڈوبتا ہوا نظر نہ آئے تو غروب کا ظن غالب ہونے کے بعد ازالۂ شک اور حصولِ یقین کے لیے دو ایک منٹ کا توقف کرنا احتیاطاً لازم ہوگا، پھر موذن کی رفتارِ صوت کے اعتبار سے اذان میں تین منٹ سے پانچ تک خرچ ہوتے ہیں، اس لیے اوسطاً چار منٹ کی مقدار اذان کے لیے رکھئے، پھر مختصراً ادائیگی کے لیے بھی کم و بیش دس منٹ رکھئے تو بھی غروب سے فراغتِ نماز تک ۱۶ منٹ ہو جاتے ہیں۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت اشتباک نجوم اگر چہ مکمل نہ ہو، مگر شروع ہو جانا اغلب ہو جائے گا، اب اگر اذان کے بعد اور فرض سے قبل دو رکعت اور پڑھی جائیں تو اشتباکِ نجوم کی قباحت کا منظم ہو جانا اغلب، بلکہ قریب بیقین ہو جائے گا۔

اسی خدشہ کی بنا پر بعض حضرات مجتہدین نے یہ فرمایا کہ اذان شروع ہوتے ہی دو رکعت والی نماز شروع کر دے تا کہ اذان ختم ہوتے ہی یہ بھی نماز سے فارغ ہو جائے، مگر یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر یہ شخص بوقت اذان مسجد میں موجود ہے جب تو اذان کی اجابت فعلی اگر چہ حاصل ہے، مگر اجابتِ قولی جو علی اختلاف الاقوال واجب یا مستحب ہوگی اس کا ترک لازم آئے گا۔

اور اگر مسجد میں موجود نہیں تھا تو اجابتِ فعلی نہ ہوگی اور اس کا ترک ایک امرِ مباح یا مستحب کا ترک لازم آئے گا اور یہ دونوں صورتیں شرعاً مذموم ہوں گی۔

ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جناب نبی کریم ﷺ کا اور صحابہ کرامؓ بھی حضرات کا ہمیشہ دائمی طور پر کنارۂ آفتاب کا غروب یقینی ہو جانے کے بعد فوراً بلا تاخیر نمازِ مغرب پڑھ لینے کا معمول تھا اور اس معمول کے خلاف کا ذکر جو بعض روایات میں آیا ہے وہ سفر وغیرہ کے عارض سے یا بیان جواز کی مصلحت سے معلوم ہوتا ہے۔

۱- ابو داؤد، باب وقت المغرب ۱/ ۶۰۔

پس بلا تاخیر ہمیشہ پڑھ لینے کے معمول سے اس معمول کا سنت رسول علیہ وسنتِ صحابہؓ بھی نکل آیا اور سنتِ رسول علیہ کے خلاف بلا عذر شرعی کرنا معصیت وکراہیت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے بھی اشتباکِ نجوم تک تاخیر کو علماء نے خلاف سنت ومکروہ فرمایا ہے، نیز حضور اکرم علیہ اور صحابہ کرام کے اس دائمی معمول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی ان دو رکعتوں کو نہیں پڑھتے تھے (۱)۔

چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اتباع سنت رسول علیہ کے عاشق تھے وہ تصریح فرماتے ہیں: "ما رأيت أحداً على عهد النبي ﷺ يصليهما" (۲) پھر مسجد میں اور علی الاطلاق نہ پڑھنا تو ظاہر ہی ہے کیونکہ کوئی ایک بھی روایت قابلِ استنا د نہیں ہے، اس کے خلاف پر موجود ہیں، گھر میں بھی آپ علیہ نے کبھی نہیں پڑھا، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو طبرانی نے سند شامیین میں سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے: "سالنا أزواج رسول الله ﷺ هل رائتن رسول الله يصلي الركعتين قبل المغرب قلن: لا، غير أم سلمة رضي الله عنها قالت: صلاها عندى مرة، فسألته ما هذه الصلوٰة، قال: نسيت الركعتين قبل العصر فصليتهما (التعليق الصبيح) ناقلا عن فتح الباري (وغيره)" (۳)۔

اسی طرح بہت سی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے اور اکابر صحابہ کی بڑی جماعت نے حضور علیہ کے بعد بھی یہ دو رکعتیں نہیں پڑھیں، ان روایات میں محفوظ السند اور صحیح السند بھی ہیں، یا کم از کم مجموعہ ایسا ضرور ہے جو درجۂ حسن تک پہنچ کر قابل استناد واحتجاج ہو جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت نخعی جو اصحاب حدیث کے نزدیک بھی مسلم بزرگ ہیں وہ بھی فرماتے ہیں: "وانها بدعة وروي عن الخلفاء الأربعة وجماعة من الصحابةؓ إنهم كانو لايصلونها"، ان ہی روایات کی بنا پر ائمہ ثلاثہ اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ ان دو رکعتوں کے سنت واستحباب کے قائل نہیں ہیں (۴)۔

بلکہ حضرت امام مالک کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا اور حضرت امام

۱- "لم يصل أبو بكرؓ ولا عمرؓ ولا عثمانؓ قبل المغرب ركعتين" (بیہقی ۴۷۶/۲ باب من جعل صلوٰة المغرب ركعتين) (مرتب)۔

۲- ابوداؤد شریف، باب الصلوۃ قبل المغرب ۱۸۲/۱۔

۳- طبرانی۔

۴- عمدۃ القاری ۶۶۱/۲۔

شافعی،حضرت امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہیں،حضرت امام ابوحنیفہ منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ نمازِعصر کے بعد کسی نفل کا نہ ہونا ظاہر ہے اور بعد غروب متصلا نمازِ مغرب پڑھنے کے دائمی معمول سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ممانعت نفل بعد غروب بھی فرض مغرب ادا کر لینے تک ممتد ہو۔

تو یہ ارشاد فرما کر اس شبہ کو دور فرما دیا اور "لمن شاء" سے نفسِ اباحت کا اظہار فرمایا، چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا محقق قول یہ ہے کہ اگر کبھی امام کے آنے میں اتفاقاً دیر ہوجائے اور لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہوں تو اس حالت میں اگر کوئی شخص ہلکی پھلکی دو رکعت کنارے ہٹ کر ادا کرے تو گنجائش ہے، ورنہ کراہت ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وتر کے بعد نفل پڑھنا:

۱-عشاء کی نماز کتنی رکعت ہے دوسری بات وتر کی نماز کے بعد کیا نفلیں پڑھنا ٹھیک ہے یا نہیں رمضان میں وتر کی نماز کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اکثر کیا یہ ٹھیک ہے یہ سنتیں نہیں کیا رسول ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ وتر کی نماز آخری نماز ہے تو نفلیں پڑھنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

۲-عرب میں تراویح کی نماز قرآن دیکھ کر پڑھتے ہیں (۱۰ رکعت بعد صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں تو ہم حنفی والے کو ایک وتر پڑھنا ہے یا نہیں) ہم اس طرح سے پڑھ رہے ہیں ایک رکعت وتر امام کے پیچھے پڑھتے ہیں بعد میں تین رکعت وتر الگ پڑھتے ہیں، کیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

محمد شفیع (الجزب سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-عشاء کی نماز کا فرض مقیم کے لئے چار رکعت ہے اور فرض سے پہلے چار رکعت سنت غیر مؤکدہ ہے اور فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ ہے اس کے چھوڑنے کی عادت کر لینا معصیت ہے اور اس کے چھوڑنے والے کے لئے "من ترک سنتي لم ينل شفاعتي" (۱) کی وعید ماثور ہے یعنی جو میری سنت کو چھوڑے گا وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا

۱- وفي رواية:"عن عبد الله: ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم" (ابن ماجہ ابواب المساجد، رقم الحدیث ۷۷۱، ۱/۱۴۱) وفي رواية:

اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھے ورنہ بڑے حرمان میں مبتلا ہوگا وتر کے بعد بلا شبہ نوافل وغیرہ کا پڑھنا جائز ہے صحاح ستہ بخاری مسلم و غیرہ میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں اور آخری نماز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مشروعیت آخر میں ہوئی ہے جیسا کہ مسلم بخاری ابو داود و ترمذی کی روایت "ان اللہ زادکم صلوۃ الخ" سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حضور ﷺ کے خود عمل سے اور خلفاء راشدین کے عمل سے بھی ہوتا ہے اور آخری نماز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آخری شب میں یا آخری وقت میں پڑھی جائے، خوب سمجھ لیجئے۔

البتہ جس کو اخیر شب میں اٹھنے کا یقین ہو اس کو اخیر شب میں وتر پڑھنا بہتر ہے اور جس کو اخیر شب میں اٹھنے کا یقین نہ ہو اسکو اول شب میں ہی پڑھ لینا بہتر ہے یہ سب صحاح ستہ میں مصرح ہیں۔

۲-وتر کی دوسری رکعت میں سلام قطعاً نہ پھیرنا چاہئے صحاح میں اس کی روایت بھی موجود ہے، نیز حضور ﷺ نے صحیح حدیث میں نماز بتیراء (فقط ایک رکعت کی نماز سے) منع فرمایا ہے چنانچہ روایت میں صراحتہ ہے کہ "نهى رسولُ الله ﷺ عن صلوة البتيراء" (۱)، اس لئے جب وہ لوگ وتر کی دوسری رکعت میں سلام پھیر کر محض ایک رکعت پڑھیں تو اس میں انکی اقتداء نہ کرے، بلکہ اپنی وتر علیحدہ تین رکعت ایک سلام سے پڑھے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھنا:

رمضان مہینہ کی ۲۷ ویں تاریخ کو ہم لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھتے ہیں یہ لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں کیا نفل کی نیت سے پڑھے جواب دیں مجموعہ نیت نامہ میں لیلۃ القدر لکھا ہے۔

احقر العاصی بشیر احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

لیلۃ القدر کے لئے کوئی خاص نماز احادیث صحیحہ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ اپنی نفلی عبادتوں میں سے کچھ رکعت نفل

عن عائشة: ستة لعنتهم ولعنهم الله......والتارک لسنتي" رواه البيهقي ورزين (مشکوۃ مع شرح الطیبی کتاب الایمان حدیث نمبر ۱۰۹، ۲۶۰/۱)۔

۱- اخرجہ ابن عبدالبر فی کتاب التمہید نصب الرایہ ۱۲۰/۲، المجلس العلمی۔

نماز کی اور دنوں کے اعتبار سے زیادہ پڑھ لینا اور لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل کر لینا بھی احادیث سے کافی ہونا ثابت ہے، اور کسی خاص نماز کو ضروری سمجھنا ناجائز اور بدعت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۲/۱۴۰۳ھ

باب الجمعہ

غیر مسلم ممالک میں نماز جمعہ وعیدین کا حکم:

ا-یورپ کے اندر بیشتر ممالک ایسے ہیں جہاں کبھی حکومت اسلامی ہوئی ہی نہیں وہاں جمعہ واعیاد نیز سکونت مسلمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

۲-یہاں کی مجلس علماء نے مقامی موسمی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ستمبر کے آخری ہفتہ سے مارچ کے آخری ہفتہ تک شفقِ ابیض کے غائب ہونے پر بالاتفاق ابتداء عشاء کا وقت تسلیم کیا ہے،ابتدا اپریل سے ستمبر کے تیسرے ہفتہ تک شفق احمر کے غائب ہونے پر بالاتفاق ابتداء عشاء کا وقت تسلیم کیا ہے ابتداء اپریل سے ستمبر کے تیسرے ہفتہ تک شفق احمر کے غائب ہونے کے بعد وقت عشاء کی ابتداء تسلیم کی ہے ایسا نہ کرنے میں نزاع شدید،حرج مدید ہے۔کیا مجلس علماء کا یہ فیصلہ قابل عمل ہے؟

فیروز احمد (سکریٹری نیوزی لینڈ اسلامک سوسائٹی)

الجواب وبالله التوفيق:

ا-ایسے ممالک میں جہاں کبھی اسلامی حکومت ہوئی نہ ہو لیکن وہاں حکومتِ وقت کی جانب سے امن وامان قائم رہتا ہو، بدامنی اور شر وفساد کو حکومت روک دیتی ہو تو ایسے ممالک میں بھی جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اور رکھنا مسلمانوں پر بشرائطہا واجب ہوجاتا ہے اور مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ اپنی آپس کی رضامندی سے کسی کو خطیب امام مقرر کرکے اس فریضہ کو انجام دیں، "**وأما بلا عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين، فيجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلما منهم**"(۱)۔

۱-　　ردالمحتار ۸/ ۴۳۔

اسی طرح وہاں سکونت مسلمین بھی جائز ہے، اور صحیح ہے خواہ مستامن ہوکر ہو خواہ مستقل شہری باشندہ کی حیثیت سے ہو، البتہ مسلمانوں پر یہ بھی ضروری رہے گا کہ اپنے معاشرتی معاملات کو شرعی احکام کے مطابق درست رکھنے کے لیے معتبر علماء سے رجوع کیا کریں، نیز آپس کے نزاعی معاملات کے حل کے لیے جماعت مسلمین بنا کر اس سے رجوع کر کے اپنے معاملات میں شرعی احکام کے مطابق فیصلہ لے کر عمل کیا کریں، "فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير و أحسن تاويلا"(۱)۔

۲-آپ کے یہاں کے حالاتِ مذکورہ کے پیش نظر آپ کا مندرجہ طریقہ شرعاً بالکل صحیح درست اور قابل عمل ہے۔

هذا ما عندی من الشرع، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جمعہ فی القری کا حکم:

ایک بستی جس کی مردم شماری بائیس سو ہے جس میں ۹۵ فیصدی مسلم ہیں اور ۵ فیصدی ہندو ہیں اور لوگوں کی عام طور پر ضرورتوں کے پورے ہونے کے لئے تقریباً بیس دوکان ہیں اور اس بستی میں نماز جمعہ اور عیدین پہلے سے پڑھتے چلے آئے ہیں اگر ترک کیا جائے تو اختلاف کا اندیشہ ہے اس بستی میں نماز جمعہ اور عیدین کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

حنفیہ کے نزدیک جمعہ جائز ہونے کے لئے شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے چھوٹے گاؤں میں جمعہ درست نہیں ہے، بلکہ ظہر کی نماز فرض ہے، بڑا گاؤں وہ ہے جس میں گلی کوچے ہوں بازار ہو روزمرہ کی ضروریات مثلاً غلہ کپڑا جوتا، آٹا دال ترکاری گوشت وغیرہ ہمیشہ ملتی ہوں ایسا نہ ہو کہ ہفتہ میں ایک دن یا دو دن بازار لگتا ہو اس سے ضروریات پوری کی جاتی ہوں یا کسی دوسری جگہ سے پوری کی جاتی ہوں ضروری پیشہ ور بڑھی دھوبی لوہار موچی نائی وغیرہ سب وہاں رہتے ہیں ڈاکخانہ ہو ڈاکٹر یا طبیب ہو دوائیں ملتی ہوں غرض ضروریات اور آبادی کے لحاظ سے وہ قصبہ کے مثل ہو جس گاؤں کے متعلق شبہ ہو،

۱- سورۂ نساء:۵۹۔

بہتر یہ ہے کہ تجربہ کار مسائل فقہیہ کے کسی ماہر عالم کو بلا کر معائنہ و مشاہدہ کرادیا جائے پھر اس کی رائے پر عمل کیا جائے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خطبہ میں آیات قرآنی سے قبل تعوذ وتسمیہ پڑھنا:

ہم شافعی ہیں ہمارے امام شافعی کے قول کے مطابق مسئلہ بتلایا جائے ہم جمعہ کے خطبہ میں چوتھے فرض، یعنی ایک آیت قرآن کی پڑھنا ضروری ہے اس آیت سے پہلے "أعوذ باالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم" پڑھنا شافعی قول سے درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبا الله التوفيق:

"اعوذ باالله من الشيطان الرجيم" اور" بسم الله الرحمن الرحيم" کو قرآن کی پڑھنے سے قبل پڑھنا درست ہے، کیونکہ یہ دونوں ادب قرأت میں داخل ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اعلان یا خطبہ سے قبل سلام:

تبلیغی اجتماع ہو یا اور کوئی جلسہ وغیرہ میں جب اعلان کیا جائے تو اعلان سے قبل سلام کرے پھر اعلان کرے، یا امام جمعہ خطبہ سے قبل لوگوں کو سلام کر کے خطبہ شروع کرے تو یہ قبل الاعلان سلام کرنا کیسا ہے؟

الجواب وباالله التوفيق:

اعلان کرنے کے لئے یا خطبہ جمعہ وغیرہ شروع کرنے کے لئے سلام مشروع نہیں ہوا ہے، سلام تو شروع ملاقات

۱- "المصر وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها؛ وعليه فتوى أكثر الفقهاء" (الدرالمختار ۵/۳) نیز درمختار میں ہے: "إنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم..." الخ (الرد المحتار علی الدرالمختار ۵/۳، نیز دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۴۵)۔

کے لئے مشروع ہوا ہے، پس جب اعلان کرنے کے لئے اٹھے یا خطبہ وغیرہ دینے کے لئے اٹھے اور کوئی سا آدمی اکیلا یا ایسے ہی چند سامنے پڑ جائیں تو ان کو سلام کر دینا پھر اعلان یا خطبہ وغیرہ شروع کرنا جائز رہے گا، باقی اعلان کرنے یا خطبہ دینے کے واسطے سلام کا حکم شرعی سمجھ کر سلام کرنا ثابت نہیں، بلکہ منع ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

خطبہ جمعہ اردو میں پڑھنے کا حکم؟

کسی شہر میں اکثر مساجد میں جمعہ کا خطبۂ اولیٰ اردو میں ہوتا ہے، ایسے شہر میں کوئی قدیم مسجد آباد کرنے والے نے خطبۂ اولیٰ اردو میں جاری کئے ہوں، مگر اس شہر کے اکثر مسلمان خطبہ اردو میں سننے کے عادی نہ ہوں تو افضل اور اولیٰ حالات کے اعتبار سے کیا ہے؟ دیگر مساجد کے منتظمین اور مسلم آبادی میں حد درجہ حالات بد اور شدت آچکی ہے۔ منتظمین کے رویہ نے بھی آبادی میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا ہے، ڈر ہے کہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو جائے اور ہاتھا پائی کی نوبت آجائے، لہٰذا ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز جمعہ کے لیے دونوں خطبے شرط ہیں، جیسا کہ عام کتابوں میں فقہ کی لکھا ہوا ہے (۲)، اسی وجہ سے اس میں عبادت کی بھی شان ہے، اس کی طرف اشارہ: "**إذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام**" (۳) سے بھی ملتا ہے۔

نیز خطبہ بھی مثل صلوٰۃ کے امر تعبدی ہے، اس کو عالمگیری نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے: "**الخطبة كالصلوٰة**"، اسی وجہ سے اس میں بھی قیاس کو دخل نہ ہوگا، بلکہ جس طرح نماز امرِ تعبدی ہے اور جس طرح جس کیفیت وقیود وشرائط کے ساتھ دربار رسالت سے منقول ہے، اسی طرح ادا کرنا اور پڑھنا ضروری ہے، قیاس کر کے کہ خطبہ کے معنی مضامین وعظ اور

۱- "وترك السلام من خروجه إلى دخوله في الصلاة، وقال الشافعيؒ إذا استوى على المنبر سلم" (درمختار مع رد المحتار ۳/۲۳) (مرتب)۔

۲- "ويسن خطبتان خفيفتان" (الدر المختار علی الشامی باب صلوٰۃ الجمعۃ ۱/۵۴۴)۔

۳- "وكل ما حرم في الصلوة حرم فيها أي في الخطبة، خلاصة وغيرها، فيحرم أكل وشرب، وكلام ولو تسبيحاً أو ردالسلام أو أمر بالمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت" (الدر المختار علی هامش الشامی باب صلوٰۃ الجمعۃ ۱/۵۵۱) (مرتب)۔

احکام کے ہیں اور مخاطب کو نفع پورا جب ہی پہنچے گا، جب اس کو مخاطب کی زبان میں پڑھا جائے، غلط ہوگا۔

جس طرح نماز کی قرأت و دعاؤں میں یہ ساری مصلحتیں ہوتی ہیں، مگر غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں، اسی طرح خطبہ کا بھی حکم ہوگا۔

اوران ہی وجوہ واسباب کے تحت صحابہ کرامؓ بھی جب بسلسلۂ تبلیغ و جہاد عرب سے باہر نکلے اور فارس وروم میں پہنچے تو انہوں نے کبھی خطبہ جمعہ غیر عربی میں نہیں دیا (مخاطب کی زبان میں) بلکہ قرون ثلٰثہ مشہود لہا بالخیر میں کوئی جزئیہ نہیں ملتا کہ ان حضرات نے خطبہ جمعہ غیر عربی میں پڑھا ہو، حالانکہ ان میں اور ان کی جماعت میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو غیر عربی اور مخاطب کی زبان جانتے تھے، نیز ان کا مقصدِ اولین تبلیغ اور اشاعتِ دین تھا اور اس لیے عرب سے باہر نکلے تھے اور اس وقت اشاعتِ مذہب اور احکامِ مذہب کا طریقہ بھی اس وعظ و نصیحت میں قریب قریب محدود تھا اور آج کل کی طرح اس کے ذرائع ووسائل کثیر نہیں تھے اور وہ ہم سے زیادہ مستعد و شوقین اس معاملہ میں تھے ان سب باتوں کے باوجود خطبۂ جمعہ کو مثل نماز کے بالکل اسی طریقہ میں محدود رکھا جس کو دربار رسالت سے حاصل کیا تھا۔

تو معلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ کو اسی طرح عربی میں محفوظ رکھنا شرعی مطلوب و مقصود ہے، اس سے خروج کرنا منشاء رسالت ﷺ کے خلاف اور: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد" (۱) کا ایک فرد ہوا۔

اوران ہی وجوہ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جن کا پہلا قول غیر عربی میں جواز کا تھا اپنے اس قول سے رجوع فرمالیا۔

اوران ہی وجوہ سے مفتی بہ قول خطبۂ جمعہ کے غیر عربی میں ہونے کے کراہتِ تحریمی کا ہے، جیسا کہ شرح مؤطا میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث قدس سرہ العزیز نے بھی فرمایا ہے (۲)۔

۱- مشکوۃ المصابیح/ ۲۷۔

۲- "ولما لاحظنا خطب النبي ﷺ وخلفائه رضي الله عنهم وهلم جراً فوجدنا وجود أشياء منها الحمد والشهادتان والصلوٰة على النبي ﷺ (إلى قوله) وأما كونها عربية فلاستمرار أهل المسلمين في المشارق والمغارب به مع أن في كثير من الأقاليم كان المخاطبون أعجميين. وقال النووي في كتاب الأذكار: حمد الله تعالیٰ ويشترط كونها أي خطبة الجمعة وغيرها بالعربية. وهل يشترط كون الخطبة كلها بالعربية وجها أن الصحيح اشتراطه، فإن لم يكن منهم من يحسن العربية خطب بغيرها ويجب عليهم التعلم والاعصراً ولا حجة لهم، (شرح احیاء العلوم للزبیدی ۳/ ۲۲۶) روى مسلم عن جابر في قصة يوم الفطر ثم خطب النبي ﷺ، فلما فرغ نزل فأتى النساء، وروى البخاري عن ابن عباسؓ بعد وعظ النساء ثم انطلق هو وبلالؓ إلى بيته. فقوله: فرغ فذكرهن ونزل وانطلق إلى بيته إلى قوله: ولاشك أن التذكير بالهندية ليس من الخطبة المسنونة في شيء؛ لان من

اب جن لوگوں کو اس پر اصرار ہو ان کونرمی ومحبت سے اصل مسئلہ احناف کا اور اصل منشاء حضرت رسالت مآب ﷺ وصحابہ کرامؓ وتابعین عظام کا سمجھایا جائے اور اگر ضرورت داعی ہو تو اس طرح جمع کرلیا جائے کہ ہر خطبہ جمعہ شروع ہونے کے متعینہ وقت کے قبل اذانِ اول کے بعد کوئی صاحب (امام یا غیر امام) خطبہ کا مضمون اور ضروری وعظ بیان کردے اور خطبہ کے متعینہ وقت سے دس آٹھ منٹ قبل اپنا بیان قطعاً بند کردے، تاکہ لوگ اطمینان سے سنت مؤکدہ وقت کی پڑھ لیں اور خطبہ ونماز وقت سے ادا ہو اور گڑبڑی نہ ہو یا پھر تمام نماز (فرض وسنت) سے فراغت کے بعد وعظ کا سلسلہ قائم کرلیا جائے، مگر خطبہ جمعہ کو بعینہٖ ویسا ہی رکھا جائے جس طرح صحابہ کرام سے منقول ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خطبہ جمعہ کے بعد امام کا مصلی پر بیٹھنا:

اس قصبہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز تخمیناً ۸۰-۹۰ سالوں سے ادا کی جارہی ہے جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ پیش امام صاحبان منبر سے اتر کر نماز پڑھانے کے لئے جائے نماز پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر تکبیر شروع ہوتی تھی اب چند مہینوں سے ایک نوعمر پیش امام مقرر کئے گئے ہیں یہ امام صاحب جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ منبر سے اتر کر جائے نماز پر بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھ جاتے ہیں پھر تکبیر شروع ہوتی ہے، جب تکبیر میں حی علی الصلوۃ کہا جاتا ہے تو امام صاحب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اس پر مقتدیوں کا اعتراض ہے، بلکہ اندیشہ فساد اور فریق بندی کا ہے، دریافت ہے کہ قدیم امام کا طریقہ صحیح اور صواب ہے یا کہ جدید امام صاحب کا، یعنی جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ منبر سے اتر کر جائے نماز پر کھڑا ہوجانا یا بیٹھ جانا اور پھر کھڑا ہونا نمازیوں کی اکثریت تکبیر سنتے ہی کھڑی ہوجاتی ہے، جبکہ امام صاحب بیٹھے ہی رہتے ہیں جب تک حی علی الصلوۃ نہ کہی جائے اٹھتے نہیں ہیں عند الشرع کیا حکم ہے؟

خواصها المقصورة كونها بالعربية لعدم نقل خلافها عن صاحب الوحي أو السلفؒ منقول من جواهر الفقه اول" اور درمختار میں شروع فی الصلوۃ کے بیان میں ہے: "علىٰ هذا الخلاف الخطبة وجميع أذ كار الصلوٰة" (الدر المختار علی ہامش الشامی کتاب الصلوۃ ۱/۳۲۵) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلے امام صاحبان کا طریقہ صحیح اور متوارث ہے نئے امام صاحب جو چند مہینوں سے امامت کرتے ہیں اگر جمعہ کے علاوہ اور نمازوں میں پہلے سے اگر بیٹھ چکے ہوں اور بوقت اقامت حی علی الصلوۃ تک بیٹھے رہیں تو گنجائش ہے کہ بعض فقہاء نے حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح پر جو کھڑے ہونے کو لکھا ہے اس کی یہی صورت ہے، لیکن بالقصد ایسا طریقہ بنانا اور اختیار کرنا جو موجب فتنہ ہو ہرگز جائز نہیں ہے، جبکہ ابتداء سے کھڑے ہونے کی تصریح بھی ہے اور متوارث بھی ہے اور خطبہ جمع کے بعد منبر سے اتر کر مصلی پر جا کر پہلے بیٹھ لینے کا طریقہ تو فقہ حنفی میں کہیں ثابت نہیں اور اس کو ضروری سمجھنا یا ایسا (نہ) کرنے والوں پر نکیر کرنا یا ان کو برا سمجھنا قطعاً نا جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۷/۸۵ ۱۳ ھ

جمعہ کی سنتوں کا حکم:

جمعہ کی نماز میں جمعہ کے دو فرضوں کے قبل کی سنتیں اور فرضوں کے بعد کی سنتوں او رنوافل میں قبل جمعہ یا بعد جمعہ کس طرح نیت باندھی جائے گی یا صرف لفظ وقت جمعہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے دیگر یہ کہ قبل کی سنت فوت ہو جائے تو بعد فرض ادا کس طرح کریں اگر کرے تو کیا سب سنتوں کے بعد۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں طرح صحیح ہے، نیت بندھ جائے گی کوئی شق ضروری نہیں (۲)، اگر جمعہ کے قبل والی سنتیں رہ جاویں تو بہتر یہ ہے کہ بعد جمعہ کی سنت پڑھ کر پڑھیں (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- فإذا اتم أي الإمام الخطبة قوله: أقيمت بحيث يتصل أول الإقامة بآخر الخطبة وتنتهي الإقامة بقيام الخطيب مقام الصلاة.... ويكره الفصل بأمر الدنيا (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/۳۹) (مرتب)۔

۲- "والنية: إرادة الصلاة لله تعالى على الخلوص" (البحر الرائق ۱/ ۲۸۰)۔

۳- "بخلاف سنة الظهر وكذا الجمعة، فإنه إن خاف فوت ركعة يتركها ويقتدى ثم يأتي بها على أنها سنة في وقته أي الظهر قبل شفعه عند محمد وبه يفتى " (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۵۱۳، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار نفس صفحہ و بعدہ)، "عن عائشةؓ أن النبي ﷺ كان إذا لم يصل أربعاً قبل الظهر صلاهن بعده" (سنن الترمذی ۲/ ۲۹۱، ابواب الصلاۃ حدیث: ۴۲۶) (مرتب)۔

باب العیدین

نمازعیدین میں حنفی کا شافعی کی اقتداءکرنا:

شافعی امام کے پیچھے حنفیوں کی نماز صحیح ہوتی ہے یانہیں خصوصاً عید کی نماز کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں ایک مفتی صاحب نے ہمارے ملک برما میں عدم جواز کا فتوئ صادر فرمایا ہے، اب تک شافعی مذہب والے اور حنفی مذہب والے ایک دوسرے کی اقتدا کرتے ہوئے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں اب اس عدم جواز کے فتوی سے عوام الناس میں بڑی سراسیمگی ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

"درمختار" (۱/۳۷۸) میں ہے: **"ان تيقن المراعاة لم يكره أوعدمها لم يصح وإن شك كره وتحته في قوله: إن تيقن المراعاة أى المراعاة في الفرائض من شروط وأركان في الصلوة (الى قوله) ذهب عامة مشائخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف وإلا فلا والمعنى أنه يجوز في المراعي بلا كراهية وفي غيره معها، ثم المواضع المهمة للمراعاة أن يتوضأمن الفصد والحجامة والقئي والرعاف ونحو ذلک لا فيما هو سنة عنده۔ مكروه عندنا"**(۱)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ شافعی مذہب امام اگر حنفی مقتدی کی رعایت نماز کے شرائط وطہارت کے مسائل میں کرتا ہے تو بلا کراہت حنفی کی نماز صحیح ہوجائے گی۔اوراگر نماز کے شرائط وطہارت کے مسائل میں بالخصوص نواقض وضو وغیرہ کے مسائل میں رعایت نہ کرتا ہوتو حنفی کی نماز صحیح نہ ہوگی۔

۱- مطلب فی الاقتداء بشافعی ونحوہ باب الامامۃ وکذا فی البحر الرائق باب الامامۃ ۱/۵۱۶، رشیدیہ وکذا فی تبیین الحقائق باب الوتر والنوافل (مرتب)۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ شافعی محتاط ہو اور ان مذکورہ مسائل میں احتیاط رکھتا ہو تو اس کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوگی، ورنہ اقتدا کرنے میں احتیاط کی جائے۔

یہی حکم عیدین کے بارے میں بھی ہے، پھر اگر امام عیدین جو شافعی ہو اور محتاط ہو اور چار زائد تکبیروں سے زائد تکبیر کہے تو حنفی اس میں خموش رہے اور نماز حنفی کی اس صورت میں بلاشبہ صحیح ادا ہو جائے گی اور اگر امام حنفی ہو تو چار زائد تکبریں اس طرح کہے کہ شافعی مقتدی اپنی زائد تکبیریں پوری کرلیں، فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵ / ۲ / ۱۴۰۳ھ

عورتوں کا نماز عیدین کی جماعت میں شریک ہونا:

عورتیں نماز عیدین کی ادائیگی کے لئے عیدگاہ جاتی ہیں اور مسئلہ کے مطابق مردوں اور بچوں کی صفوں کے بعد اپنی صفیں بنا کر امام کے پیچھے نماز عیدین ادا کرتی ہیں عندالشرع موجودہ زمانہ میں کیا حیثیت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

عورتوں کے لئے نماز عیدین اور جمعہ کسی میں شرکت کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ عورتوں کا بناؤ سنگار اور زینت کا لباس پہن کر مردوں میں آنا ممنوع ہے اور جبکہ پردہ کا بھی اہتمام نہ ہو تو اس صورت میں غیر محرم کے سامنے آنا حرام ہے، اس لئے بجائے خدا کی رحمتوں کے حصول کے غضب کے نزول کا سبب بن جائے گا۔

"قال في الخلاصة :ولا يخرج الشابُّ من النساء في جميع الصلوات إلى قوله. وقد ذكرنا الجواب المختار في زماننا أنهن لا يخرجن "(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶ / ۷ / ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ

خطبہ عید کے بعد دعا:

ہمارے یہاں بعض جگہ عید کی نماز کے بعد دعا کرنے کے بجائے خطبہ کے بعد دعا کرتے ہیں خطبہ نماز کے بعد ادا

۱- دیکھئے: فتاوی قاضیخان علی ہامش الفتاوی العالمگیریہ ۱ / ۱۸۳۔

کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بشیر احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز عیدین میں خطبہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں ہے، ہاں نماز کے بعد فوراً دعا کر سکتے ہیں (۱)، اور دعا کے بعد خطبہ پڑھ سکتے ہیں حدیث شریف میں ہر نماز کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، اس لئے یہ بدعت نہ ہوگا اور خطبہ کے بعد ثابت نہیں، پس اگر خطبہ کے بعد دعا کرنے کو ضروری یا حکم شرعی سمجھ کر بالالتزام دعا کریں تو نا جائز اور بدعت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۲/ ۱۴۰۳ھ

نماز عید کے بعد مصافحہ ومعانقہ:

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان عیدین میں نماز عید کے بعد ملاقات اور معانقہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو عید مبارک کے ساتھ مبارکباد دیتے ہیں اس میں حضور ﷺ اور صحابہ کا کیا معمول رہا۔

یوسف ابا والندنی

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کے دن بعد نماز جو معانقہ ومصافحہ وغیرہ کا مروجہ طریقہ ہے کہ نماز کے پہلے سے بالکل ساتھ ساتھ تھے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھی، مگر نماز سے فارغ ہو کر مصافحہ ومعانقہ کرنے لگے گویا کہ یہ معانقہ ومصافحہ عید کا معانقہ ومصافحہ ہے، یہ چیز سرکار دو عالم ﷺ کے دور میں، بلکہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے اندر کہیں نہیں ملتی، اس لئے اس کو شرعی وضروری سمجھ کر کرنا قطعاً نا جائز اور : "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد" (۲) (وفي رواية): "فهو مردود" کا مصداق

۱- "ويدعو ويختم بسبحان ربك" (الدرالمختار علی الرد ۱/ ۴۹۵، مطبوعہ عثمانیہ) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۵/ ۳۰۱ کتاب الصلح حدیث ۲۶۹۷، صحیح مسلم کتاب الاقضیہ حدیث ۱۷/ ۱۸/ ۱۷ا عن عائشہ (مرتب)۔

ہے اور اس طور پر ایسا کرنا بدعت ہوگا ہاں اگر کوئی شخص وہاں نہیں تھا اور ملاقات ہوگئی یا کوئی شخص کہیں باہر سے آ گیا اور ملاقات ہوگئی تو اس سے مصافحہ اور معانقہ ممنوع و بدعت نہ ہوگا، لیکن جہاں اس معانقہ وغیرہ کی بدعت کا ایسا عام رواج ہو کہ لوگ اس کو ضروری سمجھ کر کرتے ہوں تو وہاں ان لوگوں سے بھی احتیاطاً معانقہ وغیرا ایسا کام کرنا جس سے اہل بدعت کو سند پکڑنے کا موقعہ ملے درست نہ ہوگا، کیونکہ یہ امر محض مباح یا بیش از بیش مستحسن ہوگا اور عقیدۂ عوام کی حفاظت اور عوام کو غلط عقیدہ میں ابتلاء سے بچانا واجب ہوگا اور مستحسن کے لئے واجب کا ترک کرنا جائز نہیں ہوگا، باقی عیدین کے روز نفس خوشی منانا اظہار مسرت کرنا اور دوست واحباب سے ملنا اور بوقت ملاقات کلمات ترحیب پیش کرنا بھی اس طرح سے کہ اہل بدعت سے مشابہت نہ ہو درست اور جائز ہے(۱)، اس لئے کہ حدیث شریف میں ان ہی ایام کے بارے میں آیا ہے: "**هذه الأيام أيام أكل وشرب أو كما قال عليه الصلاة والسلام**(۲) یعنی یہ دن کھانے پینے اور ازدواجی زندگی کو سنوارنے کے ہیں ہمارے اکابر بھی اہل ہوئی و بدعت کی مشابہت سے بچتے ہوئے اظہار مسرت اور دوست احباب، اعزہ واقرباء سے ملنا جلنا رکھتے تھے اور رکھتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

عید کے دن غیر شرعی کاموں کو انجام دینا:

یہاں عید کے دن میں لوگ کیا کیا بناتے (میدان بنانے کنواں کھودنے یا اسکول کا جھنڈا (بوٹا) کا کھمبا خریدنے) کے لئے ایسا ہی روپیہ اٹھاتا ہے (چندہ کرتے ہیں) شریعت میں یہ بات ہے (یہ شریعت کی بات ہے)؟ کیا ایسا کرنا اچھا ہے؟

۱- "**وندب كونه من طريق آخر واظهار البشاشة وإكثار الصدقة والتختم والتهنئة بتقبل الله منا ومنكم لا تنكر**" (درمختار مع ردالمحتار ۳/۴۹ تفصیل کے لئے شامی دیکھئے)۔

۲- "**عن عقبة بن عامرؓ قال، قال رسول اللهﷺ يوم عرفة ويوم النحر وأيام التشريق عيدنا أهل الإسلام وهي أيام أكل وشرب**" (سنن الترمذی ۳/۴ ۱۳ کتاب الصوم باب ما جاء فی کراهية الصوم فی أيام التشريق حديث ۷۷۳، سنن ابو داود ۲/۳۲۰ کتاب الصوم باب صيام أيام التشريق حديث ۲۴۱۹) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کے دن ان چیزوں کا کرنا شریعت میں ثابت نہیں، بلکہ بعد کے لوگوں کی من گھڑت ایجاد ہے اس کو شرعی چیز سمجھ کر کرنا یا شرعاً اچھا سمجھنا سب ممنوع اور: ”من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد“ (۱) میں داخل ہو کر ناجائز اور بدعت ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۸/۱۱ھ

۱- ”عن عائشةؓ قالت قال رسول اللهﷺ: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد“ (صحیح البخاری مع فتح الباری ۳۰۱/۵ کتاب الصلح باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود حدیث ۲۶۹۷) (مرتب)۔

باب الجنائز

موت پر ختم تہلیل:

کیا کسی کی موت پر ختم تہلیل کرنا بدعت ہے؟ اگر ہے تو کس صورت میں اور جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ واضح جواب سے نوازیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کو ایصال ثواب کے لئے ختم تہلیل یا تلاوت قرآن اور صدقہ وغیرہ کرنا، جبکہ مشروع طریقہ پر بلا قیود ورسومات ہو جائز ہے، **"صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر، بأن للإنسان أن یجعل ثواب عمله لغیره صلاة أو صوماً أو صدقة أو غیرها کذا فی الهدایة"** (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

غائبانہ نماز جنازہ کا بیان:

قرآن وحدیث اور مسلک کے اعتبار سے غائبانہ نماز جنازہ کا چاروں اماموں کے نزدیک کیا حکم ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں کہ کس کی نماز جنازہ غائبانہ میں پڑھنی چاہئے اور کس کی نہیں؟

محمد اکرام مظفر نگری

۱- شامی ۱/ ۶۲۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

نمازِ جنازہ غائبانہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اور ایک روایت میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے اور حضرت امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور جمہور امت کے نزدیک ناجائز ہے، "**ومنها أن يكون الميت حاضرا فلا تجوز الصلاة على الغائب...... باتفاق الحنفية والمالكية وخالف الشافعية والحنابلة**"(۱)۔

جو حضرات جائز فرماتے ہیں ان کی دلیل صحاحِ ستہ کی صرف ایک روایت ہے جس میں حضور علیہ السلام کا حبشہ کے بادشاہ حضرت نجاشیؓ کی نمازِ جنازہ کا پڑھانا مروی ہے(۲)۔

وفي حديث أنه عليه السلام: "قال: مات اليوم عبد لله صالح أصمعة النجاشي فأمنا وصلى عليه" (رواہ مسلم) حالانکہ صحاحِ ستہ کی دوسری صحیح روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت نجاشی کا جنازہ بوقت نماز حضور علیہ السلام کے سامنے رای العین کر دیا گیا تھا(۳)، حجاباتِ ارضی مرتفع فرما کر یا جس طرح بھی اللہ نے چاہا ان روایات کی بنا پر نمازِ غائبانہ ہی کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

رہ گیا ان صحابہ کا جو اس میں شریک تھے ان کے اعتبار سے بھی نمازِ غائبانہ کہنا مشکل ہے، اس لیے کہ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت صحاح ہی میں ہے کہ ہم لوگوں کو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ جنازہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

اگر غائبانہ ہی تسلیم کر لیا جائے تو ان حضرات کی خصوصیت قرار دی جائے گی بچند وجوہ: اول یہ کہ جب یہ اسلام لا چکے تھے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک آدھ دفعہ تو خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گئے ہوتے بالخصوص جب کہ حاضری میں کوئی خاص مانع نہیں تھا، پس ان کے اسلام کی اشاعت کے لیے آپ علیہ السلام نے ان کی نماز پڑھ کر اس کو ظاہر فرمایا۔

دوم یہ کہ ایک خلقِ کثیر نے آپ علیہ السلام کے سامنے انتقال فرمایا اور بعضوں کی موت بڑی دردناک حالت میں غزوات وغیرہ میں ہوئی، مگر آپ علیہ السلام نے کسی کی بھی نمازِ جنازہ غائبانہ نہیں پڑھی، یہ کھلی دلیل ہے کہ نمازِ جنازہ غائبانہ جائز

۱- کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۱/۵۲۲۔

۲- "عن أبي هريرة أن النبي ﷺ نعى للناس النجاشي اليوم الذى مات فيه وخرج بهم إلى المصلى فصف بهم وكبر أربع تكبيرات" (الصحیح لمسلم ۱/۳۰۹، الصحیح للبخاری ۱/۱۶۷ واللفظ للمسلم) (مرتب)۔

۳- "كما قاله العياض في الشفاء: ورفع النبي ﷺ النجاشي حتى صلى عليه فتكون صلوته عليه كصلوٰة الإمام على ميت رآه ولم يره المأموم، ولا خلاف في جوازها كما ذكر الواقدي في كتابه عن ابن عباس قال كشف للنبي ﷺ عن سرير النجاشي حتى راه وصلى عليه" (مرتب)۔

ہوتی تو اس پر ضرور عمل کر کے دکھایا جاتا۔

رہ گئیں معاویہ بن معاویہ حبشی کے جنازہ کی نماز غائبانہ پڑھنے کی روایات تو یہ اس قدر ضعیف اور مجروح ہیں کہ ان میں کسی میں بھی حجتِ جواز بننے کی صلاحیت نہیں ہے اور اگر کوئی ان سب روایات کے مجموعہ سے استدلال کرے تو ان میں یہ تصریح بھی ہے کہ حجابات مرتفع کر کے جنازہ سامنے کر دیا گیا تھا(۱)۔

اقوال:

حضرت نجاشی پر آپ ﷺ کے نمازِ جنازہ ادا کرنے کا یہ بھی جواب دیا جاتا کہ حضور ﷺ نے جو صحابہ کو لے کر اصمعہ نجاشی پر نمازِ جنازہ پڑھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نجاشی خفیہ طور پر ایسی جگہ مسلمان ہوا تھا کہ وہاں ان پر نمازِ جنازہ پڑھنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔

"ومن ثم قال الخطابي لايصليٰ علی الغائب إلا إذا وقع موته بأرض ليس بها من يصلی عليه"۔

تیسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ نجاشی کا بدن تو سامنے نہیں لایا گیا تھا، مگر ان کی روح آپ ﷺ کے سامنے لائی گئی، اس لیے اس پر نمازِ جنازہ پڑھی، لیکن رفعِ حجاب کرنا یا روح کو حاضر کرنا آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے .... چوتھا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دوسرے بادشاہوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے اور جو دوسرے بادشاہ آپ ﷺ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ان کے استیلافِ قلوب کے لیے نجاشی پر نمازِ جنازہ پڑھی، نیز صلوٰۃ جنازہ کے متعلق یہ بھی شرط ہے کہ میت امام کے سامنے موجود ہو اور صلوٰۃ علی الغائب کے جواز کی صورت میں یہ شرط فوت ہو جاتی ہے، بہر حال صلوٰۃ علی الغائب کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔

اس لیے غائبانہ جواز پر استدلال درست نہ ہوگا، اسی طرح زید بن خلف اور جعفر طیارؓ) کے جنازوں کی زیارت کی روایت کا بھی یہی حال ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں کے لیے دعاءِ مغفرت وغیرہ کی ہے، نہ کہ صلوٰۃ جنازہ ادا فرمائی۔

اور اگر تسلیم بھی کر لیں جب بھی خلقِ کثیر پر غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا ثبوت محض ہوتے ہوئے ان جزوی واقعات سے شیوع وعموم کے ساتھ نمازِ جنازہ غائبانہ کا اثبات کسی طرح بھی درست نہ ہوگا، اسی لیے تابعین حضرات صلوٰۃ

۱- "كما قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم لتبوك فنزل جبرئيل عليه السلام، فقال يا رسول الله! ان معاوية بن معاوية المزني مات بالمدينة، أتحب أن تطوى لك الأرض فتصلي عليه؟ قال عليه السلام: نعم، فضرب بجناحه على الأرض ورفع له سريره فصلىٰ عليه" (مرتب)۔

جنازہ غائبانہ کے قائل نہیں ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا میت کو غسل دلانے والے پر غسل واجب ہے؟

اگر نابالغ بچہ کا انتقال ہو جائے اور جو شخص اس نابالغ بچہ کو غسل دے اس پر غسل کرنا واجب ہے یا نہیں، اور اگر بچہ چند ہی دن کا ہے تو اس کو غسل دینے والے پر غسل واجب ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں غسل دلانے والے پر غسل واجب نہیں ہے: چاہے میت بالغ ہو چاہے چند دنوں کا بچہ صغیر ہو (۲)، منیۃ المصلی میں غسل کی گیارہ قسمیں مذکور ہیں اور یہ کسی بھی قسم میں شمار نہیں ہے (۳)، اور تصانیف کا مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ یہ مواقع غسل میں سے نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمن خیر آبادی

دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا، نیز نماز جنازہ کب تک ادا کی جاسکتی ہے؟

(۱) زید برضائے الٰہی فوت ہو گیا۔

وفات کے بعد اسے غسل دینے اور کفنانے کے بعد ایک مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی، لیکن اس میں اولیاء جنازہ میں کوئی بھی اتفاق سے شرکت نہ کر سکا۔ تو کیا کوئی ولی (علی الترتیب) دوبارہ نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے کہ نہیں، نیز ولی کی صلاۃ

۱- "لأنه لو جازت الصلوٰة على الغائب مطلقا لصلى النبي ﷺ على من مات من الصحابة ويصلي المسلمون شرقا وغربا على الخلفاء الأربعة وغيرهم ولم ينقل ذلك" (عینی ۴/ ۳۳ او الفتح، والبذل والتعلیق ۲/ ۲۳۷ والأعجز ۱/ ۲۲۷) (مرتب)۔

۲- البتہ غسل دلانے والوں کو غسل کرنا مستحب ہے، کما في رد المحتار: "وندب أى الغسل لجنون أفاق وكذا المغمى عليه (إلى قوله) أو غسل ميتاً الخ" (فتاوی شامی ۱/ ۱۶۷) (مرتب)۔

۳- کبیری ص، ۵۲، ۵۴، کتاب الطہارۃ۔

الجنازۃالاولی میں قصداً عدم شرکت کا کیا حکم ہے، (۲) زید بیرون ملک میں فوت ہوگیا وہاں پر اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا اس کے بعد غسل دے کر کفن پہنا کر لکڑی کے تابوت میں بند کر کے بغیر جنازہ پڑھے اس نعش کو اپنے سابقہ ملک بھیج دیا گیا وفات کے بعد تین روز کے اندر وہ نعش ورثۂ اولیاء کو مل گئی اب تین دن کے اندر ورثا اس کا جنازہ پڑھ سکتے ہیں کہ نہیں، (۳) زید کی نعش بیرون ملک سے وفات کے تین روز بعد ورثہ کو ملی اور بظاہر کوئی بدبو اور جسم کا تفسخ نہیں محسوس ہوتا تو اس کا اب جنازہ پڑھانا جائز ہے کہ نہیں، جبکہ اس سے قبل اس کا کوئی جنازہ نہ پڑھا گیا ہو، (۴) اس زمانے میں خصوصا جو نعشیں بیرون ملک سے لائی جاتی ہیں پوسٹ مارٹم کر کے کوئی خاص مسالہ لگایا جاتا ہے یا نعش کو تابوتی مختصر سرد خانہ میں رکھ کر باہر سے بند کر دیا جاتا ہے اس طرح کہ جس کی وجہ سے بدبو محسوس نہیں ہوتی سوال ہے کہ اگر یہ مسالہ نہ لگایا جاتا یا اس سرد خانہ میں رکھنے کا انتظام نہ کیا جاتا تو تین روز کے بعد بالفرض یہ نعش متورم ہو کر پھٹ جاتی، لیکن پھٹنے اور بدبو پھیلنے سے بظاہر اس عارضی انتظام کی وجہ سے بچ گئی۔ کیا اس نعش پر بھی کئی کئی دنوں اور مہینوں کے بعد نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں، (۵) وفات کے بعد میت پر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے وقت کی کوئی حد از روئے شرع مثلاً تین روز وغیرہ کی مقرر ہے یا کہ جب تک میت کے جسم کا تفسخ خون وغیرہ کا خروج بدبو نہ محسوس ہوتی ہو، دیگر شرائط کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنے کو جائز قرار دیا جائے۔

غلام مصطفیٰ عفی عنہ (دارالعلوم عثمانیہ، ۸۵، رسول پارک، اچھرہ ۱۶، پاکستان)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- جب اولیاء میں سے کسی نے شرکت نہیں کی تھی تو اولیاء بعد میں پڑھ سکتے ہیں کسی مجبوری سے شرکت نہ کر سکے ہوں یا بالقصد شریک نہ ہوئے ہوں دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے کہ ولی بعد میں پڑھ سکتا ہے (۱)۔

۲و۳و۴ جنازہ تین دن کے اندر ملے یا تین دن کے بعد ملے اگر پھٹا نہیں ہے اور نعش مجسم موجود ہے تو اس پر نماز جنازہ اگر اب تک نہیں پڑھی گئی تو نماز جنازہ پڑھنا اس پر فرض ہے اور نعش کا یہ تحفظ، خواہ مسالہ لگا کر ہو یا سردخانہ میں رکھکر ہو یا کسی اور وجہ سے جب جسم صحیح ہے اور نماز جنازہ ادا نہیں ہوئی ہے تو ادا کرنا فرض ہے (۲)۔

۱- ”فإن صلى غيره أي الولي ممن ليس له حق التقدم على الولي ولم يتابعه الولي أعاد الولي ولو على قبره“ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۲۳، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار) (مرتب)۔

۲- ”وإن دفن وأهيل عليه التراب بغير صلاة أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له صلى على قبره إستحساناً ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح“ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۲۵) (مرتب)۔

۵-قبر میں دفن کے بعد فقہاء کرام جو تین دن کے بعد پڑھنے سے منع فرماتے ہیں وہ اس بنا پر فرماتے ہیں کہ جسم پر مسالہ وغیرہ نہ چڑھایا جائے اور گرم میں رکھا جائے تو عموماً تین دن میں نعش خراب ہوجاتی ہے اور جب خراب ہوجائے تو وہ نعش باقی نہ رہی تو نماز جنازہ کا حکم ختم ہوجاتا ہے، ورنہ تین دن کی تحدید کوئی اصلی وذاتی نہیں ہے (۱) پس جب تین دن کے بعد بھی وہ نعش صحیح سالم محفوظ ہے تو نماز جنازہ کا حکم متوجہ رہے گا اور جب تک نماز جنازہ ادا نہ ہوئی ہو ادا کرائیں گے "**كما يوخذ من هذه العبارة وشرحه (أى الصلوة للجنازة) إسلام الميت وطهارته ووضعه أمام المصلى (متن الدر) وفي شرحها وشرطها ايضا حضوره ......وكونه هو اوا كثره**" (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۴۰۱ھ
الجواب صحیح سید احمد علی مفتی دارالعلوم دیوبند

جنازہ پر آیات کریمہ یا اسمائے حسنیٰ والی چادر ڈالنا کیسا ہے؟

پہلے زمانہ کے لوگ مردوں کو چارپائی پر لے جاتے تھے تو اوپر سے کوئی سفید چادر ڈال لیتے تھے۔ اب تکلف زیادہ ہوگیا ہے۔ قیمتی تابوت بنوایا جاتا ہے، اوپر پردہ کے لئے مخمل کا پردہ آیا ہے اس پر کلام اللہ کی آیات لکھی ہیں۔ کچھ دیندار لوگ اس کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں آیات قرآنی کی توہین ہے۔ بجائے اس کے سادی چادر ڈالنا چاہئے۔

سوال ہے:

☆ اس مخملی قیمتی چادر کو استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ تنزیہی؟

☆ اگر ناجائز ہے تو اس چادر کو کیا کیا جائے۔

الجواب وبالله التوفيق:

☆ دیندار حضرات کا کہنا صحیح ہے۔ کلام اللہ شریف کی آیات واجب التعظیم ہیں، اور واجب التعظیم شئے کو مظنۂ

۱- "ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح، لأنه يختلف باختلاف الأوقات حراً وبرداً والميت سمناً وهزالاً والأمكنة" (ردالمحتار على الدر المختار ۳/۱۲۵) (مرتب)۔

۲- درمختار کی عبارت اس طرح ہے: "وشرطها أيضاً حضوره و"وضعه" وكونه هو أو أكثر "أمام المصلى" (الدر المختار مع ردالمحتار ۳/۱۰۴) (مرتب)۔

ذلت واہانت میں رکھنا ناجائز ہے اور جس چادر پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہوں اس چادر کو جنازہ پر ڈالنا مظنۂ اہانت ہونے سے خالی نہیں، اس لئے کہ اگر وہ آیات کمر سے نیچے پیر وغیرہ کی جانب ہوں یا جسد میت سے نیچی لٹکی ہوئی ہوں تو ان آیات کی اہانت ظاہر ہے۔ اسی طرح کمر سے اوپر سینہ یا سر کی جانب ہوں جب بھی جسد میت سے اکثر کچھ ناپاک رقیق رطوبت وغیرہ خارج ہونا ظاہر ہے، پس اگر کفن کے اوپری حصہ کی جانب یہ نجاست کفن میں لگ جائے تو چادر کے اس سے مس ہونے سے خود آیات کریمہ کا نجاست پر ڈالنا لازم آئے گا جس سے بچنا واجب ہونا ظاہر ہے اور اس چادر کے عام استعمال کی اجازت دینا کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ پس اگر کوئی شخص بہت اہتمام سے حفاظت کرے اور جسد کے اوپر کمانی وغیرہ لگا کر اس چادر کو اتنے اوپر رکھے کہ ان مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو، بلکہ محض برکت کیلئے سر یا سینہ کی محاذات میں رکھ دیا جائے تو اس میں مضائقہ نہ ہوگا۔ مگر جب بھی اس چادر کے عام طور پر استعمال کو جائز کہہ دیا جائے تو مظنۂ نجاست واہانت پر پیش کرنے میں شبہ نہ ہوگا، اس لئے ایسی چادر کی جنازہ پر عام اجازت ہرگز نہیں ہو سکتی، اس لئے بہر حال تحرز چاہئے۔

☆اور جب ناجائز رہا تو اس چادر کو تبرک کی طرح رکھ دیا جائے یا محترم موقع پر رکھا جائے فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۵/۱۴۱۱ھ

قبر میں رکھنے کے بعد چہرہ دیکھنا:

ہمارے یہاں آجکل یہ رواج عام ہوتا جا رہا ہے کہ مردہ کو کفنانے کے بعد قبرستان کی مسجد میں بعد نماز جنازہ یا قبر میں رکھنے کے بعد میت کے چہرہ کو کھول کر دیکھایا جاتا ہے شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ التزام درست نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی امر مباح کو اگر لازم اور ضروری سمجھ لیا جاوے تو اس کا ترک ضروری ہے، اگر کوئی منہ دیکھنا چاہے تو کفنانے کے بعد دیکھلایا جائے نماز جنازہ کے بعد یا قبر میں رکھنے کے بعد منہ دیکھلانا مناسب نہیں، کیونکہ اس حالت میں اس پر آثار برزخ شروع ہو جاتے ہیں۔

" فیه أن من أصر علی أمر مندوب و جعله عزماً ولم یعمل بالرخصة أصاب منه الشیطان من

الإضلال، فكيف من اصّر على بدعة ومنكرا نتهى والله تعالىٰ اعلم (مأة مسائل)"

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

مردہ کو دفن کر کے جب واپس آتے ہیں تو اس وقت ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے کو جی چاہے تو قبر کی طرف سے منھ پھیر کر قبلہ رو ہو جائیں (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

ہمارے یہاں قبرستان پر زیارت کرتے وقت یا زیارت کرنے کے بعد قبلہ کی طرف منھ کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگا جاتا ہے مطلقاً قبرستان پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

بشیر احمد

الجواب وبالله التوفيق:

قبرستان میں بوقت زیارت دعا کرنے میں ہاتھ نہ اٹھانا بہتر ہے، اگر دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانے کا دل چاہے قبلہ رخ ہو جائے اور قبر سے رخ پھیرے (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

۱- واذا اراد الدعاء یقوم مستقبل القبلۃ کذا فی خزانۃ الفتاوی، ہندیہ ۵/ ۳۵۰، رشیدیہ پاکستان (مرتب)۔

۲- "وإذا أراد الدعاء يقوم مستقبل القبلة كذا في خزانة الفتاوى" عالمگیری ۵/ ۳۵۰، رشیدیہ، پاکستان (مرتب)۔

جمعہ کی شب میں وفات پانے والے شخص کو جمعہ کی نماز سے قبل دفن کرنا ضروری ہے؟

اگر کسی شخص کا جمعہ کے روز یا جمعہ کی شب میں انتقال ہوا، تو کیا اس کو جمعہ کی نماز سے قبل دفن کرنا ضروری ہے؟
بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس کو جمعہ سے قبل دفن کر دیا گیا تو تمام جمعوں کا ثواب ملتا رہے گا ورنہ نہیں۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی صورت میں نماز جمعہ سے قبل دفن کرنا واجب نہیں ہے اور واجب سمجھنا غلط ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ نماز جنازہ میں شریک ہونے والے جس صورت میں زیادہ ہوں اس کا لحاظ افضل رہے گا، ہاں اگر نعش خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے دفن کر دینا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظہیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

عذاب قبر کا تعلق روح اور جسم دونوں سے ہے یا ایک سے؟ نیز قبر سے کیا مراد ہے؟

کیا عذاب صرف جسم کو ہوتا ہے یا روح کو یا دونوں کو قبر سے مراد کون سی قبر ہے یہ قبرستان والی یا جو علیین میں جہاں روح ہوتی ہے کیا روح کا تعلق جسم سے ہوتا ہے یا نہیں کچھ لوگ کہتے ہیں قبر سے مراد علیین والی قبر ہے قبرستان والی قبر مراد نہیں ہے شریعت کی رو سے جواب دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک ہے دارالعمل (دار تکلیف جو دنیا ہے اس کے بعد جزاء اور سزا کا معاملہ ہوگا جس کا نام دار آخرت (دار جزاء) ہے، ان کے علاوہ تیسرا دار ہے کہ انسان دنیا سے رخصت ہوا اور قیامت سے پہلے درمیان میں پڑتا ہے اس کا نام دار قبر ہے جو (برزخ) کہلاتا ہے آدمی جو عمل کرتا ہے قیامت سے پہلے اس عمل کا بدلہ شروع ہوتا ہے اور آئندہ ملنے والی چیزوں کا نمونہ

دیکھایا جاتا ہے،نعمت کی شکل میں ہو یا عذاب کی شکل میں ہو (۱)،قبر سے مراد وہ گڑھا نہیں ہے جس میں دفنا دیا جاتا ہے، بلکہ مرنے کے بعد کی حالت مراد ہے وہ کسی طرح سے بھی ہو چاہے وہ پانی میں ڈوب کر مرجائے یا اور کسی طرح سے (۲)،دنیا کے اندر اصل جسم ہے اور روح اس کے تابع ہے جسم کے واسطے سے روح کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور آخرت میں جسم تابع ہے اور روح اصل ہے،اس لئے اگر جسم ریزہ ریزہ ہوگیا ہو اور مٹی بن گیا ہو تب بھی مقصد حاصل ہوتا ہے،لیکن جسم کو بھی تابع بنا کر عذاب دیا جاتا ہے آخرت کی حیات اور دنیا کی حیات میں فرق ہے۔دنیا میں جسم اور روح کا تعلق قوی ہے وہاں ایسا نہیں ہے (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱/۱۴۰۲ھ

کافر کی موت کی خبر سن کر کیا کہنا چاہئے؟

کافر کے مرنے کی خبر سنکر کیا کہنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی بات کہے جس میں اس کا معاملہ خدا کے حوالہ ہو جاوے مثلاً یوں کہے خدا اس کے مناسب حال معاملہ اس کے ساتھ کرے (۴)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۱۰/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''إن رسول اللہ ﷺ قال: إن أحدكم إذا مات عرض عليه مقعده بالغداة والعشي إن كان من أهل الجنة فمن أهل الجنة وإن كان من أهل النار فمن أهل النار، فيقال: هذا مقعدك حتى يبعثك الله يوم القيامة'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۳/ ۲۴۳ کتاب الجنائز حدیث: ۱۳۷۹)۔

۲- ''وإنما أضيف العذاب إلى القبر لكون معظمه يقع فيه ولكون الغالب على الموتى أن يقبروا وإلا فالكافر ومن شاء الله تعذيبه من العصاة يعذب بعد موته ولو لم يدفن'' (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۳/ ۲۳۳)۔

۳- ''وخالفهم الجمهور فقالوا تعاد الروح إلى الجسد أو بعضه كما ثبت في الحديث ولو كان على الروح فقط لم يكن للبدن بذلك إختصاص، ولا يمنع من ذلك كون الميت قد تفرق أجزاؤه، لأن الله قادر أن يعيد الحياة إلى جزء من الجسد ويقع عليه السوال كما هو قادر على أن يجمع أجزاءه'' (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۳/ ۲۳۵) (مرتب)۔

۴- دیکھئے: کتاب الخراج لابی یوسف/ ۲۱۶ و ردالمحتار ۹/ ۵۵۷، مکتبہ زکریا۔

ایصال ثواب کا روپیہ مدرس کی تنخواہ میں دینا:

ایصال ثواب کا روپیہ مدرس کی تنخواہ میں بھی دیا جاسکتا ہے کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ایصال ثواب کا روپیہ منت کا ہے یعنی اس کے ایصال کی منت مان چکا ہے تو اسکا صدقہ کرنا واجب ہے اس کے مستحق صرف غریب اور نادار طلبا ہیں، مدرس کی تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے اور منت کا نہیں ہے تو تنخواہ مدرس میں بھی دے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

غیر مسلموں کے ایصال ثواب کا حکم:

بعض غیر مسلموں کو خواجہ صاحب یا اور بعض بزرگوں سے بڑی عقیدت ہے، چنانچہ وہ ان کے ایصالِ ثواب کے لیے غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں، یا صدقہ خیرات کرتے ہیں یا مسجد مدرسہ بنواتے ہیں، تو کیا ان غیر مسلموں کا ایصالِ ثواب ان اکابر کو پہنچتا ہے یا نہیں؟

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ ہوسکتا ہے کہ خواجہ صاحب یا ان بزرگوں کو کچھ ثواب منجانب اللہ مل جائے، اللہ کی مشیت ومرضی پر موقوف ہے ضابطہ نہیں ہے۔

باقی مسلمانوں کے ایصالِ ثواب کی طرح ایصالِ ثواب کرنے والے کو جو ثواب آخرت کا ملتا ہے، وہ غیر مسلم کو نہیں ملے گا، البتہ دنیا میں کچھ وسعت وراحت پہنچ جائے تو یہ ہوسکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۱۱/ ۱۴۰۱ھ

ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا حکم شرعی:

انگلستان کی اکثر مساجد میں عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہوجاتا ہے تو اس کا رشتہ دار مساجد کمیٹی کے سکریٹری /صدر کے ذریعہ یہ اعلان کرانے کی خواہش کرتا ہے کہ فلاں دن فلاں وقت برائے ایصال ثواب ختم قرآن شریف ہوگا۔ آپ سب حضرات مسجد میں تشریف لائیں۔

ابھی دو ماہ ہوئے اس مسجد میں جب کسی نے ایسی درخواست کی تو اپنے امام صاحب نے (جو مفتی ہیں) کہا یہ جائز نہیں، ایک بزرگ اور تھے انہوں نے بھی کہا کہ نہیں۔ اپنے گھروں میں قرآن خوانی کرالیں اور مسجد میں دعائے مغفرت ہو جائے گی۔

کافی بھائیوں کو تعجب ہوا کہ یہ رواج ہم اپنے بچپن سے ہندوستان اور پاکستان میں دیکھتے آئے ہیں، اور اب یہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسجد میں پھر قرآن خوانی نہیں ہوئی۔

ابھی دس دن کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی کی لڑکی فوت ہوگئی اس نے قرآن خوانی کی خواہش کی آخر اس کے کہنے پر یہ فیصلہ ہوا کہ سورہ یسین پڑھ کر دعائے مغفرت کر دی جائے۔

مفتی صاحب نے (زادالمعاد ص ۱۵۰، ج ا، مصری) کا حوالہ دیا جس میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ طریقہ نہ تھا کہ تعزیت کے لئے لوگ جمع ہوں اور قرآن خوانی ہو، نہ قبر کے پاس نہ کسی اور جگہ یہ سب باتیں بدعت ہیں، ایجاد کردہ ہیں، مکروہ ہیں۔

اب جو بھائی قرآن خوانی کے حق میں ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ ایک تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں قرآن شریف ابھی مکمل کتاب کی صورت میں تیار نہیں ہوا تھا (وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے عہد خلافت میں مکتوب ہوا)، اس لئے آپ ﷺ کے وقت میں قرآن شریف ختم کرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے یہ کہ "نہ کسی اور جگہ" میں صرف مسجد ہی نہیں آتی، بلکہ گھر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ تو پھر قرآن خوانی کیسے ہو اور مرحوم کو ایصال ثواب کی صورت کیا ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مرحوم کے دوست احباب کو کہہ دیا جائے کہ تم منفرداً ختم کرالو، یعنی اکٹھے ہو کر نہیں اور پھر یہاں مسجد میں آکر سب مل کر دعاء مغفرت کرلیں گے۔

میں اور میری یہاں کی کمیٹی آپ کی بے حد مشکور ہوگی اگر آپ اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈال کر ہماری اصلاح فرمائیں گے۔

محمد عبدالحمید (چیرمین ومیاڈن مسجد کمیٹی۔لندن)

الجواب وبالله التوفيق:

تعزیت کے لئے لوگوں کا آنا یا جمع ہوجانا دوسری چیز ہےاور اھداءِ ثواب للمیت اورایصال ثواب کے لئے قرآن پاک پڑھ کر میت کوایصال ثواب کرنا دوسری چیز ہے۔دونوں کے الگ الگ حکم ہیں،دونوں میں خلط ملط کرنا صحیح نہیں ہے۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے کہ اہداءِ ثواب للمیت جائز ہے،صرف معتزلہ اس کے منکر ہیں (۱)۔

تعزیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ صاحب میت،یعنی جس کے یہاں میت ہوگئی ہو اس کے یہاں جا کر صبر وتحمل کی تلقین کی جائے تسلی وتشفی کے کلمات کہے جائیں۔اور اس سلسلہ میں اگر وہ کلمات کہہ دیے جائیں جو ماثور ومنقول ہیں۔جیسے:"لله ما أعطى ولله ما أخذواليه النشور" وغیرہ۔تو یہ درست ہوگا باقی اس وقت تلاوتِ قرآن پاک قرون مشہود لہا بالخیر سے ثابت ومنقول نہیں ہے۔

یہی مذہب مختار حضرات شوافع کا بھی ہے کما فی رد المحتار:"**والذى حرره المتأخرون من الشافعية وصول القراء ة للميت إذا كانت بحضرته أودعى له عقبها ولو غائبا، لأن محل القراء ة تنزل الرحمة والبركة. والدعاعقبها ارجىٰ للقبول الخ**" (۲) اور ابن قیم حنبلی نے جن کی "زاد المعاد" ہے،انہوں نے بھی اپنی مشہور ومسلم کتاب (کتاب الروح) میں لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:"**اختلف في إهداء الثواب إلى الحي، فقيل: يصح لإطلاق قول أحمد يفصل الخير ويجعل نصفه لأبيه أو أمه**" (۳)۔

جب زندہ کے لئے ایصال ثواب کے جواز کو نقل فرمایا ہے تو میت کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ودرست ہوگا۔پس "زاد المعاد" کا وہ مفہوم لینا درست نہ ہوگا اور اگر تسلیم کرلیا جائے تو وہ ان کی اپنی تحقیق وذاتی رائے ہوگی۔جو دوسروں کے لئے حجت نہ ہوگی۔بالخصوص جب کہ حضرت امام احمد بن حنبل سے وہ خود ایسی بات نقل کرتے ہیں جو ان سے موافقت نہیں کرتی۔ البتہ اجتماعی قرآن خوانی اگر کرنی ہو تو سب کو آہستہ وسراً پڑھنا ضروری ہوگا۔جہراً پڑھنا مکروہ ہے،جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری،میں ہے:"**ويكره للقوم أن يقرأ القرآن جملة جهرا لترك الاستماع والإنصات المامور بهما، كذا في القنية**" (۴)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۴/۱۴۰۳ھ

۱- کما فی الشامی ج ص ا۔

۲- رد المحتار کتاب الصلاۃ باب صلاۃ الجنازۃ ۲/۱۵۲ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

۳- شامی ج ص ۱/۶۰۵ باب صلاۃ الجنازۃ،مطلب فی القراءۃ للمیت واہداء ثوابہا لہ ۲/۱۵۲ طبع دار الکتب العلمیہ۔

۴- فتاویٰ عالم گیری ۱/۳۱۷۔

کیافرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والا مسلمان شہید ہے؟

موجودہ حالات کے پیش نظر جو ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی ترقی پر ہے اور غیر مسلم مسلمانوں پر حملہ کرکے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔جیسا کہ فی الحال بجنور۔مظفرنگروشاملی وغیرہ میں حادثے ہوئے ہیں۔شرعی ضابطہ سے نوازیں کہ ان مسلم مرنیوالوں کوشہید کا درجہ ملتاہے یا اور دورجہ ان کے لئے شرعی ضابطہ سے نافذ ہے۔مرنے والوں میں تبلیغی جماعت بھی ہوسکتی ہے اور مسافر بھی۔شہر میں اکثر دیہاتی بھی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی اشخاص ہوتے ہیں جو پرانی عداوت کا بدلہ لیتے ہیں ان تمام وجوہات کے پیش نظر شرعی ضابطہ سے مسائل سے نوازیں کہ کس پر کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس فرقہ وارانہ کشیدگی میں جو مسلمان کسی بھی غیر مسلم کے ہاتھ سے مارا جائے وہ بلاشبہ شہید ہوتا ہے،البتہ سب پر لازم ہے کہ حسب استطاعت اپنی پوری حفاظت اور پوری مدافعت کرتے ہوئے مریں یا بچیں۔بزدلی کے ساتھ یا اپاہجوں کی طرح جان نہ دیں،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۵/۱۴۱۱ھ

مسلمان اگر مسلمان کو مار ڈالے تو وہ شہید ہے یا نہیں؟

یہاں دو مسلمان بھائی آپس میں تکرار کررہے ہیں وہ یہ کہ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کو مار ڈالے وہ شہید نہیں ہے،دوسرے صاحب کہتے ہیں کہ وہ شہید ہے اس کو غسل اور کفن نہ دیا جائے پہلے صاحب کا کہنا صحیح ہے یا دوسرے صاحب کا کہنا صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں فریق میں سے کسی کا کلیہ صحیح نہیں ہے،نہ ہر حال میں شہید ہوگا نہ ہر حال میں غیر شہید ہوگا،بلکہ بعض صورتوں میں شہید ہوگا اور بعض میں نہیں،جیسے مسلمان ڈاکو مسلمان پر ڈاکہ ڈالیں تو جن مسلمانوں پر ڈاکہ پڑا ہے اگر ان میں سے کوئی قتل ہوجاوے تو وہ شہید ہوگا اور اگر خود ڈاکوں میں سے اس ڈاکہ میں کوئی قتل ہوگا تو وہ شہید نہ ہوگا،اس لئے کہ شہادت ایک

فضیلت کا درجہ ہے اور یہ تو ایسی خراب موت ہے کہ اس پر نماز جنازہ بھی نہیں، ''کما تدل علیه هذه العبارات۔ هو (أی الشهید) في الشرع من قتله أهل الحرب والبغي وقطاع الطريق'' (وایضاً)(۱)، ''ویصلی علی کل مسلم (الی قوله) إلا البغاة وقطاع الطريق ومن بمثل حالهم'' (ہندیہ باب الشہید)(۲)۔

اسی طرح یہ حکم بھی صحیح نہیں کہ جو بھی شہید ہو اس کو غسل اور کفن نہ دیا جائے، بلکہ بعض شہید کو غسل وکفن دیا جائے گا اور بعض کو نہیں دیا جائے گا، جیسے جس شہید نے ارتثات کرلیا یا جنابت کی حالت میں شہید ہوا اور اس کے جنبی ہونے کا علم ہو ''کما تدل علیه هذه العبارات ویغسل إن قتل جنباً'' الخ(۳)، ''ویغسل من ارتث وهو صار خلقاً في حکم الشهادة لنیل مرافق الحیاة۔۔۔الخ'' هندیه باب الشهید(۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۷۔
۲- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۳۔
۳- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۸۔
۴- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۸۔

كتاب الزكوة

کتاب الزکوۃ

زکوۃ کس پر فرض اور زمین پر زکوۃ ہے یا نہیں:

زکوۃ کن لوگوں پر فرض ہے فرض کرو کہ زید کے پاس سات بیگہ زمین ہے اور ایک سو (۱۰۰) من غلہ ہے غلہ کی قیمت پانچ ہزار روپیہ ہے جو روپیہ ان دنوں رائج ہے اور زید کے پاس دوسرے کا قرض آٹھ ہزار روپیہ ہے کچھ زمین دوسرے کے ذمہ سودبھرنا ہے کیا ایسی حالت میں زید کو زکوۃ ادا کرنا ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ ادا کرنا ایسے لوگوں پر فرض ہوتی ہے جن کے پاس اپنی حوائج اصلیہ (تمام ضروریات زندگی) سے اور ادائیگی قرض سے فاضل اور زائد ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس وزن کا چاندی کا زیور یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس وزن کا سونے کا زیور وغیرہ یا تجارت کا سامان موجود ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو کچھ زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے (۱)۔

آپ نے اپنے جو حالات لکھے ہیں اس کے مطابق آپ پر ادائیگی زکوۃ واجب نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۱۰/۱۳۸۵

الجواب صحیح محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

کسی خاص مقصد کے لئے رکھی گئی رقم پر سال گزرنے کے بعد زکوۃ کا حکم:

لڑکی کی شادی یا مکان بنوانے کے لئے یا سواری خریدنے وغیرہ کے لیے جمع کی گئی رقم ایک سال سے زائد رکھنے پر

۱- "وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي ... تام.... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد..... وفارغ عن حاجته الأصلية، لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۴ ۱۷-۱۷۸) (مرتب)۔

جبکہ صاحب نصاب بھی ہوگیا اس جمع کی گئی رقم پر زکوۃ واجب ہوگی جو کسی خاص مقصد کے لئے رکھی گئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص کے پاس یہ رقم سال بھر رکھی رہی جب وہ شخص صاحب نصاب ہے تو اس کی بھی زکوۃ ادا کرنی فرض ہوگئی، خواہ کسی بھی مقصد کے لئے رکھی رہی ہو، "**الزکوۃ واجبة علی الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملک نصابا ملکا تاما وحال علیه الحول**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۱۱/۱۴۱۰ھ

فروخت شدہ پیداوار سے جو رقم آئی اس پر زکوۃ:

ناچیز فصل انبہ فروخت کرتا ہے اس طور سے جو رقم وصول ہوتی ہے کیا رقم وصول ہوتے ہی اس پر ڈھائی فیصد (2½) کے حساب سے زکوۃ واجب ہوجاتی ہے یا جب اس رقم پر ماہانہ رقم پر پورا ایک سال قمری گزر جائے گا تب واجب الاداء ہوتی ہے، برائے مہربانی وضاحت سے احکامات شرعیہ سے روشناس فرمائیں۔

ایس ایس حیدر، لکھنؤ

الجواب وباللہ التوفیق:

فصل انبہ کے فروخت پر جو رقم وصول ہوتی ہے اس کا حکم اموال تجارت کی زکواۃ کی طرح نہیں ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد دی جانے کا حکم ہو، بلکہ اس زکوۃ کا نام عشر (دسواں حصہ) یا نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے (۲)۔

چونکہ بعض علاقہ میں آم کی فصل بھی جو بار بار پانی و کھاد وغیرہ دیئے ہوئے اور زمین کھود کر زم کئے ہوئے ہیں آتی ہے جیسے کشمیر وغیرہ کے بعض علاقے تو اس جگہ کے پھل آنے پر کل پھل کا بیسواں حصہ جہاں تک جلد ہو سکے بطور صدقہ نکال دے یا اس کی قیمت ادا کر دے۔ سال گذرنے کا انتظار نہ کرے اور جہاں کہیں آم کی فصل ایسی نہیں ہوتی کہ بار بار پانی و کھاد وغیرہ دئے بغیر ہو یا پانی و کھاد وغیرہ دینا ہو تو کم تو ایسی جگہ کی پیداوار کا دسواں حصہ نکال دے جیسے دس من پھل میں سے ایک

۱- ہدایہ ۱/۱۸۵۔

۱- "ولو باع الزرع إن قبل إدراکه فالعشر علی المشتری ولو بعده فعلی البائع" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۷۶)۔

من پھل یا اس کی قیمت نکال دے (۱) مگر یہ حکم اور تفصیل اس صورت میں ہے جب باغ عشری زمین میں ہو (۲) اور اگر ایسا نہ ہو تو بیسواں یا دسواں حصہ متعین نہیں بلکہ اسی مقدار پر یا چالیسواں حصہ یا جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ نکال دے کہ یہ نکالنا باعث خیر و برکت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۴/۱۴۰۲ھ

زکوۃ وفطرہ کا مقصد:

زکوۃ وفطرہ کے ادا کرنے کا مقصد عید کے دن معذور اقرباء یتیم اور بیوہ مساکین کو دیگر عید کے دن خوشی میں شریک ہونا اور فاقہ زدگی سے بچ کر صاحب نصاب کو ثواب پہنچانا مقصد ہے یا کوئی دوسرا مقصد ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں یہ بھی ایک مقصد ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد ہیں، لیکن اصل حکم شرع اور اس کی اتباع ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۷/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود احمد غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

حکومت کی کسٹڈی میں رکی ہوئی رقم پر زکوۃ:

میرے پاس کاروبار میں کافی کثیر روپیہ تھا ہر سال جس کی زکوۃ ادا کر دیا کرتا تھا سال ہذا ایک پاکستانی کمپنی جو

۱- "عن سالم بن عبد الله عن أبيه قال، قال رسول الله ﷺ: فيما سقت السماء والأنهار والعيون أو كان بعلا العشر، وفيما سقي بالسواني أو النضح نصف العشر" (سنن ابوداؤد ۲/۱۰۸، کتاب الزکوۃ باب صدقۃ الزرع حدیث ۱۵۹۶) (مرتب)۔

۲- "وأما شرائط المحلية، فأنواع: منها أن تكون الأرض عشرية" (بدائع الصنائع ۲/۱۷۵)۔

۳- "إنما كان قول المؤمنين إذا دعوا إلى الله ورسوله ليحكم بينهم أن يقولوا سمعنا وأطعنا وأولئك هم المفلحون، ومن يطع الله ورسوله ويخش الله ويتقه فأولئك هم الفائزون" (سورہ النور: ۵۱-۵۲)، "عن ابن عباسؓ قال: فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر طهرة للصائم من اللغو والرفث وطعمة للمساكين من أداها قبل الصلاة فهي زكاة مقبولة، ومن أداها بعد الصلاة فهي صدقة من الصدقات" (سنن ابوداؤد ۲/۱۱۱، کتاب الزکوۃ باب زکوۃ الفطر حدیث: ۱۶۰۹)۔

مدراس میں واقع ہے اس کمپنی سے کاروبار زیادہ کیا گیا مذکورہ کمپنی کو حکومت نے محکمہ کسٹوڈین میں لے لیا ہے جس کی وجہ سے میری اور میرے آسامیوں کی کثیر رقم رک گئی ہے جس کو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے، یہ رقم حکومت ہم کو ادا کرنے کا امکان بھی ہے، لیکن کس قدر عرصہ میں یہ رقم حاصل ہوسکیں گی جس کا صحیح اندازہ نہیں ہورہا ہے فی الوقت بہت ہی مختصر روپیہ کاروبار میں ہے جس سے میری گذر بسر بمشکل ہوسکتی ہے مخفی مباد کہ آسامیوں کی واجب الادا رقم و سرمایہ دونوں کسٹوڈین میں رکے ہوئے ہیں عرض خدمت یہ ہے کہ شرعی نظریہ سے مختصر سرمایہ جو اسوقت کاروبار میں مشغول ہے اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی یا خطیر، یعنی کثیر روپیہ جو کسٹوڈین میں رکا ہوا ہے اس کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

عبدالستار

الجواب وبالله التوفيق:

جو رقم کسٹوڈین میں رکی ہوئی ہے اس کی زکوۃ ادا کرنا ابھی آپ کے ذمہ واجب نہیں ہے جب جب ملے گی اور جس طرح ملے گی اس طرح کرنا واجب ہوگا پہلے نہیں (۱)، البتہ جو مختصری رقم آپ کے قبضہ میں اس وقت ہے اور جو سرمایہ اس وقت آپ کے قبضہ میں ہے اس پر جو اور قرضے و بقائے ہوں ان کو وضع کرنے کے بعد جس قدر بچے اگر وہ مقدار نصاب زکوۃ ہو تو فقط اس پر فی الحال زکوۃ واجب ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

زر ضمانت پر زکوۃ:

زید کے پاس مکمل حساب نہیں ہے اور نہ پہلے کبھی تھا وہ ہر سال اپنے کو صاحب نصاب سمجھتے ہوئے احتیاط کے طور پر کچھ زیادہ رقم کا ہی زکوۃ نکالتا رہا ہے، مگر قلب کو تسکین نہیں ہے، اس لئے دریافت ہے۔

۱-زید ایک کاروبار دوسرے کنٹرکٹ پر لیا ہے جس کی ضمانت کے طور پر نقد روپیہ ڈھائی ہزار رجع مالک کے پاس کیا

۱- "وعندهما الديون كلها سواء تجب زكوتها ويؤدى متى قبض شيئاً قليلاً أو كثيراً" (ردالمحتار باب زکاۃ المال ۲/۳۳۶)۔

۲- "وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد .... وفارغ عن حاجته الأصلية لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۱۷۴-۱۷۸)(مرتب)۔

ہے اس سال تمام میں بھی زید اس روپیہ کا زائد مالک ہے، مگر روپیہ مالک کے پاس جمع ہے۔

قرض دی ہوئی رقم پر زکوۃ:

۲-زید اپنے خاص کاروبار میں بچت کا روپیہ اندازہ کے موافق زیادہ سے زیادہ دو ہزار فرض کرتا ہے جو کچھ دوسروں کو بطور قرض دے چکا ہے اور کچھ کاروبار میں پھنسا ہوا ہے۔

مشین کی مالیت پر زکوۃ:

۳-زید کے پاس دو عدد مشین کپڑا بننے والی اپنی ہیں جو پانچ ہزار مالیت کی ہیں جس سے آمدنی دو سو روپیہ سے لے کر ڈھائی سو روپیہ تک ہے۔

بیوی کے مستعمل زیورات کی زکوۃ:

۴- زید کی بیوی کے پاس پانچ سو روپیہ کے زیورات ہیں جو استعمال کرتی ہے۔

۵-زید کے ذمہ کاروبار کے طور پر کچھ دوسروں کا باقی اور کچھ پر اس کا باقی ہے جو اپنے حساب سے برابر تصور کر چکا ہے اب ایسی حالت میں زید کو کس کس رقم پر زکوۃ نکالنی ہوگی۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ضمانت کے طور پر جو ڈھائی ہزار جمع ہے اس پر ابھی زکوۃ نہیں، ملنے کے بعد دیجئے (۱)۔

۲-بچت کے دو ہزار روپیہ میں سے جو دوسروں کو بطور قرض دیا ہے اگر دست گردان کے طور پر ہے کہ جلدی ہی مل جائے گا تو اس کی زکوۃ دی جائے گی، ورنہ ملنے کے بعد بہرحال پچیس روپیہ فی ہزار کے حساب سے زکوۃ دینی ہوگی (۲)۔

۳-مشینوں کی مالیت پر زکوۃ نہیں (۳)۔

۱- ''ويؤدي متى قبض شيئاً قليلاً أو كثيراً إلا دين الكتابة والسعاية والدية في رواية'' (ردالمحتار على الدر المختار ۳/۲۳۶)۔

۲- ''ففي القوي (أي الدين القوي وهو بدل القرض ومال التجارة) تجب الزكوة إذا حال الحول، ويتراخى القضاء إلى أن يقبض أربعين درهماً ففيها درهم ....الخ'' (البحر الرائق ۲/ ۳۶۳) (مرتب)۔

۳- ''ولا (زكاة) في ثياب البدن .... وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها .... وكذلك آلات المحترفين'' (الدر المختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۸۳) (مرتب)۔

۴-بیوی کے پاس جو چاندی سونے کے زیور ہیں اگرچہ استعمال کرتی ہیں، مگراس میں زکوۃ دیناواجب ہےاور پانچ سوروپیہ کےزیورات پرساڑھے بارہ روپیہ زکوۃ دینی ہوگی(۱)۔

۵-جب برابر ہوگیا تواس پر کچھ زکوۃ نہیں (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید احمد سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

زیورات کی زکوۃ میں سرکاری نرخ کااعتبار ہوگا یا بازار کا:

ہندوستان کی حکومت وقت نے سونے کی بین الاقوامی قیمت رائج کردی ہے اندرون ہند اور بیرون ہند ہر جگہ حکومت کا سونے کا سارا کاروبار اور لین دین بین الاقوامی شرح سے ہوتا ہے سونا بانڈ اور جنگی ضرورت سے سونے کے چندہ میں اور سونے کے قرض لینے اور دینے کے وعدہ میں بھی حکومت ہند اور ہندوستانی باشندوں کا سارا لین دین او رفراہم شدہ اور قرض ملے ہوئے سونے کی قیمت کا حکومت کی طرف سے اعلان بین الاقوامی قیمت سے ہوتا ہے، مگراس بین الاقوامی قیمت پر سونا کھلے بازار میں کسی عام خریدار کو میسر نہیں ہوتا ہے، البتہ سونے کی بین الاقوامی قیمت سے تقریباً ۹۷ روپیہ فی بھری زائد دینے پر بلیک مارکیٹ اور چور بازاری میں حسب ضرورت چوری سے سونا ملتا ہے، لیکن چور بازاری سے خرید کردہ اس سونے کو کچھ دنوں کے بعد اگر اسی سنار یا کسی دوسرے سنار کے پاس فروخت کیا جاوے تو قیمت کا کوئی نرخ متعین نہیں رہتا ہے ہر خریدار سنار من مانی قیمت دیتا ہے۔

مستورات کے پرانے زیورات کے سونے کی قیمت کی کوئی شرح متعین نہیں رہے گی زیورات کی اصل شکل میں تبدیل کے بغیر اصلی سونے اور میل اور ٹانکہ کا فرق بہت دشوار ہے، اس لئے میل اور ٹانکے کے نام پر ہر سنار کم از کم لگاتا ہے اور ضرورت اور مجبوری کے موافق زیور فروخت ہوجاتا ہے اصل سونے کی قیمت تشخیص نہیں ہو پاتی ہے۔

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ جن خواتین کے کچھ پرانا زیور بقدر نصاب باقی ہے تو وہ زکوۃ دینے کے لئے سونے

۱- ''تجب فی کل مائتی درهم خمسة دراهم وفی کل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروباً كان أو لم يكن مصوغاً أو غير مصوغ حلياً كان للرجال أو للنساء تبراً كان أو سبيكة، كذا في الخلاصة'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۸)۔

۲- ''وسببه أي سبب افتراضها (الزكاة) ملك نصاب حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد ... الخ'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۷۴) (مرتب)۔

کی قیمت کی تشخیص سرکاری اور بین الاقوامی نرخ سے کریں یا چور بازاری کی شرح سے قیمت لگائیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ صورت میں آپ یہ کرلیا کریں کہ سونے کے تمام زیورات کو وزن کرلیا کریں، مثلاً چالیس تولے ہوں تو ایک تولہ وزن کا کوئی زیور زکوۃ میں نکال دیں، اگر زیور نہ دینا چاہتے ہوں تو اس زیور کو بازار میں دکھلا کر جو عام قیمت لگے اتنے قیمت کے روپیہ زکوۃ میں نکال دیں خالص ایک تولہ سونے کی قیمت نکالنی آپ پر فرض نہیں ہے، بلکہ محض ایک تولہ سونے کے زیور یا اس کی قیمت دینی فرض ہے اور وہ اس طرح ادا ہو جائے گی اگر بالفرض ایک تولہ سونے کا کوئی زیور نہیں، بلکہ ڈیڑھ تولہ کا ہے اس کی قیمت لگوا کر اس قیمت کا دو تہائی برابر ایک تولہ زیور کی قیمت کے ہو جائے گا اسی طرح ایک تولہ سے کمی بیشی کے زیور میں حساب لگا کر نکال سکتے ہیں (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

زیورات کی زکوۃ کی ادائیگی میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟

سونے اور چاندی کے زیورات پر زکوۃ نکالنے کے لئے ان کے وزن کی قیمت کا چالیسواں حصہ مقرر ہے چاندی کا نرخ تو معلوم ہو جاتا ہے، مگر سونے کا نرخ کا کوئی قیام نہیں ہے یہ سب بلیک مارکیٹ کا بھاؤ ہے کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ گورنمنٹ نے جو نرخ سونے کا مقرر کیا ہے اس حساب سے زکوۃ دینی ہوگی انگریزی اخبار دیکھنے پر بھی اس کے نرخ کا پتہ نہیں چلا ہے بلیک مارکیٹ کا بھاؤ ایکسو پینسٹھ ۱۶۵ روپیہ تولہ ہے جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سونے چاندی کے جتنے زیورات ہوں ان سب کی قیمت بازار میں معتبر جگہوں میں لگوا کر پھر اس کی قیمت کا

۱- ''والمعتبر وزنهما أداء اً ووجوباً ولا قيمتهما (الدر المختار) شامی میں ہے: أي من حيث الأداء يعني يعتبر أن يكون المؤدى قدر الواجب وزناً عند الإمام والثاني، وقال زفر: تعتبر القيمة واعتبر محمدٌ الأنفع للفقراء" (الرد المختار علی الدر المختار ۳/ ۲۲۷) (مرتب)۔

چالیسواں حصہ اس لگی ہوئی قیمت کا زکوۃ میں نکال دیں، بے شبہ زکوۃ ادا ہوجاویگی، زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۹/۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

قرض پر زکوۃ کا حکم:

میں کپڑے کی تجارت کرتا ہوں اس میں ادھار بکری ہوتی ہے اس میں کچھا دھار ایسا بھی ہے کہ مارا بھی جاوے اور کچھ ادھار ایسا ہے کہ اس کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کب ملے اس کو زکوۃ کے حساب میں شامل کیا جاوے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس ادھار کے ملنے کی امید نہیں اس کی زکوۃ بھی نکالنا آپ کے ذمہ نہیں، بلکہ جب ملے اور جس طرح ملے اس وقت اسی طرح اس کی زکوۃ نکالنی واجب ہوگی (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمن، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

دوران سال حاصل ہونے والی رقم پر بھی زکوۃ واجب ہے؟

زید کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے کہ جس پر رمضان میں زکوۃ واجب ہوگئی ہے، مگر کچھ روپیہ رمضان کے ۴ مہینہ قبل اور آ گیا ہے ایسی صورت میں زید ایک ہزار روپیہ پر زکوۃ نکالے یا پورے روپیہ پر عند الشرع کیا حکم ہے؟

۱- ''وجاز دفع القیمة فی زکاة ... وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا: یوم الأداء ..... ویقوم فی البلد الذی المال فیه" (الدر المختار مع رد المحتار ۲۱۰/۳-۲۱۱) (مرتب)۔

۲- ''فتجب زکوتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لکن لا فوراً ،بل عند قبض أربعین درهماً من الدین القوی ''(الدر المختار مع رد المحتار ۲۳۶/۳) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کے ذمہ پورے روپیہ کی زکوٰۃ واجب ہے یعنی اصل سرمایہ کی بھی اور اس رقم کی بھی جو بعد میں حاصل ہوئی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

مشترک کاروبار میں زکوٰۃ:

ہم دو آدمی روپیہ قرض لاکر تجارت کرتے ہیں، کل مال تخمینا ساڑھے چار ہزار روپیہ ہے گذشتہ سال ہم دو آدمی بطور تنخواہ ایک ہزار روپیہ لیکر اپنے خرچ میں لائے اس کے سال آئندہ مارچ کو سال پورا ہوگا حساب کرنے میں جتنا روپیہ نکلے گا ہم دونوں کی تنخواہ ملا کر اس پر زکوٰۃ کس طرح دی جائے گی از روئے شرع ہمیں بتلائیے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب سال پورا ہو مثلاً مارچ کے ماہ میں پورا ہوگا تو اس وقت دوکان کے تمام اخراجات وقرض وغیرہ چاہے آپ لوگوں کی ذات پر یا گھر پر خرچ ہوا ہو یا قرضہ میں دیا ہو، سب مجرا کر کے جو بچے وہی اصل سرمایہ ہوگا۔ اور اسی پر زکوٰۃ واجب ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

جواب صحیح ہے، اتنی بات اور قابل لحاظ ہے کہ شریک کو اپنے کام کی تنخواہ مال شرکت سے لینا درست نہیں ہے (۳)۔

۱- ”والمستفاد ولو بهبة أو إرث وسط الحول إلى نصاب من جنسه فيزكيه بحول الأصل“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۱۴) (مرتب)۔

۲- ”وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد، ..... وفارغ عن حاجته الأصلية لأن المشغول بها كالمعدوم“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۷۴) (مرتب)۔

۳- ”يعني لو استاجر أحد الشريكين صاحبه لحمل طعام بينهما لا يستحق المسمى ولا أجر المثل،لأن العقد ورد على ما لا يمكن تسليمه، لأن المعقود عليه حمل النصف شائعاً وذلك غير متصور“ (البحر الرائق ۸/ ۴۴) (مرتب)۔

کپڑے کے تھان کے ذریعہ زکوۃ کی ادائیگی:

ایک شخص نے ایک تھان کپڑے کا تیار کیا اور اس میں سوت وغیرہ کی دس روپیہ لاگت آئی ہے، یعنی خرچہ اس تھان پر دس روپیہ کا ہوا اور وہ تھان بازار میں پندرہ روپیہ کا بکتا ہے تو پانچ روپیہ اس میں بننے کی مزدوری کے ملتے ہیں تو اگر کوئی شخص اس تھان کو اپنے ہاتھ سے بنکر کسی غریب کو اپنی طرف سے زکوۃ میں دیدے تو زکوۃ میں دس روپیہ ادا ہوں گے یا پندرہ روپیہ ادا ہوں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب کپڑا بنکر تیار ہو گیا اور اس کی مالیت پندرہ روپیہ کی ہو گئی اور زکوۃ مالیت پر ہی ہوتی ہے اور موجودہ مالیت لاگت پر لگتی ہے، تو اب پندرہ روپئے زکوۃ ادا ہونے میں کیا اشکال ہے بلاتردد پندرہ ہی روپیہ زکوۃ ادا ہوتی خواہ فروخت کر کے نقد بنا کر ادا کیا یا کپڑا دیکر (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- سواری کے گھوڑے اور کھیتی کے بیل پر زکوۃ:

زکوۃ کے نصاب کے علاوہ سواری کا ایک گھوڑا اور کھیتی کے کام کے دو بیل ہیں ان جانوروں پر زکوۃ واجب ہے کہ نہیں۔

۲- کھانے کی غرض سے خریدے گئے غلہ پر زکوۃ:

ایک شخص کے پاس کھیتی میں غلہ کے بجائے روئی پیدا ہوئی، اور اس نے روئی فروخت کر کے غلہ خریدا، اگر اپنے کھانے کی غرض سے خریدا تو اس پر خریدے ہوئے غلہ پر زکوۃ واجب ہوگی یا کہ نہیں۔

۳- جانوروں کی زکوۃ:

ایک شخص کے پاس چند ہاتھی ہیں بھینس ہیں اور بیل ہیں بکریاں ہیں مندرجہ بالا جانوروں میں کونسی قسم کے کتنے

۱- ''وجاز دفع القیمة فی زکوة وعشر'' (الدرالمختار) ''قال فی الشامیة: أی ولو مع وجود المنصوص علیه'' (الردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۲۱۰)، ''ویقوم فی البلد الذی المال فیه'' (الدرالمختار ۳/۲۱۱) (مرتب)۔

جانور پر زکوۃ واجب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲۔ سواری کے گھوڑے اور کھیتی کے بیلوں پر زکوۃ واجب نہیں اور جو غلہ گھر پر کھانے کے لئے خریدا اس پر زکوۃ واجب نہیں (۱)۔

۳۔ ہاتھی اگر تجارت کے لئے یعنی ہاتھیوں کی خرید فروخت کی تجارت کرتا ہے تو اس کی قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی (۲) اور اگر سواری کے لئے ہیں مثل سامان تجارت کے ان کی خرید وفروخت نہیں کرتا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح جو بھینس بیل ہل جوتتے یا بوجھ لادنے یا گاڑی میں چلانے کے لئے یا اور کسی کار معیشت کے لئے ہیں تو ان پر زکوۃ واجب نہیں (۳) اور کسی کار معیشت کے لئے نہیں ہیں بلکہ یوں ہی پڑے رہتے ہیں اور سال بھر میں اکثر حصہ یعنی چھ ماہ سے زائد محض چر کر ان کا گذر ہوجاتا ہے کھلانا پلانا نہیں پڑتا ہے تو ان پر زکوۃ اس وقت واجب ہوگی (۴) جب بھینس یا بیل تیس عدد یا زیادہ ہوجائیں (۵) تیس سے کم ہو یا ٦ ماہ یا اکثر حصہ سال کا ان کو کھلانا پڑتا ہے تو پھر زکوۃ واجب نہیں، یہی حکم بکریوں کا بھی ہے، فقط فرق یہ ہے کہ بجائے تیس کے جب چالیس بکریاں ہوجائیں اور اکثر حصہ سال کا محض چر کر گذارتی ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی اور زکوۃ یہ ہوگی کہ تیس بھینس یا بیل سے لے کر ۳۹ تک میں (تبیعہ) ایک سالہ بچہ اور پھر چالیس میں دو سالہ بچہ (مسنہ) اور پھر چالیس سے زائد میں ایک مسنہ (دو سالہ بچہ) اور جتنا زیادہ ہوا تنا ہی چالیسواں ایک مسنہ کا دیں گے اونسٹھ (۵۹) تک اور ساٹھ میں دو تبیعہ یعنی ایک سالہ بچہ خواہ مذکر ہو یا مونث، پھر ستر میں ایک مسن مذکر یا مسنہ مونث اور ایک تبیع مذکر یا مونث پھر اسی طرح ہر تیس پر تبیعہ یا تبیع اور ہر چالیس پر مسن یا مسنہ دیتے جائیں اور بکریوں میں جب تک بکریاں چالیس سے کم ہوں تو کوئی زکوۃ نہیں۔ جب چالیس ہوجائیں تو ایکسو بیس تک محض ایک بکری اور ایک سو بیس سے زائد میں دو سو

۱- ''ومنها فراغ المال عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة، وكذا طعام أهله وما يتجمل به من الأواني إذا لم يكن من الذهب والفضة، وكذا الجوهر واللؤلؤ والبلخش والزمرد ونحوها إذا لم يكن للتجارة'' (فتاوی عالمگیری ۱/ ۱۷۲) (مرتب)۔

۲- ''ولو للتجارة ففيها زكوة التجارة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۹۸)۔

۳- دیکھئے حاشیہ نمبر ۱، نیز ''وكذا كتب العلم إن كان من أهله وآلات المحترفين (يعني لا زكاة فيها)'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۲)۔

۴- ''فلو علفها نصفه لا تكون سائمة فلا زكوة فيها للشك في الموجب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۹۸)۔

۵- ''نصاب البقر والجاموس ثلاثون سائمة وفيها تبيع'' (تنویر الابصار مع الدر ورد ۳/ ۲۰۳)۔

تک دو بکری پھر ہر سیکڑہ میں ایک بکری (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

نوٹ پر زکوۃ:

زکوۃ کا اخراج نصاب کے اوپر مقرر ہے مثلاً سونا ۷ تولہ چاندی ساڑھے باون تولہ یا چاندی کا روپیہ ہو تو پچاس روپیہ پر ۴/۱ اب چونکہ چاندی کا نرخ ۸/ ہے تولہ کا ہے اس کے حساب سے ساڑھے باون تولہ چاندی کے دام ۱۸۲ روپیہ ہوتے ہیں علی ہذا القیاس۔

اب نہ تو پچاس روپیہ والا اور نہ ڈیڑھ سو روپیہ والا اور نہ سو روپیہ والا صاحب نصاب ہوتا ہے۔ دریافت ہے کہ اب زکوۃ کس حساب سے نکالیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نصاب زکوۃ ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس وزن کا چاندی کا زیور یا اتنی چاندی کی قیمت کا روپیہ ہے جتنے روپیہ میں ساڑھے باون تولہ چاندی مل سکے گی اتنا ہی مقدار نصاب ہوگا اور اس حساب سے چالیسواں حصہ زکوۃ دینا ہوگا، مثلاً آجکل ساڑھے باون تولہ چاندی ۱۸۲ روپیہ میں آتی ہے تو اتنی رقم نوٹوں سے جب ضرورت اصلیہ سے (فارغ) فاضل ہوگی تو مقدار نصاب کا مالک کہا جائے گا کاغذ کے نوٹ رکھنے والے بھی اسی طرح قیمت لگا کر زکوۃ نکالیں گے (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- بھینس بیل کے نصاب اور زکوۃ کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۰۳ اور بکری کی زکاۃ کے لئے ص/ ۲۰۴ (مرتب)۔

۲- ''والمعتبر وزنهما أداء ووجوباً ولا قيمتها نفى لقول زفر باعتبار القيمة فى الأداء، وهذا إن لم يؤد من خلاف الجنس وإلا اعتبرت القيمة إجماعا'' (الرد المحتار على الدر المختار ۳/ ۲۲۷)۔

۱-روپے پر زکوۃ:

روپیہ نقد پر کتنا فی صدی زکوۃ واجب ہے؟

۲-فیکٹری کے تیار شدہ اور خام مال پر زکوۃ:

کارخانہ کے تیار مال پر جو بکا نہیں ہے اور جو کچا مال پڑا ہے اس پر کس حساب سے زکوۃ دینی ہے؟

۳-مشینری اور اوزار پر زکوۃ:

مشینری اور اوزاروں پر زکوۃ ہے یا کہ نہیں اگر ہے تو کیا صورت ہے؟

۴-سونے چاندی میں زکوۃ کا طریقہ:

سونے چاندی پر زکوۃ کا کیا طریقہ ہے جس پر عورت اور مرد کا حق ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ڈھائی روپیہ فی سیکڑہ کے حساب سے زکوۃ ادا کی جاوے (۱)۔

۲-تیار مال کی تیار مال کے اعتبار سے قیمت لگا کر اور کچا مال پر کچا مال کی قیمت لگا کر زکوۃ دی جائے (۲)۔

۳-مشینری اور اوزاروں کی قیمت پر زکوۃ نہیں واجب ہوتی ہے (۳)۔

خرید کر بیچا کرتا ہے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے تو اس صورت میں ان مشینری اور اوزاروں کی قیمت

۱- ''تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۸)، ''عن علي قال :قال رسول اللهﷺ: قد عفوت عن صدقة الخيل والرقيق، فهاتوا صدقة الرقة، من كل أربعين درهما، درهماً وليس في تسعين ومائة شيئ فإذا بلغت مائتين ففيها خمسة دراهم'' (سنن الترمذی ۳/۷ کتاب الزکوۃ باب ماجاء فی زکوۃ الذہب والورق حدیث ۶۲۰)۔

۲- ''وأما أموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدراهم'' (بدائع الصنائع ۲/۱۰۹)، ''إذا كان له مائتا قفيز حنطة للتجارة تساوي مائتي درهم فتم الحول، ثم زاد السعر أو انتقص فإن أدى من عينها أدى خمسة أقفزة وإن أدى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۹)۔

۳- ''وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً، وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين'' (ہدایہ ۱/۱۶۶) (مرتب)۔

پر زکوۃ واجب ہوگی اور جو لوگ مشینری یا اس کا اوزار اپنے یہاں کارخانوں میں استعمال کے لئے خود رکھتے ہیں اس کا وہ حکم ہے کہ اس کی قیمت پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

بلکہ اس سے کاروبار کرکے جو آمدنی ہوگی اگر وہ آمدنی نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس آمدنی پر زکوۃ دینی واجب ہوگی زکوۃ کی مقدار نصاب یہ ہے کہ تمام ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ پوری کرنے کے بعد ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے برابر روپیہ جو فاضل بچے وہ مقدار نصاب ہے۔

(۴) ۳۔ میں جو مقدار نصاب کا بتلایا گیا ہے اتنا زیور جب ہو تو اس زیور کا ایک چالیسواں حصہ زکوۃ دینا واجب ہے خواہ زیور کا چالیسواں حصہ نکال دیں یا اس کی قیمت لگا کر چالیسواں حصہ نکال دیں دونوں جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

دوسرے کے قرض کی ادائیگی میں جو رقم دی اس کی زکوۃ کس پر ہے؟

زید کافی عرصہ سے مقروض چلا آتا تھا بکر نے زید کو سود سے بچانے کے لئے اب سے ایک ماہ پیشتر اس کا قرض ادا کردیا اور طے پایا کہ زید ہر ماہ بکر کو دو سو روپیہ قسط وار ادا کرتا رہے گا، بکر ہمیشہ زکوۃ رمضان کے اخیر میں ادا کرتا ہے، لہذا موجودہ شکل میں، جبکہ تین ہزار پانچ سو روپیہ زید کا قرض ادا کرنے میں لگا دیتے ہیں تو امسال اور اگلے سال زکوۃ کس پر واجب ہوتی ہے آیا زید ادا کرے یا بکر۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بکر ہی کو ادا کرنی ہوگی قرضدار کو نہیں (۲)، قرضدار کا قرضہ سودی ادا کردینا بہت بڑا ثواب ہے جتنی رقم زکوۃ میں

۱- دیکھئے: حاشیہ نمبر ا، "وجاز دفع القیمة أی ولو مع وجود المنصوص علیه" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۱۰) (مرتب)۔

۲- "واعلم أن الدیون عند الإمام ثلاثة قوی ومتوسط وضعیف، فتجب زکاتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لکن لا فوراً"، (الدر المختار) "وعندهما الدیون کلها سواء تجب زکاتها ویؤدی متی قبض شیئاً قلیلاً أو کثیراً" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۳۶)۔

دے گا اس سے کہیں زیادہ اس کا ثواب پائے گا جس کا نفع ابدی ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/ ۲/ ۸۵/ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

جس رقم کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوۃ:

جو رقم بطور قرض دی گئی ہے اور اس کے وصول ہونے میں کافی دیر ہے اور بعض صورتوں میں رقم واپس ہونے کی بالکل امید نہیں ہے تو ان حالتوں میں اس رقم پر زکوۃ دینی ہوگی یا کہ نہیں چونکہ ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک ضروری ہے اور قرض دی ہوئی رقم اپنے قبضہ سے باہر ہے اور اس رقم پر تصرف بھی حاصل نہیں ہے، اس لئے زکوۃ نکالنی واجب ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس رقم کے ملنے کی امید نہیں ہے اس کی زکوۃ نکالنی ابھی واجب نہیں ہے جب ملے اور جس طرح ملے اسی طرح زکوۃ نکالنی واجب ہوگی اور جس رقم کے ملنے کی امید ہے اس کی زکوۃ نکالنی واجب ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی حیثیت اور سرمایہ آپ کے قبضہ میں ہے اس میں اس رقم قرض کو بھی شمار کیجئے جس کے ملنے کی امید ہے اور پھر مجموعہ کا چالیسواں حصہ نکال دیجئے اس رقم کا بھی چالیسواں ادا ہوگیا، اور جس فقیر کو آپ دیں گے اس کی تملیک بھی ہوگئی ہے تملیک کا یہی مطلب ہے، یعنی فقیر کو دی ہوئی رقم کا مالک بنانا، ورنہ آپ تو مالک ہیں ہی اس رقم کا بھی جو متوقع الحصول ہے اور اس رقم کے بھی جو غیر متوقع الحصول ہے تملیک کا وہ معنی نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۲/ ۸۵/ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "عن أبي هريرةؓ عن النبیﷺ قال: من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر في الدنيا يسر الله عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر على مسلم في الدنيا ستر الله عليه في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه" (سنن الترمذی ۴/ ۲۶، ۳ کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی الستر علی مسلم حدیث: ۱۹۳۰) (مرتب)۔

۲- دیکھئے حاشیہ نمبر ۱، (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۳۶)، أما تفسيرها فهي تمليك المال من فقير مسلم .... الخ (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۰) (مرتب)۔

پاورلوم پر زکوۃ:

اگر کوئی شخص کپڑے کی سلائی کی مشین خریدے یا پاورلوم (کپڑے کی مشین جو بجلی کے ذریعہ چلتی ہے) خریدے اور خود کام کرے یا خرید کر دوسرے کو دے اور آمدنی کے منافع میں شرکت ہو تو اس مشین یا پاورلوم پر زکوۃ ہوگی یا کہ نہیں جبکہ یہ مال نامی نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سلائی کی مشین یا پاورلوم خرید کر خود اس پر کام کرتا یا کراتا ہے بغرض تجارت نہیں خریدا ہے تو اس مشین یا پاورلوم کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں (۱) اور اگر اس پر خود کام نہیں کرتا کراتا ہے بلکہ فروخت کر دیتا ہے تو یہ مال تجارت شمار ہوگا اور اس کی مالیت پر اگر حوائج اصلیہ سے اور قرضہ وغیرہ سے زائد مقدار نصاب کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۰/۸۹ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

زکوۃ وفطرہ کی رقم سال بھر رکھنا یا تجارت کے لئے دینا:

کیا زکوۃ وفطرہ کی رقم جمع کر کے سال بھر رکھنا جائز ہے یا کسی آدمی کو تجارت کے واسطے دینا اسے نفع لے کر غریبوں بیواؤں یتیموں کی امداد کی غرض سے جائز ہوگا یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ وفطرہ سال پورا ہونے پر جہاں تک جلدی ہو سکے ادا کر دینا چاہئے زکوۃ وفطرہ غریب ومسکین کا حق ہے۔ اس کے مصرف میں جب تک ان کو نہیں دے گا ادائیگی نہ ہوگی، اب ظاہر ہے کہ تجارت میں لگانا ادائیگی نہیں ہے، لہٰذا اگر تجارت

۱- ”وکذلک آلات المحترفین أی سواء کانت مما لا تستھلک عینہ فی الانتفاع کالقدوم والمبرد أو تستھلک (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۱۸۳) یعنی لا زکاۃ علیھا“ (مرتب)۔

میں لگا دیا اور مر گیا تو زکوۃ وفطرہ ادا نہ ہوگا اور گنہگار ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا بینک میں جمع شدہ رقم کی زکوۃ اسی سے دینا ضروری ہے؟

ہمارا کچھ روپیہ بینک میں جمع ہے جس کی زکوۃ نکالنا ہے ہم رمضان کے مہینے میں جمع شدہ رقم کا حساب لگا کر جتنی رقم زکوۃ کی ہوتی ہے وہ بنک سے تو نہیں نکالتے اس کے علاوہ آمد سے زکوۃ ادا کرتے ہیں کیا ایسا کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے یا وہی روپیہ بنک سے نکالنا ضروری ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بنک میں جمع شدہ روپیہ کی زکوۃ دینے کے لئے بنک سے ہی روپیہ نکالنا ضروری نہیں ہے اپنے جس روپیہ سے زکوۃ ادا کریں گے زکوۃ ادا ہوجائے گی (۲) سود کی رقم جو بنک سے ملنے والی ہوا کرے اس کو نکال کر بعینہ وہی روپیہ (رقم) صدقہ کردیا کیجئے اس میں ادلا بدلہ نہ کیجئے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''وقيل فورى أى واجب على الفور وعليه الفتوى كما فى شرح الوهبانية فيأثم بتأخيرها بلا عذر وترد شهادته، لأن الأمر بالصرف إلى الفقير معه قرينة الفور'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۱۹۱/۳، ۱۹۲، نیز فتاوی عالمگیریہ ۱۷۰/۱)، کسی کو تجارت کے لئے دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوۃ نام ہے ''تمليك المال من فقير مسلم...'' الخ کا دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۱۷۰/۱) (مرتب)۔

۲- قال إسماعيل المتكلم عليه ديون لأناس شتى لزيادة فى الأخذ ونقصان فى الدفع، فلو تحرى ذلك وتصدق على الفقراء بثوب قوم بذلك يخرج عن العهدة، قال ؒ فعرف بهذا أن فى مثل هذا لايشترط التصدق بجنس ما عليه كذا فى القنية (فتاوی عالمگیریہ ۳۶۷/۵)، وجاز دفع القيمة فى زكاة وعشر... الخ (الدرالمختار) قال فى الرد: وجاز دفع القيمة أى ولو مع وجود المنصوص عليه (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲۱۰/۳) (مرتب)۔

۳- ''ويجب رد عين المغصوب (الدرالمختار) وظاهره أن رد العين هو الواجب الأصلي، وهو الصحيح'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲۶۶/۹) (مرتب)۔

بینک میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ:

عمومی بینک یا اسلامی بینک جس میں سودی معاملہ نہیں ہوتا ہے لوگوں کے جمع شدہ رقوم میں زکوٰۃ آئے گی کہ نہیں ادلۂ فقہیہ سے بیان فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنا روپیہ جس کو آدمی خود کسی بینک میں محفوظ کرے، خواہ عمومی یا اسلامی ہر ایک میں اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب رہے گا، البتہ اپنے جمع کئے ہوئے روپئے سے زائد جو پیسہ سود کے نام سے لے اس کا حکم دوسرا ہے سود کے نام سے ملے ہوئے روپیہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو بینک میں نہ چھوڑے، بلکہ وہاں سے نکال کر بغیر نیت ثواب کے، بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غریبوں مسکینوں حاجتمندوں قرضداروں وغیرہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملکیت سے خارج کر دے اور استغفار کرے اور دعا کرتا رہے کہ اے اللہ ہمارا حال ایسا کر دیجئے کہ اس قسم کے پیسوں سے حفاظت رہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۸/۲۳ھ

مختلف کرنسیوں کے ذریعہ زکوۃ کی ادائیگی:

دیگر ممالک کی کرنسی سکے پاونڈ یا ڈالر کی قیمت حکومت کے اعتبار سے ۱۸ روپئے اور ڈالر کے اعتبار سے ۸ روپئے مقرر ہیں اور زکوۃ ادا کرنیوالے ان ممالک سے اپنے وطن ہند میں غرباء یتامی کے لئے پاؤنڈ ڈالر کے بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں بعض لوگ ۲۲ روپیہ فرانس کا سکۂ فرانک کے بجائے ۳ کے بجائے ۵ روپئے اور ڈالر کے۔ ۸ روپئے کے بجائے۔ ۱۰ دیتے ہیں اور ملتے ہیں اور ایسی شکل میں زکوۃ کی ادائیگی کے لئے جو ربع عشر نکالا جاتا ہے تو ۱۰۰ پاؤنڈ۔ ۱۰۰ ڈالر۔ ۱۰۰ فرانک ـ۔ ۱۰۰ کوچا (زامبیا کا سکہ) کی قیمت میں۔ ۸۰ پاؤنڈ۔ ۸۰ ڈالر۔ ۸۰ فرانک۔ ۸۰ کوچا کے برابر ہوجاتی ہے تو اب زکوۃ میں۔ ۸۰ پاؤنڈ۔ ۸۰ ڈالر۔ ۸۰ فرانک۔ ۸۰ کوچا کی قیمت دینے سے زکوۃ ادا ہوجائیگی یا نہیں مذکورہ کام سرکاری گناہ ہے یہ افریقہ کے باشندوں کو معلوم ہے۔

۱- ''من ملک أموالا غیر طیبة أو غصب أموالاً وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامناً، وإن لم یکن له سواها نصاب فلا زکاة علیه فیها وإن بلغت نصاباً لأنه مدیون'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۱۸) (مرتب)۔

بعض دفعہ ان سکوں کی قیمت جو حکومت نے مقرر کی ہے اس میں کم قیمت ملتی ہے مثلاً ایک سکہ کی قیمت جو حکومت کے اعتبار سے ۱۱-۱۲ ہے مگر وہ رقم سرکار سے اخفاء کر کے اور حکومت کو چوری سے ہند میں بھیجتے ہیں تو ایسی رقم (سکوں) کی قیمت کم ملتی ہے مثلاً ۱۱-۱۲ کے بجائے ۷-۸ ملتی ہے تو اس شکل میں بھیجنے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں ایک سو ڈالر کے ۱۰۰۰ کے بجائے آٹھ سو ملتے ہیں۔

اگر ۲ کے اندر زکوۃ ادا نہ ہوئی تو سوال یہ ہوگا کہ ایک ملک کا سکہ دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا حیثیت وحقیقت رکھتا ہے دیگر ممالک میں اس کی سکہ کی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر سکہ صحیح ہو تو پھر اس کی جو بھی قیمت حاصل ہو زکوۃ ادا ہونی چاہئے ان سوالات کا جواب نظائر اور دلائل سے مفصلاً تحریر فرما کر ممنون فرمائیں اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے، اس لئے جواب مدلل مع النظیر تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

کتبہ العبد محمد بن اسماعیل العمرواری (بحکم خادم دارالافتاء مفتی احمد بیات صاحب ۱۶ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ یوم الثلاثاء)

الجواب وبالله التوفيق:

ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں جو قیمت بین الاقوامی اور حکومتی سطح پر مقرر ہو وہی بنیاد اور معیار بنے گی ادائیگی کے صحت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونیکی اور جو قیمت اس حکومت کی مقررہ قیمت سے زائد دوسرے لوگ دیدیتے ہیں یا کم دیتے ہیں یہ قیمت کوئی قیمت رائجہ وناقفہ فی السوق عامۃ نہیں ہوئی کہ کنٹرول نرخ اور بازار کے عام رائج بھاؤ (بلیک) پر قیاس کیا جاسکے اور اس کو بنیاد وحکم بنایا جاسکے، لہذا جس سکہ کی جس ملک میں حکومتی سطح کے مطابق قانوناً جو قیمت مقرر ہو اسی کے اعتبار سے زکوۃ نکالنی چاہئے، دوسرے ملک میں مقامی اور وقتی اور وقتی طور پر لوگ جو زائد یا کم پیسے دیتے ہوں ان کا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔

بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ جس ملک میں جتنے سرمایہ پر ہمیں زکوۃ نکالنی ہے اتنے سرمایہ کا چالیسواں حصہ اسی ملک کے اعتبار سے ادائیگی زکوۃ کی نیت سے سال پورا ہوتے ہی الگ نکال دے اور پھر اس کی ادائیگی خود حسب موقعہ اسی ملک میں یا کسی دوسرے ملک بھیجتا رہے (۱) بلکہ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ یہ رقم مذکورہ الگ کر دینے کے بعد اپنے کسی معتمد کے حوالہ کر کے کہہ دے کہ یہ رقم مذکورہ زکوۃ کی صحیح مصرف میں آپ خرچ کر دیجئے یہ زیادہ احتیاطی صورت ہے (۲) مثلاً کسی کے

۱- "وأما شرط أدائها فنية مقارنة للأداء أو لعزل ما وجب هكذا في الكنز" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰) (مرتب)۔

۲- إذا وكل في أداء الزكاة أجزأته النية عند الدفع إلى الوكيل (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۱)۔

پاس ایک ہزار پونڈ کی زکوۃ نکالنی ہے تو ۲۵ پونڈ بمد زکوۃ نکالکر اپنے بقیہ سرمایہ سے الگ کر دیا پھر اسی طرح فی ہزار ۲۵ پونڈ کے حساب سے باقی ہزار ڈالر سے ۲۵ ڈالر کے حساب سے نکالکر الگ کر دیں اور یہ الگ کرنا محض بہی کھاتہ میں اور محض کاغذی اندراج میں نہ رہے بلکہ عین سرمایہ میں سے اتنی رقم جو فی ہزار ۲۵ کے حساب سے آتی ہو اس کو اپنے سرمایہ کی تھیلی سے نکال کر دوسری مستقل تھیلی میں یا مستقل دوسرے خانہ یا بکس میں الگ رکھ لیں یہ علیحدگی بہ نیت ادائیگی صحیح و معتبر ہوتی ہے اور یہی عزل کرنے سے اس جگہ مراد ہوتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱/۳ھ

شیئرز پر زکوۃ:

مکانات اور جائیداد وغیرہ کی ملکیت پر زکوۃ عائد نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کی آمدنی پر اگر وہ بقدر نصاب ہو، اس اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ ہوگا، مثلاً کسی نے ٹاٹا کے دس ہزار حصے خریدے تو کیا جائیداد اور مکانات کی طرح سال بھر کے ان حصص کی جو آمدنی ہوئی ان پر زکوۃ واجب ہوگی یا حصوں کی کل مالیت پر، جسے جائیداد کی طرح خریدے اور بیچے جاتے ہیں، اور بغیر خرید و فروخت کے بینکوں کی طرح رقم حسب دل خواہ نکالی نہیں جاسکتی ہے، ان حصوں کے دام بازار میں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں، یونٹ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہے، سالانہ نفع کو حصہ داروں پر ان کے حصوں کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے، یہی صورت تاج کمپنی اور دہلی کلاتھ مل وغیرہ کے حصول کی ہے براہ کرم ان امور کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

عبدالسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو صحیح ہے کہ کمپنیوں، فیکٹریوں، کارخانوں وغیرہ کے حصوں کی کل مالیت پر زکوۃ عائد نہیں ہوتی اور محض اس کی آمدنی کی بچت و نفع ہی میں وجوب زکوۃ محصور و دائر نہیں ہوگا، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کارخانہ یا فیکٹری یا کمپنی ایسی ہے کہ اس میں کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوتی، نہ اپنی بنائی ہوئی و تیار کردہ چیز کی نہ دوسرے سے کچھ خریدی ہوئی چیز کی، بلکہ محض دوسروں کا کام مثلاً اجرت لے کر کر دیا جاتا ہے، جیسے آٹا پیس کر دیدیا یا دھان کوٹ کر یا تیل نکال کر

ویدیا مثلاً نئے کپڑوں کے تھان پر پریس کر کے دیدیا وغیرہ تو ایسی صورت میں توصرف بچت پر جو جملہ اخراجات نکالنے کے بعد بچے اور نصاب کی مقدار ہوجائے تو زکوۃ نکالنا عائد ہوگا، فرنیچر واثاثہ ودیگر سامان پر وجوب زکوۃ کا حکم عائد نہ ہوگا، اور اگر وہ فیکٹری، کمپنی، یا کارخانہ ایسا ہے کہ اس میں چیزیں تیار کر کے فروخت کی جاتی ہیں چاہے دوسروں کے یہاں کی چیز خرید وفرخت کی جاتی ہوں، یا نہ کی جاتی ہوں، جیسے کلاتھ میل کہ اس میں اونی کپڑا خرید کر دھاگہ دار کپڑا تیار کر کے فروخت کیا جاتا ہے، یا مثلاً پریس وغیرہ کہ اس میں کاغذ خرید کر اپنی مطبوعہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں، اب چاہے دوسری جگہ کی مطبوعات بھی فروخت ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، جیسے تاج کمپنی وغیرہ تو ان میں زکوۃ کا وجوب محض بچت پر نہ ہوگا، بلکہ سال بھر کے پورے اخراجات وضع کر کے اس کی آمدنی کی بچت پر، نیز جتنا سامان تجارت کا تیار شدہ مال ہوگا یا برائے تیاری سامانِ تجارت، جتنا کچا مال ہوگا جیسے کلاتھ میل میں کپڑے کے علاوہ ریشم، سوت، روئی وغیرہ کی مالیت اور شوگر میل چینی کے علاوہ گڑ، گنا وغیرہ کی مالیت، ان سب کی مالیت کا حساب لگا کر زکوۃ نکالنے کا حکم ہوگا، البتہ تیار شدہ عمارت، مشینری ودیگر اثاثہ فرنیچر وآلات کی مالیت پر زکوۃ عائد نہ ہوگی، اسی اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ بھی ہوگا، اس لیے کہ کمپنیوں کے ملازمین محض وکیل واجیر کے درجہ میں ہوتے ہیں، اور اصل مالک یہی حصہ داران (شیر دار) حسب شیر وحصہ ہوتے ہیں، پس ہر حصہ دار عمارت ومشین وغیرہ ہر ہر چیز کا حسب حصہ مالک شمار ومتصور ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ چیزوں کی قیمت گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے حصوں کی خرید وفرخت ہوتی ہے، پس عمارت، مشین اور اس کے اوزار واثاثہ فرنیچر وغیرہ کی جو قیمت اس کے حصہ میں آئے گی اس پر وجوب زکوۃ نہ ہوگا، بلکہ اس کو وضع کرنے کے بعد جو سامان تجارت کا ہوگا، خواہ کچے مال کی صورت میں ہو اس کی قیمت ومالیت اور بچت پر وجوب زکوۃ عائد ہوگا، پس سال بھر کمپنی ہر حصہ دار کو جو رپورٹ وحساب دیتی ہے اگر اس میں ان سب چیزوں کی تفصیل مذکور ہو تو اس کے حساب سے حسب تفصیل مذکورہ بالا زکوۃ نکال دیں اور اگر اس رپورٹ میں یہ تفصیلات مذکور نہ ہوں تو کمپنی سے دریافت کر کے کہ میرے حصے میں تجارت کا تیار شدہ مال اور کچا مال کی کتنی مالیت ہے اور بچت کتنی ہے، صرف اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکال دیں، یہی تفصیلی حکم ٹاٹا مل اور دیگر ملوں اور کمپنیوں اور یونٹ ٹرسٹ وتاج کمپنی و کلاتھ مل دہلی وغیرہ کا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۱۲/۹۸ ۱۳ھ

زکوۃ میں نکالی ہوئی زائد رقم آئندہ سال کی زکوۃ میں وضع کرنا:

اگر کسی شخص نے موجودہ سال کی زکوۃ بلا حساب اندازاً نکالدی اور زکوۃ ادا کرنے کے بعد جب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زکوۃ میں زیادہ رقم چلی گئی ہے تو اس زیادہ دی ہوئی رقم کو آئندہ سال کی زکوۃ میں شمار کرسکتے ہیں یا نہیں۔

مولوی عبدالرحیم گجراتی مدرس مدرسہ جامعہ قدیریہ کاکوی ضلع مہسانہ گجرات

الجواب وباللہ التوفیق:

شمار کرسکتے ہیں بشرطیکہ دونوں نصابوں کی جنس متحد ہو دراہم و دنانیر اور عروض تجارت متحد الجنس ہیں، **"رجل له اربعمأة درهم فظن أن عنده خمسمأة فأدى زكوة خمسمائة، ثم علم فله أن يحسب الزيادة للسنة الثانية كذا في محيط السرخسي"**(۱)۔

"وفي الولوالجية: لو كان عنده أربعمأة درهم فأدى زكوة خمسمأة ظانا أنها كذلك كان له أن يحسب الزيادة للسنة الثانية؛ لأنه أمكن أن تجعل الزيادة تعجيلاً ١٠ ه وقيد في البحر بكون الجنس متحدا، قال: لأنه لو كان له خمس من الابل وأربعون من الغنم فعجل شاة عن أحد الصنفين ثم هلك لا يكون عن الآخر ----والدراهم والدنانير وعروض التجارة جنس واحد " (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۴/۸ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

کمپنیوں اور ملوں کے شیئرز پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

کمپنیوں اور ملوں کے شیر ز پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ بعض کمپنیاں صرف گھروں کے اثاثہ کے لیے ہوتی ہیں آیا ان پر بھی زکوۃ واجب ہے؟ نیز سمینٹ فیکٹری اور اس جیسے دوسرے ملوں کے شیر ز پر زکوۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں، اگر واجب

۱- فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۶۔

۲- ردالمحتار علی الدر المختار ۲۲۱/۳۔

ہے تو کیوں؟ اس لیے کہ شیرز کے پیسوں کا استعمال مجہول ہے کہ مشین پر صرف ہوا ہے یا تجارتی مال پر، کس قسم کی کمپنیوں اور ملوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہے اور کس قسم پر نہیں، مثال کے ساتھ مدلل اور بحوالہ تحریر فرمائیں، اگر واجب ہے تو چونکہ شیرز کی قیمت غیر معین ہے، اس لیے خریدتے وقت کی قیمت واجب ہوگی یا موجودہ قیمت پر مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

محمد یعقوب، رنگون (برما)

الجواب وباللہ التوفیق:

کمپنیوں اور ملوں کے پورے شیرز یا اس کی قیمت پر ہر حال میں علی الاطلاق زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ کمپنی اور مل جب سالانہ حساب دے اس وقت دیکھا جائے شیرز کے جتنے جتنے حصے، مشینیں، عمارتیں اور اس کے فرنیچر وغیرہ پر خرچ ہو چکے یا اور ضروریات انتظام پر جو حصے خرچ ہو چکے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جتنے نقد کی شکل میں یا تجارت کے سامان کے اور اخراجات وغیرہ وضع کر کے جتنا حصہ نفع پر آتا ہو صرف اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی (۱)۔

کمپنی یا مل جس قسم کی ہو سب میں اسی قاعدے کے مطابق زکوۃ واجب ہوگی، مثلاً شوگر فیکٹری ہے اس میں ہمارے دس ہزار شیرز کے داخل ہیں ان دس ہزار میں سے تین ہزار مشینوں پر اور دو ہزار عمارت اور اس کے فرنیچر پر خرچ ہو چکے ہیں اور ایک ہزار کا کوئلہ اور ایندھن وغیرہ موجود ہے تو اس مجموعہ (چھ ہزار) پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر ایک ہزار نقد بچا ہے اور تین ہزار چینی وبکری کا شیرہ اور ایکھ وغیرہ موجود ہے، اس میں چار ہزار پر، اسی طرح مثلاً تنخواہ ملازمین وغیرہ جملہ اخراجات وضع کر کے اپنے کل شیرہ پر چار ہزار نفع وبچت کا موجود ہے، اس پر یعنی مجموعہ آٹھ ہزار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "وسببه ملک نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد وفارغ عن حاجته الأصلية، لأن المشغول بها كا لمعدوم" (الدر المختار مع الشامی) "وقال في الهداية: وليس في دور السكنیٰ وثياب البدن وأثاث المنازل، ودواب الركوب، وعبيد الخدمة، وسلاح الاستعمال زكوٰة، لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً" (ہدایہ اولین ۱۸۶) (مرتب)۔

یونٹ ٹرسٹ میں لگے ہوئے روپے پر زکوٰۃ کا حکم؟

میں نے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں کچھ روپیہ لگایا ہے جس کا منافع ادارہ کے اعلان کے مطابق رہتا ہے، یونٹ کا پمفلٹ اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ:

۱-اس ادارہ میں لگائی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے یا نہیں؟

۲-اگر زکوٰۃ نکالنا ضروری ہو تو لگائی ہوئی رقم پر ادا کی جائے یا جو حصص خریدے گئے ہیں اس کی موجودہ قیمت پر ادا کی جائے، امید ہے کہ جواب عنایت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

الجواب باللہ التوفیق:

اس ادارہ میں لگائی گئی تمام رقم پر زکوٰۃ ادا نہ کی جائے گی، بلکہ اس ادارہ میں اثاثہ مثلاً فرنیچر، و مشینیں و عمارت وغیرہ پر جو رقم خرچ ہوگئی ہے اس کو حسب حصہ وضع کر کے جو رقم ڈپازٹ ہو اور جو سامان تجارت کا ہو اور نفع کی رقم ہو اس میں حسب حصص جس کے حصہ میں جتنی رقم آئے فقط اس پر زکوٰۃ کی ادائے گی واجب ہوگی۔

مثلاً شروع میں دس لاکھ کی لاگت سے کام اسٹارٹ کیا، دس لاکھ میں سے ۴ لاکھ اثاثہ (عمارت، فرنیچر، مشین وغیرہ) میں صرف ہوگئے، اور بچے چھ لاکھ، اس سے سامانِ تجارت خریدا گیا، اور تجارت کرنا شروع کیا جیسے گنا خرید کر اس سے شکر بنا کر شکر و گڑ کی تجارت شروع کی اور جیسے کوئی خام سامان لے کر اس سے عمدہ و قیمتی چیزیں بنا کر تجارت کرنا شروع کیا، اب اس ادارہ کی حیثیت بیس لاکھ ہوگئی تو ظاہر ہے کہ شروع میں جو حصے دس روپے میں خریدے تھے اور اسی پر یہ شرکت تھی اب وہ حصے یقیناً بیس روپے کے ہوگئے، اور اگر فرخت کیے جائیں تو اس وقت تیس روپے تک فروخت ہوسکتے ہیں تو زکوٰۃ ان بیس یا تیس روپوں پر واجب الادا نہ ہوگی بلکہ موجودہ حالت میں اس ادارہ میں جو اثاثہ (مشین و آلات وغیرہ) ہوں ان کی قیمت مناسب لگا کر وضع ہو جائیں گے پھر ادارہ میں جو رقم مجموعی طور پر ڈپازٹ مع نفع کے ہو صرف اس میں جتنا حصہ جس حصہ دار کا ہوگا۔

اسی طرح اس ادارہ میں جو سامان تجارت ہوگا مثلاً گنا، گڑ، شکر وغیرہ ان سب کی موجودہ قیمت پر جو حصہ اس شیر والے کا ہوگا صرف اس پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

منیجر پر ان تمام باتوں کی تفصیل اپنے ہر شیر دار کو بتلانا لازم ہوگا، اسی پر زکوٰۃ کا حساب لگایا جائے، اس جواب سے

امید ہے کہ سوال کے دونوں نمبروں کا جواب معلوم ہو جائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جس ملک میں حکومتی سطح پر جو قیمت مقرر ہو اسی اعتبار سے زکوٰۃ نکالی جائے؟

دیگر ممالک کی کرنسی، سکے، پاؤنڈ، ڈالر کی قیمت حکومت کے اعتبار سے اٹھارہ روپے اور ڈالر کے اعتبار سے آٹھ روپے مقرر ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ان ممالک سے اپنے وطن (ہند) میں غربا و یتامی کے نئے پاؤنڈ، ڈالر بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں، بعض ۲۲ روپیہ فرانس کا سکہ بجائے تین کے پانچ روپے اور ڈالر کے آٹھ روپے کے بجائے دس روپے دیتے اور لیتے ہیں) ایسی شکل میں زکوٰۃ کی ادائے گی کے لئے جو ربع عشر نکالا جاتا ہے تو سو پاؤنڈ سو ڈالر، سو فراں سو کو چا (زامیا کا سکہ) کی قیمت اسی پانڈ، اسی ڈالر، اسی فراں، اسی کوچا کے برابر ہو جاتی ہے، تو اب زکوٰۃ میں اسی اسی پانڈ، اسی ڈالر اسی فراں، اسی کوچا کی قیمت دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ مذکورہ کام سرکاری گناہ ہے، یہ افریقہ کے باشندوں کو معلوم ہے۔

بعض مرتبہ ان سکوں کی قیمت جو حکومت نے مقرر کی ہے اس میں کم قیمت ملتی ہے، مثلاً ایک سکہ کی قیمت حکومت کے اعتبار سے گیارہ بارہ روپے ہے، مگر وہ رقم سرکار سے اخفاء کر کے اور حکومت کی چوری سے ہند میں بھیجتے ہیں تو ایسی رقموں (سکوں) کی قیمت کم ملتی ہے، مثلاً گیارہ روپے کے بجائے سات آٹھ ملتی ہے، تو اس شکل میں بھیجنے والے کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں، ایک سو ڈالر کے گیارہ سو کے بجائے آٹھ سو ڈالر ملتے ہیں۔

اگر (۲) کے اندر زکوٰۃ ادا نہ ہوئی تو سوال یہ ہوگا کہ ایک ملک کا سکہ دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا حیثیت و حقیقت رکھتا ہے، دیگر ممالک میں اس سکہ کی حیثیت ہے یا نہیں، اگر سکہ صحیح ہو تو پھر اس کی جو بھی قیمت حاصل ہو زکوٰۃ ادا ہونی چاہیے، ان سوالات کے جوابات نظائر اور دلائل سے مفصل طور پر تحریر فرما کر ممنون فرمائیے۔

محمد ابن اسماعیل (گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲، ۳- ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں جو قیمت بین الاقوامی اور حکومتی سطح پر مقرر ہو وہی بنیاد اور معیار

بنے گی، ادائیگی صحت اور ذمہ خداوندی سے عہدہ برآ ہونے کی، اور جو قیمت اس حکومت کی مقررہ قیمت سے زائد دوسرے لوگ دیتے ہیں یا کم دیتے ہیں، یہ قیمت کوئی قیمت رائجہ ونافعہ فی السوق عامۃ نہیں ہوتی کہ کنٹرول نرخ اور بازار کے عام رائج بھاؤ (بلیک) پر قیاس کیا جاسکے اور اس کو بنیاد حکم بنایا جاسکے۔

لہٰذا جس سکہ کی جس ملک میں حکومتی سطح کے مطابق قانوناً جو قیمت مقرر ہو اسی کے اعتبار سے زکوۃ نکالنی چاہیے، چاہے دوسرے ملک میں مقامی اور وقتی طور پر لوگوں کو کچھ زائد یا کم پیسے دیتے ہوں ان کا اعتبار نہ کرنا چاہیے، بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ جس ملک میں جتنے سرمایہ پر ہمیں زکوۃ نکالنی ہے اپنے سرمایہ کا چالیسواں حصہ اسی ملک کے اعتبار سے ادائیگی زکوۃ کی نیت سے سال پورا ہوتے ہی الگ نکال دے اور پھر اس کی ادائیگی خود حسب موقع اس ملک میں یا کسی دوسرے ملک میں بھیجتا رہے، بلکہ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ یہ رقم مذکورہ الگ کر دینے کے بعد اپنے کسی معتمد کے حوالہ کر کے کہدے کہ یہ رقم مذکورہ زکوۃ کے صحیح مصرف میں آپ خرچ کر دیجئے، یہ زیادہ احتیاطی صورت ہے، مثلاً کسی کو ایک ہزار پاؤنڈ کی زکوۃ نکالنی ہے، تو پچیس پاؤنڈ بمد زکوۃ نکال کر اپنے بقیہ سرمایہ سے الگ کر دیا، پھر اسی طرح فی ہزار پچیس کے حساب سے باقی ہزار ڈالر سے پچیس ڈالر کے حساب سے نکال کر الگ کر دیں، اور یہ الگ کرنا بھی بہی کھاتہ میں اور محض کاغذی اندراج میں نہ رہے، بلکہ عین سرمایہ میں سے اتنی رقم جو فی ہزار پچیس کے حساب سے آتی ہو اس کو اپنے سرمایہ کی تھیلی سے نکال کر دوسری مستقل تھیلی میں یا کسی مستقل دوسرے خانہ یا بکس میں الگ رکھ لیں، یہ علیحدگی بنیت ادائیگی صحیح و معتبر ہوتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت اور اس پر زکوۃ وغیرہ کا مسئلہ؟

تمہید: جو اشیاء ملک گیر پیمانہ پر تیار کی جاتی ہیں، ان کے بنانے والے کارخانوں، فیکٹریوں، نیز ان مشینوں کی ملکیت جو ان کارخانوں میں نصب ہوتی ہیں چند افراد کی نہیں کثیر افراد کی ہوتی ہیں، ان کمپنیوں کو لمیٹیڈ کمپنیاں کہا جاتا ہے، ان کمپنیوں کے حصص عوام میں فروخت کیے جاتے ہیں، لوگ تھوڑے یا بہت حصے خرید کر مالک ہو جاتے ہیں، حصے خریدنے والے کارخانوں میں دخیل نہیں ہوتے ہیں، انتظام یہ ان کا ہوتا ہے جو کارخانوں کے مؤسس اور بانی ہوتے ہیں، وہ لوگ ہمہ وقت کارکن ہونے کی بنیاد پر اپنا معاوضہ بطور تنخواہ کے کارخانوں سے وصول کرتے ہیں فروخت شدہ حصص نا قابل انتفاع ہوتے ہیں، عوام آپس میں اس کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں، حصص کی قیمت کمپنیوں کی پوزیشن اور نفع آوری پر کم و بیش ہوتی

رہتی ہے، کمپنی حصص رکھنے والوں کو سالانہ منافع کا ایک محدود حصہ تقسیم بھی کرتی ہے، اس تمہید کے بعد جواب طلب امور یہ ہیں کہ:

۱-کیا یہ حصص جائیداد منقولہ کی حیثیت رکھتے ہیں؟

۲-زکوٰۃ حصص کی آمدنی اور منافع پر جو کمپنی دے اس پر عائد ہوگی؟

۳-حصص کی فروخت سے جو آمدنی ہو اس پر عائد ہوگی یا حصص پر بھی، اگر حصص پر بھی عائد ہوگی تو اس قیمت پر جس پر خریدے، یا اس قیمت پر جو سال پورا ہونے کے بعد بازار میں اس کی قیمت ہو؟

۴-بعض کمپنیاں قلیل نفع کمانے کی وجہ سے یا نقصان کی وجہ سے منافع تقسیم نہیں کر پاتیں، نتیجۃً ان پر حصص کی قیمت اصل قیمت سے گر جاتی ہے، کبھی تو ان حصص کا خریدار ہی نہیں ملتا، ایسی صورت میں حصص کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگر دینی ہو تو کس قیمت پر؟

۵-کسی ادارۂ تعلیمی کو زکوٰۃ کی شکل میں حصص منتقل کیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

۶-ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ کمپنیاں اکثر و بیشتر بینکوں اور افراد سے بھی ایک سالہ یا دو سالہ کی مدت پر سود کی رقم لیتی ہیں اور اس سود پر لیے ہوئے روپیہ سے مال تیار کر کے فروخت کرتی ہیں، حصص رکھنے والوں کو جو منافع دیا جاتا ہے اس میں سود کی رقم سے کمایا ہوا منافع بھی ہوتا ہے، یہ ایک خلش ہے جس میں راقم الحروف جو کہ حصص ہی کا کاروبار کرتا ہے، مبتلا ہے اس لیے استفتاء ارسال ہے۔

عبدالمنان (دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-یہ حصص جو کمپنیوں سے خریدے جاتے ہیں جائیداد منقولہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲، ۳، ۴-کمپنیوں کے حصص کی جو خریداری ہوتی ہے تو اس میں اگر حصہ دار آلات و مشینوں میں بھی شریک ہوتا ہے تو اس رقم کو الگ کر کے جتنے میں آلات وغیرہ کی خریداری ہوتی ہے، بقیہ تمام اصل و منافع کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ بعد میں ان حصص کی قیمت قلت منافع کی بنا پر کم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

۵-کسی ادارۂ تعلیمی کو (جو زکوٰۃ کا مصرف ہو) حصص زکوٰۃ کی شکل میں منتقل کیے جاسکتے ہیں۔

۶-عالمگیر پیانے پر جو کمپنیاں قائم ہوتی ہیں اوران کے حصص فروخت ہوتے ہیں، ان میں کارخانے کو چلانے والے ان خریداروں کے وکیل ہوتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں مالِ مستفاد میں حرمت نہ آوے گی جب کہ کمپنی قائم کرنے والے غیر مسلم ہوں" **فإن الوكيل بالبيع كالعاقد لنفسه وفساد البيع في حق الذمي لايستلزم حرمة الربح على المسلم، فان تبدل الملك يدفع خبث الفساد**"(۱)۔

البتہ مبسوط میں ہے کہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت خود مکروہ ہے، اور اگر مسلمانوں کی کمپنیاں بھی سودی لین دین کرتی ہوں، جیسا کہ آج کل غالب یہی ہے تو ان کمپنیوں میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

ناقلا عن امداد الفتاویٰ القصص السنی في أحكام حصص كمپنی

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱-جس رقم کے مالک کا پتہ نہ ہو اس کو کیا کیا جائے؟

جاوید کے والد صاحب کے پاس ایک شخص نے بڑی رقم کسی کام کے سلسلہ میں ارسال کی تھی، اس سے خرچ ہونے کے بعد کچھ رقم بچ گئی، والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اور مرسل کا بھی پتہ نہیں اس رقم کو کس مد میں صرف کیا جائے؟

۲-بغیر مد کی صراحت کے دی گئی رقم کا مصرف:

اسی طرح ایک اور صاحب نے رقم ارسال کی تھی لیکن کس مصرف میں صرف کرنا ہے اس کی تفصیل نہیں بتائی، ایک دومرتبہ خط لکھا، لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور کافی عرصہ گذر گیا، اس رقم کو بھی کس مصرف میں صرف کریں، کیا طلبہ اور اہل علم حضرات کو دی جاسکتی ہے؟ اسی طرح کیا طلباء کی کتابوں پر صرف کی جاسکتی ہے؟ مطلع فرمائیں۔

۳-غیر منقسم میراث میں وجوب زکوۃ:

غیر تقسیم شدہ میراث پر زکوۃ سال گذرنے پر ہوگی اور ادائیگی زکوۃ کے وقت تمام ورثاء کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟

محمد محمود احمد (جامعہ حسینیہ راندیر سورت گجرات)

۱- نقلاً عن امداد الفتاوی، کتاب الشرکۃ ۳ر ۴۹۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-اگر مرسل کا پتہ چل سکے تو پتہ چلا کر دریافت کرلیا جائے ،ورنہ پھر اگر مرسل الیہ کے کسی ذاتی کام کے لیے بھیجا تھا تو یہ باقی رقم بھی مرسل الیہ کی ذاتی اور مملوکہ شمار ہوگی ،انتقال کے بعد ترکہ شمار ہوگی اور حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگی اور اگر مرسل الیہ کے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں نہیں بھیجی تھی ، بلکہ کسی قومی رفاہ عام کے لیے یا کسی کار خیر کے اندر صرف کرنے کے سلسلے میں بھیجی تھی تو اس نوع کے کسی کام میں صرف کی جائے جس کام کے سلسلہ میں بھیجی تھی۔

۲-اگر یہ یقین ہے کہ خط پہنچا ہے پھر بھی کوئی جواب قصداً نہیں دیا ہے تو قرینہ یہ ہے کہ ہدیۃً یہ رقم بھیجی ہے جس مصرف میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں اور اگر یہ یقین ہے کہ انہوں نے قصداً کوئی جواب نہیں دیا ہے تو ان مذکورہ مصارف میں صرف کرنے کی اجازت کی تصریح سے پھر ایک جوابی رجسٹری خط بھیج کر جواب کا انتظار کیا جائے ،اگر جواب آجائے تو فبہا ورنہ وہی سابق ذکر کردہ حکم ہوگا۔

۳-ہاں سال گذرنے پر ایسی چیزوں پر جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ادائیگی زکوۃ فرض ہو جائے گی ، اگر ان سب کا حصہ مقدار زکوٰۃ کو پہونچتا ہو اور وہ سب بالغ بھی ہوں ، ورنہ جس کا حصہ مقدار نصاب کو پہونچتا ہے اور وہ بالغ ہیں صرف ان کے حصہ میں ادائیگی زکوۃ متوجہ ہوگی اور ادائیگی زکوۃ کے لیے ان سے اجازت بھی لینی ہوگی ، ہاں اگر ان سب نے حالاً یا مقالاً اجازت دے رکھی ہے تو وہ اجازت بھی کافی ہوگی۔

اجازت حالاً یا مقالاً کا مفہوم یہ ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد اس رقم کے کاموں کی انجام دہی ان لوگوں نے سپرد کردی ہو اور سب بالغ ہوں یا مشترک کاروبار رہو اور اس شخص کو اپنا منتظم کار بنا رکھا ہو، یا از خود یہ ذمہ داری آگئی ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو جلد از جلد تقسیم ورثاء کر کے سبکدوش ہونا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ اصل سرمایہ پر ہے یا منافع پر بھی؟

جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ زکوۃ اصل زر پر فرض ہے، لیکن سعودی عرب میں تاجروں سے حکومت صرف منافع کا 2½% زکوۃ کے طور پر سالانہ وصول کرتی ہے براہ کرم تصدیق فرمائیے کہ زکوۃ اصل زر پر فرض ہے یا صرف منافع پر، (نوٹ) اگر آپ کے پاس سے کوئی ایسا رسالہ نکلتا ہے جس میں فقہ شریعت اسلامی کے مسائل سوال و جواب کی صورت میں شائع

ہوتے ہوں تو میں ایسا رسالہ اپنے نام جاری کرانا پسند کرتا ہوں۔ان کی تفصیلات لکھئے کہ قیمت اشتراک کس قدر ،اور کس پتہ پر اور کس رسالے کے لئے روانہ کی جائے ،اپنے مذکورہ بالا چار سوالوں کے جواب کا منتظر رہونگا؟

سید عبداللہ (معرفت القوشیڑ یڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۳۲۶ الخبر۔سعودیہ عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ نکالنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ جب صاحب نصاب ہونے کے بعد سال پورا ہوا اور اپنی ضروریات سے زائد جتنا مال سال پورا ہونے کے وقت موجود ہوان سب کا مع اصل و نفع شمار کر کے چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالدے، پھر اگلے سال جب سال پورا ہونے کے دن کا حساب کریں اور تمام اخراجات اور ضروریات سے فاضل جتنی رقم وسامان مع اصل و نفع باقی رہے سب کا چالیسواں حصہ نکالدیا کریں۔غرض وہ نفع یا بچت کا چالیسواں حصہ نکالنا کافی نہ ہوگا، "**هكذا في الدر المختار و رد المحتار والبحر و غيرها من الكتب الفقهية المعتبرة للفتوى عند الأحناف(والمستفاد ولو بهبة أو ارث وسط الحول يضم إلى نصاب من جنسه، فيزكيه بحول الأصل**" (۱)، "**تجب في مائتي درهم وعشرين ديناراً ربع العشر وهو خمسة دراهم في المائتين**" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

استعمال شدہ اشیاء کی مالیت اور حصص پر زکوۃ:

اس کے بعد کا سوال زکوۃ کی ادائیگی کے متعلق ہے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے مختصراً یہ عرض کروں گا کہ میری ملکیت میں ایک قطعہ آراضی ہے جن پر مکان بنا ہوا ہے زمین اور مکان کی قیمت دس ہزار رینڈ ہے۔

نوٹ: رینڈ ساؤتھ افریقہ میں مروجہ سکہ ہے جس کی قیمت آج کل ۸ روپیہ پچاس پیسے کے برابر ہے۔

خرچ وضع کرنے کے بعد میری خالص آمدنی ایک ہزار رینڈ ہے جو ایک سال سے زائد سے میرے قبضہ میں رہتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجھ کو زکوۃ ایک ہزار رینڈ آمدنی پر ادا کرنی ہے کیا مجھے اپنی آراضی اور مکان کا نہ مالیتی مبلغ دس ہزار روپیہ رینڈ

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۱۴۔

۲- البحر الرائق ۲/ ۳۹۳۔

پر بھی ادا کرنی ہوگی۔

اسی طرح سے ایک بڑی کمپنی کے ایک ہزار رینڈ کے حصص خریدتا ہوں جس کے اور بھی حصص دار ہیں مطالبہ کے تغیرات کے ساتھ حصص کی قیمتیں بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہیں سال کے اختتام پر کمپنی حصہ رسد (منافع) اعلان کرتی ہے یہ رقم میرے قبضہ میں ہے، مثال کے طور میرا حصہ رسد کو مبلغ سو رینڈ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ رقم ایک سال سے زائد میرے قبضہ میں رہتی ہے تو زکوۃ سو رینڈ پر قابل ادائیگی ہے میرا سوال یہی ہے کہ اس رقم کے لئے بھی ہے جو جائیداد کے حصول میں لگائی جاتی ہے کیا مجھے زکوٰۃ اس رقم پر بھی ادا کرنی ہے جو میں نے حصص کے خریدنے میں لگائی حصص کی قیمتیں بازاروں رجحانات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں حصص کی قیمت اس قیمت سے کم یا زائد ہوسکتی ہے جو ابتداءًان کے خریدنے میں ادا کی گئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مکان یا زمین یا اور کسی مشینری پر جیسے موٹر انجن وغیرہ کی قیمت و مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی زکوۃ اس کی آمدنی پر نقد روپیہ یا اشرفی یا ان کے زیور پر اور تجارت کے سامان پر واجب ہوتی ہے جبکہ اس کی قیمت نصاب زکوۃ (۵۲½ تولہ چاندی یا اسکی قیمت کو) پہونچ جائے اور ضروریات سے فاضل ہو کر پورے ایک سال تک باقی رہے۔

پس اس قطعہ آراضی اور اس پر بنے ہوئے مکان کی قیمت دس ہزار یا اس سے بھی زیادہ رینڈ نہ ہو جائے اس پر زکوۃ نہ ہوگی، البتہ خرچ وضع کرنے کے بعد جو آمدنی ایک ہزار رینڈ ہے جب اس پر پورا سال گزر جائے تو انکا چالیسواں حصہ یعنی (۱/۴۰) ۲-½ رینڈ فی سیکڑہ حساب سے زکوۃ نکالنی فرض ہوگی۔

اسی طرح جو حصص آپ کمپنی سے خریدیں گے اور ان حصص کے آپ مالک ہوں گے اور ان حصص کی آمدنی ونقد کا جو حساب کمپنی سال کے اختتام پر دیگی صرف اس آمدنی ونقد کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنا ضروری ہو جائے گا۔

ہاں جس وقت ان حصص کو فروخت کریں گے اور ان حصص کے آپ مالک ہوں گے اور حصص کی آمدنی ونقد کا جو حساب کمپنی سال کے اختتام پر دیگی صرف اس آمدنی پر نقد کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنا ضروری وفرض ہوگا ان حصص کی قیمت میں سے جس قدر مشینری وعمارت وفرنیچر وغیرہ میں صرف ہو جائے گا اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنے کا حکم نہ ہوگا۔

ہاں جس وقت ان حصص کو فروخت کریں گے اور وہ حصص نقد کی شکل میں منتقل ہو جائیں گے اس وقت چونکہ آپ

دوسرے اموال سے نصاب زکوۃ کے مالک رہیں گے ان حصص کے نقد پر بھی زکوۃ واجب ہو جائے گی اور اس کا چالیسواں حصہ نکالنا ضروری ہو جائے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۴/۶/۸ھ

ڈاکخانہ میں ماہانہ آمدنی اسکیم اور اس پر زکوۃ کا حکم:

۱-زید نے ۵۰ ہزار روپے گورنمنٹ کے ڈاک خانہ میں ''ماہانا آمدنی اسکیم'' فنڈ میں جمع کرار کھے ہیں، ماہانہ آمدنی کے نام سے وہ چھ سال تک ہر ماہ پانسو روپے بونس کے نام سے واپس مل جائیں گے۔ اگر زید چھ سال پورا ہونے سے پہلے اپنی جمع کرائی ہوئی رقم واپس لینا چاہے گا تو کچھ معمولی گھاٹے کے ساتھ اس کو وہ رقم واپس مل جائے گی۔

زید اپنی مندرجہ بالا جمع کرائی ہوئی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے پاس ایک رہائشی مکان اور صرف 2½ تولہ سونا ہیں تو وہ کس حساب سے زکوۃ ادا کرے؟

۲-عمر نے ۵۰ ہزار روپے گورنمنٹ کے فنڈ میں ساڑھے پانچ سال کے لئے جمع کرار کھے ہیں 5½ سال کے بعد اس کو ۵۰ ہزار کی جگہ ایک لاکھ روپے ملیں گے اگر وہ اس رقم کو 2½ سال پورا ہونے سے پہلے لینا چاہے گا تو اس کو کچھ گھاٹے کے ساتھ وہ رقم واپس مل جائے گی۔

عمر مندرجہ بالا جمع کرائی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے اگر اس کے پاس ایک رہائشی مکان اور 2½ تولہ سونا ہیں تو وہ کس حساب سے زکوۃ ادا کرے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-رہائشی مکان کی قیمت پر کوئی زکوۃ نکالنی واجب نہیں، البتہ 2½ تولہ سونے کی زکوۃ سال میں چالیسواں حصہ نکالنا ہوگا اور ہر سال میں جتنی تعداد تک روپیہ جمع ہو چکا ہوگا، ان سب کی زکوۃ ان مجموعہ پر چالیسواں حصہ نکالتے رہنا ہوگا، اور اپنی جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم ہوگی اس پر وجوب زکوۃ کے بجائے یہ حکم ہوگا کہ اس زائد کے وبال سے بچنے کے لئے اس کو مسلم غربا ءمساکین کو دے دیا جائے، اور یہ حکم اس صورت میں ہے جب چھ سال تک حسب معاہدہ پوری قسط جمع کرتا رہے اور اس کو اپنی جمع رقم سے زائد ملے اور اس وقت میں یہ معاملہ محض شرعی ربوا کا ہوگا اور جب چھ سال سے پہلے جمع کرائی ہوئی رقم

واپس لے گا تو کچھ گھاٹے کے ساتھ رقم واپس ملے گی، پس اگر اس گھاٹے سے مراد یہ ہے کہ ان جمع کردہ اصل میں سے بھی کچھ کم واپس ملے گی تو یہ شرعاً سودی ہونے کے ساتھ قمار (جوئے) کا بھی شمار ہو جائے گا، اور نا جائز ہر حال میں رہے گا۔

۲-اور سوال نمبر ۲ کا بھی یہی حکم ہے۔

ہاں اگر اس ماہانہ آمدنی اسکیم کی صورت یہ ہو کہ جس طرح پراویڈنٹ فنڈ میں تنخواہ ملازم کے قبضہ میں آنے سے قبل ہی محکمہ خود کاٹ لیتا ہے تو اس کا حکم بھی وہی پراویڈنٹ فنڈ کا بعینہ ہوگا اور سب ملی ہوئی زائد رقم بھی اپنی جمع کی ہوئی رقم کے مانند حلال و جائز رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۰/۹/۲۵ھ

زکوۃ کی رقم تجارت میں لگانے کا حکم:

بکر کے پاس مدرسہ کی رقم بھی رہتی ہے وہ اس رقم کو اپنی رقم میں ملا کر تجارت کرتا ہے تو سوال طلب یہ ہے کہ مدرسہ کی رقم جو خیرات اور زکوۃ کا مال ہے اس کو تجارت میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر اراکین مدرسہ اور روپئے والے اصل مالکوں کی اجازت و مشورہ سے مدرسہ کے نفع کے لئے ایسا کرتا ہے اور زکوۃ کی رقم کے علاوہ سے کرتا ہے تو جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵/۱۱/۸ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- مصالح مسجد کے لئے مسجد کی رقم کا استعمال درست ہے، "واذا جعل تحته سراباً لمصالحة أي المسجد جاز" (درمختار ۶/۵۴۷) جبکہ مسجد کے احکام بہ نسبت اس کے تحت ہیں، لہذا یہاں بدرجہ اولی درست ہوگا) و رنہ نہیں (زکوۃ کی ادائیگی بغیر تملیک مصارف نہیں ہوتی، اس لئے بغیر حیلہ اس کا تجارت وغیرہ میں استعمال درست نہیں، "ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۲۹۱)۔

باب المصارف

ہندوستان میں بیت المال کا شرعی حکم:

بھٹکل کے مسلمانوں کی جو کہ سب کے سب شافعی المذہب ہیں، ایک جماعت بیت المال قائم کرنا چاہتی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ مسلمانوں سے زکوۃ جمع کرے اور شہر کے مستحقین پر تقسیم کرے، اس سلسلہ میں علماء سے استصواب کیا گیا، علماء نے جواب دیا کہ قیام بیت المال کے لئے اہم شرط اسلامی قوت قاہرہ کا وجود ہے جو احکام شرع کا بزور قوت نفاذ و اجراء کر سکے۔ اور چونکہ فی زمانہ یہ امر مفقود ہے اس کے علاوہ دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کا امکان ہے جن کے انسداد واستیصال کا کوئی ذریعہ نہیں، لہذا موجودہ صورت میں شرعاً قیام بیت المال کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، علماء کرام کا ادعاء یہ ہے کہ تبدیل احوال وظروف سے احکام بھی تبدیل ہوجاتے ہیں، اب جناب کی خدمت میں حسب ذیل امور پیش کئے جاتے ہیں۔

☆ بیت المال کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ فرض ہے؟ یا سنت؟ یا مستحب ہے؟

☆ کیا مشروط بشرط نصب امام و دیگر شرائط ہیں؟

☆ وہ دیگر شرائط کیا ہیں؟

☆ درصورت اثبات کیا ہمارے زمانہ میں یہ شرط پائی جاتی ہے، یا پائی جاسکتی ہے؟

☆ بیت المال میں کس قسم کا مال جمع کیا جاسکتا ہے؟

☆ کیا علماء کا مذکورہ بالا ادعاء صحیح ہے؟

☆ درصورت صحت ادعاء مسائل میں اس کی نظیریں کیا ہیں؟

☆ کیا کسی بستی کا کوئی ادارہ یا جماعت المسلمین امام یا مسلمان حاکم کی جگہ لے سکتا ہے؟

☆ کیا موجودہ زمانے کے قضاۃ جو صرف انعقاد نکاح وطلاق وغیرہ کا کام کرتے ہیں، امام یا حاکم کی جگہ لے سکتے ہیں؟

☆ کیا کچھ لوگ جمع ہوکر بیت المال کا نام لیے بغیر لوگوں سے جمع زکوۃ وتقسیم کا کام اجتماعی طور پر کرسکتے ہیں یا نہیں؟

☆ درصورت امتناع بیت المال ایسی ممانعت کو کس قسم میں رکھا جائے گا؟
نوٹ: ہماری بستی شافعی المذہب پر مشتمل ہے۔ از راہ کرم جواب میں مذہب شافعی کے نقطۂ نظر کو بھی واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بیت المال اصطلاحِ شرع میں اس شرعی خزانے کا نام ہے جس کو امام المسلمین قائم کرتا ہے جس میں مال غنیمت خمس وعشر وخراج واموال ظاہر یہ کی زکوٰۃ وغیرہ اکٹھا کی جاتی ہے، اس کے انعقاد واقامت کے لئے بیشک وہی شرائط ہیں جن کی طرف مقامی علماء کرام نے توجہ فرمائی ہے اہم شرط قوت قاہرہ کا موجود ہونا ہے، اور اس کے فقدان کی صورت میں ان مفاسد کا ظن غالب ہے جن کی طرف مقامی علماء نے توجہ دلائی ہے، البتہ اگرچہ شرعی بیت المال مفقود ہے اور اس کے انعقاد واقامت کے شرائط بھی موجود نہیں ہیں، لیکن چونکہ بعض مصارف بیت المال موجود ہیں، جیسے غرباء ومساکین اور مبلغین ودعاۃ وعلم دین کے معلمین وغیرہ وغیرہ، اس لئے ان مصارف کا وجود جہاں موجود ہو یا مدات بیت المال کے محل جہاں میسر ہو جائیں، جیسے دار یتامیٰ یا وہ مدارس علوم دینیہ جن میں مستحقین زکوٰۃ صدقات وزکوٰۃ کی کفالت کی جاتی ہو وغیرہ وغیرہ، ان پر وہ اموال جو بیت المال میں جمع کئے جاتے ہیں خرچ کئے جائیں تو درست ہوگا، اور اس بناء پر اس قسم کے اداروں کو جن میں مستحقین زکوٰۃ وصدقات رہتے ہیں بیت المال کا مصرف قرار دے کر وہ رقم وہاں دینا اور اس کی نوعیت مدات کی توضیح کرتے ہوئے خرچ کرنے کی تشریح کرنا درست ہے اور اس بناء پر بعض علماء کے ذہن میں آ گیا کہ یہ بیت المال بھی کہے جاسکتے ہیں اور جب یہ ادارے بیت المال کہے جاسکتے ہیں تو پھر بیت المال کے نام پر ادارہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے، خواہ بوقت عطا اس ادارہ میں مصرف بیت المال، یعنی ایسے اشخاص موجود نہ ہوں جو مصرف بیت المال کہے جاسکیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب اس ادارہ میں مستحقین بیت المال موجود نہیں، بیت المال کے اموال کے مصارف بھی موجود نہیں تو پھر اس کو بیت المال شرعی کا مصرف کیسے کہا جائے؟ بخلاف دارالیتامیٰ ومدارس دینیہ کے جن میں طلباء غیر مستطیع کے کھانے کپڑے کی کفالت کی جاتی ہے اور جس میں یہ طلباء تعلیم وتعلم کا مشغلہ رکھتے ہیں ان پر مصرف بیت المال کا اطلاق ہوسکتا ہے اور مصرف بیت المال کا محل قرار دے کر وہ جو اموال بیت المال جانا چاہئے بفقدان بیت المال کی صورت میں مصارف بیت المال کے محل میں صرف کر دینا عین منشاء شارع کی تکمیل ہے اور ان مفاسد کا بھی ظن غالب نہیں ہے جن کی طرف علماء مذکورہ نے اشارہ فرمایا ہے، اس لئے اگر اس قسم کا

کوئی نظم قائم کرلیا جائے جس سے جلد سے جلد اور محتاط طریقہ سے لوگوں کی زکوۃ ادا ہوجائے تو جائز کہا جائے گا، لیکن اصحاب وارا کین ادارہ کو یا اسکے ذمہ دار لوگوں کو کسی سے زبردستی وبجز خواہ وہ اموال ظاہر یہ ہی کیوں نہ ہوں وصول کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر ارباب اموال اس میں اپنی زکوۃ نہ دیں تو گنہگار نہ ہوں گے، بلکہ ان کو اپنے اموال کی زکوۃ خدا سے ڈر کر خود اس کے مصرف میں اور اس کے مستحقین تک پہنچانا ضروری رہے گا، البتہ اگر کسی ادارے میں جس کے بارے میں ظن غالب ہو۔اور یہ بات محقق دیکھیں کہ اس میں یہ رقوم زکوۃ وغیرہ اس کے مستحقین کی ملک میں نہایت صحیح طور پر پہنچ جاتے ہیں اور ادائیگی حسب قاعدہ شرع ہوجاتی ہے دیدیں تو ان کی ادائیگی صحیح ہوجائے گی۔

اسی طرح اصحاب وارا کین ادارہ نے اگر محتاط اور صحیح طریقہ سے شریعت مطہرہ کے بتائے اصول کے مطابق ان رقوم کو ان کے مستحقین کی ملک میں پہنچانے سے پہلے پہلے خرچ کرڈالا تو ارباب اموال کی صدقات وزکوۃ واجبہ (نذ رو کفارۂ روزہ) وغیرہ ادا نہ ہوگی، اور ایسا کرنے والے عند اللہ سخت مجرم و ماخوذ ہوں گے۔بلکہ دنیا کے وبال میں بھی ابتلاء کا شدید اندیشہ رہے گا، اور ارباب اموال کو اس کا علم صحیح اور یقین ہوجانے کے بعد ایسے ادارہ میں اپنی رقم دینا جائز بھی نہ ہوگا۔

ہماری ان گزارشات سے امتناع کا درجہ بھی معلوم ہوگیا کہ امتناع لعینہ نہیں ہے، بلکہ امتناع لغیرہ ہے، لفقدان شرائط اور اس امتناع لغیرہ کا حاصل وہی ہے جو اوپر ابھی مذکور ہوا۔اس میں ضرورت کے تمام اجزاء کا جواب آگیا، اور ہر ہر نمبر کے تفصیلی جواب الگ الگ لکھنا مقصد سے زائد اور بلاضرورت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۸/ ۹۳ ۱۳ ھ

علوم دینیہ پر زکوۃ صرف کرنا:

۱ - ''هل يجوز صرف مال الزكوة في تعليم العلوم الدينية والاسلامية''

اہل مدرسہ کو زکوۃ دینا:

۲۔ ''هل يجوز صرف الزكوة على أهل المدرسة والجامعة''

مدارس کے سفراء وعامل اور عاشر میں داخل ہیں یا نہیں؟

۳۔ ''هل يجوز اطلاق العامل والعاشر على سفير المدرسة والجامعة في أخذ الزكوة من الناس''

ابن سبیل کا مصداق طالب ہے یا نہیں؟

۴۔ "هل يصح مصداق ابن سبيل على المتعلم"

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کی تعمیر:

۵۔ "هل يصح التعمير للدار العلوم من مال الزكوة"۔

۶۔ "هل يشترط المدرسة التعليم عربية الشرعية"

کیا مدرسہ کے کارکنوں کے لئے زکوۃ لینے میں بھی فقر کی شرط ہے؟

۷۔ "هل يشترط الغناء والفقر في قبول الزكوة معلم ومتعلم والخادم المدرسه"

سادات طلبہ کو زکوۃ دینا:

۸۔ "وان كان في المدرسة سادات اعنى أولاد رسول اللهﷺ يجوز لهم الزكاة أم لا"۔

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کے لئے دینی کتب کی خریداری:

۹۔ "وإذا اشترىٰ بالمال الزكوة كتب الدينيه وأن يضع في المدرسه على طريق الوقف يصح الزكوة وخرج الزكوة"۔

۱۰۔ "بينوا بالبيان الكافي توجروا من الله بالاجر الوافي ونرجو منكم العفو في الأغلاط"۔

عبدالمنان حقانی (خادم الدارالعلوم گلستان قاطع شیبن بلوچستان پاکستان)

الجواب وبالله التوفيق:

۱، ۲۔ "لايجوز إلا بعد تمليك المستحق (أما تفسيره (الزكوة فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى)"(۱)۔

۳۔ لا يجرى كل أحكام العامل والعاشر على سفراء المدارس والجامعات في أخذ الزكوة "درمختار باب المصارف" میں ہے: وعامل یعم الساعی والعاشر اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: "الساعي هو من يسعى في القبائل لجمع صدقة السوائم، والعاشر من نصبه الإمام على الطرق ليأخذ العشر ونحوه في

۱۔　　فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰۔

المارة''(۱)۔

۴۔ نعم یصح (قلت: ورأیته في جامع الفتاوی ونصه: وفی المبسوط: لا یجوز دفع الزکوة إلی من یملک نصاباً إلا إلی طالب العلم والغازی ومنقطع الحج'' (۲)۔

۵۔ ''بدون تملیک المستحق لا یجوز التعمیر من مال الزکوة (ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا إباحة کما مر، لا یصرف إلی بناء نحو مسجد ''(۳)''وقدمناه أن الحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الأشیاء''(۴)۔

۶۔ ''نعم یشترط (ان طالب العلم یجوز له أخذ الزکوة''(۵) اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: (من أن طالب العلم) أی الشرعی(۶)۔

۷۔ نعم یشترط (جس کو زکوۃ دی جائے اس کا فقیر ہونا ادائیگی زکوۃ کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، ''ولأن الفقر شرط فی جمیع الأصناف إلا العامل والمکاتب وابن السبیل'' (۷)، نیز معلم اگر فقیر بھی ہو تو مد تنخواہ میں زکوۃ کی رقم دینا درست نہیں جب تک اس کی تملیک نہ ہو جائے)۔

۸۔ '' لا یجوز لهم أخذ الزکوة (ولا (أی لا یصرف) إلی بنی هاشم إلا من أبطل النص قرابته وهم بنو لهب'' (۸)۔

۹۔ بدون تملیک المستحق لا یوضع فی المدرسة بطریق الوقف، والا لا یصح الأداء ولا یبرا الذمة فقط (الحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الأشیاء)''(۹)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۴۔
۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۵۔
۳- ردالمحتار علی الدر ۳/ ۲۹۱۔
۴- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۳۔
۵- الدرالمختار۔
۶- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۵۔
۷- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۳
۸- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۹۔
۹- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۳۔

سید بھائی کوزکوۃ دینا:

میرا ایک حقیقی بھائی ہے۔ گاؤں میں معمولی سی کرانہ کی دکان ہے جس میں فروخت کے لئے سامان تک کافی نہیں ایک دو ایکٹر زراعتی زمین بھی ہے مذکورہ دونوں کی مجموعی آمدنی اتنی ہوتی ہے کہ کثیر العیال (دس افراد خاندان) جس میں لڑکیاں بھی شادی کی عمر سے تجاوز کررہی ہیں کہ ہمیشہ تنگدستی سے گذر ہوتی ہے، کیا میں انہیں زکوۃ کی رقم دے سکتا ہوں، تا کہ وہ دکان کے لئے سامان خریدیں، تو انہیں مناسب آمدنی کا کچھ ذریعہ ہو جائے اور وہ اپنے لڑکوں کی تعلیم لڑکیوں کی شادی وغیرہ امور پہ توجہ دے سکیں؟ جواب لکھتے وقت خیال رکھئے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے اور وہ سید خاندان ہی کا ہے۔

سید عبداللہ صاحب معرفت الغوشیہ (ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۱۳۲۶ الخبر۔ سعودیہ عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

سادات کو متقدمین فقہاء نے زکوۃ کی رقم دینے سے منع فرمایا ہے (۱)، اور چونکہ بیت المال شرعی سے سادات کے وظائف مقرر ہو جاتے تھے اور اب بیت المال شرعی نہیں رہے، اس لئے بعض متاخرین فقہاء نے سادات کو بھی زکوۃ کی رقم دینے کی اجازت دے دی ہے (۲)، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حقیقی بھائی جب سید ہے تو اس کی مدد ضرور کی جائے گی، مگر زکوۃ کی رقم سے نہ کی جائے، بلکہ صدقات نافلہ سے کی جائے اور اگر بھابھی، یعنی بھائی کی بیوی اگر غیر سید ہو تو اس کو زکوۃ کی رقم بے تکلف دینا جائز ہے۔ اور اتنی زیادہ مقدار بھی اس کو دے سکتے ہیں جس سے وہ اپنے بچوں کی پوری کفالت و تعلیم و تربیت و غیرہ کا خرچ فراغت سے کر سکے۔ ورنہ اگر حقیقی بھائی و بہن سید نہ ہوں تو ان کو اور ان کی اولاد کو جب غریب و محتاج ہوں تو زکوۃ کی رقم دینا جائز ہے بلکہ دوسرے کے اعتبار سے زیادہ بہتر ان کو دینا ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۰/۷/۳۰ھ

۱- "ولا تدفع إلى بني هاشم ہدایہ ۱/۱۸۶ یعنی سواء في ذلک کل الأزمان، وسواء في ذلک دفع بعضهم لبعض ودفع غيرهم لهم" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۲۹۹)۔

۲- "وروى أبوعصمة عن الإمام أنه يجوز الدفع إلى بني هاشم في زمانه، لأن عوضها وهي خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم وإيصالها إلى مستحقيها، وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض، كذا في البحر وقال في النهر: وجوز أبويوسف دفع بعضهم إلى بعض" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۲۹۹)۔

۳- بل هم أولى لأنه صلة وصدقة) (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۲۹۳) (مرتب)۔

مدرسہ میں زکوۃ کا مصرف:

ان مدارس کے بارے میں جن میں بیرونی طلباء زیر تعلیم ہیں اور قیام و طعام بذمہ مدرسہ ہے معطی کی نیت رقم زکوۃ بوقت ادا یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے ذمہ زکوۃ واجب ہے وہ ذمے سے ادا ہو جائے، یہ تو ہوئی نہیں پایہ تو کہتے نہیں کہ فلاں مقام پر خرچ کرو، بلکہ سفیر یا مدرسہ کے مہتمم کے کہنے پر کہ مدرسہ زکوۃ لیتا ہے تو زکوۃ دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ مصارف زکوۃ مدرسہ میں کیا کیا مقام ہے تنخواہ معلم، طلباء کے طعام قیام لباس مدرسہ کی توسیع مدرسہ کے دیگر اخراجات، مہتمم رقم زکوۃ کی اگر حیلہ تملیک نہ کرتا ہو تو اور مدرسہ میں رقم زکوۃ کو مہتمم کہاں کہاں پر صرف کرسکتا ہے۔

یہ سوال ہماری تسلی کے لئے ہے تاکہ معلوم ہو جائے اور زکوۃ کی دائیگی سے مطمئن ہو جائیں اور صحیح مصرف کا بھی علم ہو جائے۔

احمد علی صدیقی (احمد علی محمد علی پرفیومرسسیمارہ ڈپوسٹ کھوگون، ایم-پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ صدقہ فطر اور دوسری واجب التملیک رقوم کو صرف نادار اور غیر مستطیع طلبہ کے کھانے کپڑے پر خرچ کرنا لازم ہے، اگر تنخواہ مدرسین یا تعمیر وغیرہ یا کسی کام کی اجرت میں خرچ کرنا ہو یا کسی بھی ایسے کام میں خرچ کرنا ہو جس میں تملیک مستحق نہیں ہوتی بغیر تملیک مستحق کے خرچ کرنا جائز نہیں ہے(۱)، لہذا جس طرح زکوۃ کے مال سے کوئی سامان خرید کر اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، ویسے ہی اس کا اجرت میں دینا بھی جائز نہیں)۔

اس لئے احتیاطی پہلو یہی ہے کہ ان رقوم واجب التملیک پر وصول ہونے کے ساتھ ہی مستحقین زکوۃ سے تملیک کرا کے پھر خرچ کے لئے استعمال کریں اور تملیک کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جتنے روپے کی تملیک کرنا ہو اتنے روپئے کے بارے میں کسی غریب مستحق زکوۃ سے کہیں کہ تم اتنے روپئے کہیں سے قرض لا کر مدرسہ میں بطور چندہ وعطیہ دیدو، تمہارا قرض ادا کر دیا جائے گا پھر جب وہ غریب اتنا روپیہ کہیں سے قرض لا کر بطور چندہ مدرسہ میں دے دے تو اس کے بعد زکوۃ وغیرہ واجب التملیک والی رقم اس غریب کو دیدیں اور وہ غریب اس رقم سے اپنا قرض ادا کر دے۔

اس کو قرض دینے میں ایسا بھی کرسکتے ہیں کہ خود اپنے پاس سے اس کو قرض دیدیں پھر جب وہ قرض لی ہوئی رقم

۱- ''ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً ''(الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۲۹۱)، ''وکل ما صلح ثمناً أی بدلاً فی البیع صلح أجرة؛ لأنها ثمن المنفعة''(الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/۵)۔

چندہ میں دیدے تو اس کے بعد اپنی زکوۃ والی رقم اس کو دیدے پھر جب وہ اس رقم پر مالک ہو جائے تو اس سے اپنا قرض وصول کر لے۔

یہی طریقہ دوسرے کسی مالدار سے دلا کر اختیار کر سکتے ہیں (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱/۱۴۰۱ھ

کیا ادائیگی زکوۃ کے لئے کوئی مہینہ مخصوص ہے؟

۱-صاحب زکوۃ کو کس ماہ میں اور کس مدت میں ادا کر دینی چاہئے؟

مصارف زکوۃ:

۲-زکوۃ کے مستحق کون کون حضرات ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے نمبر وار اور ترتیب کے ساتھ بتلایئے کہ کس کے بعد کس کو دیجائے؟

فقراء و مساکین کس کو کہتے ہیں؟

۳-زکوۃ لینے والے کی مفلسی کس حد تک ہو جن کو زکوۃ دی جائے مجبوری کی نوعیت بھی تحریر فرمادیں۔

مصارف زکوۃ کے علاوہ دوسرے مد میں زکوۃ صرف کرنا:

۴-زکوۃ کی رقم مستحقین کے علاوہ دوسرے آدمی یا مصارف میں دی جائے تو زکوۃ ادا ہوگی یا کہ نہیں۔

زکوۃ کی رقم جمع کر کے رفتہ رفتہ خرچ کرنا:

۵۔ زکوۃ کی رقم اگر زید تمام مسلمانوں سے لیکر جمع کرے اور ایک سال تک رفتہ رفتہ مختلف نوعیت سے قومی یا نفلی مصارف میں صرف کرتا رہے تو شرع کا کیا حکم ہے۔

غیر مصرف پر زکوۃ صرف کرنا:

۶۔ اللہ اور رسول کے مقرر کردہ مستحقین کے حق کو ادا نہ کر کے اور خدا کے معذور اور مجبور بندوں کی حق تلفی کر کے جو شخص روپیہ جمع کرے اور غیر مصرف میں صرف کرے اور صاحب زکوۃ اس کو پیسہ دے کر زکاۃ ادا کرنا چاہے آیا ان دینے

۱- ''وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته، ثم يأخذها عن دينه، ولو امتنع المديون مديده وأخذها لكونه ظفر بجنس حقه، وحيلة التكفين بها التصدق على الفقير ثم هو يكفن، فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد'' (درمختار مع رد المحتار ۳/۱۹۰)(مرتب)۔

والوں کی زکوۃ بھی ادا ہوگی یا کہ نہیں اور جمع کرنے والا آہستہ آہستہ جمع کرتا رہے تو اس کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

(الف) جب مالک نصاب ہونے کے بعد حولان حول (ایک سال) پورا ہو جائے زکوۃ دینی چاہئے، خواہ کوئی سا بھی مہینہ ہو(۱)۔

(ب) مستحق زکوۃ یہ لوگ ہیں:

(۱) فقیر یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ مال ہو مگر مقدار نصاب سے کم ہو۔

(۲) مسکین، یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ مال نہ ہو دانہ دانہ کو محتاج ہو۔

(۳) عامل جو شخص امام المسلمین کی جانب سے زکوۃ سوائم وعشر وصول کرنے کے لئے مقرر ہو ان کا آج وجود نہیں ہے۔

(۴) مکاتب، اس کا بھی آج وجود نہیں۔

(۵) وہ قرضدار جس کے پاس قرض ادا کرنے کے بعد نصاب کی مقدار سے کچھ کم بچے۔

(۶) وہ لوگ جو فریضہ جہاد یا فریضہ حج ادا کرنے کے لئے نکلیں۔ اور اچانک ان کا مال ہلاک ہو جائے اور ادائیگی فریضہ سے مجبور ہونے لگے ہوں اور جو طلب علم دین میں مشغول ہو اور محتاج اخراجات ہو۔

(۷) مسافر جو اچانک زادراہ ہلاک ہو جانے سے محتاج ہو گیا ہو۔

اور فوری کوئی صورت حصول زادراہ کی نہ ہو(۲)۔

(ت) اگر کسی کو اتنا مل جاتا ہو کہ کسی طرح صبح شام ہوتی جاتی ہو لیکن اس کے پاس حوائج اصلیہ سے اتنا فاضل نہیں رہتا ہو جو نصاب زکوۃ کی مقدار ہے یعنی قول مختار کے مطابق ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنا ہی زیور یا اس مقدار کا کوئی سامان تجارت ہو تو ایسے آدمی کو زکوۃ مانگنا تو جائز نہیں، لیکن اگر کوئی اس کو از خود دیدے تو لے لینا جائز ہے، اگرچہ بہتر یہ بھی نہیں ہے

۱- "وافتراضها عمری أی علی التراخی وصححه الباقانی وغیره، وقیل: فوری أی واجب علی الفور، وعلیه الفتوی، کما فی شرح الوهبانیة، فیأثم بتأخیرها بلا عذر" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۹۱، تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۸۳-۲۹۔

اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، بلکہ تنگی سے گذر کرتا ہو اس کو مانگنا بھی جائز ہے گو بہتر نہیں (۱)۔

(ث) زکوۃ ادا نہ ہوگی دوبارہ دینا واجب رہے گا (۲)۔

(ج) یہ قطعاً جائز نہیں ادائیگی زکوۃ صحیح ہونے کے لئے غرباء و مساکین کو اس زکوۃ کی رقم کا مالک بنا دینا شرط ہے اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں (۳)، ہاں اگر زید کے پاس زکوۃ کا روپیہ جمع کرنے والے زید کو ادا کرنے کا وکیل بنا دے اور پھر زید وکالتۃً زکوۃ کے مصرف میں صرف کرے تو جائز ہوسکتا ہے، جیسا کہ مدارس اسلامیہ کے نظماء و مہتمم حضرات کرتے ہیں (۴)۔

(خ) ایسی صورت میں ان دینے والوں کی زکوۃ ادا نہ ہوگی اور اس طرح جمع کرنے والے اور غیر مصرف میں جمع کرنے والے عند اللہ سخت مجرم اور گناہ گار ہوں گے (۵) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود احمد عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

مکتب میں چرم قربانی وزکوۃ دینا:

ایک مدرسہ اس قسم کا ہے کہ مدرسہ میں سین بورڈ لگا ہوا ہے اور اس پر لکھا ہوا کہ اسلامیہ پرائمری اسکول اور رسید بہی پر لکھا ہے عربیہ اسلامیہ مدرسہ حفظ القرآن اس رسید بہی کو لے کر گاؤں در گاؤں چندہ مانگتے ہیں فطرہ اور زکوۃ اور چرم قربانی

۱- ''ویجوز دفعها إلی من یملک أقل من النصاب وإن کان صحیحاً مکتسباً کذا فی الزاهدی'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۸۹)، ''ولا إلی غنی یملک قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلیة من أی مال کان'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۵)، ''ولا یحل أن یسأل شیئاً من القوت من له قوت یومه بالفعل أو بالقوة کالصحیح المکتسب'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۳۰۵)۔

۲- زکاۃ کی تعریف ہے: ''هی تملیک المال من فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملک من کل وجه لله تعالی هذا فی الشرع'' کذا فی التبیین (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۰)۔

۳- کیونکہ زکاۃ نام ہے: ''تملیک المال من فقیر مسلم ...'' الخ کا، اور مصارف زکاۃ متعین ہیں: ''إنما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل فریضة من الله والله علیم حکیم'' (سورۂ توبہ: ۶۰) (مرتب)۔

۴- ''الوکیل إنما یستفید التصرف من الموکل'' (ردالمحتار ۳/ ۱۸۹)۔

۵- دیکھئے: حاشیہ ث، ج ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۱) (مرتب)۔

سب مدرسہ کو دیتے ہیں اور دو مدرس ہیں ایک ہندی پڑھانے کے لئے اور ایک قرآن شریف پڑھانے کے لئے جو کہ حافظ صاحب ہیں اور مہتمم مدرسہ ہندی پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔

اور مہتمم صاحب کہتے ہیں کہ جب ڈپٹی صاحب آئیں گے تو وہ قرآن کی تعلیم کی جانچ نہیں کریں گے، بلکہ ہندی کی کریں گے، اس لئے ہندی پر زیادہ توجہ دو قرآن پر کم کوئی بچہ امدادی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی باہر کا رہنے والا ہے سب مقامی بچے ہیں ایسے مکتب میں صدقہ چرم قربانی زکوۃ کی رقم صرف ہو سکتی ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صدقۂ فطر، چرم قربانی زکوۃ وغیرہ کی رقم کسی کی اجرت میں مدرس کی تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے اس کے مصرف صرف غرباء اور مساکین ہیں ان پر صدقہ کر دینا واجب ہے کما ہو مصرح فی عامۃ کتب الفقہ اور سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں طلباء مستحقین جو مصرف زکوۃ ہیں نہیں ہیں یا ہیں تو ان کو کھانا وغیرہ کچھ نہیں دیا جاتا ہے، لہذا اس مدرسہ میں یہ رقمیں دینا جائز نہیں ہے جو دے گا اس کی زکوۃ یا صدقۂ فطر وغیرہ ادا نہیں ہوگا(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۷/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

امام کے لئے صدقہ وزکوۃ لینا:

بندہ ایک مسجد میں امامت کرتا ہے اس کی ہر ماہ واری تنخواہ ستر روپیہ ہے جو کہ مقرر ہے اس ماہ واری تنخواہ سے خرچ ماہ واری نہیں چلتا ہے اس لئے بندہ ہر ماہ کے اور سال کے آخر میں مقروض ہو جاتا ہے، لہذا بندہ کے لئے صدقۂ فطر لینا یا زکوۃ کا روپیہ لینا اس ستر روپیہ کے علاوہ جائز ہے یا کہ نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جن کو خورد و نوش کے لئے ان کی کمائی کافی نہ ہو ان کے لئے صدقۂ فطر اور زکوۃ کا لینا جائز ہے خورد و نوش کو فقیہ لوگ

۱- زکوۃ میں مال کی تملیک بشرط قطع المنفعۃ عن الملک من کل وجہ للہ تعالی ہوا کرتی ہے، لہذا کسی نفع کے عوض میں یا اجرت کے طور پر دینا زکوۃ کا مصداق نہیں ہوگا دیکھئے فتاوی (عالمگیری ۱/۱۷۰)۔

حوائج اصلیہ سے تعبیر کرتے ہیں: "كذا لو كان له حوانيت أو دار غلة تساوی ثلاثة آلاف درهم وغلتها لا تكفي لقوته وقوت عياله يجوز صرف الزكوة إليه في قول محمد رحمه الله، ولو كان له ضيعة تساوی ثلاثة آلاف و لا يخرج منها ما يكفي له ولعياله اختلفوا فيه قال محمد بن مقاتل يجوز له أخذ الزكوة"(۱)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حوائج اصلیہ کے لئے اگر کمائی کافی نہ ہوتو ایسے شخص کے لئے صدقۂ فطر اور زکوۃ واجبہ ہو یا نافلہ ہو لینا جائز ہے(۲)، اگر اس شخص کے پاس زیور یا چاندی یا سوا نصاب زکوۃ کی مقدار یا اس قیمت کا سامان حوائج اصلیہ سے زائد نہ ہوتو اس کو زکوۃ لینا درست ہوگا(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جواب صحیح ہے بشرطیکہ یہ امام صدقۂ فطر اور زکوۃ کو اپنا حق نہ سمجھتا ہو اور وہاں یہ رواج نہ ہو کہ امام ہی کو دیا جائے اور نہ ملنے پر امام نمازیوں سے ناراض نہ ہو اور امامت چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے لئے آمادہ نہ ہو۔

الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

ملازمین کو زکوۃ کی رقم سے تنخواہ دینا:

زکوۃ کا روپیہ طلباء کے خرچ کے علاوہ ملازمین وغیرہ کی تنخواہوں میں خرچ کرنا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ کا مصرف غرباء و مساکین ہیں جن کو بلا عوض کسی عمل کے دینا اور ان کی تملیک کرنا ضروری ہے اور مدرسین تنخواہ اپنے عمل کے عوض میں لیتے ہیں ان کو زکوۃ کا روپیہ تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے(۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

۱- فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۶۶۔

۲- کذا فی فتاوی قاضیخان ۱/ ۱۲۴۔

۳- "ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۸۹)(مرتب)۔

۴- "بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى"، اس کے تحت بحر میں ایک جزئیہ منقول ہے: "رجل يعول أخته أو أخاه أو عمه فأراد أن يعطيه الزكوة، فإن لم يفرض القاضي عليه النفقة جاز؛ لأن التمليك بصفة القربة يتحقق من كل وجه،

مستحق زکوۃ کی رقم سے اپنے لئے کتابیں خریدنا:

عشر زکوۃ فطرہ چرم قربانی کی رقم سے دینی لائبریریوں یا اسلامی کتب خانوں میں کتابیں نہیں خرید سکتے ہیں اور نہ اخبار ورسائل کا اجراء کرسکتے ہیں، مگر یہ رقوم ایک ایسے مفلس یا نادار کو دی جاتی ہے جو اس کا صحیح معنوں میں مستحق اور اہل ہے لیکن یہ شخص فطری طور پر کتب بینی رسالہ نویسی کا دلدادہ اور شوقین واقع ہوا ہے، اس لئے وہ اپنی زیرکی سے ایسا کرتا ہے کہ ان پیسوں سے بقدر کفاف خورونوش کا انتظام کرلیتا ہے اور باقیماندہ پیسوں سے اپنے ذوق کے مطابق کتابیں خریدتا ہے، واضح رہے کہ اس میں مزکی کا ایماواشارہ بالکل نہیں رہتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب وہ مفلس ان رقوم کا صحیح مصرف ہے تو اس کو دینے کے بعد وہ ان کا صحیح مالک ہوگیا ہے اب اس کو پورا اختیار ہے جس مصرف میں چاہے خرچ کرے اگر مستحسن مصرف میں صرف کرے گا اور ثواب کے کاموں میں صرف کرے گا تو ثواب ہوگا اور اگر ناجائز مصرف میں صرف کرے گا تو گنہگار ہوگا باقی تصرف احکام قضاء میں نافذ ہوجائے گا اور زکوۃ دینے والوں کی زکوۃ ادا ہوجائے گی، البتہ دیدہ دانستہ ایسے مفلس کو دینا جو حرام اور ناجائز میں خرچ کرتا ہے، نہ چاہئے اور اس مفلس مذکور کا مصرف تو کوئی ناجائز نہیں پھر اشتباہ کی کیا وجہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ کی رقم کو دینی کتابوں اور معلمین کی تنخواہ پر خرچ کرنے کی صورت:

ایک شخص اپنی زکوۃ کی رقم دینی تعلیم، معلم کی تنخواہ، دینی کتابوں پر خرچ کرنا چاہتا ہے، زکوۃ کی رقم کہاں خرچ کرسکتے ہیں اور کہاں نہیں خرچ کرسکتے کس کو دے سکتے ہیں اور کس کو نہیں دے سکتے؟

وإن فرض عليه النفقة لزمانته إن لم يحتسب من نفقتهم جاز، وإن كان يحتسب لايجوز؛ لأن هذا أداء الواجب عن واجب آخر'' (البحر الرائق ۲/ ۳۵۳) (مرتب)۔

۱- ''وفي المعراج: التصدق على العالم الفقير أفضل'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۰۴) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ کی رقم کسی معلم کو اس کی تنخواہ کے عوض میں دینا جائز نہیں (۱)۔

دینی کتابوں پر خرچ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دینی کتابیں خرید کر کسی غریب مسلمان کو جو زکوۃ کا مصرف ہے ان کتابوں کا اس کو مالک بنا دیں "ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا إباحة" (۲)، دینی تعلیم پر دینے کی یہ صورت ہے کہ جس مدرسہ میں دینی تعلیم ہوتی ہو اور وہاں غریب مسلمان طالب علم پڑھتے ہوں وہاں کے مہتمم کو زکوۃ کے پیسہ کا وکیل بنا دے کہ یہ زکوۃ کا روپیہ ہے آپ اس کو اس کے مصرف میں خرچ کریں اور زکوۃ ادا ہو جانے کی بہتر اور بے خطرہ یہی صورت ہے بشرط یہ کہ مہتمم مدرسہ مسائل سے واقف ہو اور دیندار و محتاط ہوں (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۹۵/۹/۵ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مقروض کو زکوۃ کی رقم دے کر اس سے اپنا قرض وصول کرنا

زید کا قرض ایک غریب پر باقی تھا زید نے زکوۃ نکالی اور اس غریب کو دی پھر اس سے کہا کہ تیرے پاس رقم آ گئی ہے، اب میرا قرض ادا کر دے اس نے اس رقم سے ۱۸ سو ادا کر دیا تو زید اپنی دی ہوئی رقم کو اس طرح وصول کر سکتا ہے یا کہ نہیں، نیز اگر رقم پر قبضہ کرنے کے بعد اس مقروض نے ادائیگی قرض سے انکار کیا تو زید اپنے قرض اس رقم کو چھین کر لے سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس طرح زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی اور قرض بھی وصول ہو جائے گا اگر مقروض قرضہ واپس کرنے سے انکار کر دے تو

۱- کیونکہ: هي تملیک المال من فقیر مسلم غیرهاشمي ولو مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملک من کل وجه لله تعالى) (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰)، نیز بدائع الصنائع میں: "العاملون علیها" کی بحث میں ہے: "دل أنه إنما یستحقه بعمله لکن علی سبیل الکفایة له ولا عوانه لا علی سبیل الأجرة؛ لأن الأجرة مجهولة) (بدائع الصنائع ۲/۱۵۱) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۹۱۔

۳- "أو نوی عندالدفع للوکیل ثم دفع الوکیل بلانیة" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۸۷)، "إذا وکله الفقراء، لأنه کلما قبض شیئاً ملکوه" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/۱۸۸) (مرتب)۔

اس سے دی ہوئی رقم جبراً بھی لینا درست ہے،"وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكوته ثم يأخذها عن دينه ولو امتنع المديون مديده وأخذها لكونه ظفر بجنس حقه فإن مانعه رفعه للقاضي"(۱)۔

جی ہاں اس طرح وصول کرسکتا ہے، اس طرح زکوۃ بھی ادا ہوجائے گی۔ اور قرض بھی وصول ہوجائے گا اور اگر دی ہوئی رقم پانے کے بعد بھی مقروض ادائیگی قرضہ سے بلا وجہ شرعی انکار کرے تو زبردستی بھی چھین کر لے سکتا ہے۔ مگر اپنی دی ہوئی رقم ہونے کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اپنا بقیہ قرض ہونے کے اعتبار سے بلا وجہ شرعی ومجبوری کا مطلب ہے کہ مثلاً وہ اور اس کے ننھے بچے فاقہ اور بھوک سے مررہے تھے اور یہ رقم صرف فاقہ روک سکتی ہے زائد کچھ نہیں بچتا ہے ایسی صورت میں اگر ادائیگی قرض میں کچھ تاخیر کردے فوراً نہ دے تو گنہگار نہ ہوگا اور آپ کو زبردستی چھین لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

صدقات واجبہ کی رقم سے غریب طلبہ کو کتابیں دینا:

میرے گاؤں میں مکتب اسلامیہ جس میں تعلیم الاسلام کے چار حصے پڑھائے جاتے ہیں اور چاروں حصے انجمن حمایت الاسلام لاہور پاکستان کتاب قرآن شریف پڑھائی جاتی ہے ایک مدرس تنخواہ دار مقرر ہے بچوں سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی ہے ایک دو بچہ ایسا غریب ہے جس کو کتابیں دی جاتی ہیں جس کا صرف صدقہ فطر اور چرم قربانی اور زکوۃ کی رقم سے پورا کیا جاتا ہے اگر ایسا نہ کیا جاوے تو چلنا مدرسہ کا مشکل ہے عند الشرع اسمیں یہ فنڈ لگائے جاسکتے ہیں یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

صدقہ فطر، زکوۃ، چرم قربانی کی قیمت سے کسی مدرس کی تنخواہ دینا جائز نہیں ہے، غریب مسلمان بچوں کو کھانا کپڑا ان رقموں سے دے سکتے ہیں جو بچے پڑھتے ہیں ان کے والدین سے کچھ ماہانہ یا ہفتہ وار لے کر بھی تنخواہ دے سکتے ہیں (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۹۰۔

۲- زکوۃ کی رقم مستحق زکوۃ کو بلاعوض ومنفعت دی جاتی ہے، اجرت میں دینا جائز نہیں، البتہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے، "قال في الهداية:

اپنی زکوۃ یا فطرہ کی رقم بہو کو دینا:

اپنی زکوۃ یا فطرہ وغیرہ اپنے لڑکے کی بیوی کو بھی دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر لڑکے کی بیوی مصرف زکوۃ ہے تو دے سکتے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

قرض کا روپیہ زکوۃ یا سود سے منہا کرنا:

ایک شخص نے اپنے پانچ سو روپیہ میں سے کسی دوسرے شخص کو ایک سو روپیہ پندرہ روز کے وعدہ پر دیا، لیکن اس نے دو سال گذر جانے پر بھی واپس نہیں کیا، نہ اس سے کبھی بھی ملنے کی امید ہے۔ اس چار سو روپیہ پر بینک سے ملنے والا سود (۲) چار سو روپیہ میں واجب ہونے والی زکوۃ اس ایک سو روپیہ میں جو دیا گیا ہے کیا محسوب کیا جاسکتا ہے، یعنی سود اور زکوۃ سے یہ ایک سو روپیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر وہ آدمی غریب زکوۃ لینے کا شرعاً مستحق ہے تو بینک کا سود یا زکوۃ کا روپیہ اس کو دیکر اپنا قرض اس سے وصول کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں، "**وحيلة الجواز أن يعطى مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه**" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

وبعض مشايخنا رحمهم الله استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الإقناع تضييع حفظ القرآن، وعليه الفتوى "اھ (ردالمحتار علی الدر المختار ۳/۷۶) (مرتب)۔

۱- کیونکہ لڑکے کی بیوی اس کے اصول یا فروع میں سے نہیں ہے، ولا يدفع إلى أصله وإن علا وفرعه وإن سفل، كذا في الكافي (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۸۸) "ويجوز دفعها لزوجة ابيه وابنه وزوج ابنته" (ردالمحتار علی الدر المختار ۳/۲۹۳) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع ردالمحتار ۳/۱۹۰۔

جواب صحیح ہے، مطلب یہ ہے کہ ایکسو روپیہ جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے اس کو زکوۃ یا سود میں محسوب نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ زکوۃ یا سود کا روپیہ اس مستحق کو دیکر اس سے اپنا قرضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

جس ادارہ میں باپ نے زکوۃ کی رقم دی ہو اس میں بیٹے کا کھانا اور امداد لینا:

صدقۂ فطر اور زکوۃ کا مال گاؤں کے سب لوگ ایک جگہ ملا کر پھر اسے فقیر اور مساکین کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں اس زکوۃ دینے والوں میں باپ ہوتے ہیں اور اس زکوۃ سے حصہ لینے والوں میں بیٹے ہوتے ہیں تو اس صورت میں باپ کی زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ نیز دارالعلوم میں زکوۃ کے روپیہ پیسہ غلہ وغیرہ بھیجنے والا باپ اور دارالعلوم سے جو کھانا اور امداد دی جاتی ہے لینے والا بیٹا بھی ہوتا ہے تو مذکورہ بالا مسئلہ کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب سب گاؤں کے لوگوں کا صدقۂ فطر و زکوۃ ایک میں ملا دیتے ہیں پھر "لا علی التمیز" دیتے ہیں تو "الخلط استهلاک"(۱) کے ضابطہ کے ماتحت زکوۃ وصدقۂ فطر سب ادا شمار ہوگا، البتہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کی یہ زکوۃ کی یا صدقۂ فطر کی رقم ہے اور یہ رقم اس کے باپ یا بیٹے کو دی جارہی ہے تو یہ زکوۃ وصدقۂ فطر ادا نہ ہوگا۔ کیونکہ صدقات واجبہ کا اصول وفروع کو دینا درست نہیں (۲)، اور مدارس میں یہ رقوم جو آتی ہیں اسی اختلاط کے ضابطہ کے مطابق غیر متمیز طریقہ سے جملہ طلباء پر خرچ کی جاتی ہیں، اس لئے یہاں وہ شبہ نہیں ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

گورنمنٹ سے ملحق مدارس میں زکوۃ دینے کا حکم:

۱- جو مدرسہ گورنمنٹ سے ملحق ہو، خواہ ہمارا مدرسہ دارالعلوم ہو یا مفتاح العلوم ہو، ان مدارس میں صدقۂ فطرہ،

۱- الدرالمختار، باب الزکاۃ، مطلب فیما لو صادر السلطان جائز ۲/۲۹۰ (مرتب)۔

۲- "ولا يدفع إلى أصله وإن علا وفرعه وإن سفل كذا في الكافي" (الفتاوی الہندیہ ۱/۱۸۸) (مرتب)۔

زکوٰۃ، چرمِ قربانی وغیرہ دینا کیسا ہے، جب کہ ہمیں خوف اس بات کا ہے کہ آج نہیں تو کل یہ مدارس ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتے ہیں اور گورنمنٹ ان پر قبضہ کرسکتی ہے، بہر حال اس بارے میں مفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

۲-گورنمنٹ سے جوایڈ ملتی ہے مدرسین، ملازمین کو اس سے تنخواہ دینا کیسا ہے؟

سوال کرنے کی نوبت یوں آئی کہ میرے استاذ نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مفتی صاحب خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں افتاء کا کام کرتے تھے اور ہارون رشید ان کو کچھ بطور وظیفہ کے دیتے تھے، لہذا اس پر عوام نے فضیل ابن عیاضؒ سے شکایت کی، آپ نے عوام کو تو بہلا کر واپس کر دیا، اس کے بعد فضیل ابن عیاض مفتی صاحب کے پاس گئے، ان سے آپ نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہارون رشید یہ رقم کہاں سے آپ کو دیتے ہیں؟ تو پھر مفتی صاحب نے توبہ کی اور کہا، آج سے نہیں لوں گا۔ جب یہ معاملہ ہے تو کیسے اس حکومت سے ایڈ لیں، سمجھ میں نہیں آتا، لہذا اس مسئلہ پر غور فرما کر جلد از جلد جواب تحریر فرمائیں تاکہ اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-اگر ان مدارس میں ان رقوم کے مستحقین ومصارف موجود ہوں تو یہ رقوم بلا کراہت ان کو دینا جائز رہے گا، البتہ اگر خوفِ مذکور کا ظن غالب ہو جائے تو الحاق ختم کر دینے کا حکم عائد ہو جائے گا۔

۲-مدرسین کو اس کا لینا جائز ہے اور فضیل ابن عیاض کا جو واقعہ آپ نے نقل کیا ہے تو وہ محتاج سند ہے، اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو بہت سے بہت تقوی ہو سکتا ہے، فتوی نہیں ہو سکتا کہ اس سے استدلال کیا جا سکے اور حکومت جیسی بھی ہو، مگر ہے عوام کی، عوام کا ہر فرد یکساں مستحق ہے اور اس میں مسلمان بھی شامل ہے، حسب حیثیت وہ بھی مستحق ہے اور اسی سے استحقاق ملتا ہے اور لیتا ہے، البتہ عوام میں جو لوگ باثر وبا اقتدار ہیں، سمجھدار وسلیقہ مند ہیں ان پر ان کی حیثیت کے اعتبار سے اس بات کی سعی لازم ہے کہ دیکھتے رہیں کہ حالات کیسے بن رہے ہیں جس کا ذکر سوال میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مدارس عربیہ میں آمدہ رقوم اور ان پر زکوۃ کا شرعی حکم؟

۱-مدارس عربیہ میں صدقاتِ واجبہ اور عطیات کی رقم جو جمع ہوتی ہے، اس پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ واجب

ہوگی یا نہیں؟ نیز یہ رقم معطی کی ملک سے خارج ہوتی ہے یا معطی کی ملک شمار ہوتی ہے؟ اس میں تین صورتیں متصور ہوسکتی ہیں:

(الف) معطی کی ملک باقی ہو، جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں بھی لکھا ہے، لیکن اس پر مندرجہ ذیل اشکالات ہیں:

۱- حولانِ حول کے بعد عطیات کی رقوم پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے مگر اس کی ادائے گی کی کیا صورت ہوگی جب کے ان کے مالکوں کا کچھ علم نہیں؟ اس لیے کہ اولاً تو چندہ دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے، جن میں سے بیشتر کا پتہ لگانا مشکل ہے، پھر چندہ کی رقم ایک جگہ جمع ہوتی ہے اور حسب موقع خرچ ہوتی رہتی ہے، اس صورت میں یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس میں کس شخص کی کتنی رقم ہے، کسی نے پچاس برس پہلے رقم دی تو اب تک اس کی بھی شرکت چلی آتی ہے اور آئندہ بھی یہ شرکت جاری رہے گی۔

(ب) چندہ دینے والوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو اس کے چندہ کی رقم اس کے ترکہ میں داخل ہوگی، اس لیے اداء وصیت وقرض اور وارثوں کے حقوق اس سے متعلق ہوں گے۔ وارثوں میں مجنون اور نابالغ بھی ہو سکتے ہیں جو ابر وتبرع کے اہل نہیں ہیں، پس اس رقم کو واپس کرنا ضروری ہوگا اور یہ نمبر الف کی وجوہ سے ناممکن ہے۔

۲- مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہو، اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں:

۳- طلبہ ان رقوم کے مالک ہوں گے، اس لیے جب وہ چاہیں مہتمم (وکیل) کو برطرف کردیں اور اپنی رقوم کا مطالبہ کردیں۔

۲- اگر کسی طالب علم کا انتقال ہوجائے تو اس کے ورثاء اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

۳- جب مدرسہ میں اتنی رقم جمع ہوجائے کہ ہر طالب علم کا حصہ بقدر نصاب پہنچ جائے تو مہتمم کے لیے اس سے مزید رقم وصول کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ خود طالب علم پر زکوٰۃ فرض ہوجائیگی۔

۴- رقوم چندہ کو بیت المال پر قیاس کر کے یوں کہا جائے کہ یہ معطی کی ملک سے خارج ہوگئی مگر کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوگی، لیکن بیت المال میں حاکم کی ولایت جبریہ عامہ ہوتی ہے اور مہتمم کو وکالت اختیاریہ حاصل ہے، اس لیے یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو مدِ زکوٰۃ میں تملیک ضروری نہیں رہے گی؟

احتشام الحق سیلابادی (مدرسہ اشرف المدارس ناظم آباد کراچی)

الجواب وبالله التوفيق:

پیش آمدہ مسئلہ کو احقر اس طرح سمجھے ہوئے ہے کہ مہتممین مدارس نہ تو محض معطیین کے من کل الوجوہ نائب اور وکیل ہوتے ہیں کہ نمبر ایک کی شق پر عائد شدہ اشکالات وارد ہیں، اور نہ یہ مہتممین مدارس محض فی الحال داخل شدہ مستحق طلباء کے وکیل ونائب ہوتے ہیں کہ نمبر ۲ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ یہ مہتممین مدارس من کل الوجوہ عمال بیت المال کے مثل ہوتے ہیں، اور نہ مدارس میں داخل شدہ کل رقوم من کل الوجوہ رقوم بیت المال کے حکم میں ہوتی ہے کہ ان پر نمبر ۳ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں، بلکہ صورت کچھ اور ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے کے لیے پہلے ان داخل شدہ رقوم کی حیثیت ونوعیت معلوم ومتعین کرلینا ضروری ہے، سو عرض ہے کہ مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں:

۱-رقوم عطیات، ہدایا، وصدقات نافلہ وغیرہ یعنی وہ رقوم واجب التملیک نہیں ہوتیں۔

۲-رقوم زکوۃ ونذر وکفارہ وغیرہ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک ہوتی ہیں۔

۳-وہ رقم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے متعین کر کے دیتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ اس رقم سے فلاں کمرہ بنوا دینا، یا ٹائل لگوا دینا، یا فرش بنوا دینا وغیرہ۔

تفصیل حکم رقوم:

۳-یعنی وہ رقم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے نامزد کر کے دیتا ہے، مثلاً کوئی خاص کمرہ بنوانے کے لیے وغیرہ وغیرہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتمم مدارس محض معطی کے وکیل ونائب ہوتے ہیں، اور یہ رقم ملک معطی سے خارج نہیں ہوتی بلکہ جب تک یہ رقم موجود رہتی ہے بحکم امانت رہتی ہے اور معطی کو اختیار رہتا ہے کہ جب چاہے اس توکیل کو ختم کر دے اور اپنی رقم واپس لے لے اور جب حسب ہدایتِ معطی خرچ ہو جاتی ہے تو ملک معطی پر خرچ ہوتی ہے، غرض اس صورت میں محض معطی مالک رہتا ہے، پس مملوکیت کے تمام احکام (مثلاً حق تصرف للمعطی اور بعد ممات معطی ترکہ ووراثت وغیرہ سب احکام اس پر نافذ ولاگو ہوں گے اور اسی وجہ سے اس قسم کی رقوم کو خلط واستہلاک سے بچانے کے لیے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت ومنشاء معطی کے موافق خرچ کرنا لازم رہتا ہے، اور اگر الگ الگ رکھنے میں دشواری ہو تو قرض کی صورت میں منتقل کرالینا ضروری ہوتا ہے، اور خلط واستہلاک کی صورت میں ضمان عائد ہوتا ہے۔

(وهذه الاحكام كلها ظاهرة في الفقه)

تفصیل حکم رقوم:

۲-رقوم نمبر ۲: یعنی رقوم زکوۃ وغیرہ جو واجب التملیک ہوتی ہیں ان رقوم میں مہتممین مدارس اور حسب ضابطہ مدرسہ ان کے نواب بھی معطی کے من وجہ وکیل ہوتے ہیں، اس لیے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق نہیں ہوگا، اور اسی وجہ سے تملیک طلبہ یا تملیک مستحق زکوۃ ضروری رہتی ہے، بغیر اس تملیک کے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا، اور خلط واستہلاک سے بچنے کے لیے ان رقوم کو غیر واجبۃ التملیک رقوم سے مستقل طور پر الگ رکھنا چاہیے، نیز ان رقوم میں یہ لوگ ان طلبہ کے جو فی الحال مدرسہ میں موجود ہیں اور ان طلبہ کے جو آئندہ داخل ہونے والے ہیں، یا ان مستحقین زکوۃ کے جو مدرسہ میں فی الحال موجود ہیں اور ان مستحقین زکوۃ کے جو آئندہ مدرسہ میں رہنے والے ہوں اگر چہ یہ لوگ مجہول الذات والکمیۃ ہوں، ان سب کے بھی وکیل ونائب ہوتے ہیں اور اس جہت کے اعتبار سے چونکہ حق مستحق بھی متعلق ہو جاتا ہے، اس لیے ان رقوم کو دیدینے کے بعد معطین واپس بھی نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولانِ حول کے بعد پھر کبھی زکوۃ واجب ہوگی، اور نہ مقدار کثیر ہونے پر مزید حاصل کرنے کو نا جائز کہہ سکیں گے، اور نہ کوئی مستحق غنی کہلائے گا اور نہ وہ اشکالات عائد ہوں گے جو سوال میں مذکور ہیں۔

اس جواب کی فی الجملہ تائید حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے، جو (فتاویٰ اشرفیہ موسوم بہ فتاویٰ امدادیہ، ج ۴ ص ۲۱۸) قدیم میں مذکور ہے:

اور وہ یہ ہے کہ عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ اس میں زکوۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں، انتہی بلفظہٖ

ایک شبہ کا ازالہ:

مستحقین طلبہ میں یہ توسیع وتعمیم اس لیے ہوگی کہ مدارسِ دینیہ عربیہ محض چھ سال یا چھ ماہ کے لیے قائم نہیں کیے جاتے، بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے بغرض احیاء دین وعلم دین قائم ہوتے ہیں، **كما هو مقتضاء جميع الاوقاف** (کالمساجد والرباطات وغیرہ اور مدارس میں) ان رقوم کو دینے والے بھی اسی نیت وتصور سے دیتے ہیں، لہذا رہتی دنیا تک کے مستحقین زکوۃ فی الجملہ ضمناً وتبعاً مقصود ومراد ہو جائیں گے، اور یہ استحقاق ان کے مجہول الذوات والکمیۃ ہونے کے باوجود ان سے متعلق ہو جائے گا، پھر معطین بھی مختلف طرح کے ہوتے ہیں، بعض تو طلبہ پر خرچ کی تشریح کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض بغیر اس کے دیتے ہیں، بلکہ بعض تو یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ زکوۃ کا روپیہ ہم مدرسہ کے کام کے لیے دیتے ہیں، اور یہ

جانتے ہوئے دیتے ہیں کہ اس مدرسہ میں فی الحال نادار طلبہ کو کھانا کپڑا نہیں ملتا، پس اس جملہ کی تصریح اور شرعی توجیہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ تملیک شرعی کے ذریعہ اس رقم سے مدرسہ کا کام کیا جائے، اور جب مدرسہ میں طلبہ نادار نہ ہوں تو لامحالہ کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے تملیک کرا کر کسی مصرف مدرسہ میں رقم صرف ہو سکے گی اور عاقل بالغ کے کلام کا محمل حسن پر مہما امکن حمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، پس اگر معطی نے یہ کہہ کر دیا کہ یہ رقم ضروریات طلباء پر خرچ کے لیے ہے تو جب تو اس پر تملیک طلباء ملحوظ رہنا ضروری ہوگا، اور اگر مطلقاً بلا لحاظ تعیین طلبہ دیا ہے تو مدرسہ کے کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرالینا کافی ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں اور اگر کسی ملازم مدرسہ کو جو مستحق زکوٰۃ و نادار بھی ہے اور مصلحت شرعی ہو تو ارکین مدرسہ کے مشورہ سے اجرت و تنخواہ قرار دیئے بغیر محض بطور صدقہ کے اس رقم سے اس کی کچھ مدد کر دینا بھی جائز رہے گا، اسی لیے مصرف کی ان دونوں شکلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی رقوم کو بھی الگ الگ رکھنا بہتر ہوگا، تا کہ وہ رقوم بوجہ اتم معطی کی ہدایت و منشاء کے مطابق صرف ہو سکیں۔

تفصیل حکم رقوم:

(ا) یعنی رقوم عطیات وغیرہ جو غیر واجب التملیک ہوتی ہیں، ان رقوم کے بارے میں بھی مہتممین مدارس اور ان کے نواب وکیل و نائب ہوتے ہیں، البتہ اس کی نوعیت واحکام میں کچھ فرق ہوتا ہے:

مثلاً رقوم نمبر ۲ (واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط ہوتی ہے، اور ان رقوم (غیر واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط نہیں ہوتی ہے، لیکن ارباب حل وعقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدود شرع میں رہتے ہوئے مقرر و متعین ہوتا ہے، صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے، اور اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں یا ہوں، مگر کسی خرچ کے بارہ میں کوئی واضح ضابطہ نہ ملے تو ادارہ کے سابق اہل علم و دیانت و ذمہ داروں کا معمول واجب الاتباع رہتا ہے، اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دیگر ایسے ہی مدارس اور اداروں کا معمول دیکھا جائے گا اور اس کی اتباع کی جائے گی، مہتمم یا عملہ مدارس خودرائی نہیں کر سکتے ہیں، **كما هو ظاهر وباهر من فتوى الأكابر**۔

اور مثلاً رقوم ۲ میں مہتممین مدارس اولاً صرف معطیین و آخذین کے وکیل و نائب ہوتے ہیں، پھر بعد تملیک شرعی کے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل و نائب ہو جاتے ہیں اور رقوم ۱ میں شروع ہی سے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل و نائب ہوتے ہیں، اس لیے کہ مہتممین ارباب حل وعقد کے انتخاب سے امیر و نائب ہوتا ہے، یا ارباب حل وعقد نہ ہوں تو جس خطہ کا یہ مدرسہ ہے، اس خطہ کے بااثر سمجھ دار، ذمہ دار مسلمانوں کا امیر نائب یا نمائندہ ہوتا ہے

اور سلطان کے ایک خاص وصف (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کے قائم مقام ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا تراضی مسلمین سے اس منصب سے سلطان وابستہ ہے کما ھو مبرھن فی مقامہ تو پھر اس کے قائم مقام کا نصب کیوں نہ ان سے وابستہ ہوگا، ضرور ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اور قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت کے اقامت وتحقیق میں شبہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ سلطان میں دو وصف ہوتے ہیں: ایک وصف (حکومت وسلطنت) جس کا ثمرہ سد ثغور وتنفیذ حدود وقصاص وغیرہ اعمال ہیں اور اس میں قوت قہریہ شرط ہے، اس میں تو کوئی بغیر اس قوت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسرا وصف وہ محض انتظام حقوق عامہ ہے جس کے لیے قوت قہریہ شرط نہیں ہوتی، اس وصف میں بغیر قوت قہریہ کے بھی نیابت ہو سکتی ہے، (ھکذا فی امداد الفتاوی (ص ۱۲۲ ج ۲ قدیم)) اور یہ مالی انتظام مدارس اسی قبیل سے ہے، جو بغیر قوت قہریہ کے بھی محض آپس کی مصالحت ورضامندی سے بھی قائم و درست ہو سکتا ہے، لہٰذا قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت (مالی انتظام مدارس) کے اقامت وتحقق میں فتور واقع نہ ہوگا، چنانچہ اقامتِ جمعہ واعیاد کے انتظام میں یہ نیابت امیر تسلیم ورائج ہے اور اسی پر وجوب جمعہ واعیاد وغیرہ ہمارے مسلک میں دائر ہے اور ان کے تحقق واقامت میں کوئی فتور واقع نہیں ہوگا، پھر جب یہ انتظام حقوق عامہ دنیوی امور سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور اس کے درست ومنتظم رکھنے میں یہ نیابت سلطان جائز ہو سکتی ہے، تو مالی امداد انتظام مدارس کے لیے جو خالص امر دینی ہے درست ومنتظم رکھنے کے لیے (یعنی احیاء دین واحیاء علم دین اور اس کے ابقاء وتحفظ کے لیے) ہے، اور جو سب سے مقدم فریضہ ہے اور اہم الواجبات میں سے ہے اس میں یہ نیابت کیوں جائز و درست نہ ہوگی، بدرجہ اولیٰ جائز و درست ہوگی، بالخصوص جب کہ یہ مالی انتظام مدارس ملاک اور مستحقین کی رضا ورغبت سے بھی ہوگا اور جب مہتمم مدرسہ سلطان کے وصف ثانی (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کا قائم مقام ہوگا تو عملہ مدرسہ، عمال بیت المال کے مثل ہوں گے، اور یہ رقوم قسم ثانی کی (رقوم غیر واجب التملیک) جب برضاء ورغبت من جانب ملاک داخل ہو جائیں گی تو یہ رقوم اموال بیت المال کے مثل ہو جائیں گی، اور اگرچہ یہ رقوم وقف شمار نہیں ہوں گی، مگر بحق مدرسہ محبوس ضرور ہو جائیں گی، اس لیے کہ بغیر اس جنس کے یہ انتظام امر دینی فی زمانہ قائم ومنظم نہیں ہو سکتا، حالانکہ اس کا قائم ومنتظم رکھنا سب پر حسب استطاعت واجب ہے، اور واجب کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے، اس لیے یہ جنس بھی واجب ہوگا، اور چونکہ رہتی دنیا تک کے لیے یہ نظم قائم ومنتظم ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے (نمبر ۲ کے جواب میں) کہہ آئے ہیں، اس لیے

ان کو واپس لینے کا بھی حق کسی کو حاصل نہ ہوگا، خود معطیین کو بھی حق نہ ہوگا، اس لیے کہ اس سے جس واجب میں جو مقصود اولی ہے فتور واقع ہوجانے کا ظن غالب متصور ہے۔

اسی طرح ان رقوم کی فی الحال مقدار کثیر جمع ہوجانے کے بعد مزید رقوم کا استحصال بھی ممنوع نہ ہوگا۔

اس لیے کہ جب یہ نظم رہتی دنیا تک کے لیے واجب ہے تو آئندہ ان رقوم کثیر کے مصرف کا وجود بھی بظن غالب مظنون ہے، اسی طرح حولان حول پر ان رقوم میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ بیت المال کی رقوم کا یہی حکم ہے، نیز اس لیے کہ اس حبس دائمی کی وجہ سے ملاک کا تصرف مالکانہ منقطع ہوجاتا ہے اور ادائے گی زکوٰۃ کا حکم اسی تصرف مالکانہ کے قبیل سے ہے، لہٰذا وہ بھی منقطع ہوجائے گا، اسی طرح ولایت عامہ جبریہ سے بھی اشکال نہ ہوگا، کیونکہ ولایت عامہ جبریہ سلطان کے وصف اول یعنی حکومت وسلطنت (جس کا ثمرہ سد ثغور وقوۃ تنفیذ وغیرہ ہوتا ہے) سے متعلق ہے اور یہ نیابت (مالی انتظام مدارس) محض وصف ثانی انتظام حقوق عامہ سے متعلق ہے، اور یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوٰۃ کا مصرف:

۱-زکوٰۃ کا صحیح مصرف کیا ہے؟

ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک شرط ہے:

۲-زکوۃ کے مستحقین کو زکوٰۃ کی رقم یا دیگر اشیاء کا مالک بنادینا زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ہے یا نہیں؟

انجمن یا سوسائٹی پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنا:

۳-زکوٰۃ کی رقم کسی انجمن یا سوسائٹی پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ وہ انجمن یا سوسائٹی ہر مسلمان کی فلاح وبہبود کے لیے بنائی گئی ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شاہ قطب مصریؒ کے بھائی سید محمد قطب کی تصنیف ''شبہات حول الاسلام'' کا جو اردو ترجمہ کیا گیا ہے، اس کی عبارت نقل کی جارہی ہے:

اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر مستحق لوگوں کو خود جاکر نقد یا جنس کی صورت میں زکوۃ وصول کرنے کو روا رکھا تھا۔

مگر یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کے نزدیک زکوٰۃ کی تقسیم کا یہی واحد طریقہ ہے کہ مستحقین خود جا کر زکوٰۃ وصول کرتے پھریں اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں اختیار کیا جا سکتا، اسلامی قانون میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس سے ایسا نتیجہ نکالا جا سکے، اسلام زکوٰۃ کے روپیہ سے عوامی بہبود کے ادارے مثلاً اسکول، اسپتال قائم کرنے سے نہیں روکتا اور نہ اس کو اس کے روپیہ سے امداد باہمی، انجمنوں اور کارخانوں کی تعمیر پر ہی کوئی اعتراض ہو سکتا ہے، بالفاظ دیگر زکوٰۃ کی رقم سماجی بہبود کے سارے مفید کاموں پر صرف کی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ کے مال سے نقد امداد صرف بیماروں، بوڑھوں اور بچوں کو دی جاتی ہے، لیکن دوسرے تمام لوگوں کی امداد ان کے لئے روزگار فراہم کرنے یا ان کی بھلائی کے کسی منصوبے کی تکمیل کی صورت میں ہو سکتی ہے، کیونکہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں محض زکوٰۃ پر گزارا کرنے والے کسی غریب طبقہ کا کوئی مستقل وجود نہیں پایا جاتا، اسی طرح زکوٰۃ اسلامی ریاست کو بھی مختلف اجتماعی منصوبوں اور اسکیموں کی تکمیل کے لئے دی جا سکتی ہے۔

اسپتال اور اسکول پر زکوۃ کی رقم صرف کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

مولوی لال محمد قاسمی (سلطنت عمان)

الجواب وبالله التوفيق؟

۱، ۲- نماز، روزہ اور حج کی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے، صاحب نصاب پر زکوۃ کی ادائیگی فرض ہے، "**الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا تاما وحال عليه الحول**"(۱)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے مستحقین کو خود بنص صریح منصوص فرمایا ہے اور صیغۂ حصر کے ساتھ بتلا دیا ہے ارشاد ہے:

"**إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله ان الله عليم حكيم**"(۲) صیغۂ حصر: "**إنما الصدقات للفقراء**" کا مفہوم یہی ہے کہ "**ليست الصدقات إلا للفقراء والمساكين**" الخ اور لام تملیک کا ہے، یعنی ادائے گی زکوۃ و صدقات نہیں درست ہوگی مگر ان ہی مذکورین کو دے کر مالک بنانے سے ادا ہوگی کسی اور کے دینے سے

۱- ہدایہ ۱/ ۱۸۵۔

۲- سورۂ توبہ: ۶۰۔

ادا نہ ہوگی اور اگر لام استحقاق کے لیے لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ زکوۃ وصدقات واجبہ کے مستحق صرف یہی مذکورین ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہے، کسی اور کو دے دینا یا کسی اور جگہ خرچ کردینا، غیر مستحق کو دے دینا اور غیر مستحق پر خرچ کردینا ہوگا، جو حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہوگی، ذمہ سے بری نہ ہوگا، معتبر کتب تفسیر میں اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر لام کو انتفاع کے لئے جائے جب بھی یہی مفہوم ہوگا کہ زکوۃ وصدقات واجبہ صرف ان ہی مذکورین کی نفع رسانی کے لئے ہیں اور اگر ان کی نفع رسانی کے بجائے اور ان کی نفع رسانی کردی گئی یا کسی اور جگہ خرچ کردیئے گئے تو حکم خداوندی کی تعمیل نہ ہوگی بلکہ حکم خداوندی کی نافرمانی اور مخالفت ہوگی کسی اور کی نفع رسانی مقصود ہو یا کسی اور کام میں خرچ کی ضرورت ہو تو زکوۃ وصدقات واجبہ کے علاوہ اپنے دوسرے اموال سے نفع پہونچاؤ اور دوسرے اموال جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھے ہیں ان سے خرچ کرو چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تفسیر "فتح القدیر" میں فرماتے ہیں: "**إنما من صيغ القصر وتعريف الصدقات للجنس أي جنس هذه الصدقات مقصور على هذه الأصناف المذكورة لايتجاوزها، بل هي لهم لالغيرهم**" (۱)۔

کلمہ انما حصر کے صیغوں میں سے ہے اور لفظ الصدقات کا معرف بلام لاما جنس کے لئے یعنی ان تمام صدقات واجبہ کی پوری جنس مقصود ومحصور ہے صرف ان مذکورہ صیغوں پر ان سے متجاوز نہیں ہوسکتی۔

بلکہ یہ صدقات واجبہ صرف ان مذکورین کے لئے ہیں ان کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہیں اور جب لام تملیک کا ہے تو ان مذکورین کو مالک بنادینا لازم ہوگا یہ مالک ہوکر پھر جہاں چاہیں اور جس مصرف میں چاہیں صرف کرسکتے ہیں۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر علماء احناف تملیک مستحق صحت ادا کے لئے شرط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر تملیک مستحق کے ادائیگی صحیح نہ ہوگی اور ذمہ بری نہ ہوگا (۲)۔

مذکورہ بالا تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ انجمن یا سوسائٹی پر خود ارباب اموال ان صدقات واجبہ کو خرچ نہیں کرسکتے کیونکہ تملیک مستحق نہ ہوگی ہاں یہ مستحقین مالک ہوجانے کے بعد پھر خود اپنی ہی مرضی سے ان انجمنوں، سوسائٹیوں کے لئے دیدیں تو خرچ کرسکتے ہیں ذخیرۂ حدیث سے بھی ان مذکورہ بالا مفہوم ومقصود کی تائید وتصویب ملتی ہے اور آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ وقتی حکم دیا ہو۔

۱- تفسیر فتح القدیر للشوکانی ۲/۵۲۱، طبع دارالحدیث القاہرہ) (مرتب)۔

۲- "هي تمليك جزء مال فلو أطعم يتيماً ناويا الزكوة لايجزيه" (جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر) (الدرالمختار مع الشامی ص ۲ کتاب الزکوۃ)۔

پس شاہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی محمد قطب کے مضمون کا بھی حال معلوم ہوگیا کہ وہ ان کی ذاتی رائے ہے جو جمہور مفسرین ومحدثین وفقہاء کی رائے کے خلاف ہے، جمہور محدثین وفقہاء بھی عوامی بہبود کے اداروں و قائم کرنے سے نہیں روکتے بلکہ وہ قائم کرنے کا حکم دیتے ہیں، بلکہ حسب موقع ضروری قرار دیتے ہیں، البتہ طریقِ کار کی تصحیح کر دینا چاہتے ہیں تاکہ حدود شرع سے تجاوز نہ ہو پس اگر حکومت ان کاموں کو جو عوامی فلاح وبہبود کے لئے ہوں کرے تو وہ بھی باقاعدہ شرع کے مطابق کرے اور اگر عوام کرنا چاہیں تو وہ بھی حدود شرع کے مطابق کریں پس اگر عوام خود کرنا چاہیں تو صدقاتِ نافلہ سے ان کاموں کو کریں اور اگر حالات ناگزیر ہو جائیں اور صدقاتِ واجبہ کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہے تو اس طرح کریں کہ رقوم پر تملیک مستحق آجائے یا تملیک مستحق کے بعد کریں مثلاً مستحق اس کا مالک ہو کر پھر ان ہی کام کرنے والوں کو بطور عطیہ ان کاموں کے لئے دے دے یا ان کا وکیل بنا دے وغیرہ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ کی رقم نسواں اسکول پر خرچ کرنا:

زکوۃ کا پیسہ نسواں اسکول پر خرچ کرنا درست ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جو لڑکیاں غریب و نادار مستحق زکوۃ ہوں ان کے کھانے کپڑے پر خرچ کرنا درست ہے اور اس کے علاوہ تنخواہ ملازمین پر تملیک مستحق سے قبل خرچ کرنا درست نہیں، **"انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم الخ"**(۲)، **"أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمر بفعل هذه الأشياء"** (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۴/ ۱۴۰۴ھ

۱- "وقلنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (شامی ۲/ ۶۳ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

۲- سورۂ توبہ: ۶۰۔

۳- شامی ۲/ ۸۶، عثمانیہ۔

باب العشر

ہندوستان کی زمین اس وقت عشری ہیں یا خراجی؟

ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟ بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ ہندوستان کی زمینیں موجودہ دور میں نہ عشری ہیں اور نہ خراجی، آیا کہ یہ قول صحیح ہے یا نہیں بصورت صحت تحریر فرمائیں کہ وہ کونسی بنیادیں ہیں جن کے سبب آج ہندوستان کی زمینوں کو عشری اور خراجی ہونے سے خارج کر دیا گیا ہے، جبکہ بڑے بڑے سے پہلے فتاویٰ میں ہندوستان کی زمینوں کے عشری ہونے کا حکم متعدد علماء و مفتیان کرام سے موجود ہے، مثلاً مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مفتی کفایت اللہ صاحب و مفتیان دار العلوم دیوبند، مزید برآں عشر و زکوٰۃ کی فرضیت مطلقاً قرآن و حدیث و فقہاء حنفیہ سے ثابت ہے جس میں دار الحرب و دار الاسلام کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ہندوستان کی وہ زمینیں جنہیں سیر دھری یا کاشتکاری کہا جاتا ہے، جن میں ہندوستانی قانون کے مطابق خرید و فروخت، تعمیر، گڈھا کنواں وغیرہ کھدوانا ممنوع ہے، بیس گنا جمع کرنے کے بعد مکمل تصرفات کے اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ میراث میں داخل ہو کر شرعی طور پر تقسیم ہوں گی یا کیا حکم ہوگا؟ کیا صاحب زمین کے انتقال کے بعد وہ ترکہ ہو کر وارثوں کا حق بن جائیں گی، جبکہ حکومت ہند ان میں وراثت جاری کرتی ہے، لیکن بھومیدھر زمین و سیر دھر زمین کے وارثوں میں فرق کیا گیا ہے، مثلاً سیر دھری لڑکی نہیں پا سکتی، بلکہ صرف لڑکے اس کے مستحق ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

خاتمہ زمینداری میں جن زمینوں کو حکومت نے اپنے قبضہ تصرف میں لے لیا اور ملکیت مالکان کو ختم کر دیا وہ مالکوں کی ملک سے نکل کر حکومت کی ملک میں داخل ہوگئیں، اور وہ زمین چاہے پہلے عشری رہی ہوں، لیکن اب عشری باقی نہیں ہیں،

اس لئے کہ عشریت باقی رہنے کے لئے شرط ہے کہ زمین کبھی ملکیت غیر مسلم میں نہ جائیں، پھر ان زمینوں میں جس زمین کو حکومت نے بیس گنا وغیرہ لیکر اپنے قاعدہ وضابطہ کے تحت قابضین کی ملک میں دے دیا اور اس پر ان کو حق مالکان دے دیا اس زمین کے وہ قابضین مالک ہو گئے، ان میں وراثت حسب تخریج شرعی جاری ہوگی اور یہ زمینیں خراجی ہوں گی، جبکہ خراجی زمین میں عشر واجب نہیں ہے، اور جن زمینوں پر حق مالکانہ نہیں دیا وہ ملک حکومت میں باقی رہیں ان کو حکومت جس کو جس طرح چاہے دے اس کے اختیار میں ہے، اس میں وراثت شرعی جاری نہ ہوگی، اس کی مثال سیر دھری کی زمینیں ہیں اور یہ زمینیں نہ خراجی ہیں اور نہ عشری، بلکہ اراضی محوزہ سلطانیہ کے درجہ میں ہیں، اور ان زمینوں کی پیداوار میں سے عشر نکالنا ضروری نہ رہے گا اور جن زمینوں کا زمیندار نہیں ٹوٹا اور حکومت نے ان کو اپنے قبضۂ تصرف میں نہیں لیا، جیسے باغ مالکان اور مکان کی زمینیں اگر یہ عشری ہیں اور خاتمۂ زمیندار کے قانون سے مستثنیٰ ہیں تو یہ عشری شمار ہوں گی اور ان کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا، نیز جن زمینوں کی عشریت خاتمہ زمیندارہ قانون سے ختم ہوگئی ان سے محض وجوب ساقط ہوا ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ بغرض حصول خیر وبرکت جہاں تک ہو سکے عشر ونصف عشر نکالتے رہا جائے۔ اس قسم کے مباحث "باب الرکاز" (۱) اور "باب العشر والخراج" (۲) میں بھی کافی مل جائیں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زمین کی زکوٰۃ کا شرعی حکم:

اگر کوئی شخص ہندوستان میں کاشت کی زمین کی ہی خرید وفروخت کا کاروبار کرنے لگے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ نیز اس صورت میں اس کی پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہونے نہ ہونے کا کیا حکم رہے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب زمین ہی کے خرید وفروخت کا کاروبار کرے گا تو یہ زمین سامانِ تجارت میں شمار ہوگی حکماً مالِ نامی قرار پائے گی اور مالِ نامی کا حکم اس پر جاری ہو جائے گا اور وہ حکم یہ ہے کہ اس زمین کی قیمت جب مقدارِ نصاب کے برابر ہو جائے

۱- شامی ۲/ ۔
۲- شامی ۳/ ۔

اور سال بھر مقدار نصاب باقی رہے تو اس کی کل قیمت کا چالیسواں حصہ زکوۃ اموال کے ضابطوں کے مطابق زکوۃ نکالنا ہوگا اور جب خود زمین کی تجارت نہ کرے گا تو اس کی پیداوار پر حکم جاری ہوگا کہ وہ زمین عشری ہو اور بارش کے پانی سے پیداوار ہو تو کل پیداوار کا دسواں حصہ، ورنہ بیسواں حصہ نکالا جائے، "**عن سالم بن عبدالله بن أبيه عن النبي ﷺ قال فيما سقت السماء والعيون أوعشرما العشر وماسقي بالنضح نصف العشر**" (۱)، اور اس کے مستحق صرف غرباء اور مساکین ہوں گے اور ان کے علاوہ کسی اور کام میں جیسے مساجد وغیرہ میں بھی دینا درست نہ ہوگا، "**ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا اباحه لا يصرف إلى بناء نحومسجد ولا إلى كفن ميت وقضاء دينه**" (۲)، اور اگر وہ زمین نہ عشری ہو نہ خراجی، جیسا کہ آج کل خاتمۂ زمیندارہ کے بعد ہندوستان کی زمین کہ یہ سب اراضی محوزہ سلطانیہ کے قبیل کی ہوگی ان میں عشر کچھ بھی نکالنا واجب نہیں، البتہ زیادہ سے زیادہ جتنا ہو سکے بطور صدقہ نافلہ نکالتا رہے کہ یہ باعث خیر و برکت رہے گا اور اس کی رقم کو مسجد میں و غرباء، تجہیز و تکفین اور ہر نیک مصرف میں صرف کرنا جائز و درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۶/۱۴۱۱ھ

ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی:

آراضی ہندوستان نہ عشری ہیں نہ خراجی معلوم یہ کرنا ہے۔

الف: کون سی زمین کل یا بعض، آزادی سے قبل جو اسلامی دور رہا ہے اور موروثی زمینیں بھی جو ترکہ میں ملتی آرہی ہیں وہ یا (ب) غیر مسلم سے خریدی ہوئی یا مسلمان سے بھی خریدی ہوئی۔

کیا زمین کی تمام پیداوار میں عشر ہے؟

(ج) عشر دسواں نصف عشر بیسواں بارانی غیر بارانی مختلف پیداوار پر جو کہ سال میں تین فصلوں میں چار یا پانچ قسم کی پیداوار ہے ایک بار یا ہر فصل میں، جب عشر ہے تو کیا تمام پیداوار پر خواہ گھر کے کھانے کے لئے کی گئی ہے یا جو برائے فروخت ہو اس میں دی جائے گی پھر عشر کی کیا رہی یا زکوۃ کی عشر اور زکوۃ ایک معلوم کریں (اصل میں اسی طرح ہے جملے غیر

۱- صحیح بخاری ۱/۲۰۰۔

۲- الدرالمختار ۳/۲۹۱۔

واضح ہیں) یاعشر الگ نوع ہے اور زکوۃ الگ نوع۔

کن فصلوں میں عشر واجب ہے اور کتنا؟

(۲) اگر عشر یا زکوۃ پیداوار پر ہے تو مصرف کا طریقہ اور صاحب مصرف کی تفصیل معلوم کریں عشر یا زکوۃ کی مقدار کتنی ہے معلوم کریں اور کن کن فصلوں میں کتنی ہے۔ کپاس، مونگ پھلی، گیہوں، جوار، مکا، مرچی، تلی، رائی۔

عشر یا زکوۃ تمام پیداوار پر ہے یا تمام مصارف کو علیحدہ کر کے مثلاً تخم ملنا بونا صفائی پانی دینا (یا غیر پانی) اور دیگر اخراجات کے جو خرچ ہوئے وہ فصل سے خرچ نکال کر تفصیل سے معلوم کریں، تاکہ ہم کو پریشانی نہ ہو۔

احمد علی و محمد علی (پر فیومری سٹیمار وڈ پوسٹ کھرگون-ایم، پی)

الجواب وبالله التوفيق:

(الف، ب، ج) جن مقامات کی زمینداری توڑ کر حکومت نے اراضیات کاشت کو اپنی ملک قرار دے کر پھر اپنے قانون کے مطابق لوگوں میں زمین تقسیم کی کسی کو بھومیدار کسی کو بنا دیا وہ زمین نہ تو عشری باقی رہی نہ خراجی، بلکہ وہ اراضی اراضیات محوزی سلطانیہ میں داخل ہو گئیں، باقی چونکہ یہ حالات اپنے ہی بداعمالیوں کی نحوست سے پیش آتے ہیں، اس لئے جہاں تک ہو سکے دسواں یا بیسواں حصہ بطور صدقہ نکالتا رہے کہ یہ موجب خیر و برکت رہے گا۔

عشری زمین وہ کہلاتی ہے جس کے باشندے خود مسلمان ہو گئے یا مسلمان بادشاہ نے جہاد کر کے فتح کیا، اور مسلمانوں پر تقسیم کیا اور عرب کی ساری زمین عشری کہلاتی ہے بشرطیکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ملک میں رہے اور جو زمین ایسی نہ ہو اور نہ حکومت نے اپنی یا اپنے بیت المال کی زمین اس کو قرار دیا ہو وہ خراجی کہلاتی ہے اور جس زمین کو حکومت نے اپنی ملک یا اپنے بیت المال کی ملک قرار دے لیا ہے اراضی محوزی سلطانیہ کہلاتی ہے (۱)۔

۱- (درمختار مع رد المحتار ج۲) (أرض العرب وهي من حد الشام والكوفة إلى أقصى اليمن، وما أسلم أهله طوعاً أو فتح عنوة وقسم بين جيشنا والبصرة أيضاً بإجماع الصحابة عشرية ...... وما فتح عنوة ولم يقسم بين جيشنا إلا مكة سواء أقر أهله عليه أو نقل إليه كفار أخر أو فتح صلحاً خراجية ...... وفي الفتح: المأخوذ الآن من أراضي مصر أجرة لا خراج (درمختار ۶/ ۲۸۹تا ۲۹۴) اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: قلت: وهذا نوع ثالث: يعني لا عشرية ولا خراجية من الأراضي التي تسمى أرض المملكة وأراضي الحوز، وهو من مات أربابه بلا وارث وآل لبيت المال، أو فتح عنوة وأبقى للمسلمين إلى يوم القيامة (رد المحتار مع درالمختار ۶/ ۲۹۴)۔

(۲) عشر تو تمام پیداوار پر عائد ہوتا ہے خرچ وغیرہ نکالے بغیر عائد ہوتا ہے، "**وآتوا حقه يوم حصاده**" (۱) کے حکم سے اور زکوۃ کا وجوب صرف اموال تجارت میں اور زیوارت اور نقدین میں اسوقت ہوتا ہے جب اپنی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو اور ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے نوٹوں سے فاضل رہ کر سال بھر فاضل رہے ورنہ زکوۃ واجب نہیں ہوتی (۲)، اور عشر ہر قسم کی پیداوار پر اور جملہ پیداوار پر واجب ہوتا ہے (۳)۔

برساتی پانی سے ہونے والی پیداوار پر کل پیداوار کا دسواں حصہ دینا ہوتا ہے ورنہ بیسواں حصہ دینا ہوتا ہے اور جن مالوں میں زکوۃ واجب ہوتی ہے اور اس میں خرچ اخراجات نکالکر سال بھر فاضل رہنے والے مال کا صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱/۱۴۰۱ھ

مالگذاری دینے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوگا، غلہ کی رقم پر زکوۃ:

جس زمین کا خراج مالگذاری دینا پڑتا ہے اس زمین پر عشر ہے یا کہ نہیں ہے اور اگر ہے تو عشر جمیع پیداوار سے نکالا جائے گا یا یہ کہ پہلے مالگذاری پیداوار سے وضع کرلی جائے اس کے بعد باقی ماندہ غلہ میں عشر نکالا جائے جو صورت بھی ہو اچھی طرح واضح فرمایں اکثر علماء کی مختلف بات سن کر مضطرب ہیں ساتھ ہی اس کا انکشاف فرماویں عشر نکالا غلہ فروخت کیا گیا اس کی قیمت مقدار نصاب کو پہنچ جاتی ہے اس پر حولان حول بھی اس قیمت پر جو عشر کے غلہ کو بیچ کر حاصل ہوئی ہے زکوۃ ہوگی یا کہ نہیں جبکہ شرائط وجوب زکوۃ بھی موجود ہیں یا یہ کہ عشر نکالنے کی وجہ سے وہ غلہ کی زکوۃ ساقط ہوجائے گی۔

۱- سورہ انعام: ۱۴۱۔

۲- "وشرط كمال النصاب ولو سائمة في طرفي الحول في الابتداء للانعقاد وفي الانتهاء للوجوب، فلا يضر نقصانه بينهما، فلو هلک كله بطل الحول" (درمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۳۳)۔

۳- "قال أبوحنيفةؒ في قليل ما أخرجته الأرض، وكثيره العشر سواء سقي سيحاً أو سقته السماء إلا القصب والحطب والحشيش..." الخ (ہدایہ ۱/ ۱۸۱) (مرتب)۔

۴- "ونصفه في مسقي غرب ودالية أي يجب نصف العشر في سقي بآلة" (البحرالرائق ۲/ ۴۱۶)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس کا جواب نمبر ا میں گذر چکا ہے اب محض نفس مسئلہ کی تحقیق کے طور پر تبرعاً لکھ دیا جاتا ہے کہ جس زمین کا عشری ہونا یقین کے ساتھ معلوم ہے اس کا عشر پوری پیداوار سے نکال دیا جائے گا۔

سرکاری مالگزاری وضع نہ ہوگی مالگزاری دینے سے نہ تو عشر ساقط ہوتا ہے اور نہ کم اور عشر کے غلہ سے حاصل کردہ رقم پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی بھی ہو بلکہ جو مصرف خود عشر کے غلہ وآمدنی کا تھا وہی اس کے حاصل شدہ قیمت ورقم کا بھی ہوگا (ا)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ہندوستانی اراضی عشری ہیں یا نہیں؟

جب علماء کا متفقہ فیصلہ یا اجماع آراضی ہند کے عشر پر نہیں ہو سکا علماء کا اختلاف ہنوز باقی ہے، علماء کی ایک جماعت آراضی ہند کے عشری اور دوسری غیر عشری کے قائل ہوئی اب اس حالت میں کوئی شخص علماء کی پہلی جماعت کو مقتدا بنا کر اپنے غلوں کا عشر نکالتا ہے تو ایک واجب کی ادائیگی سے سبکدوش ہوتا ہے اور آخرت کے مواخذہ سے چھٹکارا پاتا ہے اور اگر جماعت ثانی کے علماء کو مقتدا بناتا ہے تو اس وقت عشر کا نکالنا از قبیل من واحسان ہوا اس پر ضروری نہیں تھا اب سوال یہ ہے کہ یہاں اگر کوئی شخص اپنی پیداوار کا عشر نہ نکالے تو کیا وہ گنہگار ہوگا یا اس سے تارک واجب کہا جائے گا یا اگر کوئی عشر نکالنے سے انکار کر جائے حیلہ بہانہ کرے تو اس پر نکیر کرنا اس کو مورد طعن وتشنیع بنانا روا ہوگا یا امر تعبدی کے جو دیر شریعت نے جو سزا مقرر کی ہے اس کا وہ سزاوار ہوگا اس مسئلہ کی ایک کڑی اور ہے اور اس پر بھی روشنی ڈالیں جب عشری زمین کا پیدا شدہ غلہ بدون اخراج عشر پاک وحلال نہیں ہوتا ہے چنانچہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنی کتاب ''علم الفقہ'' میں اس کی تصریح کی ہے کہ عشری زمین کا غلہ بدون عشر پاک نہیں ہوتا ہے اس کا کھانا درست نہیں ہے کیا یہی حکم اراضی ہند کی پیداوار میں ہوگا اور جو لوگ یہاں عشر نہیں نکالتے ہیں، ان کے یہاں کھانے پینے سے کلی اجتناب کیا جائے گا یا کچھ اور اپنی بساط بھر مسئلہ کی وضاحت فرماویں۔

ا- ''ویجب فی مسقی سماء أی مطر وسیح کنهر بلا شرط نصاب راجع للکل وبلا شرط بقاء وحولان حول'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۶۵)، ''ولا یأکل من طعام العشر حتی یودی العشر وان أکل ضمن عشره'' (مجمع الفتاوی، الدر المختار ۳/۲۷۴) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندوستان کے زمین کے عشری وغیر عشری ہونے میں سابق علماء کا اختلاف تھا اور بجا تھا بعد ختم زمینداری سب ختم ہو گیا ہے اب کوئی زمین عشری نہیں رہی ہاں اگر کسی مقام کی زمینداری اب بھی باقی ہو تو وہاں وہ اختلاف سابق علماء کا متوجہ رہے گا اور شامی کی ترجیح جو باب الرکاز (۱) میں ہے قابل توجہ رہے گی، اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ عشر ادا کرنا واجب نہ ہوگا اور ادا نہ کرنے میں گنہگار و مجرم بھی کوئی قرار نہ دیا جائے گا، البتہ احتیاطاً خروج عن الاختلاف کی نیت سے نکال دینے میں استحباب ہوگا اسی طرح بعد ختم زمینداری بھی مستحب ہے کہ احتیاطاً نکال دیا کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- شاید اشارہ اس عبارت کی طرف ہے: "ومن أصاب رکازاً وسعه أن یتصدق بخمسه علی المساکین، فإذا اطلع الإمام علی ذلک أمضی له ما صنع، وإن کان محتاجاً إلی جمیع ذلک وسعه أن یمسکه لنفسه وإن تصدق بالخمس علی أهل الحاجة من آبائه وأولاده جاز ذلک، ولیس هذا بمنزلة عشر الخارج من الأرض" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۶۴) (مرتب)۔

باب صدقۃ الفطر

اسکول کالج میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے؟

ایک کالج ہے جس میں صرف انگریزی اور بنگلہ اور ہندی کی تعلیم ہو رہی ہے تو ایسے اسکولوں اور کالج میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے جب کہ وہ ادھار صدقۂ فطر لینے کے لئے تیار ہو اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیے گا کہ زکوۃ کا مال دینا کیسا ہے، تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں گے، دوسری بات یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے اگر مدرسہ میں دینا جائز ہے تو اسکول وکالج میں بھی دینا جائز ہونا چاہئے اور اگر اسکولوں میں دینا نا جائز اور مدرسہ میں جائز ہے تو کیسے تفصیل کیساتھ لکھیں گے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اپنے کالج میں جہاں دینی تعلیم نہیں ہوتی ہے اور نہ کالج سے غریب طلباء کو کھانا ملتا ہے تو اس کالج میں صدقۂ فطر اور مال زکوۃ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ جگہ اس مال کے مصرف کی نہیں ہے، البتہ اگر غریب طلباء کو وظائف کالج کی طرف سے دئے جاتے ہوں تو دینا جائز ہے، لیکن اس رقم کو وظائف میں بھی صرف کرنا ضروری ہوگا، ہاں جن مدرسوں میں دینی تعلیم ہوتی ہے اور غریب طلباء کو کھانا کپڑا بھی ان مدرسوں کی جانب سے ملتا ہے تو ان میں صدقۂ فطر و مال زکوۃ دینا جائز ہے، کیونکہ یہ مدارس غرباء کے کفیل بنے ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ کالج میں صدقات واجبہ مثل صدقۂ فطر و زکوۃ کا مصرف نہیں ہوتا ہے اس لئے وہاں نہیں دینا چاہئے دینی مدارس میں غریب طلباء بھی پڑھتے ہیں جن پر زکوۃ صدقۂ فطر خرچ کیا جاسکتا ہے، اس لئے وہاں دینا جائز ہے (۱)۔

كتبہ محمد نظام الدين اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- "وفي المبسوط: لايجوز دفع الزكاة الى من يملك نصابا الا الى طالب العلم والغازى ومنقطع الحج" (الرد المحتار علی الدر ۳/۲۸۵، مکتبہ زکریا) (مرتب)۔

صدقۂ فطر کا وجوب اور اس کے مصارف:

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے اور کس کو دینا چاہئے، کیا زکوٰۃ اور صدقۂ فطر مسجد میں دے سکتے ہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جس کے پاس ضرورت سے زائد بالکل فاضل چیزیں نصاب کی مقدار موجود ہوں، اس پر صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہوتا ہے(۱)، اور جو شخص زکوٰۃ لینے کا مستحق و مصرف ہو وہی اس کا بھی مستحق و مصرف ہے(۲)، مسجد کے کسی کام میں زکوٰۃ اور فطرہ دینا جائز نہیں ہے(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

صاع کی صحیح مقدار:

فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے صاع کا وزن ۱۰۴۰ درہم لکھا ہے، عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وزن جو کے صاع کا ہے۔ علامہ شامیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ اتنے وزن کے جو سے برتن بھر جائے وہ صاع ہوگا۔ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

پس اگر اس برتن میں گیہوں بھر کر وزن کریں تو جو کے مذکورہ وزن سے یقیناً زیادہ ہوگا، پھر گیہوں بھی مختلف وزن کے ہوتے ہیں، اس لئے اس کے نصف صاع کا صحیح اور یقینی وزن معلوم کرنے کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۴۰ درہم جو وزن کر کے ایک برتن میں بھر لیں پھر اس برتن کو ماش سے بھریں، پھر ان ماش کا وزن کر لیں تو جو وزن آئے گا، گندم میں وہی وزن معتبر سمجھا جائے، کیونکہ گیہوں کی کسی بھی نوع کا وزن ماش سے زیادہ نہیں ہو سکتا (کذا فی الشامیۃ)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ۱۰۴۰ درہم کا حساب سیر اور تولہ سے لگا کر اس وزن کے مطابق گیہوں کا صاع قرار دینے کا جو معمول چلا آرہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

۱- "وهو من له أدنى شئي أى دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة، ومسكين من له لاشئ له على المذهب، لقوله تعالىٰ أومسكينا ذا متربة" (کتاب الزکاۃ الدر المختار علی هامش الشامی ۵۸/۲) (مرتب)۔

۲- "مصرف هذه الصدقة ما هو مصرف الزكوة" (الفتاوی الہندیہ ۱۹۸/۱) (مرتب)۔

۳- "لايصرف أى مال الزكوٰة إلى بناء نحو مسجد، قال الشامي: كبناء القناطير والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد، وكل ما لاتمليك فيه" (شامی ۶۲/۲) (مرتب)۔

یہاں ۷۰ جو کا وزن برقی مشینوں سے کرایا گیا تو ۷-۵۸۱ ۲ رتی ہوا، اس حساب سے نصف صاع ایک سیر ۱/۲ ۶۹ تولہ ہوا، لہذا اتنے جو سے جو برتن بھر گیا اسے گیہوں سے بھر کر وزن کیا تو ۲ سیر ۳۰ تولہ ہوا، اور ماش سے بھرا گیا تو ۲ سیر ۳۶ تولہ ہوا۔

پس تحقیق مذکور کی بناء پر گیہوں سے صدقۃ الفطر ادا کرنے کے لئے ۲ سیر ۳۶ تولہ گیہوں ہونے چاہئیں، تحقیق کرنے سے اس طرح سمجھ میں آیا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت مفتی محمود صاحب علیل ہیں بسلسلۂ علاج باہر تشریف لے گئے، اور یہ گرامی نامہ مع سوال کے احقر کے سپرد فرما گئے کہ تو ہی اس سلسلے میں جواب لکھ دے، اس لئے جرأت سمع خراشی ہے۔ اگر کوئی بات صحیح ادا ہوگئی تو اللہ کا شکر ہے۔ ورنہ معذرت خواہی کے ساتھ حصول فہم سلیم وحصول طبع مستقیم کے لئے دعاء کی درخواست ہے۔

سوال کے متعلق جو بات چند نصوص کی طرف ذہن میں ہے، عرض ہے:

سب سے پہلے ان حسابی تحقیقات وتدقیقات کا شرعی درجہ متعین ومعلوم کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرع شریف میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ آیا صحت ادا کے لئے اس حساب یا کسی حسابی تحقیقات وتدقیات کا اختیار کرنا لازم ہے؟ کیا اس کے بغیر ادائیگی صحیح نہ ہوگی۔ اور فرض ذمہ میں باقی رہ جائے گا یا کچھ اور صورت ہے؟

اس سلسلہ میں چند نصوص کی طرف ذہن رہنمائی کرتا ہے۔

مثلاً: (الف) "نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب" (۱)۔

(ب) "الدين الفطرة" (۲)۔

(ج) "الدين يسر" (۳) وغیر ذلک۔

اس سب کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص حساب، کتاب جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، بدوی ہو یا شہری ہو، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، ہر ایک جب عاقل بالغ غیر معذور مکلّف ہو، تو احکام شرع پر بآسانی عمل کر کے اپنے معبود حقیقی سے اپنا

۱- اس روایت کی تخریج اور حوالہ جات پہلے گذر چکے، دیکھئے: بخاری ومسلم مع النووی باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الہلال ۴/ ۴۰۵۔

۲- عن أبي هريرةؓ "الفطرة خمس أو خمس من الفطرة، وفي رواية عشر من الفطرة (رواہ ابن ماجہ ۱/ ۵۹ ابواب الطہارۃ، رقم الحدیث: ۲۹۰، ۲۹۱۔

۳- اس کا حوالہ پہلے گذر چکا۔

رشتہ جوڑ سکتے ۔اور خطاب تکلیف میں کامیاب ہوسکے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مدارنجات یامدار صحت عمل، یامدار صحت ادانہیں ہوسکتے ،بیش از بیش ان کا مرتبہ تحسین یا استحباب کے درجہ میں ہوگا ، یا یہ چیزیں طمانیت قلب کے قبیل سے ہوں گی ، مکلّف کی برأت ذمہ کے لئے موقوف علیہ ہرگز نہ ہوں گی۔

پس فقہاء کرام کی یہ ابحاث اسی درجہ وقبیل کی ہوں گی عمل کی صحت وجواز کے لئے معیار یامدار نہ ہوں گی۔

اور ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ صدقۂ فطر کی مقدار نصف صاع حنطہ (گیہوں) یا ایک صاع شعیر (جو) واجب ہونے کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس واجب کی ادائیگی بلا تکلیف صاع مدینہ سے یا جو صاع میسر ہو اس سے یا جس نوع کے صاع کی ہدایت تھی اس سے نصف صاع یا ایک صاع ادافرما دیتے تھے، اور سبکدوش وبری الذمہ قرار دیدیئے جاتے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ جس صاع کا اعتبار تھا اور جس صاع سے ادافرماتے تھے وہ سارے کے سارے ایک تاریخ کے بنے ہوئے تھے یا ایک ہی نوع کے تھے، بلکہ نئے پرانے جو میسر آگئے ان سے ادائیگی کرلی، خواہ پتھر سے بنے ہوئے ہوں یا لکڑی سے بنے ہوئے ہوں اور مشاہدہ ہے کہ بالکل پرانا صاع جو مدتوں سے بار بار استعمال ہوتا ہے اس کا ظرف واندرونی خول کافی بڑھ چکا ہوتا ہے، بالخصوص جب لکڑی کا ہو، اور جو صاع بالکل تازہ اور نیا ہوتا ہے، اس کا اندرونی خول وظرف کم اور چھوٹا ہوتا ہے۔

اور بڑے خول وظرف میں زیادہ مقدار غلہ کی سمائے گی اور چھوٹے میں کم مقدار سمائے گی اور وزن کرنے میں دونوں کی مقداروں میں بڑا فرق بھی ہوگا، مگر ادائیگی سب کی تسلیم کی گئی۔

اسی طرح ادائیگی میں کوئی قید نہیں کہ اتنے وزن وحجم اور اتنی دبازت کے گیہوں یا جو ادا کئے جائیں۔

بلکہ جو گیہوں یا جو میسر ہوا، ادا کردیا، یا بیش از بیش اوسط درجہ کا لحاظ کرلیا، اس میں گیہوں کے ہلکے اور بھاری ہونے کے اعتبار سے بڑا فرق آنا ظاہر ہے۔ بھاری اور وزنی گیہوں جو ایک صاع میں یا نصف صاع میں سمائے گا اس کا وزن بہت زیادہ ہوجائے گا، اور ہلکے گیہوں کا وزن کم ہوجائے گا، اور اس کی مقدار بھی وزن کے اعتبار سے بہت کم ہوجائے گی۔

باوجود ان باتوں کے ادائیگی سب کی صحیح ومعتبر مانی گئی، اگر یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مدار یا شرط ہوں تو ان سب کی ادائیگی کیسے صحیح ومعتبر ہوگی؟ بلکہ بہت سارے صحابۂ کرامؓ (نعوذ باللہ من ذلک) قاصرۃ الاداء قاصر العمل، قابل

مواخذہ قرار پائے جائیں گے (ثم العیاذ باللہ)۔

قرن اول کا یہ عام حال بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مطلوب شرعی نہیں، اور اس کو لازم وضروری قرار دینا یا اس پر صحت ادا کو یا برأت عن الذمہ کو موقوف یا معلق کرنا منشاء ومزاج شرع کے خلاف ہوگا۔

اور بہت ممکن ہے، قبیلۂ ما یاں حضرت گنگوہیؒ کی اس اصولی تحریر سے تقریری جواب معلوم ہوگیا، وہ تحریر یہ ہے:

"چونکہ ہر جگہ کا حساب مختلف اور وزن مختلف ہے، پس ستر جو م بریدہ غیر مقشر کا ایک درم، پس اس حساب سے رطل بنالیں۔ اور آٹھ رطل کا ایک صاع بنالیں اور کسی کی تحریر کا اعتبار نہ کریں" (۱) حضرت کے اس جملہ میں (کہ اور کسی کا اعتبار نہ کریں) اس جانب بھی اشارہ ہوا کہ اس میں غلو کرنا درست نہیں اور ان کو شرط لازم قرار دینا یا مدار صحت برأت عن الذمہ قرار دینا منشاء ومزاج شرع کے خلاف ہوگا۔

نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایک ملک کے تول یا ناپ یا سکہ کو جب دوسرے ملک کے تول یا ناپ یا سکہ میں ڈھالا جاتا ہے اور مطابقت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دونوں کی بنیا مختلف ہونے کی وجہ سے انطباق مکمل اور صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً درہم کے وزن کو جب ہم تولہ، ماشہ کے وزن سے منطبق کرنا چاہیں گے تو کبھی پورا انطباق نہ ہوگا، اس لئے کہ ہندی وزن تولہ، ماشہ کی بنیاد خشخاش پر ہے کہ آٹھ خشخاش کا ایک چاول پھر آٹھ چاول کی ایک رتی پھر آٹھ رتی کا ایک ماشہ پھر بارہ کا ایک تولہ۔

اور درہم (عربی وزن) کی بنیاد شعیر (جو) پر ہے کہ پانچ شعیر کا ایک قیراط چودہ قیراط کا ایک درہم، لہذا جب تک شعیر (جو) کا چاول یا خشخاش یا رتی کے ساتھ کلی انطباق نہ ہوگا، بلکہ جتنا فرق چھوٹے اور بنیادی اجزاء میں ہوگا اس سے کئی گنا زیادہ بڑے وزن میں ہوگا، اگر تولہ کے درجہ میں دو خشخاش کا بھی فرق ہوگیا تو من اور کوئنٹل تک پہنچتے پہنچتے ایک من کا سوا من اور سوا من کا ایک من ہوسکتا ہے، پھر اسی طرح شعیر بھی مختلف جسامت اور حجم و وزن کے ساتھ انطباق معلوم کرے گا اور ایسی صورت میں عدم انطباق ناگزیر ہوگا، اور صاحب درمختار نے جو ماش وعدس کے ذریعہ سے وزن کرنے کا ذکر کیا ہے وہ صرف اس بنیاد پر ہے کہ ماش وعدس مختلف وزن وحجم کے ساتھ انطباق معلوم کرے گا اور ایسی صورت میں عدم انطباق ناگزیر ہوگا۔ اور صاحب درمختار وزن وحجم کے نہ ہوں، لیکن اس زمانہ میں بالخصوص ہمارے اطراف میں تو ماش وعدس دونوں مثل گیہوں وجو کے مختلف حجم و وزن کے ہوتے ہیں، لہذا یہ دردسری محض بےکار ہوگی اور غیر مفید ہوگی، جیسا کہ خود علامہ شامیؒ نے بھی اس کی

۱- فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۶۱ کامل ہر سہ حصہ۔

طرف اشارہ کیا ہے، لہذا صاحب "درمختار" کی تحقیق پر بناء کر کے کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح برقی مشینوں کے ذریعہ سے وزن کی جو مقدار معلوم ہو، فقط اسی کو لازم قرار دینا اور اسی پر صحت ادا کو معلق کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، اور نہ اس کی بنیاد پر خلفاً عن سلف عندالجمہور جو معتبر و معمول بہ چلا آرہا ہے۔ اس کی تغلیط درست ہوگی، جیسا کہ نصاب زکوۃ میں اپنے اکابر کا ذوق معلوم و مشہور ہے کہ مقدار نصاب (۵۲ ½ تولہ) چاندی کو جو جمہور سلف سے بطور توارث چلا آتا ہے۔ اس کے خلاف مؤقر علماء کی تحقیق کے بعد بھی اس کو ترک نہ کیا گیا کما صرح بہ صاحب "الاوزان الشرعیہ" (۱)۔

ہاں یہ الگ بات ہوگی کہ اگر احتیاط برتے اور مشینی وزن کی مقدار کے مطابق ادا کرے تو یہ احتیاط ہوگی، اس کو ممنوع یا ناجائز نہ کہیں گے، لیکن ایسے شخص کو اس کا بھی حق دیں گے کہ وہ دوسروں کو اسی کے ذریعہ حاصل شدہ مقدار پر ادائیگی کے لئے مجبور کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا جوار، مکا و باجرہ صدقہ فطر میں دیا جاسکتا ہے، اور اس کا وزن کیا ہوگا؟

صدقہ فطر کے لئے گیہوں کنٹرول میں ۵۶ نئے پیسے اور باجرہ ۹۰ نئے پیسے اور مکائی یا مکا ۸۰ نئے پیسے اور جواری ۵۷ نئے پیسے اور کھلا بازار میں جو ایک روپیہ بیس نئے پیسے فی کلو کے حساب سے مل رہا ہے اور دیہاتوں میں جواری ایک روپیہ فی کلو کے حساب سے بغیر کنٹرول کے مل رہی ہے سب اناجوں میں قیمتوں کا یہ فرق ہے بتلایئے کہ جوار مکا باجرہ بھی صدقہ فطر میں دیا جاسکتا ہے اور ہر ایک کی مقدار وزن کتنی ہے اور ساتھ ہی مشین سے صاف کیا ہوا جو اور بغیر چھلکا صاف کیا ہوا جو اس کی کیا مقدار ہے ایک نفس کے لئے اور اگر کنٹرول بھاؤ گیہوں کی قیمت سوا دو کلو کی ایک صدقہ فطر کے لئے دینا بہتر ہے، یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

گیہوں اور جو اور چھوہارے اور منقی کے علاوہ بھی ہر چیز صدقہ فطر میں دی جاسکتی ہے اور بازاری قیمت ان چیزوں

۱- جواہر الفقہ / ۱۴، ۴۱۴ و ۴۱۵ لمفتی محمد شفیع۔

کی معتبر ہوگی ،البتہ گیہوں اور جو وغیرہ میں وزن معین ہے گیہوں کا وزن ہر فطرہ میں پونے دوسیر اور جو کا دوگنا ہے کنٹرول کے بھاؤ کا اعتبار نہیں ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر جوار مکا وغیرہ دیں تو جس قدر وزن گیہوں دیا جاتا ہے وہ ان میں معتبر نہیں ہے، بلکہ جتنا گیہوں واجب ہوتا ہے اس کی قیمت میں جس قدر جوار مکا وغیرہ ملے وہ دیدیں (۲)۔

محمود احمد عفی عنہ ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

صدقۂ فطر کا مصرف:

جب فطرہ سب پر واجب ہے تو دینے والا کس کو دے اور جس کو دیا ہے اس پر فطرہ واجب ہے یا نہیں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ سب پر واجب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

فطرہ سب پر نہیں واجب ہوتا ہے بلکہ صرف اس آدمی پر واجب ہوتا ہے جس کے پاس اپنی ضروریات اور حاجت اصلیہ سے فاضل اور زائد نصاب کی مقدار ساڑھے باون تولہ چاندی یا چاندی کا زیور یا اس کی قیمت کا روپیہ یا سامان موجود ہو اور صدقۂ فطر صرف ان لوگوں کو دینا چاہئے جن کو زکوۃ دینا جائز ہو، ورنہ فطرہ ادا نہ ہوگا (۳)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

۱- ’’نصف صاع فاعل يجب من بر أو دقيقه أو سويقه أو زبيب وجعلاه كالتمر .... أو صاع تمر أو شعير ولو رديئاً‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۳۱۸)(مرتب)۔

۲- ’’وما لم ينص عليه كذرة وخبز يعتبر فيه القيمة‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۳۱۹)(مرتب)۔

۳- وهي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلاً عن حوائجه الأصلية، كذا في الاختيار شرح المختار (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۹۱، نیز الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۳۱۰،وصدقة الفطر كالزكاة في المصارف أي المذكورة في آية الصدقات إلا العامل الغني فيما يظهر (الردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۳۲۵)(مرتب)۔

صدقہ فطر کسی تنظیم میں دینا اور حسب موقع خرچ کرنا:

صدقہ فطر کسی فنڈ میں لے کر استعمال کر سکتے ہیں یا کہ نہیں۔

جیسے دہرہ دون دو جماعت فنڈ ہیں وہ لوگ فطرہ بیت المال میں لیکر لوگوں کو دیتے ہیں اور اس کے حساب کتاب کا مسجد میں اعلان کرتے ہیں حکم یہ ہے کہ نماز سے پہلے ادا کردیں اور بیت المال والے نہ معلوم کب کا کب خرچ کرتے ہیں اس کا پورا پورا جواب دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صدقہ فطر غریب مسلمانوں کو دینے سے ادا ہوجاتا ہے اور نماز عید سے پہلے غریب تک پہنچا کر ان کو مالک بنا دینا افضل ہے اور بعد میں بھی دینے سے ادا ہوجاتا ہے مگر افضلیت کے خلاف ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اگر فقیر مسکین تک پہنچ جاتا ہے تو ادا ہوجاتا ہے (۱)، لیکن یہ طریقہ اس طرح بہتر نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

قیمت کے ذریعہ صدقہ فطر ادا کرنے میں گیہوں کے کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟

فطرہ کے بارے میں ایک حافظ صاحب نے بتایا ہے کہ چونکہ گیہوں بازار میں بلیک سے فروخت ہوتا ہے اور اس کا کوئی قیام نہیں ہے اور گورنمنٹ نرخ پر گیہوں ملتا جاتا ہے، لہذا ۱۶۰ پیسہ فی کلو گیہوں کی قیمت ادا کی جائے گی کیا یہ حساب ٹھیک ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر آپ بعینہ گیہوں ہی دیں تو سب سے بہتر ہے جائز طریقہ سے جہاں سے اور جس قیمت پر ملتی ہوں کوئی اشکال

۱- ''وصدقة الفطر كالزكاة في المصارف وفي كل حال....'' الخ (الدر المختار مع رد المحتار ر ۳/ ۳۲۵)، لہذا تملیک مستحقین شرط ہے ادائیگی کے لئے)، نیز ''ويستحب إخراجها قبل الخروج إلى المصلى بعد طلوع الفجر عملاً بأمره وفعله عليه الصلاة والسلام وصح أداؤها إذا قدمه على يوم الفطر أو أخره اعتباراً بالزكاة'' (الدر المختار مع رد المحتار ر ۳/ ۳۲۲) (مرتب)۔

اور تر دو نہیں ہے، خواہ گورنمنٹ نرخ سے ملا ہو یا بازار کے نرخ سے ملا ہو فطرہ ادا ہو جائے گا، البتہ اگر گیہوں نہ دینا ہو، بلکہ قیمت دینی ہو تو بازاری بھاؤ ہی کا اعتبار ہوگا ہر بلیک مارکیٹ شرعاً واجب الاحتراز نہیں ہے اس میں تفصیل ہے گورنمنٹ نرخ عام بازار میں نہیں ہے اور نہ ہی ہر جگہ ہی ہے اور اصول وقواعد کلی ہوتے ہیں (۱) ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”ثم قيل يجوز أداؤه باعتبار العين والأحوط أن يراعي فيه القيمة، هكذا في محيط السرخسي“ (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۹۱، نیز دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۳۲۱) (مرتب)۔

کتاب الصوم

مسئلہ توحید اہلّہ :

سوال: الفرقان محرم ۱۳۹۱ھ اسلامی منعقدہ مکہ مکرمہ شعبان ۹۰ھ کے اجلاس کی تجویز توحید اہلہ کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب۔

خلاصہ سوال یہ ہے کہ متعدد ممالک اسلامیہ کے بہت سے علماء اور ذمہ دار حضرات کی یہ رائے اور تجویز ہے کہ عالم اسلامی میں رمضان وعید وغیرہ کا یہ فرق واختلاف عملاً باقی نہ رہے، بلکہ کبھی بھی ایک جگہ کی رویت ہلال کی بناء پر پورے عالم اسلام میں رمضان کا آغاز اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ ایک ہی دن ہوا کرے۔

ان کے نزدیک وحدتِ امت کا بھی تقاضا ہے۔ اور اس تجویز کا عنوان توحید اہلہ ہے۔ حضرات علماء اہل تحقیق مسئلہ کی اہمیت محسوس فرماتے ہوئے، نیز اس کے اطراف وجوانب اور ما لہ وما علیہ پر غور فرما کر دلائل کے ساتھ اپنی آراء سے مطلع فرمائیں، بنیادی طور پر اس میں یہ تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱- اس مسئلہ میں براہِ راست کتاب وسنت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

۲- جن ائمہ نے اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے۔ ان کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ اور اس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری، جیسا کہ بعض محققین نے رائے ظاہر کی ہے، اگر اختلاف ونزاع حقیقی ہے تو دلائل سے میری طرف سے کس مسئلہ کو ترجیح ہے؟

۳- حنفیہ کے مشہور مذہب عدمِ اعتبار اختلاف کی بنا پر ہندوستان وپاکستان کے احناف کے لئے کیا اس کی گنجائش ہے کہ وہ توحید اہلّہ کی تجویز کو قبول کرلیں۔

الجواب وبالله التوفيق :

الفرقان کا تراشہ اہتمام کی معرفت موصول ہوا۔اس میں قائم کردہ سوالات کے جوابات لکھنے سے قبل ایک اہم چیز قابل غور ہے جو پیش خدمت ہے۔اس پر توجہ دینا زیادہ اہم ومقدم ہے۔وہ یہ ہے کہ توحید اہلہ مقصد شرعی ہے یا نہیں؟ یا ہوسکتا ہے یا نہیں؟اس کا جواب بھی قائم کردہ نمبرات وسوالات کے ذیل میں ان شاء اللہ آجائے گا، یہاں اس سے قطع نظر یہ دیکھنا ہے کہ اس تحریک (توحید اہلہ) کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں رمضان وعید وغیرہ کا فرق واختلاف عملاً باقی نہ رہے، بلکہ کسی بھی ایک جگہ رویت ہلال کی بناء پر پورے عالمِ اسلام میں اس مقصد کی تکمیل یا اس میں کامیابی جب ہی ہوسکتی ہے کہ ہر مملکتِ اسلامی پورے قلم رو میں قانوناً لازم قرار دے دے کہ کسی مقام کا کوئی فرد یا کوئی قبیلہ یا باشندہ عملاً اس کے خلاف نہ کرسکے۔اور کرے تو اس سے باز پرس ہو، اس کے خلاف کارروائی ہو، غرض سب کو اس پر مجبور کیا جائے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو مقصد متعین کیا گیا ہے (وحدت فی العمل) وہ حاصل نہ ہوگا، اور اگر سرے سے اس کو لازم ہی نہ کیا جائے، بلکہ ہر شخص کو عمل میں اختیار دے دیا جائے کہ جس کا جی چاہے اتفاق کرے تو یہ تحریک ہی بالکل بے سود ہوگی۔اور اگر واقعی لازم قرار دے دیا جائے۔اور اس کے مطابق عمل کرنا قانوناً ضروری قرار دے دیا جائے تو شرعاً یہ جائز نہ ہوگا۔

اولاً : اس لئے کہ غیر لازم کو لازم قرار دیا جائے گا اور اس کے مطابق عمل کرنا قانوناً ضروری ہوگا۔
غیر لازم کو لازم قرار دے دینا۔جس چیز میں شریعت مطہرہ نے اختیار دیا ہو اس سے اختیار کو سلب کر لینا شریعت مطہرہ نے ناجائز قرار دیا ہے، اس کے نظائر بے شمار ہیں۔

ثانیاً : اس لئے کہ نفس رویتِ ہلال رمضان کا مسئلہ امور دینیہ میں سے من کل الوجوہ تحت القضاء داخل ہی نہیں کہ علی الاطلاق تحت القضاء داخل ہو کر اس طرح کا لزوم بطریق قضائے قاضی (حکومت) نافذ ہوجائے۔

ثالثاً : اس لئے کہ جو لوگ اختلاف مطالع کو معتبر جانتے ہیں ان کے لئے بُعد مسافت کی صورت میں بعض وقت اس حکم حکومت پر عمل کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔اس لئے کہ انکا متدل براہِ راست مستند الی الروایات ہوگا۔جیسا کہ حضرت کریبؓ کی روایت میں ہے جس کو صحاح میں سے اکثر نے بہ سند صحیح روایت کیا ہے۔اور الفاظ روایت یہ ہیں:

"أخبرني كريب أن أم الفضل ابنة الحارث بعثته إلى معاوية بالشام، قال: فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهل عليّ هلال رمضان وأنا بالشام فرأينا الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني ابن عباس ثم ذكر الهلال، فقال

رأيتم الهلال؟ فقلت: رأيناه ليلة الجمعة، فقال: رأيتهٗ ليلة الجمعة، فقلت: رآه الناس (في رواية مسلم) ورأيت وراٰه الناس وصاموا وصام معاوية، فقال: لكن رأيناه ليلة السبت فلا نزول نصوم حتى يكمل ثلاثون يوماً أو نراه، فقلت: ألا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ قال: لا هكذا أمرنا رسول الله ﷺ" (۱)۔

اور جیسے کہ وہ روایت جس کو امام مسلم نے "باب لكل أهل بلد رؤيتهم" سے ذرا قبل روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''عن ابن عمر عن النبي ﷺ أنه ذكر رمضان فقال: لا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه فإن أغمي عليكم فاقدروا له (وفي رواية) فاقدروا إلى ثلثين (وفي رواية) فعدوا ثلثين'' (۲)۔

غرض ان کا استنا دو استدلال براہِ راست روایات سے ہے۔ان کے خلاف کا فیصلہ قاضی وحاکم کے اختیار میں نہ ہو سکے گا۔هو مبرهن في مقامه،نیز اس میں وسعت دین کو تنگ کرنا لازم آتا ہے۔اور جو تسہیل ووسعت اللہ رب العزت نے اس امت کو دی ہے اور ارشاد نبوت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام: "اختلاف أصحابي رحمة لأمتي" (۳)(محبت) سے اس کو موثق ومؤید فرمایا ہے۔مسلوب ہو کر رہ جائے گی جو منشاءِ شرع اور شارع کے خلاف ہوگا۔اور ایک قسم کی دین حنیف میں مداخلت بیجا کے مترادف ہو جائے گی اور انہیں وجوہ کی بناء پر امام مدینۃ الرسول علیہ السلام حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنی کتاب ''موطا'' کو دستور وقانون کی حیثیت دے کر سب پر اس کی پابندی لازم قرار دینے سے روکا ہے۔جس کو نقل کرنے والوں نے خود امام کے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے: ''وقد روى أبو نعيم في حيلة الأولياء عن مالك أنه أن أعلق المؤطا على الكعبة ويحمل الناس على ما فيه فقلت لا تفعل، فإن أصحاب رسول الله ﷺ اختلفوا في هذه الفروع تفرقوا في البلدان وكل مصاب، فقال: وفقك الله يا أبا عبد الله'' (۴)۔

۱- ترمذی باب لکل أهل بلد رؤیتهم إلی قوله: والعمل عند أهل العلم على هذا الحديث إن لكل أهل بلدة رويتهم (رقم الحدیث: ۶۹۲، باب ما جاء لکل أهل بلد رؤیتهم ۳/ ۲۱۳ ط: احیاء تراث العربی بیروت)، وهکذا في أبي داؤد و مسلم/ ۳۲۶)۔

۲- وهکذا في أبي داؤد و مسلم/ ۳۲۶۔

۳- في رواية: اختلاف أصحابي لكم رحمة، کشف الخفا للعجلونی ۱/ ۶۸، المغنی عن حمل الاسفار للعراقی ۱/ ۲۸، تذکرۃ الموضوعات للفتنی/ ۹۰، ابن عساکر: تہذیب تاریخ دمشق ۶/ ۲۸۵، وفي رواية: اختلاف امتي رحمة"المغنی عن حمل الاسفار للعراقی/ ۲۸، اتحاف السادۃ للزبیدی ۱/ ۲۰۴، ۳۰۴، ۲۰۵، تذکرۃ الموضوعات/ ۹۰، کنز العمال للمتقی الہندی/ ۲۸۶۸۶، موسوعۃ اطراف الحدیث ۱/ ۱۷۳، (مرتب)۔

۴- مقدمۃ التعلیق الممجد علی الموطا للامام محمد۔

امام صاحب کا یہ منع کرنا پہلی بار نہیں تھا، بلکہ اس سے تقریباً ۳۰،۴۰۵ سال قبل اس کے دادا منصور کو بھی نہایت سختی سے منع فرمایا تھا۔جس کے الفاظ یہ ہیں:

"روی ابن سعد في الطبقات عن مالک أنه لماحج المنصور قال لي: عزمت علی أن أمر بکتابک هذه التي وضعتها فتنسخ ثم أبعث إلی کل واحد من أمصار المسلمين منها نسخة وآمرهم أن يعملوا بما فيه ولا يتوجهوا إلیٰ غيرها فقلت: لا تفعل هذا، فإن الناس قد سبقت إليهم الأقاويل وسمعوا الأحاديث وردوا روايات وأخذكل قوم بما سبق روايته فدع الناس، وما اختار أهل کل بلد منهم لأنفسهم كذا في عقود الجمان" (۱)۔

اس بار بار منع کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ امام نے محض تواضعاً نہیں منع فرمایا یا روکا ہے، بلکہ ایسی تنگی شرعاً قبیح ومذموم تھی جس کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور شرعی حیثیت سے روکا ہے۔پھر اسی رویت ہلال کے خاص موضوع پر نکیر نہیں فرمائی اور نہ اس کو خلاف مقصد شرع یا شارع قرار دیا اور نہ وحدت ملت کے منافی سمجھا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس وقت اس کا انتظام بہت سہل تھا۔خلافت راشدہ اور مشکوٰۃ نبوت کا زمانہ بہت قریب تھا، عام طور سے صحابہ موجود تھے، بلکہ صحابہؓ کا دور تھا، دین کے ہر حکم کی تعمیل پر من تن دھن کی بازی لگادینا آسان تھا اور وحدت ملت کا مسئلہ بھی ان کے ذہن میں اس درجہ اہم تھا کہ جنازہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام تین دن تک رکھا رہا، جب تک خلافت کا مسئلہ طے ہو کر وحدتِ ملت حاصل نہ کر لی گئی تدفین مؤخر رکھی گئی، اگر توحید اہلہ میں وحدت ملت کی کوئی حیثیت ہوتی اور یہ (توحید اہلہ) خود یا اس کے ضمن میں کوئی اہم مقصد شرعی یا فضیلت مضمر ہوتی تو صحابہ کرامؓ کی بصیرت اور عقل وہوش ودانش پر قرآن پاک ناطق ہی نہیں، بلکہ قیامت تک کے انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے تشہیر واعلان کا حکم ہے، ارشاد ربانی ہے: **"قل هذهٖ سبيلي أدعو إلی الله علی بصيرة أنا ومن اتبعني"** (۲)۔

اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی: **"أصحابي کالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم"** (۳)۔

۱- مقدمۃ التعلیق، ص ۱۵۔

۲- سورۂ یوسف: ۱۰۸۔

۳- تلخیص الحبیر لابن حجر ۴/ ۱۹۰، عبد بن حمید فی مسندہ من طریق حمزۃ النصیبی عن نافع عن ابن عمر، وحمزۃ ضعیف جداً، میزان الاعتدال ۱/ ۴۱۳، ۶۰۷ رقم الحدیث: ۱۵۱۱، ۲۲۹۹ عن ابن عمر، وعن الاعمش، عن ابی صالح، عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ (مرتب)

اس ارشاد میں صحابہ کرامؓ کے مقتدا ہونے کو بھی واضح کیا گیا ہے، ان کی اقتداء کی ترغیب بھی دی گئی ہے، اسی کے ساتھ وہ روایت بھی ملا لیجئے جس میں امت کا بہت سے فرقوں میں منقسم ہو جانا اور اس میں سے محض ایک کا حق پر ہونا اور باقی سب کا ضلالت پر ہونا بیان کیا گیا۔ اس سوال پر کہ برحق فرقہ کون ہوگا؟ جواب میں صحابہ کرامؓ کو مشعلِ راہ قرار دینا اور اپنے معیارِ حق ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کو بھی تبعاً بہ برکت اتباع صادق معیارِ حق بتلا کر یہ جتلانا کہ ان کے نقشِ قدم کے تابع رہنے والا حق پر رہے گا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: ليأتين على أمتي كما أتى على بني إسرائيل حذو النعل بالنعل (إلى قوله) وتفترق أمتي على ثلث وسبعين ملة كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: ومن هي يا رسول الله! قال: ما أنا عليه وأصحابي" (۱)، وفي رواية أحمدؒ وأنه سيخرج في أمتي أقوام تتجاری بهم تلک الأهواء کما يتجاریٰ الكلب بصاحبه لا يبقیٰ منه عرق ولا مفصل إلا دخله"۔

ان باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ اگر اس میں کوئی خاص فضیلت یا اہمیت ہوتی یا اس پر کوئی خاص شرعی مقصد مرتب ہوتا تو صحابہ کرامؓ کی توجہ اس طرف بھی ہوتی، پھر صحابہؓ ہی کے دور میں اسلام عرب سے نکل کر فارس و روم و افریقہ جیسے دور دراز مقامات تک پہنچ گیا تھا اور اختلاف اہلہ کے واقعات بے شمار واقع ہو رہے تھے اور اس وقت سے زیادہ ضرورت اس وقت توحید اہلہ کی جانب توجہ دینے کی تھی، مگر صحابہؓ نے پھر بھی توجہ نہیں فرمائی، کوئی اشارہ تک اس طرف نہیں ملتا، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ یہ اختلاف وسعت امت و رحمت علی الامۃ کے دائرہ سے خارج نہیں، اس لئے اس کے خلاف کرنا اور اس میں تنگی ڈالنا مزاج شرع و شارع کے خلاف ہے۔

رابعاً: اس لئے کہ جو لوگ اختلاف مطالع کو مقید نہیں مانتے وہ اختلاف مطالع کے وجود کے منکر نہیں ہیں، بلکہ پنجگانہ وغیرہ تمام ہی معاملات و امور میں معتبر مانتے ہیں اور اس کے مقتضا پر عمل کرتے ہیں اور استناد روایات سے کرتے ہیں اور صحیح کرتے ہیں، صرف وجوب صوم کے اثبات میں بوجہ روایات صحیحہ اعتبار نہیں کرتے اور اس پر بنا نہیں رکھتے، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر طریق موجب (شہادۃ علی الرؤیۃ) (شہادۃ علی قضاء القاضی استفاضہ) کے ذریعہ اہل مشرق کی رویت اہل مغرب پر ثابت ہو جائے تو ان پر لزوم صوم ہو جائے گا۔

۱- رواہ الترمذی، کتاب الایمان باب ما جاء فی افتراق ہذہ الامۃ حدیث نمبر: ۲۶۴۔

اور ظاہر ہے کہ ریڈیو وغیرہ کی خبر طریق موجب نہیں بن سکتی، اگر بن سکتی ہے تو کبھی کبھار استفاضہ بن سکتی ہے یا پیش از پیش طبل قاضی۔ یا صورت مدافع یا قنادیل منارہ وغیرہ کے درجہ میں ہوکر حصول غلبہ ظن کے لئے مفید ہوسکتی ہے اور بعض موقعوں میں اپنے شرائط وقیود کے ساتھ معتبر بھی ہوسکتی ہے جو محض ایک امر مجتہد فیہ ہوگا۔ اگر کسی قید یا شرط ضروری یا کسی نص کے خلاف ہوگی تو قابل عمل نہ رہے گی، ان شرائط وقیود کی قدرے تفصیل احقر کے مضمون (ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ رویت ہلال کی اطلاع کا شرعی حکم) میں مذکور ہے، وہ بھی پیش خدمت ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے، مثلاً ریڈیو وغیرہ کی اطلاع اگرچہ اعلان معتبر مفید کے الفاظ میں بھی ہو، لیکن جس مقام وخطہ میں اطلاع پہنچ رہی ہے وہاں ۲۸،۲۷ تاریخ ہے کہ وہاں اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ صرف ۲۸،۲۷ دن کا ہوکر رہ جائے گا۔ اور وہ صرف صریح نصوص کے خلاف ہوگا جو جائز نہ ہوگا۔ مثلاً:

حدیث:۵" عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا وهكذا، وعقد الإبهام في الثالثة، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، ويعني تمام الثلثين، يعني مرة تسعاً وعشرين ومرة ثلثين"(۱)۔

اور جب ۲۸/۲۷ تاریخ سے روزہ شروع کردیا جائے گا تو حدیث ذیل کے منافی ہوگا۔

حدیث۶: "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: لايتقدمن أحدكم رمضان بصوم يوم أو يومين إلا أن يكون رجل كان يصوم صوماً فليصم ذلك اليوم" (۲)۔

اور اس مجتہد فیہ حکم کی وجہ سے خلاف نصوص کرنا کسی طرح جائز نہ ہوگا، البتہ صرف ان مقامات وممالک میں قابل عمل رہ سکے گا۔ جہاں ۲۹ویں تاریخ گذر کر ۳۰ویں شب آچکی ہو یا آرہی ہو۔ حاصل یہ نکلا کہ جو حضرات اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں فرماتے ان کے نزدیک بھی اس کے طریق کار میں تمام ممالک اسلام میں عمل کی یکسانی وحدت حاصل نہ ہوسکے گی اور یہ مقصد حاصل نہ ہوسکے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان پہلوؤں پر غور کرلینا ضروری ہے، تاکہ نتائج زیادہ صحیح وپائیدار نکل سکیں ان مفروضات کے بعد جناب کے قائم کردہ سوالات کے جوابات کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، لیکن اشکالاً ہر ایک کا جواب نمبروار درج ہے۔

۱- رواہ البخاری والمسلم، مسلم مع النووی باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الہلال ۲۰۵/۴۔

۲- صحیح البخاری مع الفتح ۱۲۸/۴، ورواہ أیضاً عن ابن عمر مسلم وفیہ: "لاتقدموا رمضان الخ" مسلم مع النووی ۲۰۸/۴۔

۱-اگر اس سوال کا منشاءفقط اتمام حجت یا حصول بصیرت وطمانیت قلب ہو یا یہ ہو کہ چونکہ یہ مسئلہ بین الاقوامی وعالمی سطح پر ہے اور اس میں تمام اسلامی فرقوں سے خطاب ہے، اس لئے کلام بھی ایسی ہی سطح پر ہونا چاہئے جو سب کے لئے حجت بن سکے تو یہ صحیح ہے، اسی کے پیش نظر کچھ مختصر اُعرض ہے کہ صوم رمضان اسلام کی ایک بنیادی عبادت ہے۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے: **"عن ابن عمرقال: قال رسول الله ﷺ: بني الإسلام على خمس شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله وإقام الصلوٰة وإيتاء الزكوٰة والحج وصوم رمضان"**(۱)۔

قرآن عزیز نے اس کو ایک خاص انداز میں بیان فرمایا۔ارشاد ہے:

"يا أيها الذين اٰمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون أياماً معدودات"(۲)۔

اس آیت کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح بعض امم سابقہ نے حکم کے اندر تقدیم وتاخیر وغیرہ کی خرابیاں پیدا کردیں تو تم ویسا ہی مت کرنا۔پھر اس کی فرضیت کو قمری مہینہ رمضان مبارک کے اندر منحصر فرما کر کس انداز سے تعبیر فرمایا گیا ہے: **"شهر رمضان الذى أنزل فيه القراٰن هدى للناس وبينٰت من الهدىٰ والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه"**(۳)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ مبارک اور اس کے روزے اور قرآن عزیز میں آپس میں ایک خاص ربط وتعلق ہے۔اور اس کا ملحوظ رکھنا مطلوب شرعی ہے۔اور اس لحاظ رکھنے پر کچھ خاص برکتیں اور ہدایتیں مضمر ہیں، پھر مطلوب کی تحصیل اور اس کے امتثال کی ترغیب بھی ہے۔

بلکہ ان تمام چیزوں کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی خود بطور دلالت النص اور ماسیق الکلام لاجلہ کے فائے تفریعیہ باتعقیبیہ لاکر **"فمن شهد منكم الشهر فليصمه"**(۴) سے عبارت النص منصوص فرمادیا گیا۔کہ جو شخص تم میں سے اس مہینہ کا مشاہدہ کرے (چاند دیکھ لے) اور موجود ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس مہینہ کا روزہ رکھا کرے۔جس کا خلاصہ یہ

۱- بخاری مع الفتح ۱؍۴۹، مسلم مع النووی ۱؍۱۷۸، کتاب الایمان، الفاظ بخاری کے ہیں (مرتب)۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۳۔

۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۵

۴- سورۂ بقرہ: ۱۸۵

ہے کہ اس ماہ مبارک (رمضان) کا چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنے شروع کئے جائیں۔ پھر اگلا چاند دیکھ کر رکھنا موقوف کیا جائے۔ ظن وتخمین یا محکمۂ موسمیات کی تحقیقات وغیرہ پر مدار نہ رکھا جائے، جیسا کہ اس سے اگلی آیت کریمہ اس کی صاف صاف وضاحت کرتی ہے۔ ارشاد ہے:

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم" (۱)۔

لہذا اگر رویتِ ہلال کے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ ثبوت رویۃ کا اختیار کیا جائے گا تو اس نص کے صریح خلاف ہو جائے گا۔ جو کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ اور صحیح حدیث: **"إنا أمۃ أمیۃ لا نکتب ولا نحسب الشھر ھکذا وھکذا"** (۲)، اور حدیث: **"لا یتقدمن أحدکم رمضان بصوم یوم أو یومین"** جو شروع جواب میں گذر چکا ہے ان میں اس کی تصریح موجود ہے۔

اور ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ وغیرہ محدثین نے صحاح میں ان حدیثوں کو بالخصوص انا امۃ امیۃ کی حدیث کو انہیں نکتوں کی جانب اشارہ کرنے کے لئے "باب الصوم" میں خاص طور سے ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ شارح بخاری حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی کی اس تصریح سے اشارہ ملتا ہے فرماتے ہیں: **"بل ظاھر السیاق یشعر بنفی التعلیق بالحساب أصلاً ویوضحہ قولہ علیہ السلام فی الحدیث الماضی: فإن غم علیکم فأکملوا العدۃ ثلثین ولم یقل: فاسئلوا أھل الحساب"** (۳)۔

اور حضرت ملا علی قاری **"ولا تصوموا حتی تروا الھلال"** کے تحت فرماتے ہیں: **"قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تصوموا إی یوم ثلاثی شعبان عن رحضان" کما یدل علیہ السیاق"** (۴)۔

اور حضرت حذیفہؓ کی روایت میں جس کو ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے صراحۃً اس کی نہی موجود ہے: **"عن حذیفۃ رفعہ: لا تقدموا الشھر حتی تروا الھلال أو تکملوا العدۃ"** (۵)۔

بلکہ بالقصد تقدیم وتاخیر یوم او یومین تو بڑی چیز ہے ماہ رمضان نہ ہونے کا شبہ (یوم الشک) ہو جب بھی صوم رمضان

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔
۲- بخاری مع الفتح ۴/۱۲۶، مسلم مع النووی ۴/۲۰۴-۲۰۵۔
۳- فتح الباری ۴/۱۲۷ باب الصوم۔
۴- مرقاۃ المفاتیح ۲/۵۰۱۔
۵- ابوداؤد کتاب الصوم رقم الحدیث: ۲۳۲۶۔

کی شب سے روزہ رکھنے کو ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے:"**عن عمار بن یاسرؓ قال: من صام الذی یشک فیه فقد عصی أبا القاسم ﷺ**"(۱)۔

یہ روایت اگر چہ سنداً موقوف ہے مگر سند صحیح ہے اور حکماً مرفوع ہے اس لئے ممانعت ومعصیت کا حکم، حکم رسول اللہ ﷺ ہونے میں شبہ نہیں، البتہ ہر فرد کا خود اپنا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ پوری آبادی یا قوم یا علاقہ میں صرف بعض کی روایت بھی علیٰ حسب شرائط وقیود اور اس پر اعلان ہو جانا بھی کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ پوری قوم میں محض بعض نے چاند دیکھا اور شہادت دی اور شہادت ضابطۂ شرعی کے مطابق ہے تو معتبر ہوگی اور حجت شرعی ہوگی، اولاً: اس لئے کہ شہادت کا درجہ محض تخمین وحساب کا نہیں۔

ثانیاً: اس لئے کہ آیات وروایات میں شہادت صحیحہ کو ایسا محکم اور قوی درجہ دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام حقوق کا اثبات واجراء کیا جاتا ہے، شہادت ہی پر مدار رکھ کر بڑے بڑے احوال متنازعہ میں قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ حدود وقصاص ورجم کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ جان لے لی جاتی ہے۔ ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور یہ سب احکام قرآن عزیز واحادیث میں مصرح ومفصل موجود ہیں، البتہ قرآن مجید نے شہادت کے باب میں بھی ہم کو ایک ضابطہ کی تعلیم دی ہے اور وہی ضابطہ شہادت صحیحہ وغیر صحیحہ کا معیار ہے۔

مثلاً: جب مشہود علیہ امور دنیویہ میں سے ہو اور حقوقِ ناس سے متعلق ہو تو اس کے لئے ضابطۂ قرآنی یہ ہے:

"**فاستشهدوا شهيدين من رجالكم فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء**"(۲)۔

اور مثلاً جب مشہود علیہ خالص امور دینیہ میں سے ہو تو اس کے لئے ضابطہ مقرر کر دیا کہ مخبر کا معتبر وثقہ ہونا بھی کافی ہے اور اس پر ذیل کی آیت کریمہ بھی دلالت کرتی ہے:

"**إذا جاء كم فاسق بنباء فتبينوا**" (۳)، غرض قرآن عزیز کی آیات اور اس قسم کی نصوص، نیز روایات سے اخذ شدہ ضابطے "باب الشہادۃ" میں مفصل مذکور ہیں اور ان ہی پر احکام کی بناء ہوگی، یہاں اس بحث کا نہ تو مقام ہے اور نہ

۱- رواہ الجماعۃ، مشکوٰۃ ص ۱۷۴۔
۲- سورۂ بقرہ: ۲۸۲ (مرتب)۔
۳- سورۂ حجرات: ۶۔

گنجائش،فقہ کے باب الشہادۃ کا مطالعہ کافی ہے۔

صوم رمضان مبارک چونکہ خالص امور دینی میں سے ہے،اس لئے مطلع صاف ہونے میں ایک کی خبر معتبر وکافی ہوگی،جیسا کہ حدیث بالا سے ظاہر ہے،ہلال شوال کا تعلق چونکہ امور دنیا جیسے معاملات سے بھی ہوجاتا ہے،اس لئے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں کم از کم حسب آیت:"واستشهدوا شهيدين الخ"(۱)،دو عادل شاہد کی شہادت کا ہونا ضروری ہے،محض حساب وکتاب یا تخمین کافی وصحیح نہ ہوگا۔

اور اس تمام گفتگو کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ بذریعۂ شہادت صحیحہ ثبوت رویت ہونے کے بعد اگر بذریعہ ریڈیو مخصوص شرعی الفاظ میں اعلان کیا جائے تو یہ اعلان بھی اپنے شرائط وقیود کے ساتھ معتبر ومفید ہوسکتا ہے،اختلاف مطالع ہو یا نہ ہو،اس لئے کہ اختلاف مطالع پر شریعت مطہرہ نے صوم رمضان کی بناء نہیں فرمائی ہے،بلکہ اگر بناء رکھی ہے تو ثبوت رویت کے اعلان پر،جیسا کہ ابھی حدیث ابن عباسؓ سے معلوم ہوجائے گا،اور وہ یہ کہ ایک اعرابی نے ہلال رمضان دیکھ کر اپنا چاند دیکھنا جناب نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا،تو جناب نبی کریم ﷺ نے اس کے مسلمان ہونے کا اعتبار کر لینے کے بعد حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کردو کہ کل سے روزہ ہے(۲)۔

۲-جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ مدار ثبوت وجوب صوم رمضان محض آیات وروایات اور رویت وثبوت رویت پر ہے اختلاف مطالع پر نہیں ہے تو مقصد صرف یہ ہے کہ صوم رمضان کے ثبوت ووجوب کا مدار اختلاف مطالع پر نہ ہوگا،نہ یہ کہ اختلاف مطالع کے نفس وجود وتحقیق سے انکار ہے،بلکہ اس کا وجود وتحقق تسلیم ہے،بلکہ صوم رمضان کے علاوہ اور امور دینیہ ودنیویہ میں ملحوظ بھی ہے،جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں حتیٰ کہ اوقات نماز اور حج وقربانی وغیرہ تک میں ملحوظ ومعتبر ہے،چونکہ نصوص نے ہم کو اس میں پابند نہیں کیا ہے اور یہاں پابند فرمایا ہے۔اسی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اختلاف حقیقی ہے،صرف لفظی وتعبیری نہیں ہے اور نہ یہ علماء کی شان کے لائق ہے ہر فریق کے مستدلات روایات کی جانب مستند ہیں۔اور ہر ایک کے نتائج وثمرات اور ہر ایک کا دائرۂ عمل سب الگ الگ وجداگانہ ہیں۔

دلائل کے لحاظ سے ترجیح عدم اعتبار اختلاف مطالع کے قائلین کے حق میں ہے اور وہی ظاہر الروایۃ ہے،اس لئے کہ ان کے مسلک کے مطابق نصوص صحیحہ وصریحہ پر عمل کرنا دوسروں کے اعتبار سے زیادہ حاصل ہوتا ہے،گویا ان کا قول نصوص کی ترجمانی ہے۔

۱- سورہ بقرہ:۲۸۲۔

۲- مشکوۃ شریف۔

۳-سابق معروضات سے ہی یہ معلوم ہوگیا کہ توحید اہلہ کی یہ تجویز کوئی شرعی مقصد نہیں ہوسکتا اور نہ وحدت ملت اس پر موقوف ہے اور نہ اس کے ضمن میں کسی خدمت دینی کی تکمیل یا تحصیل ہی مضمر ہے، اگر ایسا ہوتا تو بتقاضائے آیت کریمہ: "الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم الخ"(۱)، دربار رسالت سے براہ راست یا پھر قرون مشہود لہا بالخیر سے کوئی نہ کوئی اشارہ وغیرہ ضرور ملتا جب ایسا نہیں ہے تو اس کو ضروری ولازم قرار دینا درست ومشروع نہ ہوگا۔ اور مذہبی حیثیت دے کر وجود میں لانا احداث فی الدین کے مترادف ہوگا۔ اور حسب تصریح امام دینی امور میں حرج اور تنگی ڈالنے کے بھی مترادف ہوگا۔

اور ان سب چیزوں سے قطع نظر اور بر تقدیر تسلیم اگر ثبوت ہلال کا مدار شرعی شہادت سے ہٹ کر کسی حساب یا محکمۂ موسمیات کی تحقیقات وغیرہ پر رکھا گیا تو نصوص وروایات مقدمہ کے صریح خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول، بلکہ واجب الرد ہوجائے گا، فقہائے محققین کی مندرجہ ذیل تصریحات سے اس کی تائید ہوتی ہے:

"ولا عبرة بقول المؤقتین ولو عدولاً علی المذهب" (۲) "وتحته في الشامي:"بل في المعراج: لا یعتبر قولهم بالإجماع ولا یجوز للمنجم أن یعمل بحساب نفسه وفي النهر فلا یلزم بقول المؤقتین إنه أی الهلال یکون في السماء لیلة کذا، وإن کانوا عدولاً في الصحیح کما في الإیضاح"(۳)۔ پھر ایک سطر کے بعد فرماتے ہیں:"ما قاله السبکي رده متأخرو أهل مذهبه" پھر چند سطر کے بعد فتاویٰ شہاب رملی الکبیر شافعی سے ایک طویل بحث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:"لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة الیقین وماقاله السبکي مردود ردّه علیه جماعة من المتأخرین"(۴)۔

اور اگر مدار ثبوت شرعی شہادت ہی پر رکھا جائے جب بھی نشریہ مشتہرہ دوسرے مقامات میں پہنچے گا تو وہاں کے لئے وہ نشریہ شہادت نہیں بن سکے گا۔ کیونکہ غائبانہ شہادت متحقق ہی نہیں ہوتی۔ "کما هو ظاهر ومبرهن في مقامه" بلکہ زیادہ سے زیادہ اخبار کے درجہ میں ہوگا جیسے طبل قاضی بصورت مدافع یا قنادیل منارہ کی حیثیت میں قرار دے کر اعلان کے درجہ میں ہوگا۔ قاضی کا نقارہ یا توپ کی آواز یا منارہ کی روشنی اس صورت میں بھی ان دونوں کے صحت واعتبار کے لئے کچھ شرائط وقیود ہیں

۱- سورۂ مائدہ: ۳۔
۲- درمختار۔
۳- ردالمحتار (الشامی) ۲/ ۹۲۔
۴- حوالہ سابق۔

جس کی کچھ تفصیل مضمون منسلکہ میں مذکور ہے اگر ان شرائط وقیود کا پورا پورا لحاظ بھی کرلیا جائے تب بھی کسی مقام پر عمل کرنے والوں کے حق میں مہینہ ۲۹/ ۳۰/دن کا ہونے کے بجائے ۲۸/ یا ۳۱/دن کا ہو رہا ہو تو صریح نصوص وروایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا درست نہ ہوگا ہاں جن کے یہاں عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن یا ۳۱/دن کا نہ ہو رہا ہو بلکہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا محفوظ وباقی رہتا ہو صرف ان کے وہاں درست رہے گا۔اور حجاز مقدس دور دراز مقامات کی بنیاد پر نشر یہ مشتہر کرنے میں ہندو پاکستان میں مہینے کا تحفظ ۲۹ یا ۳۰ دن میں غیر ممکن نہیں تو مشتبہ ضرور ہے۔ بلکہ اس کا عدم تحفظ ظاہر ہے۔ جیسا کہ سوال میں خود بھی مذکور ہے۔اس لئے اس تقدیر پر احناف کے لئے ایک ایک دن اور بسا اوقات دو دو دن کا فرق ہونے کی وجہ سے توحید اہلہ پر عمل کی گنجائش نہ ہوسکے گی۔ بلکہ ان تمام ملکوں میں عمل کرنا جائز نہ ہوگا۔جہاں مہینہ ۲۹/ یا ۳۰/دن کا محفوظ نہ رہتا ہو،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی شرعی حیثیت اور اس کے حدود:

رویت ہلال کے متعلق مفصل فتویٰ باعثِ شرف اندوزی ہوا احقر مطالعہ سے مستفیض ہوا،آپ حضرات کی جدوجہد مستحق صد تحسین ہے۔جزاکم اللہ عنا وعن سائر المسلمین،خیال ہے کہ اس کو طبع کرا کر حضرات علماء کی خدمت میں تصدیق کے لئے بھیجا جائے،ان کی تصدیق حاصل ہو جائے گی تو ایک متفق علیہ فتویٰ ہو جائے گا،مگر معاف فرمایئے اس کے ایک حصے میں وضاحت کی ضرورت تھی،وہاں ابہام رہ گیا مہربانی فرما کر اس ابہام کو رفع فرمائیں،اس فتویٰ کا سب سے آخری فقرہ یہ ہے۔ ”یا مثلاً اس طرح انتظام کردیا جائے کہ ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں اور اس میں ایک مستند اور تجربہ کار مفتی شریک ہو اور وہ کمیٹی اپنے انتظام میں رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرکے حکومت سے اجازت لےکر، بایں الفاظ اعلان نشر کردے کہ ہم فلاں ہلال کمیٹی کے تمام افراد رویت ہلال کا شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء اعلان کرتے ہیں کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہے اور کل یکم رمضان ہے اور روزے رکھے جائیں گے یا کل یکم شوال ہے نماز عید ادا کی جائے گی، پھر اسی طرح ہلال شعبان، ذی الحجہ وغیرہ کے لیے اعلان کردیا جائے،اگر ضرورت پڑے تو جہاں جہاں اس قسم کے ریڈیو وغیرہ کے مراکز ہوں اس قاعدۂ مذکور کے مطابق انتظام کرلیا جائے۔“ آخری لفظ ”اور پھر سب کو ایک میں منسلک کردیا جائے۔“ وضاحت طلب ہیں۔جو بھی وضاحت ہو اس میں اس کا خیال رکھا جائے کہ دہلی۔کلکتہ۔بمبئی۔مدراس وغیرہ کو ایک

سلک میں منسلک کرایا جائے اور کیا اس مختصر وقت میں اس انسلاک پر عمل کرنے کی بھی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟ اس فقرہ کے پیش نظر چند سوال درج ذیل ہیں:

سوال ۱۔ دلی میں رویت ہلال کمیٹی ہے اس میں زیادہ تر علماء کرام ہیں کہ ان کو تجربہ کار مفتی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کمیٹی اگر انتظام کردے کہ اس کے فیصلے کی اطلاع آپ کے پیش کردہ شرائط کے بموجب دہلی ریڈیو سے ہوجائے تو ہندوستان میں جہاں جہاں یہ خبر پہنچے گی تو کیا وہاں کے مسلمانوں کے لئے جائز ہوجائے گا، کہ اسی خبر پر عمل کر کے عید منالیں یا اس کا کوئی حلقہ نہیں ہے اور پورے ہندوستان کے لئے کافی ہے تو آپ کے ''اس قسم کے مرکز ہوں تو ہر جگہ اس قاعدہ کے مطابق انتظام کیا جائے'' الخ'' اور اگر حلقہ ہے'' تو کیا ہے اس کی حدود کیا ہیں؟

۲- اس وقت یہ کمیٹی صرف اہل دلی کی ہے، اس لئے احقر کے خیال میں اس کا فیصلہ اہل دلی کے لئے واجب العمل ہوگا، اہل دلی کے علاوہ اور جگہ جہاں اس فیصلے کی خبر پہنچے گی اس کی حیثیت ایک خبر کی ہوگی اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہوگا، لیکن اگر ایسی شکل بن جائے کہ کمیٹی پورے ہندوستان کی نمائندہ کمیٹی مان لی جائے تو اس کی طرف سے جو اعلان ہوگا وہ پورے ہندوستان کے لئے قابل قبول ہوگا یا نہیں؟

۳- اگر حکومتِ ہندوستان یا کوئی اس کا مسلمان وزیر جس کا تعلق اوقاف وغیرہ امور مذہبی سے ہو وہ چند مستند تجربہ کار مفتی صاحبان کی کمیٹی بنائے اور اعلان کردے کہ یہ کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے ہے تو اگر اس صورت میں یہ کمیٹی فیصلہ کردے اور آپ کی تحریر کردہ شرائط کے بموجب اعلان کردے کہ اس کمیٹی کے جملہ افراد نے رویتِ ہلال کا ثبوت شرعی ملنے کے بعد باتفاق آراء فیصلہ کیا ہے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہوچکا ہے تو کیا اس صورت میں اس کمیٹی کا اعلان ہندوستان کے ہر ایک مسلمان کے لئے قابل تسلیم ہوگا؟ اور ہندوستان کے مسلمان جہاں بھی ہوں ان کے لئے جائز ہوگا کہ اس اعلان کے بموجب اپنے یہاں یکم شوال یا یکم رمضان تسلیم کرلیں؟

۴- کیا کمیٹی کے تمام ارکان کو ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر اعلان کرنا ہوگا، ریڈیو والے تو اس کی اجازت نہیں دیں گے، اور غالباً یہ ممکن بھی نہیں ہوگا کہ سب ارکان بولیں۔ تو کیا یہ جائز نہ ہوگا کہ کمیٹی کا ایک ذمہ دار فرد، مثلاً صدر خود اعلان کرے یا کمیٹی کی طرف سے تحریر جائے اور وہ سنادی جائے، اس کے الفاظ یہ ہوں گے کہ فلاں مقام کی رویت ہلال کمیٹی نے شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء فیصلہ کیا ہے کہ کل فلاں دن یکم رمضان ہے اور روزے رکھے جائیں گے۔ یا الخ

مولانا محمد میاں

الجواب وبالله التوفيق:

گرامی نامہ نے شرف صدور بخشا، عزت افزائی کا شکریہ، شائع کرانے کے سلسلہ میں جیسا جناب کا خیال ہے ہمیں اس سے اختلاف نہیں ہم نے تو خود عرصہ ہوا ''ماہنامہ دار العلوم'' میں شائع کرنے کے لئے دیا ہے، مگر اب تک شائع نہیں ہوسکا، انسلاک سے یہ مقصد نہیں ہے کہ ریڈیو کے تمام مراکز کی ایک کمیٹی بنادی جائے، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ جس طرح مثلاً دہلی میں شرعی قیود وشرائط کے مطابق ہلال کمیٹی قائم ہے، اسی طرح اور جگہ بھی جہاں جہاں ریڈیو اسٹیشن ہوں، شرعی ہلال کمیٹی بنادی جائے اور اس کے ذریعہ آپس میں ایسا ارتباط قائم کرلیا جائے جس سے ایک دوسرے کو اعتماد حاصل ہوجائے، اور کبھی کبھی حسب ضرورت وموقعہ شرعی ہلال کمیٹی کا ایک ایک دو دو نمائندہ لے کر اجتماع کرلیا جائے اور کوئی نئی پیش آمدہ بات ہو تو اس میں تبادلہ خیالات کر کے حتی المقدور یک جہتی حاصل کرلی جایا کرے، اس کے علاوہ بھی اس میں چند فوائد پیش نظر ہیں:

۱-مثلاً جب ہر مرکز ریڈیو سے شرعی اصول وضابطے کے مطابق اعلان یا خبر نشر ہونے لگے گی تو ہر طرح کی افواہوں اور غیر مصدقہ خبروں کی اشاعت کا سلسلہ خود بخود بند یا کم ہوجائے گا، یا کم از کم بے اثر ضرور ہوجائے گا اور عوام الناس اکثر ان الجھنوں سے محفوظ ہوجائیں گے جن میں آج کل عموماً مبتلا ہوجاتے ہیں اور آئندہ مزید ابتلاء کا اندیشہ ہے۔

۲-پورے ملک کے ہر گوشے میں رویت ہلال ممکن ہے اور ہر گوشے سے صرف ایک مقام کی شرعی ہلال کمیٹی تک شرعی اصول وضابطہ کے مطابق اطلاعیں پہنچانا دشوار ہوگا، اور جب ہر مرکز پر معتبر شرعی ہلال کمیٹی ہوگی تو اپنے قریب تر مقام کی شرعی ضابطہ واصول کے تحت اطلاعات پہنچانے اور تحقیق کرنے میں آسانی ہوجائے گی اور آپس میں رابطۂ اعتماد ہونے کی بنا پر اس کی تائید وتوثیق حدود مذکورہ میں، نیز جس مقام تک ان شرعی قیود وشرائط کے مطابق اطلاعات پہنچیں، جن کی تفصیل پورے مضمون میں جابجا کی گئی ہے، بآسانی وہ اطلاعات قابل قبول ہوسکیں گی، اس سے بھی بہت حد تک عوام تشویش وافتراق سے محفوظ رہ سکیں گے۔

اس گزارش کے بعد اب پیش کردہ سوالات کے جواب کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن امتثال امر اور مزید سد طمانیت قلب کی خاطر ہر سوال کے جواب نمبر وار مذکور ہیں۔

۱- ریڈیو کی بعض اطلاعات اعلان کے درجہ میں ہوں گی جن کی طرف ہم مسئلہ ۱-۲ میں اشارہ کر چکے ہیں، اور بعض اطلاع محض خبر کے درجہ میں ہوں گی، جن کی طرف ہم مسئلہ ۳-۴ میں اشارہ کر چکے ہیں۔

بہر حال جب کوئی اعلان یا کوئی خبر شرائط و قیود شرعیہ مذکورہ کے مطابق ہوگی تو پورے ہندوستان کے لئے عمل کے واسطے کافی ہو سکے گی، جس فاصلہ تک اختلاف مطالع کی بحث نہیں آتی، جس کی مقدار بعض روایات فقہیہ کی بناء پر پیدل کی مسافت سے ایک ماہ کی مسافت ہے جو چار سو اسی میل (انگریزی میل سے) دور نہ ہوگی، بلا اختلاف رائے قابل قبول عمل ہو سکے گی، اور اس کے بعد والوں کے لئے بھی ان علماء کے قول کے مطابق جن کے نزدیک ظاہر روایات اور مفتی بہ قول کے تحت اختلاف مطالع معتبر نہیں قابلِ قبول و قابلِ عمل ہو سکے گی، بشرطیکہ اس اعلان یا خبر پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کا مہینہ ۲۹/دن یا ۳۰/دن ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو، جیسا کہ ہم اپنے جواب ۱، ۲ میں و تنبیہ ۲ میں ذکر کر چکے ہیں، اس لئے کوئی حد یا حلقہ متعین کرنے کی ضرورت نہیں، ورنہ ہر مرکز ریڈیو پر شرعی ہلال کمیٹی بنانا ہی بے سود ہوگا۔

۲- اگر ایسی شکل نہ بھی بنے کہ یہ شرعی کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے نمائندہ کمیٹی تسلیم کرلی جائے، جب بھی اس کا اعلان یا خبر جو شرعی ثبوت کے ساتھ ہوگی وہ دہلی والوں کے لئے اور مضافات والوں کے لئے اس فاصلے تک جہاں تک اختلاف مطالع کی بحث نہیں پیدا ہوتی یکساں قابلِ عمل و قابل قبول رہے گی، اور اس کے بعد والوں کے لئے ان علماء کے قول کے مطابق جن کے نزدیک اختلاف مطالع معتبر نہیں اس مذکورہ شرط کے ساتھ قابل عمل و قابل قبول رہے گی جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا علی سبیل التسلیم اور اگر ایسی شکل بن جائے کہ یہ شرعی کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے نمائندہ کمیٹی تسلیم ہو جائے جب بھی اس کے اعلان یا خبر کا حجت صحیح ہونا ظاہر ہے۔

۳- چند مستند و تجربہ کار مفتی صاحبان کی شرعی ہلال کمیٹی بنانے اور اعلان کرنے کے لئے تو کسی مسلمان وزیر یا حکومت کی قید یا شرط نہیں ہے، بلکہ بعض ذی رائے مسلمانوں کی رائے سے بھی ہو سکتی ہے، پس اگر حکومت یا وزراء کا تعاون حاصل ہو جائے تو حدود شرعی کے اندر اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر ایسی صورت ہو جائے کہ حکومت کی جانب سے شرعی قاعدے کے مطابق رویت ہلال کمیٹی کا ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا قانون و انتظام ہو جائے یا کسی مسلمان حاکم، یا مسلمان وزیر کو، خواہ وہ وزیر امور مذہب سے متعلق ہو یا نہ ہو، حکومت کی جانب سے شرعی قاعدے کے مطابق ثبوت رویت ہلال حاصل کر کے اعلان کرنے کا اختیار ہو جائے تو یہ اور عمدہ بات ہوگی بشرطیکہ حدود شرعی کے اندر ہو، جیسا کہ ہم جواب ۱، ۲ میں وضاحت کر آئے ہیں۔

۴- کمیٹی کے تمام ارکان کا ریڈیو اسٹیشن پر پہنچ کر اعلان کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ کمیٹی کا محض ایک ذمہ دار فرد بحیثیت معلن اعلان کر دے یا کمیٹی اپنی طرف سے ایک متفقہ تحریر لکھ کر دیدے جس کے الفاظ وہی ہوں جس کو جناب نے لکھا

ہے اور وہ تحریر سنادی جائے تو یہ بھی کافی ہے، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۷/۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح: مفتی سید احمد علی سعید، مفتی محمود غفرلہ

تذئیل: ادارہ مباحث فقہیہ دہلی کے شائع کردہ استفتاء کا جواب

الجواب وباللہ التوفیق:

تعارفی کلمات کے اخیر میں مذکور ہے کہ تجویز کے زیر عنوان جو لکھا ہے اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے، اس استفتاء ثانی کے جواب میں مطمح نظر یہی جزئیات ہیں پھر صفحہ (ل) کے نوٹ میں درج ہے کہ اس کی تصدیق یا تردید فرمائیں۔ پھر استفتاء ثانی کے ابدائی اجزاء کے متعلق ہم اس کے جواب میں کچھ لکھ چکے ہیں، اس لئے بغیر اختصار اس وقت صرف انہیں مشارالیہ امور سے متعلق کچھ معروضات ہیں:

تجویز۱ کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ نفس اختلاف مطالع کے وقوع سے تو بیشک کسی کو انکار نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے اور یہ بالکل کھلی چیز ہے، البتہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس میں ہے کہ رویت ہلال کا شرعی حکم ثابت ہونے میں اختلاف مطالع کو دخل ہے یا نہیں؟

ظاہر الروایۃ میں اور جمہور امت کے علماء محققین کے نزدیک، خواہ کسی مجتہد کے مکتب خیال سے متعلق ہوں! اس ثبوت کا مدار اختلاف مطالع پر نہیں ہے، بلکہ حسب قاعدہ شرع براہِ راست رویت پر یا رویت کی شہادت پر حسب ضابطہ اس کے اعلان و اخبار پر ہے، جیسا کہ ہم اپنی سابق دو مفصل تحریروں (توحیدِ اہلہ) اور (ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ اطلاعات کا شرعی حکم) میں تفصیل کے ساتھ اس پر مدلل کلام کر چکے ہیں، لہذا اس وقت گفتگو اسی نہج (مبنی بر ظاہر الروایۃ) پر ہونی چاہئے ، اور اگر ثبوت رویت ہلال کا مدار ظاہر الروایۃ سے ہٹ کر اختلاف مطالع پر رکھ دیا جائے تو مسئلہ کی پیچیدگیاں ختم نہ ہوں گی، بلکہ اور بڑھ جائیں گی اور عمل میں سہل کاری کے بجائے اور طرح طرح کی افراتفری اور دشواریاں پیدا ہو جائیں گی اور جس الجھن و پریشانی میں آج قوم مبتلا ہے اور جس کے تدارک کی تدبیر سوچنے کے لئے ہم اکٹھا ہو رہے ہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ الجھاوے اور خرابیاں سامنے آجائیں گی۔

پہلی خرابی: اختلاف مطالع کی حد مثلاً پانچ سو (۵۰۰) میل مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے مطابق ڈھاکہ سے

رویتِ ہلال کا اعلان ہوا۔ ڈھاکہ سے کلکتہ، پانچ سو میل کے اندر ہے، وہاں وہ حکم جو اس اعلان میں تھا نافذ ہوا، لیکن الہ آباد، بنارس مثلاً ڈھاکہ سے پانچ سو (۵۰۰) میل کے بعد اور زیادہ دور ہے۔ وہاں یہ حکم شرعی نافذ نہ ہوگا تو اب فرض کیجئے ادھر دہلی سے بھی رویت شرعی کا اعلان ہوا اور قاعدہ مسلمہ کے تحت اس کا حکم بھی صرف پانچ سو میل تک نافذ ہوگا۔ اور الہ آباد (بنارس کی دوری دہلی سے پانچ سو میل سے زائد ہے، اس لیے پانچ سو میل کے اندر اندر اس اعلان کا بھی حکم وہاں نافذ نہ ہوگا، تو اب یہ نتیجہ ہوگا کہ دہلی و اطراف دہلی میں تمام عید یا رمضان (۵۰۰) میل کے اندر اندر رہوگا، اسی طرح کلکتہ و ڈھاکہ و پٹنہ اور صرف درمیان میں کچھ دور عید نہ ہوگی نہ رمضان تو ذرا خود خیال فرمایئے کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر اس سلسلہ میں کیا کیا اور کتنا کچھ خلفشار و ہنگامہ ہونے کا خطرہ یا ظن غالب ہے۔

دوسری خرابی: اختلاف مطالع کی یہ تحدید ظاہر ہے کہ منصوص تو نہیں ہے، بلکہ مبنی بر حساب و قیاس ہے۔ تو پھر اس پر عبادات جیسے فریضہ کے وجوب و سقوط کا مدار کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کلکتہ سے ہلال رمضان کے ثبوت کا شرعی اعلان ہوا اس کے مطابق پانچ سو (۵۰۰) میل تک کے لوگوں کو روزہ رکھنا فرض ہوگیا اور اس کے بعد والوں کو نا جائز ہوگا، یا مثلاً ہلال عید کے ثبوت کا یہی شرعی اعلان کلکتہ سے ہوا تو پانچ سو میل تک (مثلاً لکھنو تک) کے لوگوں پر روزہ رکھنا حرام اور عید منانا فرض ہوجائے گا اور اس کے مطابق جیسے (شاہجہاں پور وغیرہ) کے لوگوں پر روزہ رکھنا فرض اور عید منانا حرام کیا جائے گا۔

یہ فرض و حرام کا حکم کس نص کے ذریعہ سے ہوگا، اس حکم کا استناد کس نص کی جانب ہوگا، جبکہ یہ تحدید محض قیاسی و حسابی ہے۔

اگر کہا جائے کہ "لکل بلد رؤیتھم" اس کا مستند ہوگا تو اول تو یہ نص شارع نہیں ہے، نہ حقیقۃً نہ حکماً، بلکہ فہم راوی ہے، حتی کہ فہم ابن عباسؓ بھی ہونا اس کا ضروری نہیں ہے، پھر ایسے حکم کی بنیاد اسی چیز پر کس دلیل شرعی سے ہوسکے گی، اور اس قول (لکل أھل بلد رؤیتھم) نص کو بھی تسلیم کرلیں جب بھی اہل کلکتہ اور اس کے توابعات تو اس کا مصداق ہوسکیں گے، لیکن لکھنو تک کے تمام شہر جو کلکتہ سے سیکڑوں میل دور دراز ہوں گے اور قطعاً کسی نوع سے توابعات کلکتہ نہ ہوں گے وہ اس کے مصداق کس طرح ہوں گے؟ اگر کہا جائے کہ اعلان کی وجہ سے یہ سیکڑوں بلاد اس نص کے مصداق ہوگئے کہ یہ اعلان ان تک پہنچ رہا ہے تو بعینہ یہی سوال اور یہی جواب اعلان اور سننے کی بات لکھنو والوں سے بعد والوں کے لئے بھی ہے، تو اب ذرا ہونے والے خلفشار کا اندازہ کیجئے بالخصوص جب کلکتہ اور دہلی دونوں جانب سے یہ اعلانات یکساں ہو رہے ہیں۔

تیسری خرابی: اس سے مثلاً پانچ سومیل کی تحدید کا کیا مفہوم ہے؟ آیا مقام رویت سے ہر طرف پانچ پانچ سومیل یا ہر طرف سے صرف ڈھائی سومیل یا محض ۵۰۰ میل مربع ان ہر سہ تقدیرات پر تفریعات علیحدہ علیحدہ اور آپس میں متضاد ہوں گی، مثلاً اگر پانچ سومربع لیا جائے تو قطر ڈیڑھ سو یونے دوسومیل سے زائد نہ ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ صرف ۱۵۰ یا ۱۷۵ میل ہی پر مطلع بدل جائے، حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں اور اگر ڈھائی سومیل ہر طرف لیا جائے تو بھی لازم آئے گا کہ دو سو پچاس میل کے بعد ہی مطلع بدل جائے، حالانکہ کوئی اس کا بھی قائل نہیں، اور اگر ہر طرف ۵۰۰ میل لیا جائے، جیسا کہ ظاہر اور متبادر ہے تو اس صورت میں مثلاً لکھنؤ سے رویت ہلال کے شرعی ثبوت کا اعلان ہوا، تو یہ اعلان لکھنؤ سے ۵۰۰ میل پچھم دہلی تک اور ۵۰۰ میل پورب کلکتہ تک تمام مقامات کو یکساں شامل اور تمام مقامات کے لئے ثبوت رویت کا یکساں موجب ہوگا، اور اس تقدیر پر کلکتہ سے دہلی تک کا ایک مطلع ہونا لازم آجائے گا جو اپنے مفروض کے خلاف ہوگا۔

چوتھی خرابی: نیز یہ خرابی بھی لازم آئے گی کہ مثلاً جب دہلی سے رویت ہلال کا شرعی ثبوت تسلیم ہو جائے گا تو اس سے پورب سمت میں ۵۰۰ میل کے بعد بھی جتنے مقامات ہوں گے ان سب کے مطلع میں چاند کا ہونا لازمی و لابدی ہوگا۔ اور پورب سمت کے کسی مقام میں اختلاف مطالع کا سوال ہی نہ ہوگا کہ ان میں رویت کا حکم نہ دیا جائے، پھر کس دلیل شرعی سے اس پورب سمت میں بھی ۵۰۰ میل کے بعد عدم رویت اور عدم صوم یا فطر کا حکم دیا جائے گا۔

اس لئے کسی مقدار (۵۰۰ میل یا ۸۰۰ میل وغیرہ) کی تحدید سے پہلے ان احتمالات ثلاثہ کی تعیین و تشریح اس طرح ضروری ہے کہ یہ عائد شدہ اشکالات مرتفع رہیں، ورنہ پھر جو تشتت و افتراق وخلفشار امت میں رونما ہوگا۔ اس کی خرابی احاطہ بیان سے باہر ہے۔

پانچویں خرابی: ظاہر ہے کہ مطلع کا اختلاف آفتاب کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کے تابع ہوتا ہے جس نوع کی حرکت آفتاب کی ہوگی اسی نوع کا اختلاف مطلع ہوگا، پس جب حرکت آفتاب مسلسل اور تدریجی اور ہر آن میں متجدد ہوتی رہتی ہے تو اختلاف مطالع بھی مسلسل اور تدریجی ہوتا رہے گا، بلکہ حقیقت میں ہر آن میں متجدد ہوتا رہے گا، اور پانچ سومیل مقدار کی تحدید محض انتظامی اور تخمینی ہوگی، جو محض میدانی علاقوں میں تو کچھ کام دے سکے گی، مگر پہاڑی مقامات میں یا ان مقامات میں تلال و وہاد (ٹیلے اور گڑھے) بکثرت ہوں، جیسے حواشی سمندر کے اکثر علاقے ہوتے ہیں کام نہ دے سکے گی اور قاعدہ کلی اور عام قرار دینے کی اس میں قطعی صلاحیت نہ ہوگی۔

چھٹی خرابی: اختلاف مطالع کی بنیاد پر ۵۰۰ سومیل کی تحدید یا کسی مقدار کی بھی تحدید پیچیدگیوں کو ختم کرنے والی

نہ ہوگی، مثلاً ۵۰۰ میل کی تحدید پر کلکتہ کا مطلع ۵۰۰ سومیل پر ختم ہوجائے گا، اور جو مقام کلکتہ سے مثلاً سومیل جانب مغرب میں واقع ہے، اس کا مطلع کلکتہ کے انتہا سے سومیل بعد ختم ہوگا، اسی طرح دوسومیل بعد یا تین سومیل بعد کے مقام کا مطلع دوسومیل یا تین سومیل بعد ختم ہوگا۔ وہلم جرا۔

اس مقدمہ کو ذہن میں رکھنے کے بعد اب غور فرمائیے کہ اگر کلکتہ سے سومیل پچھم کسی مقام پر رویت ہلال ہوا، اور وہاں ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے، اس لئے اس کا اعلان کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے وہ تو سننے والا اس اعلان کا حکم کلکتہ سے ٹھیک ۵۰۰ سو میل پر سمجھے گا۔

حالانکہ اس رویت کا حقیقت کے اعتبار سے یہ حکم شرعی مزید سومیل بعد تک جانا چاہئے، اسی طرح اگر کلکتہ سے سو میل یا دو سومیل یا تین سومیل قبل ہی مطلع کی انتہا ہونی چاہئے، حالانکہ اس اعلان سے لوگ پورے ۵۰۰ سومیل تک سمجھیں گے اور عمل کریں گے، اور یہ غلط ہوگا، اب اگر اس اعلان میں یہ سب تفصیلات ظاہر نہ ہوں تو یہ اعلان کسی طرح قابل عمل نہیں رہے گا، چہ جائے کہ واجب العمل قرار پانے کا تصور کیا جائے اور اگر یہ سب تفصیلات اعلان میں ظاہر کی جائیں تو خیال فرمائیے عوام کی الجھنوں کا کیا حال ہوگا، اور کس طرح یہ اعلان قابل عمل بنایا جاسکے گا۔

ساتویں خرابی: اختلاف مطالع کی یہ تحدید مقام اعلان سے ہر چہار جانب پانچ پانچ سومیل ہو یا اس کا نصف نصف ہو یا صرف پانچ سومیل مربع ہو ہر تقدیر پر یہ ضابطہ اور تحدید طول البلد کے اعتبار سے اگر نافذ ہو تو عرض البلد کے اعتبار سے نافذ ہونا ضروری نہیں اور اگر دونوں کا لحاظ کیا جائے تو سمت کے اعتبار سے پانچ سومیل یا ۸۰۰ سومیل یا ۲۵۰ میل وغیرہ ہونا صحیح نہ ہوگا، بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقہ کے اعتبار سے مختلف مقدار ہوگا، پھر یہ تحدید محض ایک کھلونا ہی نہیں، بلکہ دین میں تماشہ بنانے کے مترادف فعل ہوجائے گا۔

غرض ثبوت رویتِ ہلال کی مقدار محض اختلاف مطالع پر رکھتے ہیں تو اسی طرح کی اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اور بہت سی الجھنیں پیدا ہوں گی جن کا دفعیہ یا ان کی اصلاح قابو سے باہر ہوگی۔ اور غالباً ایسی ہی وجوہ ہوں گی جن کی بناء پر ہر طبقہ خیال کے جمہور علماء نے اختلاف مطالع پر ثبوت رویت کی بنا رکھنے کو منع فرمایا ہے، بخلاف اس کے اگر مدار ثبوت رویت بجائے اختلاف مطالع کے ظاہر روایت پر ہی رکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں، اس میں کم از کم ایک معتمد وتجربہ کار مفتی شریک کار ہو اور رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے، بایں الفاظ ریڈیو پر خود اعلان کرے، یا اپنے کسی نائب یا وکیل کے ذریعہ سے کرائے (کہ ہم رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے

اعلان کررہے ہیں کہ کل صبح یوم فلاں یکم رمضان ہے روزے رکھے جائیں یا یکم شوال ہے نماز عید الفطر پڑھی جائے) تو چونکہ یہ اعلان طبل قاضی یا قندیل منارہ یا توپ وغیرہ کی طرح محض علامت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے قوی تر اور واضح شئی (اعلان) ہے یہ بدرجہ اولی غلبہ ظن حاصل ہونے کا سبب اور موجب ہوگا، اس لئے یہ اعلان ان تمام لوگوں کے لئے شرعاً حجت اور موجب عمل ہوگا، جن کو یہ اعلان ۲۹ شعبان یا ۲۹ رمضان کو سنائی دے اور اس عمل کرنے کی وجہ سے ان کا مہینہ ۲۸ر دن کا نہ ہو رہا ہو۔

اگر وہ لوگ اس اعلان کو صحیح اور قاعدہ شرع کے مطابق جانتے اور سمجھتے ہیں تو ان پر اس کے مطابق عمل کرنا دیانۃً واجب اور ضروری ہو جائے گا، البتہ اس اعلان مذکورہ پر عمل کرنے کی وجہ سے جن لوگوں کا مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا ہونا لازم آئے تو ان کو اس اعلان پر عمل کرنا درست و نا جائز رہے گا۔

پس اگر عوام و خواص سب کے سامنے معیار عمل ثبوت صرف یہی اعلان (انہی مخصوص لفظوں میں کہ ہم رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے اور انہی شرائط و قیود کے ساتھ جو ابھی مذکور ہوئیں رکھ دیا جائے تو امید ہے کہ کوئی الجھن سمجھنے میں اور عمل کرنے میں نہ ہوگی، اور نہ ۵۰۰ سو میل یا ۸۰۰ سو میل یا کسی بھی مسافت کی تحدید وغیرہ کی بحث پیدا ہوگی، اور اندرون مملکت و بیرون مملکت کی تحدید کی بحث بھی پیدا نہ ہوگی، بلکہ ظاہر مذہب کے مطابق اس عبارت: "**واختلاف المطالع غير معتبر علىٰ ظاهر المذهب أى قوله) فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم بطريق موجب**"(۱) کے تحت دنیا کے کسی گوشہ و حصہ سے یہ اعلان ۲۹ تاریخ کو مذکورہ بالا شرائط و قیود کے مطابق آئے اور مہینہ ۲۸ دن کا نہ ہو رہا ہو تو شرعاً حجت ہو جائے گا، البتہ اس پر عمل کے نفاذ کا اختیار انتظاماً عوام کو نہ ہوگا، کما حققہ العلامۃ التھانوی فی رسالتہ "زوال السنة عن أعمال السنة" بلکہ مقامی شرعی ہلال کمیٹی کو ہوگا یا مقامی یا قریبی معتمد مفتی یا عالم کو ہوگا جو مسائل متعلقہ ضروریہ سے اچھی طرح واقف ہو جیسا کہ ہم تفصیلی جواب (ریڈیو و ٹیلیفون وغیرہ کی اطلاع کا شرعی حکم) میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

تجویز ۲ اس سلسلہ میں کچھ تو ہم تجویز ۱ میں کہہ آئے ہیں اور بعض یہ امور مزید عرض کرتے ہیں، جن کو نمبر وار عرض کرتے ہیں:

● زیر عنوان "رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل" دفعہ (ب) یہ عرض ہے کہ تشکیل اور یہ تحدید اگر اختلاف مطالع کی بنیاد پر

۱- درمختار علی ھامش الشامی ۲/۹۶۔

قائم کی گئی تو یہ سب غیر معتبر اور غیر صحیح شمار ہوگی، چہ جائیکہ واجب التسلیم ہو، اور دفعہ (د) کے تحت قولہ ''صاحب بصیرت امام'' اس میں امام کا مطلقاً اور محض صاحب بصیرت ہونا کافی نہیں، بلکہ امام کا ان ضروری مسائل سے بھی اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے جو اس قسم کے معاملات سے متعلق ہوں، اور اس امام کا تنہا فیصلہ بھی محض اسی صورت میں قابلِ تسلیم ہوگا، جبکہ وہاں مستند شرعی ہلال کمیٹی موجود نہ ہو، لہذا اس میں یہ قید بھی لگانی ضروری ہے۔

● ربط ہم کے تحت (دفعہ الف تا و) جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس سے تقویت و تائید کا فائدہ تو بیشک حاصل ہوگا، لیکن ان میں سے کسی سے بھی یہ قوت پیدا نہ ہوگی کہ اس پر مدار ثبوت اور حکم رکھ دیا جائے تو محض اس کی بنیاد پر رویت کا فیصلہ کردیا جائے، اس لئے کہ ان میں کوئی شق بھی طرق موجبہ (**شهادة على الرؤية، يا شهادة على الشهادة على القضاء، يا استفاضة**) میں سے نہیں ہو رہی ہے، اور نہ ہی کتاب القاضی کے ضابطہ پر پوری اتر رہی ہے اور نہ ہی "**لو كان ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلين للضرورة**"(۱) کے قاعدہ میں داخل ہو رہی ہے کہ مفید مطلب ہو سکے۔

ہاں اگر اس کمیٹی میں سے کوئی شخص اس ٹیلی ویژن یا ٹیلیفون سے، بایں الفاظ خبر دے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں شخص (اور وہ معلوم و معتبر ہو) نے مجھ سے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہو کہ اس نے واقعی خود چاند دیکھا ہو، یا اس سے فلاں شخص نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہو، تو یہ خبر معتبر ہوگی، اسی طرح اگر کوئی ایسی شرعی کمیٹی ہو جس میں مزید تین افراد ارکان ہوں اور خبر دینے والے کے سامنے ان افراد کمیٹی نے چاند دیکھنے کی شہادت لیکر ثبوت رویت کا فیصلہ کیا ہو، اور یہ خبر دینے والا شخص خبر دے کہ میرے سامنے یہاں کی ہلال کمیٹی نے چاند کی شہادت شرعی لیکر رویت ہلال کے ثبوت کا فیصلہ دیا ہے، اور معاملہ رمضان المبارک کے چاند کا ہے، اور مطلع غبار آلود ہے تو یہ ایک خبر (ٹیلیویژن یا ٹیلیفون کی) بھی ثبوت کے لئے کافی ہو جائے گی، اور اگر مطلع غبار آلود ہو صاف نہ ہو اور چاند عید کا ہو یا کسی اور مہینہ کا ہو یا چاند رمضان ہی کا ہو مطلع صاف ہو اور غبار آلود نہ ہو تو کم سے کم ایسی ایسی دو خبروں کا دو ٹیلیفونوں کے ذریعہ آنا ضروری ہوگا، جو اپنی مقرر کردہ یا تسلیم کردہ شرعی رویت ہلال سب کمیٹیوں میں سے دو مختلف کمیٹیوں سے آرہے ہوں۔

اگر یہ خبریں انہی مقرر کردہ و متعینہ الفاظ میں آرہی ہیں جو متعینہ الفاظ بھی اوپر مذکور ہوئے ہیں، مگر اپنی مقرر کردہ یا تسلیم کردہ رویت ہلال کمیٹی سے نہیں آرہی ہیں، بلکہ آزاد جگہوں اور آزاد لوگوں کی جانب سے آرہی ہیں اور مطلع صاف ہے، تو

۱- درمختار کتاب الصوم ۳/ ۳۵۴ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان (مرتب)۔

خواہ رمضان کا چاند ہو یا غیر رمضان کا مختلف مقامات سے اتنی تعداد میں آجانا ضروری ہے کہ صداقت کا ظن غالب حاصل ہوجائے اور صداقت کے غلبہ ظن حاصل ہونے کے لئے کسی تعداد کی تعیین وتحدید نہیں ہے، بلکہ شرعی رویت ہلال کمیٹی سب ارکان کی متفقہ صوابدید پر موقوف ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نقل مطابق اصل طریقہ کار کی تفصیل:

۱-اس مرکزی ہلال کمیٹی کے تحت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے متعلق اور اسی طرح بھارت کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے متعلق شرعی رویت ہلال کی الگ الگ سب کمیٹیاں بنادی جائیں جن کے سب افراد باشرع ہوں اور ان میں ایک مستند مفتی یا معتمد عالم بھی شریک رہے اور کل افراد کی تعداد پانچ نفر سے زیادہ نہ رہے۔

اور ان کمیٹیوں کے ذمہ یہ کردیا جائے کہ اپنے اپنے علاقہ سے رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے ریڈیو اسٹیشنوں سے، بایں الفاظ اعلان کریں کہ رویت ہلال شرعی ثبوت حاصل کرکے بہ اجازت مرکزی ہلال کمیٹی یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل صبح یکم رمضان ہے، روزے رکھے جائیں، یا کل صبح یکم شوال ہے، نماز عید ادا کی جائے۔

۲-چونکہ صوبائی ریڈیو اسٹیشنوں سے جو اعلانات نشر ہوں گے ان کا پورے ملک میں پہنچنا ضروری نہیں ہے، اس لئے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے متعلق جو شرعی ہلال کمیٹی ہو وہ تمام اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے اپنی سب کمیٹی کے اعلان کو سننے کا خود ہی انتظام والتزام اس تاریخ (۲۹) میں کریں اور جن اسٹیشنوں سے وہاں کی ہلال کمیٹی شرعی قیود وشرائط کے تحت رویت ہلال کا اعلان نشر کرے یہ کمیٹی بھی بغرض تصدیق وتکمیل یہ اعلان آل انڈیا ریڈیو سے کردے، تاکہ پورے ملک میں یکساں طور پر اعلان پہنچ جائے۔

۳-حکومت سے یہ مطالبہ کرلیا جائے کہ اس شرعی کمیٹی کے اعلان کے علاوہ اور کوئی رویت ہلال کے بارے میں حکومت نہ کرے یا اگر اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے یہ اعلان نشر کرے تو کم ازکم اس شرعی ہلال کمیٹی کے اعلان کو فوراً نشر کرادینے کا انتظام کردے، اور شرعی ہلال کمیٹی کے افراد خود یا کسی اپنے نائب سے یہ شرعی اعلان نشر کرائیں، اس نائب کا اس شرعی ہلال کمیٹی کے افراد میں سے ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے، اس طریقہ سے یہ اعلان دیانۃً مستند ہوجائے گا۔

۴-ریڈیو اسٹیشنوں کے علاوہ بھی جہاں تک ممکن ہو ہر ہر شہر وقصبہ و بڑی آبادی میں سے یہ مرکزی ہلال کمیٹی اپنی ہلال کمیٹی اس مقام کے مذہبی لوگوں کے تعاون سے قائم کرادے، اور اس کے ذمہ یہ کام کردے کہ اپنے اپنے علاقہ رویتِ ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے جس طرح اپنے یہاں مقامی طور پر اعلانِ ثبوت رویت کرے، اسی طرح اپنے قریب تر ریڈیو اسٹیشن سے متعلق شرعی ہلال کمیٹیوں کو بھی شرعی اصول وضوابط کے مطابق آگاہ کردیا جائے۔

۵-جن جن مقامات میں شرعی اعلان پہنچے گا اگر وہاں ۲۹ رتاریخ ہو اور اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو تو وہاں کے لوگوں پر اس اعلان کے مطابق عمل کرنا دیانۃً ضروری ہو جائے گا، اس لئے اگر اس جگہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی موجود ہو تو وہ کمیٹی ورنہ وہاں کا مستند مفتی یا معتمد عالم اس اعلان کی وضاحت کرادے۔

۶-جن جن مقامات میں اس شرعی ہلال کمیٹی کا اعلان نہ پہنچے وہاں کے لوگ اپنی مقامی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی اگر یہ نہ ہو تو اپنے یہاں کے مستند مفتی یا معتمد عالم کی ہدایت کے تحت رویت کا شرعی ثبوت حاصل کر کے روزہ رکھیں۔

۷-جن جن مقامات میں شرعی ہلال کمیٹی یا مستند مفتی یا معتمد عالم وغیرہ کوئی نہ ہو تو وہاں کے لوگ اپنے کسی قریبی آبادی سے جس میں اس کا شرعی نظم ہو اس سے اپنے کو منسلک کر کے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا کریں۔

۸- چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن سے متعلق جو ہلال کمیٹیاں ہوں گی ان کے سامنے رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو جائے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں جہاں ریڈیو اسٹیشن اور ہلال کمیٹیاں ہوں، ان میں سے کسی مقام میں رویت نہ ہو اور ایسے مقامات میں شرعاً ثابت ہو جائے، جہاں ریڈیو اسٹیشن اور ہلال کمیٹیاں بالکل نہ ہوں، اس لئے کسی اسٹیشن سے یہ اعلان تو ہرگز نہ کیا جائے کہ رویت ہلال شرعاً ثابت نہیں۔ اول تو سکوت کیا جائے کہ کوئی اعلان ہی نہ کیا جائے اور مصلحت سے اعلان ضروری ہو تو یہ اعلان کیا جائے کہ ہمارے پاس رویت کا ثبوت نہیں پہنچ سکا ہے، لہذا جن لوگوں کے یہاں رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہو وہ لوگ اپنے طور پر اس کے مطابق روزے رکھیں یا عید منائیں۔

۹-رویت ہلال کمیٹی کے انعقاد اور اس کے لئے انتظام یا اہتمام کا مقصد ہرگز توحید اہلہ نہیں ہے کہ سارے ملک میں شرعاً ایک ہی دن روزے رکھے جائیں، اور ایک ہی متعین دن میں سارا ملک عید و بقرعید یا شبِ برأت وغیرہ منایا کرے، کیونکہ یہ چیز شرعاً تو مطلوب ہی نہیں ہے اور نہ اس کا التزام ہی درست یا محمود ہوگا، بلکہ یہ چیزیں منشاء شرع اور شارع علیہ السلام کے خلاف ہیں، جیسا کہ ہم اپنے رسالہ توحید اہلہ میں تفصیل سے کہہ چکے ہیں۔ اس انتظام اور اہتمام کا مقصد صرف یہ ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ سے آواز اور غیر شرعی خبروں اور طرح طرح کی اطلاعات اور نشریات کی وجہ سے غلط

طریقے پر جوروزے رکھے جاتے ہیں یاعید منائی جاتی ہے، نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ چیز جائز نہیں ہے اوراس سے روزہ اور نمازعید وبقرعید جیسی اہم عبادتیں خراب اورتباہ ہوجاتی ہیں،اورمزید لوگوں پریشانیاں اورتباہیوں کاموجب ہوتی ہیں،اس طرح عوام ان عام اطلاعات ونشریات کی وجہ سے جوتشویشات اورالجھنیں پیدا کرکےنزاع وفساد کاسبب بن جاتے ہیں،ان کابھی فی الجملہ انسداد ہوسکے کہ یہ چیزیں شرعاناجائز ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت معیوب اورشرمناک المیہ بھی ہوتا ہے۔

۱۰-ان مسائل اورطریقہ کاراور دستورالعمل کی پوری ملک میں ہرجگہ ہروقت خوب اشاعت وتشہیر کی جائے اور پمفلٹ چھپوا کران ایام میں مفت تقسیم کرائے جائیں،مختلف اخبار ورسائل میں بھی ان مسائل اورطریقہ کار کی متعدد بار اشاعت کی جائے اورعوام کوآگاہ کیاجائے کہ وہ ان مسائل کوخوب سمجھ لیں اورہرریڈیو وٹیلیفون کے ہراعلان یاخبر پرتوجہ نہ دیں،بلکہ شرعی اصول وضوابط کےمطابق جواطلاعات ملیں صرف ان کےمطابق عمل کریں،مثلااس شرعی ہلال کمیٹی کی جانب سے شرعی ثبوت کے بعدان مخصوص شرعی الفاظ میں (کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اعلان کیاجاتا ہے)جواعلان نشر ہوفقط اس کی اتباع کریں یااپنے یہاں کی مقامی شرعی ہلال کمیٹی یااپنے مفتی یامعتمد عالم کی ہدایت کے مطابق عمل کریں اورخوب سمجھ لیں کہ یہ احکامات وانتظامات شرعی ہیں،لہذااپنےطور پرخودرائی سے کوئی عمل نہ کربیٹھیں ایسا کربیٹھناشرعاً درست نہ ہوگا،بلکہ نیکی اورنیک کام وعبادت بربادکرنے کےہم معنی ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۴/۹/۹۱ ۱۳ھ

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے لائحہ عمل کے سلسلہ میں گزارش ہے کہ جناب اس کومرتب کرنے کے لئے اپنا قیمتی وقت اس میں لگائیں!اورحسب ذیل نکات کی طرف خاص توجہ فرمائیں!

۱-رویت ہلال کی شہادت میں شاہد کاعادل ہونا:

رؤیت کی شہادت میں شاہد کی عدالت پر روشنی ڈالیں،کیا فاسق ذی مروت وذی وجاہت کی اس سلسلہ میں شہادت معتبر ہوسکتی ہے یانہیں؟

۲-رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی خبرجہر مستفیض ہوگی یانہیں؟

اگررویت عامہ اس مقصد کے لئے بنانا ہوتوشرعی کمیٹی کےفیصلہ کی خبربذریعہ خطوط یاٹیلیفون ملےتواس کوخبرمستفیض کہاجاسکےگایانہیں؟

۳-شرعی فیصلہ کے اعلان کے لئے کیا معتمد مسلمان کا ہونا ضروری ہے؟

جبکہ ریڈیو پر رویت ہلال کے شرعی فیصلے کا اعلان علامت کے درجہ میں معتبر ہو، اعلان کنندہ کے لئے مسلم معتمد کی شرط ضروری ہے یا نہیں؟

امید کہ بہت جلد لائحۂ عمل مرتب فرما کر ارسال فرمانے کی زحمت گوارہ کریں گے، تاکہ مرکزی کمیٹی بلا کر اس کا فیصلہ لیا جاسکے۔

قاضی سجاد حسین (کنوینر، کل ہند رویت ہلال کمیٹی جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان، دہلی-۶)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-مسلمان اگرچہ فاسق ہو لیکن اگر ذی مروت و ذی وجاہت و باوقار ہو کہ جھوٹ بولنے میں اپنی توہین سمجھتا ہو، سبکی محسوس کرتا ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو تو اس کی شہادت قابلِ قبول و معتبر ہوسکتی ہے (**كما في كتاب الشهادة من الدر والبحر وغيرها**)۔

۲-ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ شام کو بعد غروب ہوگا اور کبھی کافی دیر بعد بھی ہوسکتا ہے اور محض چند گھنٹہ بعد صبح سے ہی روزہ رکھنا یا عید منانا ہوگا اور اتنے قلیل عرصہ میں کوئی خط بذریعہ ڈاک نہیں آسکتا، البتہ دستی خطوط یا ٹیلیفون یا ریڈیو کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

اگر ریڈیو کے ذریعہ ہو تو اس میں وہی متعین لفظوں میں اعلان (کہ ہم شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد الخ) مفید ہوگا، اور اگر دستی خطوط کے ذریعہ سے ہو تو اگر شرعی کمیٹی کا فیصلہ دوسری شرعی کمیٹی کو پہنچانا مقصود ہے اور وہ فیصلہ ہلال رمضان سے متعلق ہے تو باقاعدہ کتاب القاضی کی ایک تصدیقی تحریر ایک معتبر مسلمان کو بھی شاہد بنا کر اور اپنی مہر وغیرہ لگا کر اس شاہد کے ذریعہ دوسری شرعی کمیٹی تک بھیج دی جائے تو معتبر ہو جائے گا، اور اگر ہلال رمضان کے علاوہ کسی اور مہینہ سے متعلق ہلال کا فیصلہ ہے تو اسی تصدیقی تحریر پر دو معتبر شخصوں کو شاہد بنا کر انہی دونوں کی معرفت بھیج دی جائے، باقی ٹیلیفون میں چونکہ عام طور سے کتاب القاضی الی القاضی کی صورت نہیں بنتی، اس لئے اس سے عام طور سے صرف تقویت و تائید کا فائدہ حاصل ہوسکے گا اس پر حکم کا مدار نہ رکھ سکیں گے۔ہاں بعض صورتیں اس میں بھی مفید ہوسکتی ہیں جس کو ہم اسی منسلک تحریر کے اخیر میں اپنے اس قول (ہاں اگر اس کمیٹی الخ) سے اخیر تک تفصیل سے پیش کر رہے ہیں۔اسی میں دیکھ لیا جائے اعادہ میں طول کے سواء کچھ

نہیں!

۳-ریڈیو کا یہ شرعی اعلان قاضی یا قندیل منارہ یا صورتِ مدافع کی طرح محض علامت ہی نہیں ہے کہ اس پر قیاس کیا جائے، بلکہ اس سے بہت اونچی چیز ہے اور با قاعدہ اعلان ہے اور اعلان کرنے والا اس کمیٹی کا نائب یا وکیل ہوگا، پس جس طرح اس کمیٹی کے لئے کچھ شرائط وقیود ہیں اسی طرح اعلان کرنے والے کے لیے بھی کچھ شرائط ہوں گی، کم از کم اس کا مسلمان ہونا ضروری ہوگا۔ اور اس حکم کا ماٰخذ وہ احادیث ہوں گی جن میں حضور ﷺ نے کسی امر کا اعلان کرنے کے لئے یا کسی دینی کام کی تکمیل کے لئے اپنے نواب یا قائم مقام بھیجے ہیں اور بالخصوص یہ حدیث: "**عن ابن عباس قال: جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال يعني هلال رمضان فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله! قال: نعم، قال أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا**"(۱)۔ اس کا ماخذ ہو سکے گی اور آیت کریمہ: "**لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا**" (۲) کا اشارہ بھی اس طرف ہے اور حضرت عمر ؓ کا واقعہ جس کو صاحب تفسیر مظہری نے فرمایا: "**لا تتخذوا اليهود والنصارىٰ أولياء**" (۳) کے تحت نقل کیا ہے، بہت واضح رہنمائی کرتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پاکستان رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ کیا ہندوستان کے لئے بھی معتبر ہوگا؟

ہندوستان اور پاکستان کا مطلع تقریبا ایک ہی ہے اور پاکستان میں پورے ملک کے لئے رویت ہلال کمیٹی حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے زیر قیادت شرعی اصول وضوابط کے ماتحت بنی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ جس طرح پورے پاکستان کے لئے معتبر اور قابل عمل ہے اسی طرح اختلاف حکومت کے باوجود پاکستان رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کو شرعی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے لئے بھی معتبر اور مقبول قرار دینے کی اجازت وگنجائش فقہی اصول کے پیش نظر ہے یا نہیں؟

مصلح الدین (مولوی شمس الدین روڈ مغلواڑہ، بڑودہ، گجرات)

۱- رواہ الجماعۃ والدارمی مشکوٰۃ شریف ۱/۱۷۴۔

۲- سورہ نساء: ۱۴۱۔

۳- سورۂ مائدہ: ۵۱۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں ہندوستان اور پاکستان کا مطلع ایک ہی سا ہے، جیسا کہ مرادآباد کے اجلاس میں اکابر تصریح فرما چکے ہیں، جب شرعی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ شرعی ضابطہ کے مطابق ۲۹ رتاریخ کو ہم تک پہنچے گا تو شرعاً معتبر ہوگا، ورنہ شرعاً معتبر نہ ہوگا، اس کے معتبر ہونے کے اصول وضوابط وقیود وغیرہ بھی سب تفصیل سے اس رسالہ میں مذکور ہیں مطالعہ فرمائیں، ہاں اگر کسی چیز میں اختلاف ہو تو مع وجہ اختلاف عرض کرے گا، یا رجوع کرے گا فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۹/۱۳۹۸ھ

رویت ہلال عیدگاہ کمیٹی ممبئی کی رویت ہلال سے متعلق مفصل بحث

سوال:۱ (الف) رویت ہلال کا مسئلہ رویت وخبر سے تعلق رکھتا ہے یا شہادت سے؟

(ب) اگر خبر سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہئیں۔

(ج) اگر شہادت سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہئیں؟

ڈاڑھی مونڈنے کی خبر یا شہادت:

(د) داڑھی مونڈنے والے شخص کی خبر یا شہادت قبول کرلی جائے گی یا نہیں؟

اختلاف مطالع کی جغرافیائی حقیقت:

سوال ۲ (الف) کیا اختلاف مطالع کی کوئی جغرافیائی حقیقت ہے؟

ایک علاقہ کی رویت دوسرے علاقہ کے لئے:

(ب) کسی مقام یا علاقہ کی رویت دوسرے مقام یا علاقہ کے لئے شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

(ج) کیا مشرقی علاقہ کی رویت جہاں آفتاب پہلے غروب ہوتا ہے مغربی علاقہ کے لئے جہاں آفتاب بعد میں غروب ہوتا ہے معتبر سمجھی جانی چاہئے یا نہیں؟

کیا ہندوستان کے ایک مقام کی رویت پورے ملک کے لئے معتبر ہوگی؟

(د) کیا ہندستان کے کسی مقام کی رویت کو پورے ملک کے لئے قابل قبول ہونا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ہلال رمضان تو مطلقاً خبر سے متعلق ہے باقی اور ہلال (عید وغیرہ)، اگر حاکم یا والی مسلم یا قاضی شرع یا اس کا قائم مقام، جیسے رویت ہلال کمیٹی وغیرہ موجود ہو تو شہادت سے متعلق ہوتا ہے، ورنہ وہ بھی خبر شرعی سے متعلق ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

الف: **"وقيل: بلا دعوىٰ وبلا لفظ أشهد وبلا حكم ومجلس قضاء، لأنه خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم وغبار وخبر عدل أو مستور۔**

ب: **"وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادت ولفظ أشهد وعدم الحد في قذف لتعلق نفع العبد"۔**

ج: **"ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلين مع العلة للضرورة إلى الاٰخر"**

اور اس کے تحت "شامی کتاب الصوم" (۱۲۵/۲) میں ہے:

"قوله للضرورة الخ أى ضرورة عدم حاكم يشهد عندهٗ"(۱)۔

اس لفظ "للضرورۃ" سے معلوم ہوا کہ اگر حاکم شرع یا اس کا قائم مقام موجود ہوگا تو اس کو تقدم ہوگا اور فیصلہ کرنے کا استحقاق اسی کو رہے گا۔

(ب، و، ج) شہادت کے متعلق ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خصومات یا حقوق العباد میں واقع شدہ نزاعات کی طرح ہر اعتبار سے تحت القضاء داخل ہو، بلکہ مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز اگر چہ دیانات کے قبیل سے ہے، مگر چونکہ اس کا تعلق عامۃ المومنین سے ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں جیسے رویت ہلال فطر میں کہ اس میں نفع عباد کا بھی تعلق ہو جاتا ہے، اس لئے درستگی نظم اور عمدگی امتثال کے لئے قضا و امارات سے تعلق ہو جاتا ہے اور قضا و امارات سے متعلق ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ امیر المؤمنین و صاحب قوت قہریہ کا موجود ہونا ضروری ہو، بلکہ اگر یہ موجود ہو تو فہوالمراد ورنہ ایسا معتمد و ثقہ شخص جو تراضی مسلمین سے اس قسم کے معاملات میں حدود شرع میں رہ کر فیصلہ کرنے کے لئے اور اس میں جو اختلافات رونما ہوں، ان کو دور کرنے کے لئے منتخب و نامزد کر دیا گیا ہو تو کافی ہے۔

۱- شامی ۱۲۵/۲۔

اور اگر ایسا عند الکل معتمد شخص موجود نہ ہو تو جماعت مسلمین (جیسے رویت ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں) یا خطیب جامع مسجد وعیدگاہ یا وہاں کا معتمد مفتی یا عالم جس کے سامنے اس قسم کے معاملات میں رجوع کیا جاتا ہو قاضی شرع کے قائم مقام قرار دے کر اس کے سامنے اس قسم کے شہادتیں گزار کر ثبوت رویت حاصل کرلیا جائے، کیونکہ وجوب صوم وافطار کا مدار محض ثبوت رویت پر ہے جو شرعی ضابطہ کے مطابق ہو، جیسا کہ آیت کریمہ: "**فمن شهد منكم الشهر فليصمه**" (۱) کے منطوق اور احادیث صحیحہ کے مدلول اور مفہوم سے واضح ہوتا ہے، مثلاً:

الف: "**صوموا الرويته وأفطروا لرؤيته**" (۲)۔

(چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو اور چاند ہی دیکھ کر افطار کیا کرو)۔

ب: "**ولا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه فإن أغمي عليكم فاقدروا له ثلاثين (وفي رواية) فعدوا ثلاثين**" (۳)۔

(روزہ مت رکھا کرو اور اسی طرح افطار مت کیا کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو اور اگر بوجہ ناصافی مطلع چاند مخفی رہ جائے تو (مہینہ کی) مقدار پوری کرلیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے لئے تیس دن پورے کرلیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ تیس کا شمار کیا کرو)۔

ج: "**لا تقدموا الشهر حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة، ثم صوموا حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة**" (۴)۔

(کسی مہینہ کی ابتداء) چاند دیکھنے پر مقدم نہ کیا کرو (اگر چاند نظر نہ آوے تو) شمار (تیس دن کا) پورا کرلیا کرو پھر (اسی طرح چاند دیکھ کر) روزہ رکھا کرو، یا تیس دن کا شمار پورا کرلیا کرو)۔

اور جن شرائط وقیود کا قبول شہادت وخبر میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ان کی تفصیل فقہائے کرام رحمہم اللہ نے اس طرح تحریر فرمائی ہے۔

(۱) اگر موقع ہلال رمضان کا ہو اور مطلع ناصاف ہو، یعنی کسی غبار وغیرہ کی وجہ سے رویت عامہ سے مانع ہو تو محض ایک

۱- سورۂ بقرہ:۱۸۵۔
۲- مسلم ۱/۳۴۷۔
۳- مسلم ۱/۳۴۷ وابوداؤد۔
۴- ابوداؤد ۱/۳۲۵ (مرتب)۔

عادل یا مستور الحال مسلمان کی شہادت سے روزہ رکھنے کا حکم دیدیں گے، خواہ وہ گواہ گواہی دینے کا لفظ (میں گواہی دیتا ہوں الخ) کہے، یا نہ کہے دونوں صورتیں معتبر ہوں گی (درمختار)۔

(۲) اگر موقع ہلال عیدین یا کسی اور مہینہ کا ہو اور مطلع نا صاف ہو تو دو عادل یا مستور الحال ثقہ مسلمانوں کی شہادت سے جو گواہی کے الفاظ (مثلاً گواہی دیتا ہوں الخ) کے ساتھ ہو (درمختار)

(۳) اگر موقع ہلال رمضان یا غیر رمضان (عیدین وشعبان وغیرہ) کا ہو۔ مگر مطلع صاف ہو تو عادل یا مستور الحال ثقہ مسلمانوں کی شہادت (گواہی کے الفاظ) کے ساتھ اتنی تعداد میں ہو کہ رویت ہلال کے ثبوت کا ظن غالب ہو جائے۔

نوٹ: یہ تعداد متعدد ہونے کے بعد کسی خاص عدد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (ہلال کمیٹی وغیرہ) کی صواب دید پر محمول ہے۔

(۴) اگر ایسے مقام میں رویت ہلال کے ثبوت کا مسئلہ پیش کیا جائے جہاں قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی یا خطیب جامع مسجد وغیرہ) کوئی موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگوں پر لازم ہوگا کہ وہ لوگ انہی تفصیلات مذکورہ کے ساتھ جو ابھی تین نمبروں میں مذکور ہوئی ہیں، عادل یا مستور الحال مسلمان کے قول وخبر کے مطابق عمل کریں، عوام خود رائی ہرگز نہ کریں۔

(و) داڑھی رکھنا تمام انبیا علیہم السلام کی سنت اور تمام انبیاء کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کو اپنانے کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے اور مونچھ کٹانے اور داڑھی رکھنے کو مسلمانوں کی پہچان اور اسلامی شعار بتایا گیا ہے اور اس کا بھی بہت تاکیدی حکم دیا گیا ہے: ''قصوا الشوارب واعفوا اللحیٰ (وفی روایۃ) حلقوا الشوارب واعفوا اللحیٰ وخالفوا زی الأعاجم''(۱)۔

(مونچھوں کو کٹایا کرو اور داڑھی کو بڑھایا کرو اور ایک روایت میں ہے مونچھوں کو صاف کروایا کرو۔ یعنی جلد سے بال نکال دیا کرو، مونڈ کر یا کاٹ کر، اور داڑھی کو بڑھا کے رکھا کرو، اور اعاجم (غیر مسلمین) کے طور طریقے کی مخالفت کیا کرو)۔

۱- مسلم/۱/۱۲۹، باب خصال الفطرۃ، اس باب کی تمام احادیث سے متعلق تفصیلات کتاب الصلاۃ میں گذر چکی ہیں، حسب ضرورت رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس مضمون کی بہت سی تاکیدی روایات واحادیث اور بھی ہیں، اس کو شعار اسلامی قرار دینے سے اہمیت اور عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے، قرآن کریم میں ہے: ''ومن یعظم شعائر اللہ فإنھا من تقوی القلوب'' (۱) اور شعائر کے تحفظ کرنے وزندہ رکھنے میں قوم کی بقاء وزندگی مضمر رکھی گئی ہے، انہی وجوہ سے داڑھی نہ منڈانا واجب قرار پایا ہے اور یہ ایسا کبیرہ ہے کہ اس کو چھپانا بھی چاہے تو چھپایا بھی نہیں سکتا۔ اور پھر اس کے منڈانے کی عادت کر لینے میں تو کبیرہ ہے کہ اس کو چھپانا بھی چاہے تو چھپایا بھی نہیں سکتا، اور پھر اس کے منڈانے کی عادت کر لینے میں تو کبیرہ گناہ کے ارتکاب علی الاعلان پر اصرار ہو جاتا ہے جس سے معصیت کبیرہ کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسا علانیہ وظاہر ارتکاب ہوتا ہے کہ اس کے ثابت کرنے میں کسی دلیل شرعی کے قائم کرنے کی احتیاج بھی نہیں رہتی ہے، اس لئے ایسا شخص اصطلاح شرع میں خود بخود فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے جس طرح تارک صلوٰۃ تارک صوم جو علی الاعلان وبر ملا صوم وصلوٰۃ کو ترک کرتا ہو، اگر چہ داڑھی رکھتا ہو، مگر وہ بھی فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے اور داڑھی رکھنا اس کو فسق سے نہیں بچاتا، لیکن اس کے باوجود اس کی شہادت ہر موقع میں نامقبول ومردود نہ ہوگی، بلکہ بہت سے مواقع میں مقبول ومعتبر ہوگی، جیسا کہ اگلی تفصیلات سے عنقریب واضح ہو جائے گا، اس لئے کہ فاسق معلن کے بارے میں حکم خداوندی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو تبیین کرو، اور بغیر تحقیق وتبیین کے کوئی حکم اس کی خبر پر نہ لگاؤ۔

اور اس کا حاصل یہی ہے کہ اگر تحقیق وتبیین کے بعد خبر کی صداقت کا ظن غالب ہو جائے تو وہ مقبول ہو سکتی ہے، لہذا جب شرعی اصطلاح کے مطابق کوئی شخص فسق میں ابتلاء کے ساتھ شہادت یا خبر دے گا تو بحکم آیت قرآنی اس کی تبیین وتحقیق کریں گے اور قاضی خان کی ذکر کردہ تفصیل کے مطابق قبول یا عدم قبول کی تعیین کریں گے۔ قاضی خاں اس طرح فرماتے ہیں:

''الفسق لا یمنع أھلیة الشھادة عندنا...... وانما یمنع أداء الشھادة لتھمة الکذب، وتکلموا فی الفسق الذی یمنع الشھادة اتفقوا علی أن الإعلان بکبیرة یمنع الشھادة فی الصغائر إن کان معلنا نوع فسق مستشنع یسمیه الناس بذلک فاسقا مطلقا لا تقبل شھادته، وإن لم یکن کذلک ینظر إن کان صلاحه أکثر من فساده وصوابه أغلب من الخطاء ویکون سلیم القلب یکون عدلا تقبل شھادته......

۱- سورہ حج: ۳۲۔

وعن أبي يوسفؒ إن كان الفاسق وجيها ذا مروءة جازت شهادته؛ لأن مثله لا يكذب" (۱)۔

(فسق کسی کو اس کے شاہد بننے کی صلاحیت سے نہیں روکتا، بلکہ کذب کی تہمت کی وجہ سے شہادت ادا کرنے (اور قبول کرنے سے) روکتا ہے (اور علماء نے اس فسق کے بارے میں جو ادائے شہادت سے روکتا ہے) پوری گفتگو فرمائی ہے، علماء نے اتفاق کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو علی الاعلان کرنا قبول شہادت سے روک دیتا ہے اور صغائر کو بالاعلان کرنے میں تفصیل ہے کہ اگر اس قسم کا ہو جس سے شنیع وقبیح درجہ کا فسق نمایاں ہو کر اس کی وجہ سے عوام الناس اس کو فاسق سمجھنے لگتے ہوں تو اس کی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اور اگر وہ شخص ایسا نہ ہو تو غور کریں گے اگر اس کی صلاح واچھائیاں اس کی خطاء وبرائیوں پر غالب ہوں اور وہ شخص سلیم القلب ہو تو وہ عادل ہی شمار ہوگا اور اس کی شہادت بھی مقبول ہوگی اور حضرت امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر فاسق ذی وجاہت اور با مروت ہو تو اس کی شہادت بھی مقبول ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ایسا آدمی جھوٹ نہیں بولتا جھوٹ کو اپنی حیثیت عرفی کے منافی سمجھتا ہے)۔

اور اسی مضمون کو متعدد فقہاء نے اپنے اپنے انداز میں مختلف عبارتوں میں ذکر فرمایا ہے، جیسے (رد المحتار، درمختار، بحر الرائق، بدائع الصنائع)، چنانچہ صاحب بدائع (۱/۲۷۱) کے الفاظ یہ ہیں: **"لكن الصدق لا يقف على العدالة لا محالة"** (۲)، یعنی لیکن صدق ہمیشہ سچائی اور لامحالہ عدالت ہی پر موقوف نہیں رہا کرتی، بلکہ **"فإن من الفسقة من لايبالي بارتكابه أنواعا من الفسق ولكن لا يستنكف عن الكذب"**، بلکہ بہت سے فاسق ایسے ہوتے ہیں جو طرح طرح کے فسق میں مبتلا رہنے کے باوجود جھوٹ نہیں بولتے، جھوٹ بولنے کو برا جانتے اور مانتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ داڑھی منڈانے والا شخص مثلاً اگر صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے، معاملات کا سچا ہے، جھوٹ نہیں بولتا، یا ذی وجاہت وذی مروت ہے، باوقار ہے، جھوٹ بولنے کو، بالخصوص ایسے معاملات میں اپنی تحقیر وتوہین سمجھتا ہے تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

اسی طرح ایسا شخص جس کی شکل وصورت وضع قطع شریعت کے مطابق نہ ہو، لیکن وہ سنجیدہ اور باوقار ہو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہو، اس کی شہادت بھی تسلیم کی جا سکتی ہے، "درمختار کتاب الشہادت" میں ہے: **"فإن عدالة الشاهد شرط لوجوبه لا للصحة، فلو قضى بشاهد فاسق نفذ"** (۳)۔

۱- فتاوی قاضی خاں، کتاب الشھادۃ، ۲/۴۶۰۔
۲- بدائع الصنائع ۱/۲۷۱۔
۳- درمختار کتاب الشہادۃ، ۲/۳۷۲۔

اور اسی بناء پر ایسے لوگوں کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے فسق کا علم رکھتے ہوئے بھی آ کر شہادت دیں، اس لئے کہ بسا اوقات قاضی اس کی شہادت قبول کر لے گا، چنانچہ اسی "درمختار" میں ایک سوال قائم فرماتے ہوئے فرماتے ہیں: **"وهل له أن يشهد مع علمه لفسقه قال البزازي: نعم، لأن القاضي ربما يقبله"**(۱) (کیا کسی فاسق کو اپنے فسق کا علم ہونے کے باوجود گنجائش و جواز ہے کہ وہ شہادت دیدے تو (جواب میں) صاحب فتاویٰ بزازیہ نے کہا ہے کہ ہاں، اس لئے کہ قاضی بسا اوقات اس کی شہادت قبول کر لے گا اور حق واضح ہوگا اور داڑھی منڈانے والے یا اپنی شکل وصورت یا وضع قطع مطابق شریعت نہ رکھنے والے بسا اوقات ایسے سنجیدہ ذی وجاہت اور باوقار ہوتے ہیں جو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف قرار دیتے ہیں، بخلاف اس شخص کے جو داڑھی حد شرع میں رکھتا ہو، لیکن شراب کے نشہ میں برملا چور رہتا ہو، اور بلا حجاب وشرم باہر نکلتا اور اسی نشہ میں گھومتا پھرتا ہو، اور بخلاف اس شخص کے جو داڑھی بھی رکھتا ہو، حج بھی کر چکا ہو، نماز بھی پڑھتا ہو مگر برملا شراب سازی کا کاروبار بھی کرتا ہو یا طوائف کے ساتھ بھی خلوت وجلوت، ربط وضبط رکھتا ہو، یہ لوگ اپنی ظاہری شکل وصورت اگرچہ صحیح رکھتے ہوں، مگر اپنے اس شنیع فعل اور دنی وذلیل حرکات کی وجہ سے عوام کے نزدیک بھی باوقار وذی وجاہت ومعتبر شمار نہ ہوں گے اور ایسے لوگوں کی شہادت قبول نہ کی جائے گی، اسی طرح وہ شخص جو برملا سٹہ بازی کرتا اور جوا کھیلتا ہو، اور عام طور پر متہم بالکذب والدنائۃ ہو اس کی شہادت بھی باوجود ظاہری شکل وصورت وضع قطع خلاف شرع نہ ہونے کے قبول نہ کی جائے گی، بخلاف اس شرابی یا زانی یا چور یا سود خور کے جو یہ حرکتیں مخفی طور پر کرتا ہے اور مخفی رکھتا ہے عند اللہ اگرچہ وہ بھی فاسق وفاجر اور عاصی ہے اور تائب ہونا قبول یا مردود الشہادت ہونا ضروری نہ ہوگا، اس لئے کہ شریعت مطہرہ نے: **"ولقد كرمنا بني آدم"** (۲) کے تحت اور عرض مومن کے تحفظ کی خاطر بلا وجہ تجسس سے روکا ہے حتی کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے: **"إن الشاهد إذا كان فاسقاً سرا لا ينبغي أن يخبر بفسقه (إلى قوله) والمعدل إذا قال للشاهد: هو متهم بالفسق لا تبطل عدالته"** (۳)۔

(شاہد جب مخفی طور پر فسق میں مبتلا ہو تو جائز نہیں ہے کہ کوئی اس کے فسق کی خبر دے اور اس کی صحیح شہادت کو مجروح کرے، بلکہ اگر معدل بھی کسی شاہد کے بارے میں اطلاع دے کہ یہ شخص فسق کے ساتھ متہم ہے تو بھی ایسی حالت میں اس کی عدالت ظاہری باطل نہ ہوگی)۔

۱- حوالہ سابق۔
۲- سورہ اسراء: ۷۰۔
۳- شامی ۴/ ۳۷۷۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ فاسق، خواہ چوری، شراب نوشی، زنا وغیرہ کے فسق میں مبتلا ہو یا داڑھی منڈانے کے فسق میں گرفتار ہو، لیکن ہر دور میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ان سارے وجوہ کے باوجود ذی وجاہت با مروت ہوتے ہیں، اور اپنی حیثیت عرفی کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کو اپنی شان سے گرا ہوا دیکھ کر کبھی اس کا ارتکاب نہیں کرتے، نیز ایسے لوگ بھی دیکھے جاتے ہیں جو عام معاملات عبادات کے لحاظ سے دیندار معلوم ہوتے ہیں، فرائض وواجبات، بلکہ سنن ونوافل ومعمولات کے بھی پابند ہوتے ہیں، لیکن سوسائٹی کی خرابی کی وجہ سے داڑھی نہیں رکھتے۔ اس لئے ایسے افراد کے لئے شریعت مطہرہ نے علی الاطلاق شہادت رد کردینے کے بجائے تبیین وتحقیق کا اصول مقرر کیا ہے ان کی شہادت کو ان اصولوں کے معیار پر رکھ کر دیکھ لیا جائے اگر تبیین وتحقیق کے بعد ان کی خبر یا شہادت قابل قبول ہو تو قبول کرلی جائے، ورنہ رد کردی جائے۔

(۲)، (الف) اختلاف مطالع کے موجود ہونے اور اس کے ثابت وتحقق ہونے اور پائے جانے سے قطعاً انکار نہیں ہے اس کا وجود تسلیم ہے، بلکہ مشاہد ہے کہ ایک جگہ طلوع آفتاب کا وقت ہے تو ایک جگہ دوپہر کا وقت ہے اور ایک جگہ غروب کا وقت ہے، فی زماننا اس کے وجود کا انکار معمولی عقل کا انسان بھی نہیں کرسکتا، کلام اس کے وجوب صوم وافطار میں معتبر ہونے میں ہے۔ شریعت مطہرہ نے وجوب وثبوت صوم وافطار کو اختلاف مطالع پر محمول یا دائر نہیں فرمایا، بلکہ حدشرع کے مطابق چاند کے دیکھنے اور دیکھنے کی شہادت وخبر پر دائر فرمایا ہے، جیسا کہ اوپر ہم "**صوموا لرؤیتہ**" وغیرہ احادیث اور آیت کریمہ: "**فمن شھد منکم الشھر فلیصمه**" (۱) پیش کرکے ذکر کرچکے ہیں، پس اختلاف مطالع کی جغرافیائی حیثیت تو تسلیم ہے، بلکہ نماز وغیرہ کے اوقات اور دیگر بہت سے معاملات میں جن میں شریعت نے اس کے اعتبار کرنے کی آزادی دی ہے اعتبار بھی ہے، مگر صوم وافطار میں شریعت مطہرہ نے ہم کو پابند بنا دیا ہے، اس لئے اس کا اعتبار اور اس پر مدار رکھنا درست نہ ہوگا۔

(ب) اپنے قیود وشرائط کے ساتھ معتبر ہوگی۔

(ج) ہاں! جب شرعی ضابطہ کے مطابق آجائے تو معتبر ہوگی۔

(د) ہاں! اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب شرعی ضابطہ کے مطابق ثابت ہوکر اور شرعی ضابطہ کے مطابق اس کی اطلاع آجائے گی تو معتبر ہوگی۔ ان تینوں نمبروں (ب، ج، د) میں محولہ شرعی قیود وشرائط کی تفصیل عنقریب خود بخود سوال نمبر چار میں آجائے گی۔

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔

رویت ہلال سے متعلق:

جناب مفتی اعظم صاحب ہمارے یہاں نہ کوئی ہلال کمیٹی ہے اور نہ کوئی اس بارے میں خاص انتظام ہے توامسال ہلال عید کے متعلق قصبہ میں اختلاف ہوگیا کہ چند اشخاص نے محض ریڈیو کی اطلاع سے روزہ افطار کرلیا اور بعض حضرات نے لوگوں کے کہنے سے کہ فلاں مقام پر چاند ہوگیا ہے،اس اطلاع پر روزہ افطار کرلیا،اور ایک جماعت نے نہ روزہ افطار کیا،اور نہ اس خبر کی تصدیق کی ، بلکہ اس روز اپنا روزہ پورا کیا تو اس صورت میں معلوم کرنا ہے کہ آیا اس جماعت نے جس نے روزہ افطار کیا اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے یا کہ نہیں یا دوسری جماعت نے کہ جس نے روزہ افطار نہیں کیا ہے وہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے ۔

الجواب وبا الله التوفيق:

جبکہ رویۃ عامہ ثابت ہوچکی ہے اس لئے جن لوگوں نے اتوار کو روزہ توڑ دیا ہے ان پر قضاء واجب نہیں ہے تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن رویت کا ثبوت شرعی نہیں ہوسکا تھا اس لئے جن لوگوں نے افطار نہیں کیا وہ بھی فعل حرام کے مرتکب نہیں ہوئے ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

برطانیہ میں رویت ہلال سے متعلق چند اہم سوالات:

برطانیہ کے بعض علاقوں میں موسم گرمی میں رویت ھلال کا امکان ہے یعنی گرمی کے موسم میں اگر بادل وغیرہ کوئی علت آسمان پر نہ ہواور مطلع صاف ہوتو چاند دیکھ سکتے ہیں ،جیسا کہ امسال جمعیۃ علماء برطانیہ کا اعلان رجب المرجب کی پہلی کا یہیں کی رؤیت پر ہوا ہے اس صورت میں حسب ذیل سوالات حل طلب ہیں:

(۱)موسم گرمی میں جب رؤیت ممکن ہے تو کیا شرعاً ساکنان برطانیہ کو دوسرے مما لک سے خبر رؤیت ہلال منگوانا ضروری،یعنی واجب ہے اگر واجب نہیں ہے اور نہ ہی بیروں ملک سے خبر منگوائی یا موصول ہوئی او ررؤیت نہ ہوسکی تو کیا مکمل تیس دن شمار کرکے پہلی شعبان یا رمضان شمار کرنا درست ہے یا نہیں ۔

(۲) بیرون ملک سے خبر منگوانا واجب نہ ہو اور یہاں کے متدین علماء رویت ہلال کمیٹی نے پہلی رمضان یا عید کے نفی کا فیصلہ کر دیا (یعنی شعبان کو تیس دن کا شمار کر کے) بعدہ کسی نے دوسرے ملک سے خبر منگوائی اور وہ خبر اثبات میں آئی یا متعدد ممالک سے مختلف خبر کسی نے منگوائی تو کیا ہمیں اس بیرونی خبر پر اعتبار کرنا ہوگا یا نہیں اپنی مقامی خبر پر مدار رکھا جائے یا جو خبر منگوائی گئی ہے اس کی تحقیق کرنا لازم ہے۔

(۳) نوٹ رؤیت ھلال کمیٹی نے چونکہ باہر سے خبر منگوانا واجب نہیں ہے دوسرے ملک سے خبر نہیں منگوائی کسی نے انفرادی طور پر منگوائی۔

(۴) سردی کے موسم میں رؤیت ھلال کا امکان نہیں ہے یعنی بادل وغیرہ اکثر بلکہ ہر وقت ہوتے ہیں جس سے چاند کا نظر آنا ممکن نہیں ہے تو ایسے علاقوں کے رہنے والوں کو بیرون ملک سے خبر منگوانا ضروری ہے یا نہیں اگر خبر منگوانا واجب ہی ہے تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی کذفی العکس۔

(۵) مختلف ممالک سے مثلاً مراکش، افریقہ، الجزائر، ٹیونس وغیرہ۔ سے فون پر کسی جان پہچان والے سے ان کے یہاں رمضان وعید کے رؤیت کے متعلق پوچھ لیا کہ آپ کے یہاں کیا فیصلہ ہوا ہے اگر سب جگہ سے یوں خبر دی گئی کہ رؤیت ھلال ہوگئی تو کیا ان مختلف ممالک سے جو خبر فون پر لی گئی ہے اس کو خبر مستفیض بنا سکتے ہیں یا نہیں؟۔

مفتی احمد (ترکیسر، سورت)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اگر شعبان کی ۲۹ر تاریخ کو مطلع ناصاف تھا لیکن ایک معتمد و متدین مسلمان نے چاند دیکھ کر چاند دیکھنے کی شہادت دیدی تو روزہ رکھنا سب پر شرعاً واجب ہوگیا، اب نہ کسی خبر کا منگوانا جائز رہے گا اور نہ اس شہادت شرعی کے خلاف کرنا جائز رہے گا۔ اسی طرح ۲۹ر رمضان کو مطلع ناصاف تھا، لیکن دو معتمد و متدین مسلمانوں نے چاند دیکھکر چاند دیکھنے کی شہادت دیدی تو عید منانا سب پر واجب ہوگیا اب نہ کسی خبر وغیرہ کا منگوانا جائز رہے گا اور نہ اس شہادت شرعی کے خلاف کرنا جائز رہے گا۔ اسی طرح اگر مطلع صاف ہو اور چاند دیکھنے کی اتنے لوگوں نے شہادت دیدی کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لینا سمجھ میں نہ آتا ہو یا دشوار معلوم ہوتا ہے تو ان کی شہادتوں پر عمل کر لینا واجب ہو جاتا ہے اب کہیں سے خبر منگوانا یا اس شرعی شہادت کے خلاف کرنا جائز ہی رہے گا۔ ۲۹ شعبان کا معاملہ ہو یا ۲۹ رمضان کا دونوں میں یہی حکم ہے کہ ۲۹

شعبان کے بعد روزہ رکھنا اور ۲۹؍رمضان کے بعد عید منانا واجب ہوجائے گا۔ برطانیہ کے لئے بھی یہی حکم ہے(۱)۔

(۲) اور اگر ۲۹؍شعبان کو یا ۲۹ رمضان کو مذکورہ بالا حکم (جو اوپر میں درج ہے) کے مطابق چاند دیکھنا ثابت نہ ہوا تو ۳۰؍شعبان کو دن میں روزہ رکھنے کی نیت کر لینے کے بعد وقت کے اندر اندر (یعنی نصف نہار شرعی تک اطلاع کا انتظار کرنا (تلوم) اور عام عادت کے مطابق چاند کا پتہ لگانا (التماس ہلال) شرعاً واجب رہتا ہے (۲)، قولہ عام عادت کے مطابق مثلاً آج کل کے ریڈیو۔ ٹی۔ وی کو عام ہوجانے کی وجہ سے ۲۹؍شعبان کی شام کو دنیا کے کسی خطہ کے شرعی رؤیت ہلال کمیٹی کی جانب سے جس کے سب افراد با شرع و معتبر ہوں اور بایں الفاظ اعلان آجائے کہ ہم فلاں شرعی رؤیت ہلال کمیٹی چاند ہو جانے کی شرعی ثبوت حاصل ہونے کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ صبح روزہ رکھا جائے تو اب سب پر روزہ رکھنا واجب ہوجائے گا ۲۹؍رمضان کو اسی قسم کی شرعی رؤیت ہلال کمیٹی جس کے سب افراد با شرع اور معتبر ہوں ان الفاظ میں اعلان کریں کہ شرعی ضابطہ کے مطابق ہلال عید کی رؤیت ثابت ہونے کی وجہ سے ہم اعلان کرتے ہیں کہ صبح عید منائی جائے تو عید منانا واجب ہو جائے گا۔

اسی طرح منجانب پوری کمیٹی کے فقط اس کا صدر اپنے عہدہ کو بتلاتا ہو، یہی اعلان کرے جو ابھی مذکور ہوا تو بھی اس پر عمل کر لینا واجب ہوجائے گا اس لئے کہ مفتی بہ قول میں رؤیت ہلال کے ثبوت کے بارے میں اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے بلکہ صرف طرق موجبہ سے نقلی ثبوت کے شرعی طریقہ سے ثابت ہوجانا کافی ہے (۳) اور یہ اعلان مذکور نہ شہادت ہے نہ خبر، بلکہ

۱- ''إن کان بالسماء علة فشهادة الواحد علی هلال رمضان مقبولة إذا کان عدلاً مسلماً عاقلاً بالغاً حراً کان أو عبداً ذکراً کان أو أنثی'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۹۷) ''وإذا کان بالسماء علة لم تقبل في هلال الفطر إلا شهادة رجلین أو رجل وامرأتین، لأنه تعلق به نفع العبد وهو الفطر فأشبه سائر حقوقه...... وإن لم یکن بالسماء علة لم تقبل إلا شهادة جماعة یقع العلم بخبرهم'' (الہدایہ کتاب الصوم/۱۹۶)۔

۲- ''والمختار أن یصوم المفتي بنفسه أخذا بالاحتیاط ویفتي العامة بالتلوم إلی وقت الزوال ثم بالإفطار نفیاً للتهمة'' (ہدایہ/۱۹۴)، ''والتلوم الانتظار کما في المغرب'' (رد المحتار ۳/۳۴۹، رؤیت ہلال سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۳، کتاب الصوم، البحر الرائق ۲/۴۵۹، عالمگیریہ ۱/۱۹۶) (مرتب)۔

۳- واختلاف المطالع ورؤیته نهاراً قبل الزوال وبعده غیر معتبر علی ظاهر المذهب وعلیه أکثر المشائخ وعلیه الفتوی، بحر عن الخلاصة، فیلزم أهل المشرق برؤیة أهل المغرب، إذا ثبت عندهم رؤیة أولئک بطریق موجب (درمختار مع رد المحتار ۳/۳۶۳) بطریق موجب کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: کأن یتحمل اثنان الشهادة أو یشهد علی حکم القاضي، أو یستفیض الخبر، بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة کذا رأوه، لأنه حکایة (۳/۳۶۴)، نیز اختلاف مطالع کے سلسلہ میں تفصیل کے لئے مذکورہ متن کے تحت علامہ شامی کی تفصیل ۳/۳۶۳، ۳/۳۶۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

مدافع قاضی وحاکم شرعی کے مدافع ونقارہ کی آواز یا اس کا اعلان اعلان عام کے حکم میں ہے اور اس پر عمل کرنا اس شخص پر دیانۃً واجب ہو جاتا ہے جو اس قاضی یا حاکم شرعی کو جانتا مانتا ہو **کما هو مبرهن في مقامه كالشامي والبحر وغيرهما(۱)۔**

پس اگر ۳۰؍شعبان کو نصف یوم شرعی تک تلوم والتماس کے باوجود رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت نہیں ملا تو بجز خواص کے سب کو کھا پی لینا اور روزہ نہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے اب اگر اس وقت کے گذر جانے کے بعد، یعنی نصف نہار شرعی کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع رؤیت آجائے گی جب بھی کوئی گناہ نہ ہوگا، بلکہ صرف ایک روزہ کے قضاء کا حکم ہوگا جس طرح ٹیلی ویژن اور ریڈیو عام ہو گیا ہے اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ٹیلیفون بھی عام ہو چکا ہے تو اس ٹیلیفون کا حکم یہ ہے کہ اس اطلاع پر چونکہ اعلان کی شرعی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے اس کی اطلاع اعلان شرعی نہیں کہا جا سکتا ہے، البتہ اگر شرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع آئے تو خبر شرعی کا درجہ ہو کر اور **"ولو كانو ببلدة لا حاكم فيها"** (۲) "درمختار" کی عبارت کے تحت خبر کے درجہ میں معتمد اور غیر معتمد ہو سکتی ہے اور اس کے معتبر ومفید ہونے میں بہت سی شرطیں ہیں جو محض استفتاء کی شکل میں حل نہیں ہو سکتیں اگر رؤیت ہلال کے ثبوت کا شرعی حکم (احقر کا رسالہ) جس کو مختلف کتب خانوں نے شائع بھی کر دیا ہے دیکھ لیا جائے تو اس میں بھی کافی تفصیل ومواد مل سکتا ہے۔

باقی غیر منظم ہو کر اور اس افراتفری کے ساتھ مختلف لوگوں کا اپنی اپنی طور پر ٹیلیفون یا ریڈیو وغیرہ کی خبروں پر عمل کر لینا یا مختلف طور سے افراتفری کے ساتھ خبریں منگوانا قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ معتمد علماء کی ایک رؤیت ہلال کمیٹی ہر شہر و قصبہ و آبادی میں ہو سکے تو ہر آبادی میں قائم کر کے شرعی ہدایت وضابطہ کے مطابق عمل کرنا لازم ہے۔ سع وع ان دونوں کا حکم بھی اوپر مذکورہ تفصیل سے نکل آیا ہے۔

(۵) اس کا حکم بھی ۱ کے اندر مذکور مفتی بہ قول کے ضابطے کے مطابق نکل آیا کہ مراکش، افریقہ، یا کسی بھی دور یا نزدیک ملک کی قید ضابطہ شرعی پر نہیں ہے، بلکہ شرعی ضابطہ کے مطابق آنے کی قید ہے اور یہ قید ہے کہ وہ شرعی الفاظ وضابطہ

۱- "قلت والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر، لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن" (ردالمحتار علی الدر ۳؍۳۵۴)۔

۲- "ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة" (درمختار مع رد المحتار ۳؍۳۵۴)۔

میں ہو اور اس پر عمل کرنے سے عمل کرنے والوں کے نزدیک مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا ہونا لازم نہ آتا ہو(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۸/۱۴۰۰ھ

پاکستان کا اعلان ہندوستان کے لئے معتبر ہے یا نہیں؟

آج ہندوستان میں، بلکہ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمان عید منا رہے ہیں، مگر ہمارے کوٹہ (راجستھان) میں عید نہیں منائی جارہی ہے وجہ یہ کہ یہاں کے قاضی صاحب نے آج کے لئے عید کا اعلان نہیں کرایا۔ کوٹہ میں ہمیشہ سے یہی قاعدہ ہے کہ رات کو اعلان کرایا جاتا ہے کہ کل عید ہے اور نماز فلاں وقت ہوگی۔ گذشتہ رات کو ۹ بجے آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوگئی ہے کہ دہلی، کلکتہ، بنگال (بھارت) میں آج ۲/۸/۸۱ء کو عید منائی جائیگی۔ پاکستان آج منا رہا ہے۔ رات سے ہم لوگوں کو بھی امید تھی کہ آج عید ہوگی مگر صبح جب اٹھے تو پتہ چلا کہ قاضی صاحب ان سب اطلاعات کو نہیں مانتے اور جو ہوا وہ عرض کر چکا ہوں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے پاکستان نے ہلال کمیٹی بنا کر یہ مسئلہ حل کیا ہے اور جو کمیٹی فیصلہ کرتی ہے سارا ملک مانتا ہے۔ کیا ہندوستان کے علماء کرام اعلان نہیں کرسکتے دہلی کے پیش امام صاحب سارے ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے اعلان نہیں کراسکتے، جبکہ بھارت کی حکومت مسلمانوں کے لئے تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے آل انڈیا ریڈیو آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہے۔ مہربانی فرما کر بذریعہ ڈاک جواب دینے کی تکلیف فرمائیں۔ کہ کیا اس ترقی یافتہ دور میں کن اصولوں پر عید منانا چاہیے۔ یہاں ۳۰ میل دور بندق میں بازارو قصبہ ہے وہاں آج مسلمان عید منا رہے ہیں جب کہ آسمان پورا ابر آلود ہے۔

احقر سید حامد علی کوٹہ پاکستان

الجواب وباللہ التوفیق:

آل انڈیا ریڈیو کی یہ مذکورہ خبریں کہ دہلی، کلکتہ، بنگال میں آج عید منائی جائیگی شرعی خبر نہیں ہے شرعاً یہ معتبر نہیں ہے، البتہ رویت ہلال کمیٹی دہلی کے صدر امام جامع مسجد دہلی جب کمیٹی کی طرف سے یہ اعلان کریں یا کرائیں شرعی ثبوت کے

۱- ''ابن عمرؓ یحدث عن النبی ﷺ: إنا أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الإبهام فی الثالثة، والشهر هكذا وهكذا وهكذا یعنی تمام ثلاثین'' (صحیح مسلم کتاب الصیام حدیث ۱۵/۱۰۸۰)۔

ذریعہ رویتہ ہلال تسلیم کرکے اعلان کیا جاتا ہے کہ صبح عید کی نماز پڑھی جائے۔

یا یہی اعلان پاکستان کی شرعی رویتہ ہلال کمیٹی کرے تو یہ اعلان بیشک شرعی اعلان ہوگا اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

اور یہ دونوں ہلال کمیٹیاں (دہلی اور پاکستان) کی کئی سال سے شرعی الفاظ میں اعلان کرتی ہیں۔پس ان کو خوب غور سے سنا جائے، بلکہ ان دونوں اعلانوں کے الفاظ ٹیپ کرکے مقامی علماء جو اس قسم کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں ان کے سامنے رکھا جائے پھر وہ حضرت جو حکم شرعی دیں اس پر عمل کیا جائے۔خود رائی وغیرہ ہرگز نہ کی جائے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا بذریعہ ٹیلیفون مطلقاً رویت ہلال کی اطلاع معتبر ہوگی:

رمضان وعیدین بذریعہ فون رویت ہلال کی خبر دینے والا شخص سامع کے نزدیک معلوم ومتعارف ہو اور اس کی آواز بھی جانی پہچانی ہو اور عادل بھی ہو اس صورت میں کیا قیود وشرائط کے ساتھ بذریعہ فون دی ہوئی خبر اور شہادت شرعاً مقبول ومعتبر سمجھی جائے گی یا فون سے دی ہوئی خبر اور شہادت بہر صورت علی الاطلاق غیر مقبول وغیر معتبر ہوگی، اس بارہ میں آپ کی اور دیگر موجودہ اکابر دیوبند کی کیا رائے ہے؟

مصلح الدین (مولوی شمس الدین روڈ مغلواڑہ، بڑودہ، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

رمضان المبارک وعیدین وغیرہ کی رویت کی جو اطلاع بذریعہ فون آئے گی، وہ غائبانہ اطلاع ہوگی وہ اطلاع خواہ کتنے ہی مضبوط وموثق طریقہ سے آئے شہادت نہیں کہلائی جاسکتی، شہادت میں مجلس قضا میں آکر بیان کرنا شرط ہوتا ہے، شہادت غائبانہ نہیں ہوتی، البتہ اس اطلاع کو خبر کہہ سکتے ہیں اور جب حدود شرعی کے مطابق ہوگی تو معتبر ومقبول بھی ہوسکتی ہے، مطلقاً اور ہر حال میں مقبول ومعتبر نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں احقر کا ایک طویل وبسیط استفتاء (ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعہ رویت

۱- ”شهدوا أنه شهد عند قاضي مصر كذا شاهدان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى القاضي به ووجد استجماع شرائط الدعوى قضى أي جاز لهذا القاضي أن يحكم بشهادتهما؛ لأن قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به، لا لو شهدوا برؤية غيرهم؛ لأنه حكاية نعم لو استفاض الخبر في البلدة الأخرى لزمهم على الصحيح من المذهب“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۵۸) (مرتب)۔

ہلال کا شرعی حکم) شائع ہو چکا ہے احقر اس کو بھیج رہا ہے اس میں تفصیلی بحث ہے، بصیرت کے ساتھ حکم معلوم ہو سکے گا، اور دارالافتاء کی رائے بھی واضح ہو سکے گی، نیز اس کا ایک ضمیمہ بھی یہاں ذیل میں درج کر دیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۹/ ۹۸ ۱۳ھ

ضمیمہ ضابطہ فقہیہ:

"ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلين مع العلة للضرورة" الخ (۱) کی بنیاد پر اپنے مطبوعہ جواب کے ضمیمہ کے طور پر کچھ مسائل جو کہ خاص ٹیلیفون سے متعلق ہیں احقر مزید عرض کر رہا ہے، تا کہ ٹیلیفون سے متعلق مسائل کی مزید وضاحت ہو جائے اور عمل آسان ہو سکے۔

مسئلہ ۱: پورے علاقہ میں جتنی معتبر شرعی رویت ہلال کمیٹیاں ہوں ان سب کو حتی المقدور ایک نظم میں منسلک کرنے کی کوشش کی جائے اور باہم رابطہ قائم رکھا جائے، تا کہ عمل میں ہم آہنگی اور ثبوت میں آسانی ہو۔

مسئلہ ۲: جب کسی ایک معتبر شرعی رویت ہلال کمیٹی کے نزدیک شرعی اصول سے رویت ہلال ثابت ہو جائے تو وہ کمیٹی دوسری رویت ہلال کمیٹی کو شرعی کے مطابق اس ثبوت رؤیت کی اطلاع کر دے ضابطہ شرعی کی بعض صورتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(الف) اس کا ایک خاص ضابطہ تو وہی ہے جو عام طور سے کتب فقہ میں مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ شرعی کمیٹی دو آدمیوں کے سامنے شرعاً رویت کے ہو جانے کو لکھے اور ان دونوں کو اس تحریر کی تصدیق وتصویب کے بعد اپنے یہاں بھی ثبوت رویت کا اعلان کر دے، پس ٹیلیفون کے ذریعہ حسب قاعدہ شرع ثابت شدہ رویت کی اطلاع بھی اسی ضابطہ کے مطابق دوسری شرعی رویت ہلال کمیٹی کے پاس بھیجے۔

(ب) اگر یہ طریقہ اطلاع دینے کا میسر نہ ہو یا دشوار ہو تو یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ شرعی رویت ہلال کمیٹیاں رویت ہلال کی خبر واطلاع دوسری شرعی رویت ہلال کمیٹی کو دینے کے بارے میں کچھ خاص اصطلاحی الفاظ بنالیں جن کو عام لوگ نہ سمجھیں، جیسے فوجوں کے خاص اصطلاحی الفاظ (کوڈ) میں بذریعہ فون دوسری معتبر شرعی کمیٹی کو اطلاع دے دے، پھر جب اس دوسری شرعی رویت کمیٹی کو اس اطلاع وخبر کے صحیح ہونے کا ظن غالب ویقین ہو جائے تو وہ اپنے یہاں بھی ثبوت شرعی

۱- شامی ۲/ ۱۲۵۔

رویت کا اعلان کردے۔

(ج) اگر مخصوص اصطلاحی الفاظ متعین نہ ہوں یا متعین ہوں، لیکن ان کے ظاہر ہوجانے اور مخفی نہ رہنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں جس مقام کی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے یہ فون آیا ہے اس کمیٹی سے دوبارہ دریافت کرکے یا وہاں کے چند معتمد مسلمانوں سے فون کرکے مزید تصدیق واطمینان کرلیا جائے اور جب سچ ہونے کا ظن غالب حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اپنے یہاں بھی اعلان کردیا جائے اور جب تک ان خارجی شواہد وقرائن کے ذریعہ سے صداقت کا ظن غالب پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک اپنے یہاں اعلان نہ کیا جائے، احتیاط کی جائے۔

اس لیے کہ فون کی اطلاع عام طور سے تحریر کے اعتبار سے زیادہ خفاء اور التباس ہوتا ہے، اور ایک شخص کی آواز دوسرے شخص کی آواز سے بعض اوقات خطوط کی مشابہت سے زیادہ مشابہ اور مختلط ہوتی ہے، پس جب تحریر کی تصدیق کرنے میں "**الخط یشبه الخط**" کی وجہ سے خارجی دلائل وشواہد اور قیود وغیرہ کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے تو اس میں بدرجہ اولی لازم وضروری رہے گا۔

نوٹ: جب کمیٹیوں میں باہم تعاون کا رابطہ نہ ہو یا کیف ما اتفق کوئی ٹیلیفون کہیں سے ثبوت رویت کا آجائے تو اس صورت میں جو صورتیں فون کی شرعاً معتبر ہونے کی ہیں وہ مطبوعہ جواب میں مسئلہ ا تا ۸ تفصیل سے آچکی ہیں، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ اطلاع ہلال کا شرعی حکم:

آج کل آمد ورفت اور خبر رسانی کے ذرائع اس قدر عام اور آسان ہوگئے ہیں کہ عید اور بقرعید ورمضان کے چاند کی خبریں بھی ہر وقت گاؤں گاؤں، شہر شہر ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں، کبھی تار وٹیلیفون سے کبھی ریڈیو سے اور مسلمانوں کا عام طبقہ عموماً مسائل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک الجھن اور کش مکش میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ ایسے موقع پر حکم شرع شریف کیا ہے؟ ہمیں عید منالینی یا روزہ رکھ لینا چاہئے یا نہیں؟ بالخصوص ریڈیو کی خبریں بعض مرتبہ حجاز اور بعض ایسے دور دراز ممالک سے آجاتی ہیں جس سے کبھی ۲۸ رشعبان ہی کو پہلی رمضان معلوم ہوتی ہے اور کبھی ۲۸ ررمضان ہی کو عید کا دن معلوم ہوتا ہے اور کبھی آٹھویں ذی الحجہ کو بقرعید اور قربانی کا دن معلوم ہوتا ہے۔ ہر جگہ معتبر عالم موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ الجھن اور بڑھ جاتی ہے، بعض لوگ اختلاف مطالع کی آڑ لے کر ٹال دیتے ہیں، بعض لوگ جنتری کو بنیاد بنا کر حجت کرتے ہیں اور بعض لوگ علم

ہیئت کے اصول سے بحث ومعارضہ کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان خبروں کو شہادت کا درجہ دے کر صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر ڈالتے ہیں، اور بعض لوگ مقامات مقدسہ یا اسلامی ممالک کا نشریہ ہونے کی بنا پر بلا کسی قید وشرط کے لحاظ کئے ہوئے واجب العمل قرار دے کر دوسروں کو بھی ماننے پر مجبور کرتے ہیں، غرض اس سے عوام میں بڑے بڑے فسادات رونما ہوجاتے ہیں، ایک ہی آبادی کے کچھ حصہ میں عید منائی جاتی ہے اور کچھ حصہ میں روزہ ہوتا ہے، بعض جگہ عید گاہوں میں جھگڑا فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

بعض مفسدین دین کو بازیچہ شیاطین بنانے اور کھلونے کی شکل دینے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں، اس لئے گزارش ہے کہ ان خبروں سے متعلق کچھ مسائل اور اصول وقواعد مفصل اور مدلل اس طرح بیان کر دیئے جائیں جس سے بصیرت کے ساتھ مسئلہ کی صحیح حیثیت ذہن میں اتر سکے اور عمل کرنے میں روشنی مل سکے اور کش مکش ختم ہو سکے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو صحیح ہے کہ ریڈیو کی خبر یا اعلان شہادت شرعیہ نہیں، لیکن مطلقاً ہر حال میں بالکل نا قابل عمل اور نا قابل التفات قرار دے دینا بھی صحیح نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ریڈیو پر آنے والی ہر خبر اور اعلان بالکلیہ صحیح اور درست ہو کہ اس پر تحقیق وتفتیش کی بھی ضرورت نہ رہے اور اس پر عمل واجب ہوجائے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، کچھ قیود وشرائط ہیں، ان کے ساتھ ریڈیو کا نشریہ واعلان معتبر قابلِ عمل ہو سکتا ہے، اور ان شرائط اور قیود کے بغیر معتبر اور نا قابل توجہ وعمل رہے گا، ان تفصیلات وقیودات کی اجمالی نشان دہی ذیل میں نمبر وار کی جائے گی، اور امید ہے کہ اس سے مذکورہ جملہ شقوں کا جواب اور جملہ شکوک کا ازالہ بھی ہوجائے گا، ان تفصیلات وقیودات کی نشاندہی کرنے سے پہلے کچھ ضمنی گفتگو بطور تمہید ومقدمہ پیش کی جاتی ہے جو مفہوم مسئلہ کے حل کرنے میں معین ونافع ہو سکتی ہے۔

تمہید ومقدمہ:

اولاً چند عبارات فقہیہ نقل کی جاتی ہیں:

- "ولا عبرة بقول الموقتين ولو عدولا على المذهب، قال في الوهبانية: وقول أولي التوقيت ليس بموجب" (۱)۔

۱- درمختار۔

● "وتحته في الشامية (۱۲۵/۲) أي في وجوب الصوم على الناس بالإجماع، وفي النهر: فلا يلزم بقول الموقتين أنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا، وإن كانوا عدولا في الصحيح (إلى قوله) قلت ما قاله السبكي رده متاخروا أهل مذهبه (أي الشافعي) ومنهم ابن حجر والرملي (ثم إلى قوله) وما قاله السبكي الشافعي مردود ردهٗ عليه جماعة من المتأخرين منه (أي الشافعية) وليس في العمل بالبينة مخالفة لصلوته ﷺ ووجهه ما قلنا: إن الشارع لم يعتمد الحساب بل ألغاه بالكلية لقوله نحن أمة أمية (ثم إلى قوله) وقال ابن دقيق العيد: الحساب لا يجوز عليه الاعتماد في الصلوٰة، انتهىٰ ما قاله الرملي الشافعي "(۱)۔

● "واختلاف المطالع غير معتبر على ظاهر المذهب، وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوىٰ، بحر عن الخلاصة"۔

● "قوله: ورويته نهارا الخ (تحته في الشامي (۳/ ۹۶)، إنما الخلاف في اعتبار اختلاف المطالع بمعنى أنه هل يجب على كل قوم اعتبار مطلعهم ولا يلزم أحد العمل بمطلع غيره أم لا يعتبر اختلافها، بل يجب العمل بالأسبق رؤيته (إلى قوله) وظاهر الرواية الثاني وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الروية في حديث صوموا لرؤيته (إلى قوله) بخلاف أوقات الصلوٰة"(۲)۔

(مذہب مختار کے مطابق موقتین کے قول کا کچھا عتبار نہیں وہبانیہ میں کہا ہے کہ موقتین (حساب داں) کے قول سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا، شامی میں اسی کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ثبت حکم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قول سے لوگوں پر روزہ کا وجوب بالاتفاق نہ ہوگا، اور نہر میں ہے کہ موقتین کے کہنے سے لازم نہیں آتا کہ چاند اس رات آسمان میں موجود ہی ہو، گو یہ لوگ از روئے شرع عادل ہی کیوں نہ ہوں، صحیح قول یہی ہے، پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ علامہ سبکی شافعی کا قول غیر مقبول ہے۔متاخرین شافعیہ نے اس کو رد کر دیا ہے۔اور گواہوں کی بات پر عمل کرنے میں نبی کریم ﷺ کی نماز کی مخالفت نہیں ہوتی اور موقتین کی بات کے غیر معتمد ہونے کی دلیل وہی ہے جو اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے حساب پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حساب کو سرے سے لغو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: "نحن أمة أمية" ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں۔

۱- شامی ۱۲۵/۲۔
۲- شامی ۹۶/۲۔

ابن دقیق العید (صاحب احکام الاحکام) فرماتے ہیں کہ نماز کے سلسلے میں حساب پر اعتماد کرنا جائز نہیں، انتہی ما قالہ الرملی الشافعی،شامی (۱۲۵/۲)، اور در مختار میں بحوالہ بحر لکھا ہے کہ ظاہر مذہب کے مطابق اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، اسی پہ مشائخ کا عمل ہے اور یہی مفتی بہ ہے: اور اختلاف مطالع کے معتبر و غیر معتبر ہونے میں جو اختلاف ہے، اس معنی کر کے ہے کہ کیا ہر بستی پر لازم ہے کہ وہ صرف اپنے مطلع کا اعتبار کرے اور کسی کے لئے دوسرے کے مطلع پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے، یا یہ کہ اختلاف مطالع کا کچھ بھی اعتبار نہیں، بلکہ جو شخص بھی پہلے چاند دیکھ لے سب کے ذمہ اس کی پیروی ضروری و لازم ہے، کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ دوسری ظاہر الروایۃ ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہی معتبر ہے اور مالکیہ اور حنابلہ کا بھی اسی پر اعتماد ہے، اس لئے کہ حدیث "صوموا لرؤیته" میں مطلقا رویت کا خطاب ہر فرد کے لئے عام ہے، لیکن اوقات صلوۃ کا حکم اس سے مختلف ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اختلاف مطالع کا اعتبار اور حساب منجمین کا اعتبار محققین احناف کے نزدیک اور محققین ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح نہیں، بلکہ طرق موجبہ سے جو ثبوت رویت کا ہوگا فقط وہ معتبر ہوگا، خواہ وہ ثبوت دنیا کے کسی حصہ و گوشہ سے آئے کسی بھی طرح سے آئے صرف شرط اتنی ہے کہ نصوص صریحہ صحیح یا متون صحیحہ شرعیہ کے خلاف نہ ہو، اور مقصد شرع سے بھی متجاوز نہ ہو، اس لئے کہ طرق موجبہ خود نصوص نہیں کہ نص کا یا حقیقت واقعہ کا معارضہ یا مقابلہ کر سکیں، بلکہ نصوص سے متاخر و ثانوی درجہ میں ہے، مثلاً نصوص میں وارد ہے: "صوموا لرویته"۔

- **"صوموا لرويته وأفطروا لرويته، فإن غم عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين"(۱)، أنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب الشهرهكذا وهكذا وعقد الإبهام في الثالثة، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا، يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين"(۲)۔**
- **"وعن ابن عباسؓ قال جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال يعني هلال رمضان فقال أتشهد أن لا إله إلا الله! فقال نعم، قال: أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا"(۳)۔**

(چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (عید مناؤ) اگر گرد و غبار وغیرہ کی وجہ سے چاند ڈھنک جائے تو تیں

۱- بخاری کتاب الصوم، ۲۵۶/۱ و ایضاً مسلم۔
۲- مشکوۃ المصابیح ۱۷۴/۳۔
۳- رواہ ابوداؤد و ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوۃ وغیر ذلک من النصوص الواردۃ فی ہذا الباب۔

دن شعبان کے پورے کرلو' بخاری، مسلم، ہم لوگ امت امیہ ہیں حساب وکتاب پر مدار ان چیزوں کا نہیں رکھتے، بلکہ مہینہ اتنا ہوتا ہے اور اتنا ہوتا ہے، ایک مرتبہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا اور تیسری بار اشارہ کرتے ہوئے انگوٹھے کو موڑ کر چھپالیا، پھر دوسری مرتبہ پھر مثل سابق دونوں ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا، اور اس مرتبہ تیسری بار کے اشارہ میں انگوٹھا بھی اٹھائے رکھا اور اس سے آپ تیس دن پورے مراد لے رہے تھے، اور بتلانا یہ تھا کہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے اور کبھی پورے تیس دن کا)۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے ابھی رمضان کا چاند دیکھا ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم وحدانیت رب ذوالجلال کی شہادت دیتے ہو، اس نے کہا: ہاں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے اللہ کا رسول برحق سمجھتے ہو! اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے بلال! لوگوں میں اعلان کردو کہ صبح روزہ رکھیں)۔

ان نصوص سے چند امور ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ مہینے ۲۹ دن یا ۳۰ دن میں دائر ہوں گے اس سے کم یا بیش نہیں ہوں گے، یا مثلاً یہ کہ دین اسلام عالم گیر مذہب ہے، یہ عالم، جاہل، یا متمدن بدوی، بادشاہ، رعایا، حکماء، فلاسفہ غرض سب کو ایک ساتھ مخاطب کرتا ہے، اور اصول فطری وسادہ وضع کرتا ہے، اور اسی سادگی پر بنیاد رکھتا ہے، تا کہ سب یکساں عمل کرسکیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد وہی سادگی اور فطرت پر ہے، جو علوم ہندسہ وریاضیہ کی کشاکش سے معریٰ ہے، اسی طرح تکلفات وتدقیقات سائنسیہ سے مبرا ومنزہ ہے، لہٰذا نہ خوردبین سے تلاش ہلال کی ضرورت ہے نہ فضا میں پرواز کی حاجت ہے، بلکہ اگر نصوص صحیحہ ومتون شرعیہ صحیحہ میں غور کیا جائے تو یہ امر بالکل واضح طور پر نمایاں ہوجاتا ہے کہ تکلفات وتدقیقات ریاضیہ غیر مطلوب ہیں، یہی نہیں، بلکہ غیر مستحسن بھی ہیں، بلکہ بعض اوقات مضر وغیر معتبر بھی ہوں گے، جس طرح اگر بغیر تدقیق وتحقیق اور بغیر اہتمام والتزام کے کوئی حکم ان سے مل جائے تو معتبر اور مقبول ہوگا۔

"کما حققه الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندی مدظله فی رسالة" "آلات جدیدہ" کے شرعی احکام (ص ر ۱۸۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ثبوت رویت ہلال کا مدار یا تو خود رویت پر ہے، شہادت میں قاضی شرعی ومجلس قضاء وغیرہ شرط ہے، اور بسا اوقات اس کا فقدان ہوتا ہے، ایسے مواقع میں عادل مسلمان کی خبر بھی بمفاصیلہ وشرائطہ جب اس طرح ہو کہ اس سے ثبوت کا ظن غالب حاصل ہوجائے تو کافی ہوجاتی ہے۔ کما فی التنویر:

(۷) "لو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين للضرورة۔ تحت قوله ببلدة في الشامي (۱۲۵)، أو قرية قال في السراج: ولو تفرد واحد برويته في قرية ليس فيها دال ولم يأت مصرا يشهد وهو ثقة يصومون بقوله، والظاهر أنه يلزم لأهل القرىٰ الصوم بسماع المدافع أو برؤية القناديل من المصر، لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن حجة موجبة للعمل"(۱)۔

(تنویر الابصار میں ہے کہ اگر لوگ ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم شرع نہ ہو تو لوگ اس میں ایک ثقہ ومعتبر آدمی کے قول پر روزہ رکھیں اور دو ثقہ عادل شخصوں کی خبر پر افطار کریں یہ حکم ضرورت کی وجہ سے ہے، (اسی کے تحت) شامی (۱۲۵/۲) میں یہی حکم دیہات کا بھی ہے، کسی ایسے دیہات میں چاند دیکھے اور شہر تک قاضی کے پاس شہادت دینے کے لئے نہ آئے اور وہ ثقہ معتبر شخص ہو تو لوگ اس کے قول کے مطابق روزہ رکھیں اور یہ حکم ظاہر مسلم ہے کہ دیہات والوں پر شہر کی توپ کی آواز سن کر یا شہر کے میناروں اور قندیلوں کی روشنی دیکھ کر روزہ رکھنا لازم ہوجاتا ہے، اس لئے کہ یہ ایسی ظاہری علامت ہے جس سے رویت کا ظن غالب، حاصل ہوجاتا ہے اور یہ عمل کرنے کے لئے حجت موجبہ ہے۔

اور یہ اعتبار کا ادنیٰ درجہ ہے اور مخبر کا مسلمان عادل ہونا، اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی پوری پوری شناخت اور تعین ہو، نیز اس کے دینی حالات وعادات کا بھی صحیح علم ہو کہ آیا یہ ثقہ وعادل ہے یا نہیں ٹیلی گرام ووائرلیس میں یہ سب امور غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہیں، کچھ خبر نہیں ہوتی کہ خبر دینے والا کون ہے اور کیسا ہے، اس لئے ان کی خبریں اس باب میں مفید ومعتبر نہ ہوں گی، یہ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص موقع پر ان خبروں سے قوت وتائید کا فائدہ حاصل ہوجائے، مگر مدار ثبوت ان پر نہیں ہوسکتا، ان خبروں میں اگرچہ اتنی جہالت اور اتنا ابہام نہیں ہوتا جتنا وائرلیس وٹیلیگرام کی خبروں میں ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی اتنی بات ضرور ہوتی ہے کہ آواز کی پوری شناخت ہوتی بھی ہے تو بہت کم اور دشواری سے حتیٰ کہ محققین نے اس کا درجہ خط سے بھی کم شمار فرمایا ہے:

"كما حققه الشيخ الموصوف بالتفصيل في رسالة :كشف الظنون عن حكم الخط والتيليفون"۔

(جیسا کہ شیخ موصوف (مفتی محمد شفیع صاحب) نے نہایت بسط وتفصیل سے اس کو اپنے رسالہ "کشف الظنون عن حکم الخط والتیلیفون" میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے)۔

۱- شامی ۱۲۵/۲۔

اس لئے اس پر بھی عام طور سے مدار نہیں رکھ سکتے، البتہ بعض خاص صورتوں میں اس کا اعتبار کر سکتے ہیں، جس کی تعین وتشریح بعد میں اپنے موقعہ پر عرض ہوگی، رہ گیا ریڈیو تو جن میں چند قیود وشرائط کا اگر لحاظ کرلیا جائے تو صحت کا غلبہ ظن بھی بسہولت حاصل ہوسکتا ہے، مگر چونکہ ریڈیو دنیا کے ہر خطہ سے آسکتا ہے اور آتا ہے، ایسے مقام سے بھی آتا ہے جہاں کا مطلع مختلف ہونا بالکل ظاہر اور مسلمات میں سے ہے، جیسے کہ لندن، امریکہ، قسطنطنیہ، بلغاریہ، ان مقامات سے بھی کوئی اعلان ضابطہ شرعی کے مطابق آسکتا ہے، اور اختلاف مطالع کے نفس وقوع سے اختلاف یا انکار بھی نہیں ہے، اگر انکار یا اختلاف ہے تو محض رویت ہلال کے ثبوت میں اس کے اعتبار کرنے یا اس پر مدار رکھنے میں ہے، اس لئے ریڈیو کے اس نشریہ کے اعتبار کرنے میں جو قیود وشرائط ہیں اور جن کا لحاظ رکھنا بہرحال ضروری ہے، ان کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے، تاکہ منشاء شارع علیہ السلام اور مقصد شرع سے تخالف یا تجاوز لازم نہ آئے، جو کسی طرح درست نہ ہوگا۔

غرض اس مختصر تمہید کے بعد خاص طور سے ریڈیو سے متعلق تفصیلات وقیودات موعودہ نمبروار بیان کی جاتی ہیں جن کو احکام ومسائل کے لئے اصول موضوعہ اور قواعد کلیہ کے درجہ میں بھی کہا جاسکتا ہے اور اسی لئے ہم ہر صورت کو الگ الگ بعنوان مسئلہ نمبروار بیان کرتے ہیں، تاکہ سمجھنا اور بھی آسان ہوجائے۔

مسئلہ ۱: جہاں حکومت کی جانب سے قاعدہ شرعی کے مطابق رویت کا ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا قانون وانتظام ہو اور اس پر عمل رائج ومشہور، ہو تو وہاں پر مقامی طور سے پورے حدود مملکت کے اندر عمل کرنے کے لئے یہ مطلق اعلان بھی مثل اعلان قاضی ومثل طبل قاضی وصوت مدافع وغیرہ معتبر ہوگا، خواہ حکومت مسلمہ ہو یا کافرہ، ان اعلانات اور نشریوں پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

"لحصول غلبة الظن بهذاالطريق في هذه الصورة"۔

(حکم اس لئے ہے کہ) اس صورت میں اس طریقہ سے غلبہ ظن حاصل ہوجاتا ہے)۔

اور اس صورت میں حدود مملکت سے باہر بھی اس اعلان ونشریہ پر عمل کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ مہینہ ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو (بحوالہ عبارت ۵)۔

اس لئے کہ یہ اعلان من کل الوجوہ محض طبل قاضی یا صوت مدافع وغیرہ کے مانند نہیں ہے کہ محض انہیں کے حکم کے تابع اس کا بھی حکم ہو، اور وہی چیزیں اس کا مقیس علیہ ہوجائیں اور نہ ہی قضاۃ کے امور قیاسیہ مجتہدہ میں سے ہے کہ محض ان کے حدود واختیار و دائرہ حکومت کے اندر اندر محصور ہے اور نہ ہی معاملات محضہ یا امور سیاسیہ ملکیہ میں سے ہے کہ "لنا دارنا

ولکم دارکم" کے قاعدے سے حدود حکومت ومملکت کے اندر اندر محدود رہے، بلکہ اعلان ان تمام مذکورہ چیزوں سے بہت قوی وبلند ہے اور یہ اعلان ان صحابیؓ کے اعلان کے مانند ہے جن کو رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو جانے کے بعد خود سرکار دوعالم ﷺ نے اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا: "کما رواه الجماعة والدارمي عن ابن عباسؓ قال: جاء اعرابي إلى النبي ﷺ، فقال إني رأيت الهلال، يعني هلال رمضان، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله! قال: نعم، قال أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا" (۱)۔

یہ اعلان نبوی اس اعلان کا مقیس علیہ ہو سکتا ہے اور جس طرح یہ اعلان نبوی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہیں تھا، اسی طرح یہ اعلان بھی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہ ہوگا، جیسا کہ ذی قعدہ ۷۳ھ کے مرادآباد کے اجلاس "جمعیۃ العلماء" کے اندر اپنے اکابر حضرات شیخ الاسلام اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہم اللہ کے فیصلہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، نیز یہ اعلان خالص امور دینیہ سے متعلق ہے اور باب دیانات سے ہے، بلکہ از قبیل عبادات اور خالص عبادات سے متعلق ہے، بعض مہینوں میں کچھ آمیزش معاملات کی (جیسے ماہ عید الفطر وغیرہ) جو نظر بھی آتی ہے تو وہ محض تبعا وضمنا ہے، اس میں صلاحیت نہیں کہ اس کو مقیس علیہ بنایا جائے اور اس پر مستقل احکام متفرع کیے جائیں، بلکہ جس طرح اور امور دینیہ اور عبادات کے مخاطب سارے عالم کے مسلمان ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے مخاطب بھی سارے عالم کے مسلمان ہو سکتے ہیں اور جس طرح وہ سب "فليبلغ الشاهد الغائب" (۲) کے قاعدہ سے سب پر متوجہ رہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اسی قاعدہ سے سب پر متوجہ رہ سکتا ہے، بشرطیکہ مخصوص شرعی الفاظ میں ہو، اور تمام شرائط وقیود کو حاوی ہو جن کی تشریح وتفصیل اپنے اپنے موقعہ پر آجائے گی۔

مسئلہ ۲: جہاں پر حکومت کی جانب سے ایسا انتظام نہ ہو وہاں ایسا مسلمان حاکم جس کو حکومت کی جانب سے شرعی ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا اختیار رہو اور وہ اعلان کرے یا ہلال کمیٹی جس کے تمام افراد مسلمان باشرع ہوں اور اس کی پوری کارروائی میں کوئی مستند ومفتی تجربہ کار شریک ہو یا مستند مفتی شہر یا عالم مقتداء ومتدین یہ لوگ اعلان کریں کہ شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہو تو مقامی طور پر یہ اعلان بھی معتبر ہوگا، اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

۱- مشکوۃ ۱۷۴/۔

۲- بخاری مع الفتح باب الخطبة أيام منی ۳/ ۵۷۳۔

مسئلہ ۳: جہاں پر حکومت کی جانب سے کوئی شرعی انتظام نہ ہو اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت حسب قاعدہ شرع ثبوت لے کر اعلان کا اختیار رکھتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی وغیرہ ہو، جیسا کہ ہمارے ملک کی اکثر آبادیوں کا بالخصوص دیہاتوں کا یہی حال ہے، جیسا کہ وہاں بھی مسلمان آباد ہیں اور بکثرت ہیں اور ان کو بھی روزے رکھنا شوال کی پہلی تاریخ متعین ومعلوم کرنا ضروری ہے، کیونکہ یکم شوال کو روزہ رکھنا حرام ہے، اور چاند ہر جگہ یا ہمیشہ نظر آنا ضروری نہیں اور ریڈیو بوجہ کثرت قریب قریب ہر گاؤں میں رائج ہو چکا ہے، اگر ریڈیو سے خبر آجائے اور آہی جاتی ہے، ایسے موقع پر کس طرح عمل کیا جائے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ خبر اگرچہ اپنے ملک کے کسی حصہ سے آئے لیکن بایں الفاظ آئے کہ یہاں چاند ہوا ہے، یا فلاں شخص نے دیکھا ہے یا بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے، تو یہ بالکل معتبر نہیں، خواہ کتنی ہی تعداد میں ایسی خبریں کیوں نہ آئیں۔

"لأنها حكاية محض لا خبر معتبر كما هو ظاهر"۔

(اس لئے کہ خبر وحکایت محض ہے شریعت میں غیر معتبر ہے)۔

اور ہمارے ملک میں آجکل ریڈیو کی خبریں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں، اور عوام بھی اکثر بلا لحاظ شرائط وقیود اس کو معتبر اور قابل عمل قرار دے کر عمل کر بیٹھتے ہیں اور ان ہی وجوہ کی بناء پر بعض حضرات علماء نے ریڈیو وغیرہ کی خبروں کو مطلقاً غیر معتبر ونا قابل عمل قرار دیا ہے، ورنہ راجح ومحقق یہ ہے کہ اگر بایں الفاظ اعلان یا خبر نشر ہو کہ میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے یا فلاں ہلال کمیٹی نے جس کے تمام افراد باشرع ہیں یا فلاں مفتی شہر نے یا فلاں عالم مقتدیٰ ومتدین نے یا فلاں مسلمان حاکم یا مسلمان وزیر نے (جس کو حکومت وقت کی جانب سے بااختیار بنایا گیا ہو) ثبوت شرعی حاصل کر کے ثبوت رویت کا حکم یا فیصلہ دے دیا ہے، اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص بھی معلوم ومعتبر ہو تو اس نشریہ پر بھی عمل کرنا درست اور صحیح ہوگا۔

"لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة" ينفذ أحكامه فيستند هذا الخبر إلى موجب شرعي صحيح وأقله أن يحصل به غلبة الظن الموجب للعمل كما يحصل بسماع أصوات المدافع وبرؤية القناديل من المصر" (۱)۔

(اس لئے کہ کوئی شہر ایسے حاکم شرعی سے عادۃً خالی نہیں رہتا جس کے احکام اس شہر میں نافذ ہوتے ہیں، پس یہ

۱- وفي رد المحتار الشامي: "لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة، فلا بد من أن يكون صومهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعي، فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحاكم المذكور، وهي أقوى من الشهادة...... فإنها تفيد اليقين فلا ينافي ماقبله، هذا ما ظهر لي، تأمل" رد المحتار کتاب الصوم ۳/۵۹ ۳، مطلب ما قاله السبکی)۔

خبر (اس حالت میں) صحیح شرعی سبب کی جانب سے منسوب ومستند ہوگی اوراس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس سے ایسا غلبۂ ظن حاصل ہوجائے گا جو عمل کرنے کی وجہ ہوسکے گا)۔

اسی طرح بایں الفاظ خبر یا اعلان نشر ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں فلاں (کم سے کم دو معتبر عادل) شخصوں نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اوران الفاظ کا نشر کرنے والا شخص معلوم اور معتبر ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہے تو مقامی طور پر یہ خبریں بھی طرق موجبہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے معتبر ہوں گی اور قابل عمل ہوں گی۔

"كما حققه العلامة التهانوي رحمه الله في رسالة زوال السنة من أعمال السنة وفي إمداد الفتاوى"(۱)۔

(جیسا کہ علامہ تھانویؒ نے اپنے "رسالہ زوال السنۃ عن أعمال السنۃ" میں اور "امداد الفتاویٰ" (۲/ ۷۲) میں اس کی تحقیق کی ہے)۔

مگر اس کے معتبر ہونے میں یہ تفصیل ہوگی کہ اس خاص آبادی کے آس پاس آبادی میں جہاں جانا آنا زیادہ دشوار نہ ہو، اگر کوئی عالم متدین موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے واقف ہو، اس کے سامنے ریڈیو سے خبر سننے والوں کو پیش کر کے بیان دلائیں پھر حکم شرعی معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کریں۔ عوام خود رائی وعجلت نہ کریں۔

مسئلہ ۴: جو دیہات یا آبادی ایسی ہو کہ اس کے آس پاس کی آبادی میں ویسا متدین اور ذی علم شخص موجود نہ ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا ہو یا موجود ہو، مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو اوران عالم کا آنا بھی دشوار ہو، مندرجہ ذیل طریقہ سے عمل کیا جائے تو درست ہوگا اور نجات آخرت کے لئے ان شاء اللہ کافی ہوگا، البتہ دوسروں سے الجھنا یا زبردستی کرنا یا دوسروں کو ماننے پر مجبور کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ اور وہ طریقے یہ ہیں:

(الف) اگر مطلع صاف ہونے کی حالت میں اس معتبر مضمون کا نشر یہ آجائے جو مسئلہ ۳ میں راجح اور محقق کر کے لکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے (اور یہ شخص معلوم (معتبر ہو) یا یہ مضمون ہو کہ مجھ سے فلاں (معلوم ومعتبر) شخص نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا فلاں شرعی ہلال کمیٹی یا فلاں بااختیار مسلمان حاکم نے یا فلاں قاضی شرع نے یا فلاں مفتی شہر نے (اور یہ سب لوگ معتبر ومعلوم ہوں) شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم دیا ہے، اور یہ اعلان یا خبر اتنی

۱- امداد الفتاوی للتھانوی ۲/ ۷۲۔

تعداد میں آجائے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کرلینا متصور نہ ہو یا متعذر رہو تو عمل کرنا جائز ہوگا، صرف دو ایک نشریہ کبھی اس صورت میں عمل کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا، خواہ ہلال عید کے موقع پر ہو یا ہلال رمضان کے۔

(ب) اگر مطلع صاف نہ ہو اور ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، اور مضمون وہی ہے جو ابھی (الف) میں راجح اور محقق کہہ کے لکھا گیا ہے، یعنی یہ ہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے، الخ تو ایک نشریہ بھی عمل کے لئے کافی ہوجائے گا۔

(ج) اگر مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینہ کا ہو، مثلاً شعبان یا بقرعید وغیرہ کا ہو تو ایسے معتبر مضمون کا نشریہ جس کو راجح اور محقق کہہ کے ابھی لکھا گیا ہے کہ کم از کم دو کی تعداد میں آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما تفق آ رہے ہوں، اور اس نشریہ کے صادق ہونے کا اور نشر کرنے والوں کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو۔

مسئلہ ۵: اگر منجانب حکومت ثبوت رویت کا کوئی شرعی انتظام نہ ہو، اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت شرعی قاعدہ کے مطابق بذریعہ ریڈیو وغیرہ اعلان نشر کرتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی حسب ضابطہ شرع اس خدمت کو انجام دیتی ہو، اور نہ وہ آبادی ایسی ہو کہ اس میں یا اس کے آس پاس کی آبادی میں کوئی ایسا متدین اور ذی علم موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا کراتا ہو یا موجود ہو، مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر یا اعلان سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو، اور ان عالم کا آنا بھی دشوار رہو تو ان حالات میں ہلال رمضان کے ثبوت کے لئے ٹیلیفون کا اختیار کر لینے کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔

ٹیلیفون سے آنے والی اطلاع اگر چہ شرعی شہادت نہیں ہوگی، کیونکہ باب شہادت میں شاہد کا مجلس شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، اور پس پردہ کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، لیکن چونکہ اس پر دین کے ایک بہت بڑے مسئلہ کی بنیاد واقع ہو رہی ہے، اس لئے اس کو مؤثق کرنے کے لئے حتی الامکان ان قیود کا اعتبار کرنا ضروری ہے، جو شہادت میں ملحوظ ہوتی ہیں۔

اس لئے ٹیلیفون کا مضمون وہی ہو، جو مسئلہ ۳ میں محقق و راجح کہہ کر لکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ ٹیلیفون سے بولنے والا یہ اطلاع ان الفاظ میں دے رہا ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں معتبر شخص نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے، یا میرے سامنے فلاں شرعی ہلال کمیٹی نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اور اس کے تمام ارکان ذی علم اور متدین ہیں، شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم و فیصلہ دیا ہے یا ٹیلیفون پر کہنے والا یہ کہہ رہا ہو کہ میرے سامنے فلاں

مسلمان حاکم جو اس قسم کے معاملات میں اعلان کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اس نے یا فلاں قاضی شرعی نے یا فلاں مفتی شہر نے شرعی ثبوت لے کر رویت کا حکم وفیصلہ دیا ہے اور مسلمان حاکم اور قاضی شہر کو میں خوب جانتا ہوں اور یہ لوگ معتبر و متدین ہیں اور پھر یہ شخص جو ٹیلیفون پر بول رہا ہے، یہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر و متدین شخص ہو اور اس کی آواز بھی خوب پہچانی جا رہی ہو، اور پھر ان الفاظ میں ان قیود کے ساتھ آنے والے ٹیلیفون کے بعد اس پر عمل کرنے کی محض مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

(الف)—— مطلع صاف ہو تو محض دو ایک ٹیلیفون کافی نہیں، خواہ کمیٹی ہی ثقہ اور معتبر لوگوں کی ہو، بلکہ ملک کے مختلف گوشوں سے ان ہی مذکورہ بالا الفاظ میں اتنی تعداد میں آجانا ضروری ہے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کرلینا متصور نہ ہو یا متعذر رہو۔

(ب)—— مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو تو صرف ایک ٹیلیفون بھی اپنے عمل کے لئے کافی ہوگا۔

(ج)—— مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے کا ہو، مثلاً شعبان یا بقرعید کا ہو تو کم از کم مذکورہ معتبر الفاظ میں دو ٹیلیفون کا آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما اتفق آرہے ہوں اور ان کے صادق اور معتبر ہونے کا ظن غالب حاصل ہو رہا ہو۔ اسی طرح اگر چہ کوئی شرعی انتظام ہو اور خبر کو ثبوت شرعی کے ساتھ نشر کرنے کے مراکز بھی موجود ہوں، لیکن ٹیلیفون کی اطلاع ایسے مقام سے آرہی ہو کہ وہاں سے شرعی اصول و ضابطہ کے مطابق ان مراکز تک اطلاع پہنچنا سخت دشوار و متعذر رہو، اس حالت میں اگر یہ اطلاع ان ہی معتبر الفاظ میں آرہی ہو تو یہ بھی ان ہی مذکورہ بالا تفاصیل وقیود کے مطابق معتبر ہو سکے گی۔

تنبیہ: یہی وہ حالتیں اور صورتیں ہیں جن میں ٹیلیفون کے اعتبار کی گنجائش ان مذکورہ تفصیل و شرائط کے ساتھ ہو سکتی ہے، جن کے بیان کا شروع میں وعدہ کیا گیا تھا:

"هذا أيضا مستفاد من رسالة زوال السنة عن أعمال السنة (۱۹–۱۸)، ومن إمداد الفتاویٰ (۲/۷۲)، لمجدد الوقت المحقق العلامة أشرف علي التهانوی رحمه الله.

(یہ احکام بھی رسالہ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ سے اور "امداد الفتاویٰ ۲/۷۲) سے مستفاد ہے)۔

مسئلہ ۶: جب یہ اعلانات اور نشریئے بیرون ملک سے آئیں اور اپنے یہاں مثل مسئلہ ۱ کے انتظام موجود ہو تو اس انتظام کے تحت جو اعلان ہو فقط اس پر عمل کریں خود عجلت نہ کریں اور اگر مثل مسئلہ ۱ میں جو راجح و محقق کہہ کر بایں الفاظ لکھا گیا ہے "میں نے خود چاند دیکھا ہے یا میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے ثبوت کا فیصلہ دیا ہے۔ الخ" اس کے مطابق عمل کریں اور اگر یہ

صورت بھی نہ ہو تو مسئلہ ۴ کے مطابق عمل کریں۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو مگر ٹیلیفون آرہے ہوں تو مسئلہ ۵ کے مطابق عمل کریں۔

تنبیہ ۲: ان تمام صورتوں میں عمل جائز ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ان کے اعلانات یا خبروں پر عمل کرنے سے مہینہ ۳۰ ر یا ۲۹ ر دن کے بجائے ۲۸ ر دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو، ورنہ کسی صورت میں بھی عمل کرنا قطعا جائز نہ ہوگا، مثلا رمضان کی ۲۸ ہی تاریخ کی شام کو اعلان یا خبر آجائے، خواہ ان الفاظ میں کیوں نہ آجائے جس کو راجح و محقق کہہ کر لکھا گیا ہے، یعنی میں نے چاند دیکھا ہے یا فلاں فلاں نے چاند دیکھا ہے الخ، تو یہ اعلان یا خبر کسی طرح شرع میں معتبر نہ ہوگی چاہے مسئلہ ۱ کی حالت ہو یا مسئلہ ۲ یا مسئلہ ۳ کی یا مسئلہ ۴ کی۔ یا مثلا شعبان کی ۳۰ کو بدلی تھی چاند نظر نہ آنے کے باوجود اس کے بعد اس کے بعد والے دن کو فقہی قاعدہ کے مطابق رمضان قرار دے کر روزہ رکھالیا اور بعد دوپہر بذریعہ ریڈیو یہ اعلان آگیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے اور کل آئندہ رمضان کی پہلی تاریخ ہے، تو اس اعلان یا خبر پر عمل نہ کریں گے، اور روزہ نہ توڑیں گے، بلکہ اسی دن کو جس میں روزہ رکھا ہے رمضان کی پہلی تاریخ ماننا ضروری رہے گا، ورنہ شعبان کا مہینہ ۳۱ دن کا ہونا لازم آجائے گا، اور یہ جائز نہیں، نص صریح کے خلاف ہے، کمامر فی التمہید۔

تنبیہ ۳: خوب یاد رہے کہ اس قسم کے اعلانات و خبروں پر عمل کرنے میں بڑی ہی احتیاط لازم ہے، حتی کہ اگر بعد میں دلیل شرعی سے بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس اعلان یا خبر کی وجہ سے جس دن روزہ افطار کرلیا یا روزہ نہیں رکھا، حالانکہ اس دن روزہ رکھنا چاہئے تھا یا وہ دن رمضان ہی کا تھا تو اس دن کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی، مثلا دلیل شرعی سے یہ معلوم ہو جائے ۲۹ رمضان کی بذریعہ ریڈیو رویت کی خبر غلط تھی، اس کے بعد والے دن یکم شوال نہ تھی، بلکہ ۳۰ رمضان تھی، جیسے خود ریڈیو ہی نے تردید کردی کہ وہ خبر غلط ثابت ہوگئی ہے تو اس کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی۔

تنبیہ ۴: شہر کے لوگوں کی طرح دیہات کے لوگوں کو بھی چاہئے کہ دو دو چار گاؤں کا حلقہ بنا کر اس میں ہلال کمیٹی بنالیں اور اس میں ایک متدین شخص کو بھی جو مسائل متعلقہ سے واقف ہو شریک کرلیں، پھر حسب قاعدہ شرعی مذکورہ بالا اس کے تحت عمل کرلیا کریں۔ اور ان ہلال کمیٹیوں کے بنانے میں حتی المقدور سعی و کوشش کریں کچھ ایثار کریں، بہر حال جہاں یہ بھی ممکن نہ ہو وہاں جو شہر یا قصبہ قریب ہو، اور وہاں اس کا نظم ہوا ہے کو اس سے وابستہ کرلیں اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرلیا کریں۔

تنبیہ ۵: سب سے عمدہ اور بہتر صورت تو یہ ہے کہ حکومت وقت کی جانب سے رویت ہلال کا انتظام با قاعدہ

قانونی شکل میں کرالیا جائے، کم ازکم ہلال عید و بقرعید و شعبان و رمضان ہی کا نظم کرالیا جائے، اس لئے کہ خبر رسانی کے ذرائع ووسائل کثیر و آسان و عام ہوتے جارہے ہیں ٹیلیگرام و ٹیلیفون ریڈیو لاسلکی وغیرہ جن میں بعض تو گھر گھر نہیں تقریباً گاؤں گاؤں عام ہوتے نظر آرہے اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو بعد چندے عامۃ المسلمین بڑی الجھنوں میں مبتلا ہونے لگیں گے، اس انتظام کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حکومت ایک متدین ذی علم مسائل واحکام رویت سے بخوبی واقف اور مستند مسلمان کو متعین کرکے اس کو قانوناً اختیار دے دے کہ وہ اپنے طور پر شرعی قاعدہ سے رویت ہلال کا ثبوت حاصل کرکے وقت پر قیود وتفصیلات شرعیہ مذکورہ کے تحت اعلان کردیا کرے اور سارا ملک اس کے مطابق عمل درآمد کرلیا کرے، یا مثلاً اس طرح انتظام کرلیا جائے کہ ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں، اور اس میں ایک مستند اور تجربہ کار مفتی شریک کار ہو وہ کمیٹی ایسے انتظام میں رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرکے حکومت سے اجازت لے کر، بایں الفاظ اعلانیہ نشر کردے یا کرادے کہ ہم فلاں ہلال کمیٹی کے تمام افرادرویت کا شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء اعلان کرتے ہیں، یا کراتے ہیں کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہے اور کل یکم رمضان ہے روزے رکھے جائیں، یا یکم شوال ہے نماز عید ادا کی جائے، پھر اسی طرح ہلال شعبان وذی الحجہ وغیرہ کے لئے اعلان کردیا جائے یا کرا دیا جائے، نیز اگر ضرورت پڑے (ضرورت واقعی ہے) تو جہاں جہاں اسی قسم کے لہر (یعنی ریڈیو وغیرہ) کے مراکز ہوں، اسی قاعدہ مذکورہ تنبیہ ۲ کے مطابق انتظام کرلیا جائے اور پھر سب کو ایک میں منسلک کرالیا جائے۔

امید ہے کہ اس تفصیل سے صورت مسئولہ کی تمام شقوں کا جواب بقدر ضرورت نکل آئے گا اور انشاء اللہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے گا، اس لئے اب کسی مزید تفصیل کی حاجت نہ رہی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید علی سعید، محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

دوربین یا ہوائی جہاز سے چاند دیکھنا:

دوربین کے ذریعہ یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بلندی سے چاند دیکھنے کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟

(الف) کسی مقام کی رویت کا اعلان اگر مقامی قاضی ٹیلی ویژن یا ریڈیو پر کرتا ہے یا بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دیتا ہے تو مقامی لوگوں کے لئے ایسا اعلان اور ایسی اطلاع قابل قبول ہے یا نہیں؟

ریڈیو، ٹیلی ویژن، تار، فون اور خط کے ذریعہ رویت کی خبر:

(ب) ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبر دوسرے مقامات کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(ج) ٹیلی فون کی اطلاع جب کہ آج کل بڑے بڑے شہروں کے درمیان ڈائریکٹ ڈائلنگ کا سسٹم رائج ہے، دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(د) تار کی اطلاع دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(ھ) خط کے ذریعہ دوسرے مقامات کے لوگوں کو اطلاع مل جائے تو اسے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر قبول کیا جائے گا تو کن صورتوں میں؟

رویت ہلال کے لئے کمیٹی کی تشکیل:

کیا رویت ہلال کے اعلان کے لئے کسی مرکزی کمیٹی کی تشکیل سے آپ متفق ہیں؟ اور کیا بڑے بڑے شہروں میں ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل سے بھی آپ کو اتفاق ہے؟

رویت ہلال کے مسئلہ پر کوئی اور مشورہ جو آپ دینا چاہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دین اسلام سادہ اور دین فطرت ہے، اس کے احکام بھی سادہ اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں، تا کہ عاقل بالغ انسان، خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، خواہ امیر ہو یا غریب اور خواہ کسی خطہ کا باشندہ ہو آسانی سے عمل کر سکے اور اپنے خالق و مالک و مربی سے اپنا رشتۂ عبودیت صحیح طریقہ سے جوڑ سکے۔

سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں رصد گاہیں ہند و بیرون ہند میں موجود تھیں۔ اصطرلاب وغیرہ آلات بھی موجود تھے اور ان آلات و رصد گاہوں کے ذریعہ سے صحیح طریقہ سے معلوم بھی کیا جاتا تھا کہ اس وقت چاند کس مقام کے مطلع میں موجود رہتا ہے نظر آئے یا نہ آئے، یہ دوسری بات ہے، اگر ان آلات اور رصد گاہوں کے ذریعہ تلاش ہلال کا حکم دیدیا جاتا تو کچھ مستبعد بات نہ ہوتی، مگر سرکار دو عالم ﷺ نے ایسا حکم نہیں دیا، بلکہ صاف صاف فرمادیا گیا کہ جب تک تم لوگ چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو، اسی طرح روزہ شروع کرنے کے بعد جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ ختم نہ کرو، بلکہ اگر تم پر مطلع صاف نہ

ہونے کی وجہ سے چاندنظر نہ آئے مخفی رہ جائے توتیس دن کی تعداد مہینہ کی ابتدائے صوم میں بھی اور انتہائے صوم میں بھی، بلکہ ہر مہینہ کی تعداد ایسے حالات میں تیس دن کی پوری کرلو، نیز مدینہ واطراف مدینہ میں پہاڑیاں بھی موجود تھیں ان پر لوگ چڑھتے بھی تھے اور یہ بھی یقین تھا کہ اوپر کی فضا صاف ہوتی ہے اگر اس پر چڑھ کر چاند تلاش کرنے کا حکم دیدیا جائے، لوگ عمل بھی کرلیں گے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ اگر پہاڑ پر چڑھ کر چاند دیکھنے کا حکم دیدیا جائے تو لوگ پہاڑ سے اوپر اڑ کر نہ جاسکیں گے کہ غلو کرنے یا افراط وتفریط کرنے کا اندیشہ یا خطرہ ہو، پھر بھی پہاڑ پر چاند دیکھنے کا حکم دینے پر قناعت فرمائی گئی، یہی نہیں، بلکہ علمی وسائنسی موشگافیوں اور حسابی دقیقہ سنجیوں کے احتمال سے بھی اعراض فرمایا گیا اور "نحن أمة لا نكتب ولانحسب" ()(صحیح بخاری ۲۵۶/۱) کا فرمان ناطق فرمادیا گیا، یہ سب چیزیں اسی بات کا پتہ دیتی ہیں کہ نہ دوربین استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہوائی جہاز میں اڑکر تلاش کرنے کی حاجت ہے، بلکہ ان سب طریقوں کو لازم کرنا یا اہمیت دینا شرع وشارع علیہ السلام کا مطلوب نہیں ہے اور حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ شکل حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس پر شرعی حکم محول ودائر نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا اہتمام ہی کیا جائے گا، البتہ اگر خبر دینے والے یا شاہدین ہوائی جہاز سے دیکھ کر طریقہ موجب کے ساتھ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے خبر یا شہادت دیدیں گے توحسب ضابطہ شرعی اعتبار کرلیا جائے گا اور اس طرح وہ خبر یا شہادت بھی معتبر ومقبول ہوسکتی ہے۔

(الف) اگر اعلان بایں الفاظ ہو کہ فلاں رویت ہلال کمیٹی چاند کے شرعی ثبوت مل جانے کے بعد یہ اعلان کر رہی ہے یا اپنے انتظام سے کرا رہی ہے کہ رویت شرعاً ثابت ہوچکی ہے، صبح سے (مثلاً) روزے رکھے جائیں یا صبح نماز عید ادا کی جائے اور یہ کمیٹی جانی پہچانی اور معتبر ہو، اور اس کے سب ارکان باشرع ہوں تو یہ اعلان مقبول ہوگا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوجائے گا۔

اسی طرح معتمد ومعتبر ہلال کمیٹی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں یہی اعلان اگر قاضی شہر یا اس کے قائم مقام کی جانب سے ہو تو وہ بھی مقبول اور واجب العمل ہوگا۔

(ب) انہیں شرائط مذکورہ (الف) کے ساتھ دوسرے مقامات سے آنے والا اعلان بھی واجب العمل ہوگا، صرف ایک قید ملحوظ ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ ۲۸ دن کا نہ ہو رہا ہو۔ اگر ۲۸ دن کا ہو رہا ہوگا تو عمل کرنا جائز نہ رہے گا۔

(ج) ٹیلیفون کی اطلاع کو چونکہ بہت سے آدمی بیک وقت نہیں سن سکتے، اس لئے اس کے ذریعہ اطلاع میں

اعلان کی شان نہ ہوگی، بلکہ یہ اطلاع محض خبر کے درجہ کی چیز ہو سکے گی، خواہ ڈائلنگ کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے ہو، کیونکہ اعلان کے مفہوم و ماہیئت میں یہ داخل ہے کہ اس کو بیک وقت بہت سے لوگ سنیں، اور اس اطلاع کے مقبول ہونے کی شرط یہ بھی ہوگی کہ ٹیلیفون میں بولنے والا شخص جانا پہچانا اور معتبر وثقہ شخص ہو، اور اس کی آواز بھی خوب اچھی طرح پہچانی جارہی ہو، اس میں کسی قسم کا اشتباہ یا خلط نہ ہو، اور وہ یہ کہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں شخص نے (اور وہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر وثقہ شخص ہو) اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور مجھے خبر کرنے کے لئے کہا ہے جب یہ اطلاع ان لفظوں میں ہوگی اور وہاں قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی وغیرہ) نہ ہوگا تو رمضان وعید کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط وقیود سوال ۱ کے جواب میں گزر چکی ہیں انہیں شرائط وقیود کے ساتھ مقبول و نامقبول ہوگی۔

(د) ظاہر ہے کہ تار میں تار دینے والے کے الفاظ یا اس کی بعینہ نقل نہیں آتی، بلکہ ٹیلیگراف مشین (ایک آلہ) کی آواز (کھٹکھناہٹ) کے اصطلاحی اشاروں کی مخفی ترجمانی آتی ہے اور وہ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس لئے تار کی اطلاع کو نہ تو اعلان کہہ سکتے ہیں اور نہ خبر شرعی کا درجہ دے سکتے ہیں اور یہ سب امور ظاہر ہیں، اس لئے محض تار کے ذریعہ ثبوت رویت کا حکم نہیں دیا جاسکتا، البتہ تقویت وتائید یا تصویب وتصدیق کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

خط کا حکم یہ ہے کہ اگر خط لکھنے والے نے دو معتبر وثقہ مسلمانوں کے سامنے خط لکھ کر ان دونوں کو اس پر شاہد بنا کر خط کے ہمراہ بھیجا ہے اور یہ دونوں خط لانے والے خط لا کر شہادت دیں کہ کاتب نے ہمارے سامنے یہ خط لکھا ہے تو یہ خط معتبر وحجت بنے گا۔ پس اگر یہ خط لکھنے والا قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (جیسے رویت ہلال کمیٹی) وغیرہ ہے اور اس خط میں ثبوت رویت کی اطلاع لکھی ہے تو اس خط پر عمل کرنا واجب ہو جائے گا۔

اور اگر قاضی شرع یا اس کے قائم مقام نے نہیں لکھا ہے، بلکہ کسی تیسرے شخص نے لکھا ہے اور اس میں اپنے چاند دیکھنے کی خبر دی ہے تو یہ خبر کے درجہ میں ہوگا اور رمضان وعیدین کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف و ناصاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط وقیود تفصیل سے سوال ۱ کے جواب میں درج ہیں اس کے مطابق عمل ہو سکے گا اور اگر شاہد بنا کر نہیں بھیجا ہے تو "**الخط يشبه الخط**" کی وجہ سے مفید ومعتبر نہ ہوگا، ہاں اگر مختلف مقامات سے مختلف آدمیوں کے خط رویت ہلال کے ثبوت کے اتنی تعداد میں آجائیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہے تو اس صورت میں اس کا بھی اعتبار ہو جائے گا اور وہ مفید رویت بن جائے گا۔

ہاں اتفاق ہے، البتہ رویت ہلال کی ہر شرعی کمیٹی میں سب ارکان کا باشرع ہونا ضروری ہے اور جہاں تک ہو سکے

ہر کمیٹی میں دو ایک ایسے رکن کا انتخاب کرنا انسب ہوگا جو کتاب وسنت اور فقہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

چونکہ ہلال رمضان وعیدین کا مسئلہ دین و دیانت اور عبادات سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس معاملہ میں مسائل پر غور و بحث اور اجتماعی فیصلہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل سنت والجماعت کے علماء خاص طور پر ایسے علماء جو مذاہب اربعہ کے فقہ پر عبور رکھتے ہوں، ان کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۲/ ۱۲/ ۹۳ ۱۳ ھ

محض سائنسی یا حسابی تخمینے کی بنیاد پر رویت ہلال کا حکم لگانا درست ہے:

ہمارے یہاں مختلف ممالک و مکاتب فقہ کے پیرو مسلمان طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، گذشتہ عید الاضحیٰ اور اس سے پہلے عید الفطر پر تعیین یوم عید پر اختلاف رائے ہوا، مسلمان طلبا انجمن کی طرف سے طے پایا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے مختلف اسلامی مکاتبِ فکر علماء سے معلوم کیا جائے، تا کہ آئندہ اختلاف نہ ہو، اس لیے یہ عریضہ ارسال ہے، حسب ذیل سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں:

الف: کیا ماہِ شوال کا چاند نہ دیکھنے کی صورت میں کسی بھی سائنسی یا حسابی تخمینہ کے ذریعہ جس مقررہ تاریخ کو ماہِ شوال کے چاند کے نظر آنے یا افق پر اس زاویے پر واقع ہونے کی پیش گوئی ہو جس میں موسمی حالات کے سازگار ہونے کی صورت میں چاند دکھائی دیتا ہو اور یہ پیش گوئی قطعیت یا غالب امکان کے درجوں کے ساتھ پیش کی گئی ہو، اس مقررہ تاریخ سے اگلے روز کو ارشوال مان کر عید الفطر کی نماز ادا کرنا قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے؟

ب: کیا ذی الحجہ یا کسی بھی دوسرے مہینے کے لئے اس طریقہ کار کو اپنانا جائز ہوگا؟

ج: یوم عید الاضحیٰ کا تعین قرآن وسنت کے مطابق کیسے ہوتا ہے کیا یوم وقوف یعنی وقوف العرفات کے ایک روز کے بعد خواہ آپ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں جب کہ اس صورت میں تعین مکۃ المکرمہ میں ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کی تاریخ کے لحاظ سے ہوگا اور عین ممکن ہے کہ دوسرے خطوں میں اس تاریخ کو چاند نظر نہ آیا ہو، یا کسی بھی خطہ میں وہاں کے لحاظ سے ۱۵ ذی الحجہ کو جب اس صورت میں عین ممکن ہے کہ وقوف العرفات کے روز ایک یا ایک سے زیادہ کے ایام کے فرق سے دنیا کے کسی علاقہ میں عید الاضحیٰ ہو۔

الجواب وبالله التوفيق:

مندرجہ ذیل استفتاء کے مسائل کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے چند اصول ذہن میں حاضر رکھنا ضروری ہے اور اس میں سب کی اصل یہ آیت کریمہ ہے: " **شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدىٰ والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه**"(۱) اور اس آیت کریمہ کی تفسیر و توضیح احادیث رسول پاک ﷺ و آثار صحابہؓ میں مذکور ہے، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ دین اسلام سیدھی سادی فطرت سلیمہ پر دائر ہے، تاکہ ہر طبقہ کا انسان خواہ کسی خطہ کا ہو، کسی طبقہ کا ہو، جاہل و ان پڑھ ہو، یا پڑھا لکھا، متمدن ہو یا غیر متمدن غرض کوئی ہو، صرف ایک قید ہے کہ عاقل ہو ہر ایک اپنے رب سے رابطۂ عبودیت قائم کر کے آسانی سے کامیاب و فائز المرام ہو سکے۔

اسلامی احکام کا مدار فلسفیانہ موشگافیوں پر یا علم اخلاق و ریاضی و ہندسہ کے حساب کے دقائق اور نکتوں پر دائر نہیں ہے، لہٰذا ہلال کی رویت و عدم رویت کا حکم بھی ان حسابی یا نجومی حساب پر نہیں ہوگا بلکہ صاف ارشاد فرمایا گیا: "**دقائق و نحن امة أمية لانكتب ولانحسب، الشهر هكذا وهكذا وعقد الابهام في الثانية، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا يعني تمام الثلثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلثين**"(۲)۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اسلام کے احکام کا مدار حساب و کتاب پر نہیں: کیونکہ صوم رمضان کبھی کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا ہوتا ہے، پس ۲۹ شعبان کو چاند نظر آجائے تو روزہ رکھنا شروع کر دو اور اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے ۳۰ دن پورے کر کے روزہ رکھنا شروع کر دے، چاند نظر آئے یا نہیں، کیونکہ کوئی مہینہ ۳۰ دن سے زیادہ کا نہیں ہوتا ہے، اسی طرح ہلال عید کا حکم بھی بتایا گیا کہ ۲۹ رمضان کو چاند نظر آجائے تو عید منالو، ۲۹ رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے کر کے عید منالو چاند نظر آئے یا نہ آئے، اسی طرح بخاری مسلم شریف میں فرمانِ رسالت ﷺ یہ بھی ہے:

"**قال عليه السلام: "لايتقدمن أحدكم رمضان بصوم يوم اويومين"(۳)، " وقال عليه السلام: لاتقدموا الشهر حتى تروا الهلال أوتكملوا العدة، ثم صوموا حتى تروا الهلال أوتكملوا العدة** "(۴)۔

۱- سورۂ بقرہ:۱۸۵۔
۲- مشکوٰۃ المصابیح ۱/ ۱۷۴۔
۳- بخاری ۱/ ۲۵۶۔
۴- السنن لأبی داؤد باب کراہیۃ صوم یوم الشک ۱/ ۳۱۹۔

اسی طرح حضرت عمار بن یاسر سے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کی ہے:

"من صام يوم الشك فقد عصىٰ أبالقاسم ﷺ" (۱)۔

ان روایات سے صحیح طور پر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صوم رمضان کو ماہ رمضان سے دو ایک دن بھی مقدم کر کے ہرگز نہ رکھو اور اس تحدید کے راز و حکمت کی جانب مذکورہ بالا آیتِ کریمہ نے ارشاد فرمایا کہ قرآنِ پاک کو جو احکامِ خداوندی کی اساس ہے اور ساری دنیا کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا گیا ہے، اس ماہِ رمضان المبارک سے خصوصی رابطہ و تعلق ہے اور اسی رابطہ و تعلق کی وجہ سے حکم خداوندی ہے کہ جو شخص اس مہینہ کو پا جائے اس میں پورے مہینے کے روزے رکھے "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" (۲) اور بہت ممکن ہے کہ یہ خصوصی ربط و تعلق بھی راز ہو اس بات کا کہ ہلال رمضان کے ثبوت میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

غرض دو ایک دن کی تاخیر میں بھی یہ نکتہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کی جانب حضرت عمار بن یاسرؓ کی روایت میں بھی اشارہ ہے کہ جو شخص بلا ثبوتِ شرعی کے یوم شک میں رمضان کا روزہ رکھے گا عند اللہ و عند الرسول عاصی و گنہگار ہوگا (۳)۔

اور حسابی تخمینے کا مدار محض وہم و گمان پر ہوتا ہے یقین پر ہرگز نہیں ہوتا، اگر کوئی حساب یقینی ہو بھی جائے تو اس پر انسان قادر نہیں، البتہ شہادت کو شریعت مطہرہ نے یقین کا مرتبہ دیا ہے، اس لیے خصوصی طور پر اس مہینہ کے ثبوت کا مدار رویت پر یا رویت کی شہادت پر رکھا ہے، جس طرح سے کہ اور بہت سے یقینیات کے ثبوت پر ہوتا ہے، رہ گیا یہ سوال کہ دیکھنا ہر ہر شخص کا الگ الگ ضروری ہے یا پوری قوم سے صرف دو ایک کا بھی دیکھنا کافی ہوگا (۴)۔

اس چیز کا ضابطہ بھی ارشادِ نبوی ﷺ میں فرمایا گیا، چنانچہ احادیث صحاح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"جاء أعرابي إلى النبي ﷺ، فقال: إني رأيت الهلال، يعني هلال رمضان، فقال عليه السلام: أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: تشهد أن محمدا رسول الله، قال: نعم، قال: "يا بلال!

۱- السنن لأبي داؤد باب کراہیۃ صوم یوم الشک ۱/ ۳۱۹۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔

۳- "ولا يصام يوم الشك الخ" (الدر المختار علی ھامش الشامی ص ۹۳، ج ۲ کتاب الصوم)۔

۴- "وصحح في الأقضية الاكتفاء بواحد إن جاء من خارج البلد، أو كان على مكان مرتفع، واختاره ظهير الدين، (الدر المختار علی ھامش الشامی ص ۹۳ ج ۲ کتاب الصوم) (مرتب)۔

أذن في الناس أن يصوموا غداً''(۱)۔

اس ضابطہ کاحل یہ ہے کہ ۲۹ شعبان کواگر ایک معتبر مسلمان بھی رمضان کا چاند دیکھ لے اور پوری قومِ مسلم میں رویت کا شرعی ضابطہ کے مطابق اور شرعی الفاظ میں رویت ہلال کا اعلان کر دیا جائے تو پوری قوم پر روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا اور ماہِ رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں مثلاً عید و بقرعید وغیرہ میں چوں کہ دنیوی منافع بھی شامل ہوجاتے ہیں، اس لیے ان مہینوں میں یقین کا درجہ حاصل کرنے کے لیے شہادت کا اصول بھی اختیار کرنا پڑے گا اور شہادت کے باب میں قرآنی ضابطہ یہ ہے:''واستشهدوا شهيدين من رجالكم، فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء''(۲)، اس ضابطہ کا حاصل یہ ہے کہ غیر ماہِ رمضان کے ثبوت کے لیے ۲۹ تاریخ کو کم از کم ۲ معتبر ہی مسلمانوں کا چاند دیکھنے کی شہادت دینا ضروری ہوگا(۳)، اور ان معتبر دو مسلمانوں کی شہادت رویت کے بعد اگر پوری قومِ مسلم میں رویت کا اعلان شرعی ضابطہ و الفاظِ شرعی میں ہو گیا تو پوری قوم پر روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے یہاں کی ۲۹ تاریخ کو کسی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے جس کے سب ارکان باشرع مسلمان ہوں اور ان الفاظ میں ریڈیو میں اعلان فرمائیں کہ رویت ہلال کمیٹی رمضان کا شرعی ثبوت حاصل کر کے اعلان کرتی ہے کہ کل صبح کیم رمضان ہے، روزہ رکھا جائے، تو روزہ رکھنا ضروری ہوگا، یہ اعلان خواہ کسی خطہ سے آرہا ہو، اسی طرح ۲۹ رمضان کو انہی مذکورہ الفاظ و شرائط کے ساتھ ریڈیو پر اعلان آجائے کہ عید کا چاند شرعی ثبوت سے ہو گیا ہے، صبح نماز ادا کی جائے تو عید منالینا ضروری ہو جائے گا۔

اس عید کے ثبوت کے لیے جس طرح کے الفاظ میں اعلان آنا بتلایا گیا ہے، اگر اسی طرح کے الفاظ میں عید الاضحیٰ کی رویت ہلال کے ثبوت کا اعلان آجائے اور دنیا کے کسی خطہ سے آجائے اور اس اعلان پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۹ دن یا ۳۰ دن ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا اس سے بھی کم کا یا ۳۱ دن کا یا اس سے بھی زیادہ دن کا نہ ہو رہا ہو تو اعلان کے مطابق عید الاضحیٰ کی نماز ادا کرنا ضروری ہو جائے گا اور وہ دن مكة المكرّمه کے یوم عرفات کے مطابق ہو یا اس سے آگے یا اس سے پیچھے ہو تو اس میں بھی حرج یا خرابی نہ ہوگی، کیونکہ مکہ کے یوم عرفات کا ساری دنیا میں یوم عرفات ہونے پر کوئی نص شرعی نہیں ہے اور ہر مسلمان کے لیے مہینہ محض ۲۹ دن یا ۳۰ دن کا ہونے کے لیے صریح و صحیح نصوص موجود ہیں جن کے خلاف کرنے کا حق و اختیار کسی کو نہیں ہے، پس بطریق مذکورہ بالا اس شرعی ضابطہ کے مطابق اعلان پر عمل کرنے سے احادیثِ صحیحہ و نصوصِ

۱- السنن لابی داؤد باب فی شہادة الواحد علی رؤیۃ ہلال رمضان ۱/۳۲۰۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۸۲۔

۳- ''وبعد صوم ثلاثين بقول عدلين حل الفطر'' (الدر المختار ص ۹۴ ج ۲ کتاب الصوم) (مرتب)۔

شرعیہ کی اتباع بھی نصیب رہے گی او رمزاج شرعی کے مطابق عمل ہوگا او رمکہ مکرمہ کے یوم عرفات کے مطابق یوم عرفہ ماننے سے نصوص شرعیہ صحیحہ کے خلاف ہوگا، اسی طرح محض حساب ریاضی پر عمل کا مدار رکھنے سے مزاج شرع اور تلک حدود اللہ کے خلاف ارتکاب ہوگا جس کی اجازت شرعاً نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے ملک میں بھی دنیا کے ہر گوشہ سے ریڈیو کے اعلانات برابر آتے ہوں گے، بس آپ کے وہاں کی ۲۹ تاریخ کو ان مذکورہ بالا ضابطوں کے مطابق مذکورہ بالا الفاظ میں دنیا کے جس خطہ سے ریڈیو پر یہ اعلان آجائے کہ شرعی ثبوت سے رویت ہلال ثابت ہونے کی بنیاد پر اعلان کیا جاتا ہے، تو ان اعلانوں کے مطابق بلاتر دد عمل کرلیا جائے۔

البتہ یہ شق رہ گئی کہ دنیا کے کسی ایک خطہ میں ۲۹ تاریخ کو کبھی چاند نظر ہی نہ آتا ہو، وہاں کا مطلع ہمیشہ ناصاف ہی رہتا ہو تو وہاں ۲۹ تاریخ کا تعین کس طرح کریں گے، پھر اس اعلان شرعی پر عمل کس طرح ممکن ہوگا؟

اس کا حل یہ ہے کہ ۲۹ شعبان یا ۲۹ رمضان کو جس ملک کے ریڈیو سے مذکورہ بالا شرعی اصول وضوابط کے مطابق اعلان ہوتا ہو اس ملک کے ریڈیو سے اعلان کی تلاش ہر ماہ میں جاری رکھیں اور جس تاریخ کا وہ اعلان کریں وہی تاریخ اپنے یہاں متعین رکھیں تو ۲۹ تاریخ خود بخود متعین ہوتی رہے گی اور عمل کرنا آسانی سے ہوتا رہے گا، ۲۹ شعبان کو شرعی ضابطہ کے مطابق چاند ہو جانے کا اعلان ہو جائے تو روزہ رکھنا شروع کردیں، ورنہ ۳۰ دن پورے کر کے روزہ رکھنا شروع کریں، پھر ۲۹ رمضان کو اگر چاند ہونے کا اعلان شرعی مذکورہ ضابطہ کے مطابق آجائے تو عید منالیں۔امید کہ اس تقریر سے جناب کے سوالات کی ہر شق کا جواب ذہن میں آگیا ہوگا۔

سوال (ا) کا جواب شرعی یہ نکلا کہ سائنسی یا حسابی وغیرہ تخمینے کی بنیاد پر یکم شوال یا ایک رمضان مقرر کر کے نماز عید ادا کرلینا یا روزہ رکھ لینا درست نہ ہوگا۔

سوال (ا) ب: کا حکم شرعی وجواب شرعی یہ نکلا کہ ماہ ذی الحجہ یا کسی دوسرے مہینے کے لیے بھی سائنسی یا حسابی تخمینے کی بنیاد پر تاریخ مقرر کرنا شرعی عمل نہ ہوگا۔

سوال (۲) کا بھی حکم شرعی یہ نکل آیا کہ یوم عید الاضحیٰ کا تعین بھی اسی شرعی ضابطہ واصول کے مطابق ہوگا جو اوپر مذکور ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

بحالت صوم آنکھوں، کانوں اور فرج میں دوا پہنچانا مفسدِ صوم ہے یا نہیں؟

بحالت صوم آنکھوں اور کانوں میں دوا ڈالنا یا عورت کی شرمگاہ میں دوا پہونچانا مفسد صوم ہے یا نہیں؟ نیز بحالت صوم گلوکوز اور خون چڑھانا کیسا ہے؟ آیا مفسد صوم ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

آنکھوں میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا (۱)، اور کان میں ڈالنے سے فاسد ہو جاتا ہے (۲)، اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ دوا یا غذا کی کوئی چیز جب بعینہ جوفِ معدہ میں پہنچ جائے گی، خواہ کسی راستہ معتاد یا غیر معتاد سے ہو تو روزہ فاسد ہو جائے گا ورنہ نہیں (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

ریڈیو کی خبر پر روزہ تڑوانا:

اگر کوئی عالم ریڈیو کی خبر پر لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم کردے تو اس کے حکم سے روزہ توڑنا جائز ہے یا کہ نہیں اور ایسے عالم روزے توڑنے والے پر از روئے شریعت کیا حکم عائد ہوتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

چاند کی مطلق خبر ریڈیو سے ہو یا تار وخط سے ہو یا کوئی آدمی آکر خبر دے کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا ہے یا یہ کہ عید ہو گئی

۱- فتاویٰ عالمگیری ۲۰۴ کتاب الصوم۔

۲- "ولو أقطر في أذنه الماء أو دخله لايفسد صومه لانعدام المعنى والصورة، بخلاف ما إذا أدخله الدهن" (الھدایہ مع فتح القدیر، ص ۲۶۶ ج ۲ کتاب الصوم) "أو دخل الماء في أذنه وإن كان بفعله قال الشامي والحاصل الاتفاق على الفطر بصب الدهن وعلى عدمه بدخول الماء" (فتاویٰ شامی، ۹۸ ج ۲ کتاب الصوم)۔

۳- "ولو داوى جائفة أو آمة بدواء فوصل إلى جوفه أو دماغه أفطر عند أبي حنيفة والذي يصل هو الرطب" (حوالہ مذکورہ بالا) عورت کی شرمگاہ میں دواء ڈالنا بھی مفسد صوم ہے، وفي الاقطار في اقبال النساء يفسد بلا خلاف، وهو الصحيح (فتاویٰ عالمگیری، ۲۰۴، ج ۱، کتاب الصوم) (مرتب)۔

شریعت مطہرہ میں اس قسم کی کوئی خبر معتبر نہیں ہے اور نہ اس پر حکم دیا جاسکتا ہے شریعت نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے اس ضابطہ پر جو خبر پوری اتر آئے گی اس پر حکم لگایا جاوے گا اس ضابطہ کے ماتحت اگر اس ریڈیو میں اعلان کیا جائے کہ فلاں مقام کی ہلال کمیٹی نے شرعی ثبوت کے بعد چاند ثابت ہوجانے کا حکم دیا ہے، یا اس طرح اعلان کرے کہ فلاں حاکم نے بعد ثبوت شرعی کے رویت کا حکم دیا ہے اور اس ہلال کمیٹی کے تمام افراد مسلمان بھی ہوں اور اس میں علماء بھی شریک ہوں اسی طرح حاکم بھی مسلمان ہو جو اعلان کررہا ہے وہ بھی مسلمان ہو تو یہ اعلان معتبر ہوگا دوسرے شہروں میں جہاں یہ خبر انہیں قیود کے ساتھ اگرچہ آوے لیکن جب اس شہر کا قاضی (مفتی عالم) یا ہلال کمیٹی اس اعلان کو معتبر مان کر اس پر رویۃ کا حکم دیں یا روزہ رکھنے یا افطار کرنے کا حکم دیں تو اسی شہر کے عوام کو اتباع کرنی چاہئے از خود کوئی عمل نہ کرلینا چاہئے کہ یہ مطلق العنانی شریعت میں بے رواہ روی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

ریڈیو کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟

ریڈیو کی خبر معتبر ہے یا نہیں عیدالفطر کے چاند کے بارے میں کسی شخص نے بھی خبر نہیں دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے لیکن ریڈیو سے خبر آئی کہ چاند دیکھا گیا تو اس صورت میں ہم لوگ نماز عیدالفطر پڑھیں یا کہ نہیں دوسری بات یہ ہے کہ ایک بستی کے آدھے آدمی آج نماز پڑھتے ہیں اور آدھے کل نماز پڑھتے ہیں تو جن لوگوں نے روزہ توڑ کر نماز پڑھی ان لوگوں کا کیا حکم ہے اور جن لوگوں نے روزہ رکھا ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

رویت ہلال کے بارے میں خبر موجب کا اعتبار ہے (۱) مطلق خبر کا نہیں ریڈیو سے اگر یہ خبر نشر ہو کہ چاند ہوگیا تو یہ مطلق خبر ہے جس کا شرعاً اعتبار نہیں ہے کیونکہ مخبر کا حال معلوم نہیں اور نہ ہی قوی طریقہ سے اس کو پہچانا جاتا ہے اور نہ ہی وہ نظر آتا ہے اس لئے اس خبر کا شرعاً اعتبار نہیں ہے اور اگر مسلم ہلال کمیٹی کی جانب سے شرعی طریقہ پر رویت ہونے کے بعد یہ اعلان کیا جائے اعلان کے الفاظ شرعی ہوں تو شرعی حدود کے اندر اندر اس کا اعتبار کرلیا جائے گا، جن لوگوں نے ریڈیو کی خبر پر

۱- ''(قوله وهو غلبة الظن) لأنه العلم الموجب للعمل'' (الردالمحتار علی الدر ۳/ ۵۶، مکتبہ زکریا)، ''نعم لو استفاض الخبر في البلدة الاخرى لزمهم على الصحيح من المذهب مجتبى وغيره'' (الدرالمختار علی الرد ۳/ ۵۹، مکتبہ زکریا) (مرتب)۔

روزہ توڑ دیا تھا لیکن بعد میں شرعی طریقہ پر معلوم ہوا کہ وہ عید کا دن نہیں تھا تو توڑ دینے والوں پر قضاء ضروری ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دوسری جگہ کی شہادت پر افطار کرنا:

۳۰ رمضان کو بر بناء شہادت کسی مفتی صاحب نے اپنے شہر میں فتوی دیا کہ روزے افطار کر لو چاند کی شہادت ہوگئی ہے اور اب اس شہر کے ایک یا ایک سے زیادہ معتبر آدمی کسی ایسی دوسری بستی میں جاتے ہیں ارادہ یا بے ارادہ جہاں جمعہ اور عیدین کی نماز بھی ہوتی ہے اور شہر کے حکم میں ہے وہ معتبر آدمی یہ کہتے ہیں کہ فلاں جگہ چاند کی شہادت آئی تھی اور عید ہوگئی ہے آپ سب مسلمان روزے افطار کریں تو اس بستی والے اس معتبر آدمی کی زبانی کہنے سے روزے افطار کریں یا جب مفتی صاحب کی یہ تحریر جائے کہ شہادت ہوگئی ہے جس کو میں نے مان لی ہے آپ لوگ بھی روزے افطار کریں جبکہ وہ لوگ پاکستان جیسی مسلم حکومت کا بذریعہ ریڈیو اعلان اس سے پہلے سن چکے ہوں اگر غلط افطار ہوا تو کیا قضاء آئے گی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ان لوگوں کا محض یہ کہنا کہ فلاں جگہ چاند کی شہادت آئی تھی اور عید ہوگئی کافی نہیں ہاں اگر مفتی صاحب نے ان لوگوں کے سامنے شہادت لیکر افطار کا حکم دیا ہو اور ان لوگوں نے خود سنا ہو اور پھر اس سننے یا حکم دینے کی شہادت دیتے تو یہ معتبر ہوتی یا مفتی صاحب ان دونوں کے سامنے اپنے فتوی دینے کی تحریر لکھ کر اور اس تحریر پر ان دونوں کو شاہد بنا کر بھیجتے تو اعتبار ہوتا اور چونکہ ۲۹ رکو ہلال عید کی رویۃ عامۃ شرعاً ثابت ہو چکی ہے، اس لئے ان افطار کرنے والوں پر قضاء نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مغربی ممالک میں رمضان واوقات نماز کا مسئلہ:

مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ میں بڑھتی ہوئی مسلم آبادی کی بدولت اوقات نماز کا مسئلہ علماء کرام اور مفتیان عظام کی

خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ہم امید کرتے ہیں کہ مفتیان عظام اس مسئلہ پر غور وخوض کے بعد یہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے دین فطرت کے صحیح وآسان حل کے ذریعہ موقعہ عمل فراہم فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

محکمہ موسمیات اور ہیئت دانوں نے اپنی تحقیق کے مطابق شفق کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

سول شفق (۱)———————(۶) درجہ والی شفق

بحری شفق (۲)———————(۱۲) درجہ والی شفق

شفق سیت (۳)———————(۱۸) درجہ والی شفق

تفصیل: سول شفق کو شفق احمر سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس وقت آسمان صاف ہوتا ہے، رات کے آثار کم ہوتے ہیں۔ چند موٹے موٹے تارے دکھائی دیتے ہیں۔

شفق بحری: اس شفق کو شفق ابیض سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

شفق سیت: یہ وہ شفق ہے جس کے بعد آسمان پر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔اور چھوٹے چھوٹے تارے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ماہرین فلکیات اس شفق کے بعد اپنے فنی تجربوں میں لگ جاتے ہیں۔

شفق کی تفصیل کے بعد اسلامی ممالک، نیز ہند و پاک کرۂ ارض پر "اندروں" ۴۰ عرض البلد پر واقع ہونے کی بنا پر وہاں شفق کے غروب میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے، اس لئے ان ممالک میں عموما نماز عشاء بعد غروب ڈیڑھ گھنٹہ کے سال بھر ہوتی ہے، مگر برطانیہ اور وہ ممالک جو ۴۵ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں، وہاں جوں جوں اوپر جانا ہوگا غروب شفق دیر سے ہوگی اور صبح صادق جلدی، اسی طرح موسم گرما کے بعض مہینوں اور دنوں میں تو غروب شفق اور ابتداء صبح صادق میں بالکل فصل نہیں ہوتا، اور بعض دنوں میں بہت ہی کم فاصلہ رہتا ہے جو امید ہے کہ حسب ذیل مثال سے واضح ہوجائے گا۔

۵۴ عرض البلد (انگلستان کے جس علاقہ) میں ہم رہتے ہیں ۲۰ جون کو طلوع آفتاب اور غروب حسب ذیل ہے:

	منٹ	گھنٹہ		منٹ	گھنٹہ
طلوع آفتاب	۳۵	۴	غروب شفق بحری	۱۹	۱۲
غروب آفتاب	۴۱	۹	صبح صادق	۵۸	۱
دن کی مقدار	۶	۱۷	درمیانی فاصلہ	۳۸	۱

۵۶ عرض البلد (گلاسکو اور اطراف) پر ۲۰ ؍جون سے ۱۲ ؍جولائی تک شفق بحری غائب ہی نہیں ہوتی، ''۵۸ - ۶۰ ''عرض البلد (بالائی اسکاٹ لینڈ اور اسٹورنا و لے) ۱۲ ؍مئی سے ۲۵ جولائی تک شفق مذکور غائب نہیں ہوتی ۔ ان دنوں ساری رات افق پر اجالا رہتا ہے ۔

مذکورہ حساب کی بناء پر جن مقامات پر، یعنی ۵۴ عرض البلد پر جہاں ۱۲ ؍بجکر ۱۹ منٹ پر شفق غائب ہوتی ہے اور ۴ بجکر ۳۵ منٹ پر طلوع ہوتا ہے، ہم بارہ بجکر ۳۰ منٹ سے قبل نماز عشاء نہیں پڑھ سکتے اور دوسری طرف فجر کی نماز ۴ بجے، درمیانی فاصلہ صرف ساڑھے تین گھنٹہ رہتا ہے، نماز عشاء کا یوں مؤخر کر کے ادا کرنا ناممکن نہ سہی، مگر مشکل ضرور ہے، نیز بعض ائمہ کے نزدیک جمع بین الصلوٰتین سفر اور اعذار کی بناء پر جائز ہے اور اس پر عرب ممالک کے باشندوں کا انگلستان میں عمل بھی ہے ۔

الف- تو کیا حنفی المسلک کے لئے اس میں آسانی کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی جو سارے عوام کے لئے قابل عمل ہو؟ تحقیق اوقات کا یہ مسئلہ صرف نمازوں کی حد تک نہیں، آئندہ چند سالوں کے بعد رمضان المبارک بھی انہی مہینوں میں آئے گا تو اس وقت اس مسئلہ کی اور بھی زیادہ نازک اور سنگین صورت ہوگی، مذکورہ حساب کی بناء پر روزہ تو لمبا ہو ہی جائے گا، بعض جگہوں پر تو ۱۸ بجکر ۱۱ منٹ پر طلوع وغروب آفتاب کا حساب ہوگا، اور جن جگہوں پر ا گھنٹہ ۳۸ منٹ کا فاصلہ نماز عشاء اور فجر صادق کے درمیان رہتا ہے، ان کے لئے اس مختصر سے وقت میں نماز عشاء، تراویح سحری وغیرہ کی ادائے گی ناممکن نہ سہی، لیکن مشکل ترین ضرور ہوتی ہے جس کا ادنیٰ احساس ہر ایک کرسکتا ہے ۔

نیز جو علاقے ''۶۵ ''عرض البلد پر واقع ہیں وہاں ۲۲ دن اور جو علاقہ ۵۸ اور ۶۰ عرض البلد پر واقع ہیں، وہاں ۶۵ دن (دو ماہ تک) شفق اور صبح صادق کے درمیان فاصلہ نہیں رہتا ۔

ب- روزہ کی ابتداء کب سے ہو، نیز نماز عشاء اور تراویح کا اختتام کب ہو یہ سمجھ میں نہیں آتا ۔ یا د رہے مذکورہ ساری گزارشات عمل کے لئے پوچھی جارہی ہیں ۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں اور ان کی اچھی خاصی تعداد اس مسئلہ سے دو چار ہے، اس لئے ہم امید کرتے ہیں مفتیان عظام اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرما کر اس کے قابل عمل حل سے دور افتادہ کو نوازیں گے ۔

سوال ۲ برطانیہ میں مختلف مسلک کے لوگ آباد ہیں، کوئی شافعی ہے تو کوئی حنفی تو کوئی اور مسلک کا، حنفی حضرات نماز عصر مثلین کے بعد پڑھتے ہیں، مثلین اور غروب آفتاب میں سردیوں کے موسم میں صرف گھنٹہ بھر کا فاصلہ رہتا ہے،

اور گرمیوں میں ظہر اور عصر کے درمیان کافی فاصلہ رہتا ہے، جن شہروں میں غیر حنفی عوام ہوتے ہیں اور امام حنفی ہوتا ہے تو وہاں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ قابل بحث بن جاتا ہے، امام کا اصرار مثلین پر ہوتا ہے اور عوام کا مثل اول پر، ان کے اصرار کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہاں کی اکثریت کارخانوں میں کام کرتی ہے اور موسم گرما میں مثل اول پر نماز ادا کر کے کارخانہ کو جا سکتے ہیں، اور مثلین کے انتظار تک ان کا کارخانہ کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اور بعض کارخانوں میں نماز کی ادائیگی بہت مشکل ہوتی ہے۔

نیز کتب فقہ میں اصفرار شمس کے بعد نماز عصر کو مکروہ لکھا ہے۔ اب یہاں کے موسم میں مثلین کے بعد تو کیا اس سے پہلے سورج میں زردی آجاتی ہے اور تمازت تو سارے دن نہیں ہوتی۔

الف- تو کیا ان صورتوں میں نماز عصر کو حنفی المسلک بھی مثل اول میں ادا کرے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

برطانیہ جہاں آسمان غبار آلود رہتا ہو وہاں رمضان وعید کا تعین:

سوال ؎ برطانیہ کا موسم اتنا غبار آلود ہے کہ یہاں سارے سال میں شاذونادر ہی چاند کی رویت ہوتی ہو جس ملک میں کئی کئی دنوں تک آفتاب غبار کی وجہ سے نظر نہ آتا ہو، وہاں چاند کی رویت کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے، جب رویت ہلال کا مسئلہ یوں ہے تو رمضان وعیدین کے تعین کا مسئلہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا شفیع صاحب مدظلہ سے کئی مراسلات کے بعد جناب والا کے آخری استفتاء کے مطابق آج تقریباً تین سال سے عمل ہو رہا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ رمضان المبارک کے تعین کے بارے میں تو قریبی ممالک مراکش سے بذریعہ فون بات چیت ہونے پر ان کی خبر کے مطابق کیا جاتا ہے اور عید و رمضان کے لئے ملک میں ۲۹ رمضان کو چاند ثابت نہ ہو تو ۳۰ روزے مکمل کر کے عید منائی جاتی ہے اور عید الاضحیٰ کے لئے عموماً یہاں کے علماء یوں کرتے ہیں کہ ہندو پاک کے خطوط پر یکم ذی الحجہ متعین کر کے اسی حساب سے عید الاضحیٰ کا تعین بھی ہوتا ہے، مگر بادی النظر میں یہ کوئی مستقل حل نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ جو صاحب فون کرتے ہیں اگر وہ ملک میں موجود نہ ہوں یا جن کے ساتھ مراکش فون سے بات کی جاتی ہے وہ نہ ہوں، ان دونوں صورتوں میں یہ بات پھر وہی پریشانی کا باعث ہوگی، نیز خطوط والا مسئلہ بھی کسی حد تک صحیح ہو تب بھی مستقل حل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ خاص کر عرب ممالک کے طلباء اس کو قبول نہ کرتے ہوئے محکمۂ موسمیات کے اعتبار سے تعین رمضان وعیدین کرتے ہیں۔

ا- تو کیا ان مجبوریوں کی صورت میں علامہ سبکیؒ کی تحقیق کے تحت محکمۂ موسمیات والوں کے حساب کے مطابق زمین

سے قابل رویت نہ ہونے پر عیدین ورمضان کا تعین کیا جائے تو کیا اس کی گنجائش نہیں ہوسکتی؟

خدا کے فضل سے برطانیہ میں مسلمان ایک ڈیڑھ لاکھ آباد ہیں اور بڑی تعداد میں ان کے بچے بھی ہیں، ملک بھر میں تقریباً ۶۰ سے ۷۰ تک مساجد قائم ہوگئی ہیں جن میں باقاعدہ نماز پنجگانہ، تراویح وغیرہ ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے مسائل لائق توجہ اور قابل غور ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے، اور ایک کامل ومکمل عالمگیر وبین الاقوامی مذہب ہے جو ہر انسان کو اپنے خالق و مالک سے صحیح طور پر رشتہ عبودیت جوڑنے اور اس کو جاننے کے صحیح وسادہ فطری اصول وضوابط تعلیم کرتا ہے، تا کہ ہر انسان خواہ کسی خطہ وملک کا باشندہ ہو، خواہ دشت وصحرا کا ہو یا پہاڑ یا جنگل کا، یا سمندری علاقہ یا جزائر کا، خواہ قطبین پر لینے والا ہو یا خطِ استواء پر ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، غریب ہو یا امیر آقا و بادشاہ ہو یا غلام ومملوک مرد ہو یا عورت، خواہ کوئی بھی ہو، قید صرف یہ ہے کہ عاقل وبالغ ہو، عقل وہوش رکھتا ہو، دیوانہ و پاگل نہ ہو، بچہ و نا سمجھ نہ ہو اور ساتھ ساتھ بادیانت ومنصف مزاج ہو، معاند وکینہ پرور نہ ہو۔ جو بھی اپنے معبود حقیقی کو پہچاننا چاہے اس سے اپنا صحیح رشتہ قائم کرنا چاہے تو نہایت آسانی سے ان سادہ اور فطری اصول کے ذریعہ قائم کر کے اس کے فیض قریب سے اپنے ظرف وہمت کے مطابق مستفیض ومتمتع ہو سکے اور یہی مقصد تخلیق آدم ہے اور اسی مقصد کی تحصیل وتکمیل کے لئے سلسلۂ بعثت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی۔ چنانچہ معبود حقیقی نے اپنے برحق کلام (قرآن پاک) میں مختلف عنوان وانداز سے متعدد جگہ اس طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً:

(۱)　"الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا" (۱)۔

(آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا اور اس سے میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا)۔

(۲)　"إن الدین عند اللہ الإسلام" (۲)۔

(بلاشبہ دین حق اور مقبول، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے)۔

۱-　سورہ مائدہ:۳۔

۲-　سورہ آل عمران:۱۹۔

(۳) "ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه"(۱)۔

(جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا وہ اس سے قبول نہ ہوگا)۔

(۴) "قل هٰذه سبيلي أدعو إلى الله علىٰ بصيرة أنا ومن اتبعني وسبحن الله وما أنا من المشركين"(۲)۔

(۵) "وما أرسلناك إلا كافة للناس بشيرا ونذيرا" (۳)۔

(اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا)۔

(۶) "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (۴)۔

(اللہ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)۔

(۷) "لايكلف الله نفسا إلا وسعها" (۵)۔

(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا کہ اس کی طاقت میں ہو)۔

(۸) "فاستقم كما أمرت ومن تاب معك ولا تطغوا إنه بما تعملون بصير" (۶)۔

(تو آپ جس طرح کہ حکم ہوا ہے مستقیم رہئے اور وہ لوگ بھی جو کفر سے توبہ کر کے آپ کی ہمراہی میں ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو، وہ ہم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے)۔

(۹) "ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر"(۷)۔

(اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے)۔

(۱۰) "يسئلونك عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج"(۸)۔

(آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں

۱- سورہ آل عمران: ۸۵۔
۲- سورہ یوسف: ۱۰۸۔
۳- سورہ سبا: ۲۸۔
۴- سورہ بقرہ: ۱۸۵۔
۵- سورہ بقرہ: ۲۸۶۔
۶- سورہ ہود: ۱۱۲۔
۷- سورہ قمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲۔
۸- سورہ بقرہ: ۱۸۹۔

کے لئے اور حج کے لئے)۔

حالانکہ سائلین کا مقصد اس کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ معلوم کرنا تھا جس کا تعلق علم ہیئت سے تھا، او رعلم ہیئت جاننے والے عرب میں موجود تھے جواب تحقیقی سمجھ بھی سکتے تھے، مگر اس کے باوجود ان کا رخ اس سادگی کی طرف پھیر کر جواب دیا گیا، اسی طرح اگلے نمبر کی آیت کریمہ کا بھی حال ہے۔

(۱۱)　**یسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربی وما أوتیتم من العلم إلا قلیلاً** (۱)۔

(یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔

احادیث شریف میں بھی اس طرف جا بجا کہیں اشارہ تصریح موجود ہے، کسی موقع پر ارشاد ہے: "**الدین الفطرة**"، یعنی دین فطرت سلیمہ ہے یا مثلاً:

"**کل مولود یولد علی فطرة الإسلام، فأبواه یهوّدانه أو ینصرانه أو یمجّسانه أو کما قال**" (۲)۔

(ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (مربی) اس کو یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی بنادیتے ہیں، یا مجوسی بنادیتے ہیں)۔

کسی موقعہ پر فرمایا گیا:

"**نحن أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب أو کما قال ﷺ**" (۳)۔

(ہم امت امیہ ہیں، حساب کتاب پر مدار نہیں رکھتے)۔

حالانکہ اس وقت بھی اور خود عرب میں بھی حساب و کتاب جاننے والے، بلکہ علم نجوم و ہیئت جاننے والے موجود تھے، جیسا کہ تاریخ شاہد ہے، پھر ایک موقعہ پر ارشاد ہے:

"**صوموا لرویته أو کما قال ﷺ وغیر ذلک**" (۴)۔

چاند دیکھ کر روزے رکھو، چاند دیکھ کر روزے ختم کردو، یعنی کسی قواعد ہندسیہ و ریاضیہ وغیرہ کی احتیاج نہیں)۔

۱- سورہ اسراء: ۸۵۔

۲- بخاری مع الفتح ۸/ ۵۱۲ کتاب التفسیر۔

۳- مشکوۃ المصابیح ۴/ ۱۷۔

۴- مشکوۃ المصابیح ۴/ ۱۷۔

آیات کریمہ واحادیث نبویہ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ دین سادہ وفطری ہے، فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے اس کا لقب ہی دین فطرت ہے، اس کے احکام واصول بھی سادہ وفطری ہوں گے، اس دین کی تحصیل یا اس کے احکام کی تعمیل فلسفیانہ موشگافیوں پر یا علم ہیئت یا اصول ریاضی کے جاننے و ماننے پر موقوف نہ ہوگی۔

جناب نے بھی شروع استفتاء میں تھوڑا سا اشارہ فرمایا ہے، احقر بھی ان ہی سادے اور فطری اصول کے مطابق فقہ حنفی کی مدد سے کچھ عرض کرے گا، امید کہ باعث تسکین خاطر، نیز برائے عمل قابل قبول ہوگا۔

اب نمبر وار سوال کے جوابات مختصراً، مگر اس طرح پر عرض ہیں کہ ہر سمجھ دار و منصف مزاج جو حق کا طالب ہو، اور اپنا عمل محض اللہ کی خوشنودی کے لئے مذہب کے مطابق رکھنا چاہتا ہو رکھ سکے۔

سوال ا کے جزو اول (الف) کا جواب:

مذکورہ بالا گزارشات سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس دین فطرت میں کسی حکم کا مدار ماہر موسمیات یا ماہر فلکیات کی تحقیقات و تدقیقات وغیرہ پر نہ ہوگا، بلکہ سیدھے سادے اصول فطرت پر ہوگا، پس شفق کی اپنی طرف سے تین قسمیں کرنا، یا سمندر کی تلاش و جستجو میں پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھنا یا ہوائی جہاز سے پرواز کرنا، یا سمندر کی سطح پر جا کر حقیقت معلوم کرنا مطلوب شرعی نہ ہوگا اور نہ اس پر مدار حکم ہوگا، بلکہ اپنی سطح آبادی پر (جہاں کا بھی باشندہ ہو) رہتے ہوئے سادہ طور پر آلات رصدیہ وغیرہ کا استعمال کئے بغیر صرف قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں امتیاز شفق وتعیین اوقات کرلینا کافی ہوگا۔

قرآن پاک میں وقت عشاء کے لئے غسق اللیل (رات کی تاریکی) یا "زلفاً من اللیل "(۱)(کچھ حصہ رات کا گزار کر)وارد ہے مثلاً:

(۱) "أقم الصلوٰة لدلوک الشمس إلی غسق اللیل"(۲)۔

(آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک نماز ادا کیا کیجئے)۔

اور مثلاً:

(۲) "وأقم الصلوٰة طرفی النهار وزلفا من اللیل"(۳)۔

(اور آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں)۔

۱- سورۂ ہود: ۱۱۴۔

۲- سورۂ اسراء: ۷۸۔

۳- سورۂ ہود: ۱۱۴۔

اسی طرح احادیث پاک میں بھی حدیث اوقات صلوٰۃ وارد ہے، مثلاً:

"ثم أمره فأقام المغرب حين غابت الشمس ثم أمره، فأقام العشاء حين غاب الشفق" (۱)۔

(جس وقت آفتاب غروب ہوا آپ نے حکم دیا اور نماز مغرب ادا کی گئی پھر جس وقت شفق غائب ہوئی تو حکم فرمایا اور نماز عشاء ادا کی گئی)۔

اسی طرح اور بہت سی روایات میں بھی شفق احمر وابیض کی تفصیل کے بغیر مطلقاً صرف لفظ شفق کا ذکر ہے، پھر شفق کی یہ دو قسمیں (احمر وابیض) اس کا یہ اختلاف کوئی اصولی وبنیادی اختلاف نہیں ہے، بلکہ عرف اور زمانہ کے اعتبار سے محض محاورہ کی ترجمانی کا اختلاف ہے جو محض فروعی اور ضمنی ہے، نیز شفق احمر بھی مثل ابیض کے حضرت امام ابوحنیفہؒ ہی کا (فی روایۃ) قول ہے، مگر شفق احمر صاحبین کی جانب منسوب ہو کر مشہور ہو گیا اور ابیض صرف امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب رہا، صاحبین کی جانب منسوب ہو کر مشہور نہ ہوا، بلکہ بعض روایات فقہیہ میں احمریت کی جانب امام صاحبؒ کا رجوع بھی منقول ہے:

"وقت المغرب منه إلىٰ غروب الشفق وهو الحمرة عندهما...... وإليه رجع الإمام كما في شروح المجمع وغيرها فكان هو المذهب" (۲)۔

(مغرب کا وقت صاحبین کے نزدیک غروب شمس سے غروب شفق تک رہتا ہے اور یہی قول ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کا بھی ہے اور اسی جانب امام ابوحنیفہؒ نے بھی رجوع فرمالیا ہے، جیسا کہ مجمع کی شروح وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، پس یہی متفق علیہ مذہب ہو گیا)۔

عند المحققین اگر چہ یہ رجوع ثابت و محقق نہیں، لیکن اتنا تو سب کو تسلیم ہے کہ تعامل تمام بلاد میں صاحبین کے ہی قول پر ہے، نیز یہ کہ صاحبین کا قول اوسع اور امام کا قول احوط ہے (۳)۔

چونکہ امام کا قول احوط ہے، نیز آیت کریمہ:

"إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً" (۴)۔

(یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے)۔

۱- مسلم ۳/۱۱۹-۱۲۰ مع النووی باب اوقات الصلوات الخمس۔

۲- درمختار ۱/۲۴۱۔

۳- کما فی الشامی ۱/۳۳۵۔

۴- سورہ نساء: ۱۰۳۔

میں موقوتا کی تفسیر موقتا بھی ہے، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ احتیاط کی جائے اور احتیاط یہی ہے کہ نماز عشاء شفق ابیض غائب ہونے کے بعد ادا کی جائے، تا کہ بہر طور اور بلا اختلاف نماز اپنے وقت متعین کے اندر ادا ہو، لیکن اس کے باوجود فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی مسجد کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض غائب ہونے سے قبل ہی پڑھے تو جماعت کو چھوڑ کر غروب شفق ابیض کے بعد پڑھنا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف افضل ہے، "**كما في الشامي وفي شرح المنية أنه لو كان إمام محله يصلي وحده بعد الغياب**"(۱)۔

شرح منیہ میں منقول ہے کہ اگر اپنی مسجد کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض کے غائب ہونے سے قبل ہی پڑھ لے تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اپنی نماز تنہا شفق ابیض کے غائب ہونے کے بعد پڑھے)۔

اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ابیض کے غروب سے قبل ہی اس جماعت میں شریک ہو کر پڑھ لے تو بلا کراہیت نماز ادا ہو جائے گی اور محل طعن وتشنیع نہ بنے گا۔

پس جب بغیر کسی مجبوری وعارض کے اس کی گنجائش ہے اور محل طعن وتشنیع نہیں ہے تو مذکورہ عوارض ومجبوری کی صورت میں بدرجہ اولیٰ مورد طعن یا مستوجب کراہت نہ ہوگا، بلکہ ائمہ مساجد کو خود اس کا لحاظ کرنا انسب ہوگا، تا کہ امت تنگی میں واقع نہ ہو، بخلاف حضر کے اندر جمع بین الصلوٰتین کے کہ حقیقتاً جمع بین الصلوٰتین عرفات ومزدلفہ کے سوا کسی اور جگہ وموقع میں نہیں ہے، حضر کے اندر جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں ہے، **كما بحثه وحققه صاحب بذل المجهود (۲۳۳/۲)، وصاحب أوجز المسالک حتى قال في الأوجز (۵۶/۲)۔ قال الترمذی في كتابه: أجمعت الأمة على ترک العمل به**"(۲)۔

امام ترمذی نے اپنی کتاب میں فیصلہ فرما دیا ہے کہ تمام امت نے جمع بین الصلوٰتین فی الحضر والی روایت کو عملاً متروک قرار دیا ہے(۳)۔

اس لئے جمع بین الصلوٰتین کے پیش نظر کوئی عمل نہ کریں گے، بلکہ اگر غروب شفق وطلوع فجر کے درمیان کچھ وقت نہ ملے جب بھی تینوں نمازیں (مغرب عشاء فجر) بلا لحاظ جمع بین الصلوٰتین کے مستقلاً الگ الگ پڑھیں گے گو مسلسل ہی پڑھنا

۱- شامی ۱/ ۳۳۳۔

۲- سنن الترمذی: قال عیسی: "والعمل على هذا عند أهل العلم أنه لا يجمع بين الصلاتين إلا في السفر أو بعرفة ورخص بعض أهل العلم من التابعين في الجمع بين الصلاتين للمريض" ترمذی باب ما جاء في الجمع بین الصلاتین کتاب الصلاۃ حدیث نمبر: ۱۸۷۔

۳- اوجز المسالک ۵۶/۲۔

پڑے جیسا کہ ہم خود بھی ذرا تفصیل سے اس کو بیان کر رہے ہیں، تا کہ ہر صورت مسئلہ اچھی طرح واضح اور ذہن نشیں ہو جائے اور اسی خیال سے ہر صورت بعنوان مستقل الگ الگ بیان کریں گے۔

مسئلہ ا : جب تک شفق ابیض غروب ہونے کے بعد کھانے پینے سونے وغیرہ حوائج بشریہ ضروریہ پوری کرنے کے ساتھ ساتھ آسانی سے فرض عشاء ووتر اور رمضان میں تراویح بھی بیس رکعت ''خواہ الم ترکیف'' سے پڑھ سکیں یا فقط بارہ رکعت یا فقط آٹھ رکعات ہی پڑھ سکیں تو شفق ابیض کے غروب کے بعد ہی پڑھیں گے۔

''إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابا موقوتا''(ا)، اور ''حافظوا على الصلوٰت والصلوٰة الوسطیٰ''(۲) أي أدوا الصلوٰة في أوقاتها''۔

یعنی تمام نمازیں مسلمانوں پر موقت طریقہ سے فرض کی گئی ہیں۔ اور تمام نمازوں کی اور خاص کر وسطیٰ (عصر) کی محافظت کیا کرو، یعنی ان کو ان کے اوقات میں (جب تک وقت مل سکے) ادا کیا کرو۔ کے پیش نظر شفق ابیض کے غروب ہونے کے بعد ہی ادا کی جائے۔

مسئلہ ۲: جن مقامات میں اتنا وقت نہ ملتا ہو جو ابھی مذکور ہوا ہے، خواہ ابیض باقی رہتے ہوئے ہی طلوع فجر ہو جاتی ہو، جیسا کہ گلاسکو، بالائی اسکاٹ لینڈ وغیرہ اور اس کے اطراف میں بعض دنوں میں ہوتا ہے یا اتنا وقت تو ملتا ہو، لیکن رات چھوٹی ہوتی ہو اور ابیض دیر میں ختم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ساری رات شب بیداری کرنی پڑتی ہو جو عادتاً وعموماً تحمل بشری سے خارج ہے، جیسا کہ ان ہی مقامات کے اندر دوسرے دنوں میں ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں شفق احمر ہی کے بعد نماز عشاء کی ادائیگی کر لینی عملاً علی رویۃ صحیح و درست ہوگی۔ اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے قبل عشاء و وتر سب ختم کر لینا ضروری ہوگا۔

مسئلہ ۳: جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو، بلکہ شفق احمر غروب ہوتے ہی یا اس سے بھی قبل فجر کی سفیدی شروع ہو جاتی ہو، جیسے ۶۰ عرض البلد کے بعد کے بعض مقامات میں ہوتا ہے، تو وہاں بھی اگر چہ وقت عشاء کسی قول پر نہ ملتا ہو، لیکن تینوں نمازیں (مغرب، عشاء، فجر) یکے بعد دیگرے بغیر لحاظ جمع بین الصلوتین ادا کرتے رہیں گے اور جہاں تک

ا- سورۂ نساء: ۱۰۲۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۳۸۔

ہوسکے گا صبح صادق کے طلوع سے قبل قبل فرض عشاء و وتر سے فراغت کی کوشش کرتے رہیں گے: کما حققہ الامام ابن الھمام (۱)۔

"(في باب مواقيت الصلوٰة بقوله) ومن لا يوجد عندهم وقت العشاء، كما قيل: يطلع الفجر قبل غيبوبة الشفق عندهم (إلى قوله) وأفتى الإمام البرهاني الكبير بوجوبها، ولا يرتاب متأمل في ثبوت الفرق بين عدم محل الفرض وبين سببه الجعلي الذى جعل علامة على الوجوب الخفي الثابت في نفس الأمر وجواز تعدد المعرفات للشئى، فانتفاء الوقت انتفاء المعرف وانتفاء المعرف على شئي لا يستلزم انتفاء ذلک الشئي لجواز دليل أخر وقد وجد، وهو ماتوا طائت أخبار الإسراء، من فرض الله تعالىٰ الصلوٰة خمسا، بعد ما أمروا أولا بخمسين، ثم استقر الأمر على الخمس على الخمسين شرعاً عاماً لأهل الآفاق لا تفصيل فيه بين أهل قطر وقطر (ثم إلىٰ قوله) فاستفدنا أن الواجب في نفس الأمر خمس على العموم غير أن توزيعها على تلک الأوقات عند وجودها، ولا يسقط بعدمها الوجوب، وكذا قال ﷺ: "خمس صلوات كتبهن الله على العباد"۔ ثم هل ينوى القضاء الصحيح أنه لا ينوى القضاء لفقد وقت الأداء، ومن أفتى بوجوب العشاء يجب على قوله الوتر أيضاً" (۲)۔

((باب مواقیت الصلوٰۃ) جن لوگوں کے یہاں شفق غائب ہونے سے قبل ہی فجر طلوع ہو جاتی ہے (سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ) اور کوئی حقیقت بیں شخص عدم محلیت فرض (جیسا کہ مقطوع الیدین میں ہوتا ہے) اور سببیت جعلیہ (جیسا کہ فاقد وقت عشاء میں ہوتا ہے) کے درمیان فرق سمجھنے میں شبہ نہ کرے گا۔ اور وجوب خفی جو نفس الامر میں ثابت شدہ ہوتا ہے اس پر یہ سبب جعلی (وقت صلوٰۃ) محض ظرف وعلامت ہوتا ہے (جس کا درجہ ذریعہ شناخت وقت سے زیادہ نہیں ہوسکتا) اور ذرائع شناخت ومعرفات وعلامات کے تعدد (تغیر وتبدل) کے امکان وجواز میں بھی کوئی شخص شبہ نہیں کرسکتا، پس (ظاہر ہوگیا کہ) وقت ظاہری جو محض معرف شئی کا انتفاء بعینہٖ اسی شئی کے انتفاء کو مستلزم نہیں، کسی دوسری دلیل یا معرف کے وجود کے ممکن ہونے کی وجہ سے اور (بالخصوص جب حال یہ ہو کہ) دوسری دلیل ومعرف کا وجود موجود ملتا بھی ہو اور وہ حدیث معراج واسراء کا تواتر وتو اطأ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اولاً پچاس نمازیں فرض فرمائی تھیں، پھر امت پر آسانی کے لئے صرف

۱- فتح القدیر ۱/۱۵۶۔

۲- فتح القدیر لابن الہمام ۱/۲۲۶ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

پانچ نمازیں برقرار رکھیں اور پھران پانچ نمازوں کا استقرار زمین کے ہر خطہ والوں کے لئے یکساں شروع ہوا۔اس مشروعیت عامہ میں کوئی تفصیل نہیں کہ یہ فرضیت صرف فلاں خطہ والوں کے لئے ہے اور فلاں خطہ والوں کے لئے نہیں ہے (پھر سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ)اس مشروعیت عامہ سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ نفس الامر اور حقیقت میں پانچ نمازیں عموی طور پر ہیں ان کی یہ تقسیم ان پانچ ظاہری اوقات پر محض ان کے موجود ہونے کی حالت میں ہوگی (پس ظاہر ہے کہ)ان ظاہری اوقات کے معدوم ہونے کی صورت میں نفس وجوب ساقط نہ ہوگا، بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا۔اور حضور ﷺ کے کلام (خمس صلوٰت کتبهن الله۔الخ) میں اس کا اشارہ بھی ملتا ہے (پھر یہ بحث کہ)وقت مقررہ معدوم ہونے کے وقت قضاء کی نیت کریں یا اداء کی توضیح یہ ہے کہ وقت ادا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قضاء کی نیت نہ کریں گے (بلکہ اداء ہی کی نیت کریں گے)اور جو شخص وجوب عشاء کا فتوی دے گا وہ وجوب وتر کا بھی فتویٰ دے گا)۔

اور زمانہ رمضان المبارک میں اگر تراویح پڑھنے کا موقعہ نہ ملے، نہ بیس رکعات نہ بارہ رکعات نہ آٹھ رکعات تو تراویح نہ پڑھیں، اسی طرح اگر سنن رواتب کا موقعہ نہ ملے، نہ پڑھیں، مگر فرض عشاء و وتر ضرور پڑھیں اور دن کی نمازیں (ظہر وعصر)اپنے اوقات منصوصہ میں پڑھیں۔

مسئلہ ۴: جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو جس میں ان تینوں نمازوں (مغرب، عشاء، فجر) کے محض فرض فرض بھی مختصر طریقہ پر خواہ مسلسل ہی کیوں نہ ہو نہ ادا کئے جا سکتے ہوں، لیکن وہاں آفتاب کا روزانہ طلوع وغروب ہونا صادق آتا ہو، جیسا کہ عرض تسعین کے قریب بعض مہینوں میں ایسا ہوسکتا ہے توان مقامات میں غروب شمس تک کا وقت لیل ونہار کا ایک مجموعہ شمار کر کے نصف اول (غروب شمس سے بارہ گھنٹہ تک)رات کا حصہ شمار کیا جائے اور رات کا حصہ شروع ہوتے ہی نماز مغرب پڑھ لی جایا کرے، پھر تقریباً ۱-۱/۲ گھنٹہ کے بعد سے عشاء کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے نماز عشاء کی ادائیگی کر لی جائے۔

پھر نصف اول (جو رات کا حصہ شمار ہے)ختم ہونے سے ۱-۱/۲ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور نصف اول کے ختم ہونے سے آدھ گھنٹہ بیس منٹ قبل نماز فجر سے فراغت کر لی جائے۔

پھر نصف ثانی (جو دن کا حصہ شمار ہے) کا نصف اول گزارتے ہی، یعنی لیل ونہار کے پورے مجموعے (۲۴ گھنٹہ) کا ربع ثالث شروع ہونے کے بعد سے نماز ظہر کا وقت قرار دیا جائے ،اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز ظہر سے فراغت کر لی جائے ،پھر اس مجموعہ لیل ونہار مکمل ہونے سے آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کر لیا جائے اور اصفر

ارشمس سے قبل قبل نمازعصر ادا کر لی جائے، کماسیأتی تفصیلہ فی جواب نمبر ۲۔

پھر غروب شمس سے دوسرا مجموعہ لیل ونہار شمار کر کے دوسرے دن کی مغرب شمس کے غروب ہوتے ہی پڑھ لی جائے اور پھر عشاء وفجر وغیرہ ساری نمازیں اول یوم، یعنی لیل ونہار کے اول مجموعہ کے حساب سے ادا کر لی جائیں۔ پھر اسی طرح ہر روز کی نمازوں کا معمول رکھا جائے۔ "**هذه كلها مستنبطة من الفتح**" (۱/ ۱۵۶) "**ومن الدر المختار ومن** رد المختار" (۱/ ۳۳۹ وص ۱/ ۳۷۱)۔

مسئلہ نمبر ۵: جن مقامات میں شمس کا غروب وطلوع روزانہ نہ ہوتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع یا غروب رہتا ہو، جیسے ارض تسعین اور اس کے قرب وجوار کے مقامات تو وہاں پر بھی چونکہ آفتاب ہر چوبیس گھنٹے میں اپنا ایک چکر پورا کر لیتا ہے، یعنی جس وقت جس نقطہ سے چلتا ہے پورے ۲۴ گھنٹہ پر اسی نقطہ پر تقریباً پہنچ جاتا ہے، اور یہ پورا چکر ایک (دورہ) شمار ہوسکتا ہے جو لیل ونہار کا مجموعہ اور ایک دن رات کے برابر کہا جاسکتا ہے، پس اس ہر ایک دن رات میں جو (۲۴ گھنٹہ کی مقدار کے برابر ہوگا) پانچوں نمازوں کے وقت کا تعین انداز سے کر کے برابر ان کو ادا کریں گے۔ اور اس لیل ونہار کے مجموعہ کی ابتداء اس قریبی مقام کے غروب شمس کے وقت سے کر لیا کریں، جہاں پر آفتاب غروب ہوتے ہی طلوع ہوجاتا ہے، تا کہ اس قسم کے مقامات میں اوقات نماز پر یگانگت ویک جہتی اور وحدت دین کی ایک شان نمایاں رہے اور "**حافظوا على الصلوٰت**"(۱) کا بھی حتی المقدور امتثال وظہور ہوتا رہے۔

اور اگر یہ سب صورتیں دشوار ہوں تو ایسا کرنا تو بہر حال آسان ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہو کر طلوع نہ ہونا شروع ہوجائے اور مسلسل غروب رہے اس دن کے غروب سے ۲۴ گھنٹہ کی مقدار پورے ایک دن ورات کی مقدار شمار کر کے اس میں حسب تصریح وتفصیل مذکور پانچ نمازیں ادا کریں اور ان گھنٹوں کے ہونے پر دوسرے ۲۴ گھنٹے پھر تیسرے گھنٹے بناتے اور اس میں دن ورات کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں، اور دن بڑا ہونے میں جس دن آفتاب طلوع ہو کر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو پہلے دورہ کے لئے طلوع سے صرف بارہ گھنٹہ کی مقدار پر ایک دورۂ شمس ۲۴ گھنٹہ کا ختم کر کے اس میں ظہر وعصر کی نماز پڑھ لیں، اور پھر اس کے بعد ۲۴ گھنٹہ کا ایک دورۂ شمس شمار کر کے نصف اول کو دن قرار دے کر اس میں دن کی نماز پڑھا کریں اور نصف ثانی کو رات قرار دے کر اس میں رات کی نماز پڑھا کریں اور یہ طریقہ احقر کے نزدیک سب سے اشبہ بالفقہ ہے۔

۱- سورۂ بقرہ: ۲۳۸۔

اس مسئلہ میں حدیث نبوی سے کافی روشنی ملتی ہے جس میں واقعہ دجال کا ذکر فرماتے ہوئے ،اس ایک دن کے اندر جوایک سال کا ہوگا،ہر چوبیس گھنٹہ کی پانچوں نمازوں کوانداز ہ کر کے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، کمارواہ مسلم فی صحیحہ اور ابن ہمام نے اس طرح فرمایا ہے:

”وما روى عنه عليه الصلوٰة والسلام أنه ذكر الدجال فقلنا ما لبثه في الأرض؟ قال: أربعون يوماً يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر أيامه كأيامكم، فقيل: يا رسول الله! فذلك اليوم الذى كسنة أتكفينا صلوٰة يوم؟ (١) قال: لا اقدروا له (رواه مسلم) فقد أوجب أكثر من ثلاث مائة عصر قبل صيرورة الظل مثلاً أو مثلين وقس عليه، فاستفدنا أن الواجب في نفس الأمر خمس على العموم غير أن توزيعها على تلك الأوقات عند وجودها ولا يسقط بعدمها الوجوب انتهىٰ بلفظه“ (٢)۔

(اور وہ حدیث جوحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ نے دجال کا ذکر فرمایا تو ہم نے (صحابہ نے)عرض کیایا رسول اللہ! وہ دنیا میں کتنے دن ٹھہرے گا، جواب دیا کہ صرف چالیس (۴۰) دن ،لیکن اس کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ماہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے ان عام دنوں کے برابر ہوں گے، پھر عرض کیا گیا کہ وہ دن جوایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں صرف ایک دن کی نمازیں پڑھ لینی کافی ہوں گی،فرمایانہیں، بلکہ اس میں اپنے دنوں کے اعتبار سے اندازہ کر کے نمازیں پڑھنی ہوں گی (مسلم شریف)،خلاصہ یہ کہ حضور علیہ السلام نے (اس دن میں) تین سو سے زیادہ عصر کی نمازیں ہر شئی کا سایہ اصلی ایک مثل اور دومثل ہونے سے قبل قبل واجب فرمادیں اور اسی پر بقیہ نمازوں کو بھی قیاس کرلو،اسی حدیث سے ہم کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اصل اور نفس الامر میں پانچ نمازیں علی العموم واجب ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ ان پانچ نمازوں کی تقسیم ان پانچ وقتوں میں ان پانچ وقتوں کے پائے جانے کی صورت میں واجب ہے (اور یہ بھی معلوم ہوا کہ)ان نمازوں کا وجوب ان کے اوقات کے موجود نہ ملنے سے ساقط نہ ہوگا)۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ نے بھی اسی حدیث کو معمول بہ قرار دے کر اسی کے مطابق اندازہ سے نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے، وإلیہ مال فی امداد الفتاوی أیضاً وصرح بہ فی فتاویٰ دار العلوم (۲/ ۱۳)۔

۱- الصحیح المسلم ۲/ ۴۰۱۔

۲- شرح فتح القدیر ۱/ ۲۲۶۔

مسئلہ ٦: اگر قریبی مقام کے غروب سے مجموعہ لیل ونہار کی ابتداء کا انطباق مشکل ہو، اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق (کہ ٢٠ مارچ اور ٢٢ ستمبر کا دن تمام روئے زمین پر برابر، یعنی ١٢ گھنٹہ کا ہوتا ہے) اگر صحیح ہو اور ان تاریخوں میں سے کسی ایک میں بھی وقت غروب آسانی سے متعین ہوسکتا ہو تو تمام سال کے مجموعہ لیل ونہار کی ابتداء اس سے متعین کرلیا کریں، غرض جس میں سہولت ہو اختیار کریں۔

مسئلہ ٧: جب تک رات چھوٹی ہو اور دن بڑا ہو، اور آفتاب روزانہ طلوع وغروب ہوتا ہو، اس وقت تک زوال شمس اور وقت ظہر وعصر الگ الگ متحقق ومتمیز ہوں گے اور ہر وقت کی نماز اس کے اصل وقت میں پڑھنی ضروری ہوگی، البتہ عصر کی نماز اصفرار شمس سے قبل ادا کرنا ضروری ہوگا، ورنہ نماز مکروہ ہوگی۔

مسئلہ ٨: جب رات بڑی ہو اور دن چھوٹا ہو تو جب تک زوال شمس اور مثل ومثلین متمیز ومعلوم ہوسکے اس وقت تک ظہر کی نماز ایک مثل کے اندر اور عصر کی نماز مثلین کے بعد ضروری ہوگی۔ ہاں اگر مثلین آتے آتے اصفرار شمس ہوجائے تو نماز عصر مثلین سے قبل اور ایک مثل کے بعد ہی پڑھ لینا چاہئے۔ کما یاتی تحقیقہ فی جواب ٢۔

مسئلہ ٩: جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ مثل ومثلین کا تعین وتمیز نہ ہوسکے تو زوال شمس کے بعد جہاں تک جلد ہوسکے نماز ظہر پڑھ لی جائے اور اصفرار شمس سے کچھ پہلے نماز عصر سے فراغت کرلی جایا کرے۔

مسئلہ ١٠: جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ زوال شمس بھی متمیز ومتحقق نہ ہوسکے تو اندازہ سے دن کی نصف مقدار گزارنے کے بعد نماز ظہر پڑھ لی جائے اور اصفرار شمس سے قبل نماز عصر پڑھ لی جائے گو دونوں نمازوں کے درمیان فصل بہت تھوڑا ہے یا بالکل نہ رہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، **كما مر في التحقيق الذي نقلته في المسألة الثالثة**۔

مسئلہ ١١: جب دن اتنا چھوٹا ہوجائے کہ دن کی نصف مقدار گزرنے کے بعد فرض ظہر وعصر بغیر سنن رواتب کے بھی ادا نہ کرسکیں تو طلوع سے غروب تک کی پوری مقدار میں پہلے صرف ظہر کا فرض پھر عصر کا فرض پڑھ لیا جایا کرے۔

مسئلہ ١٢: جب طلوع شمس کے بعد سے غروب شمس کے قبل قبل ظہر وعصر کا محض فرض بھی ادا کرنے کا وقت نہ ملے، لیکن آفتاب کا طلوع ہونا روزانہ صادق آتا ہو تو طلوع آفتاب سے طلوع آفتاب تک کا ٢٤ گھنٹہ کا مجموعہ ایک لیل ونہار کا مجموعہ شمار کرکے نصف اول دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف اول کے نصف اخیر، یعنی پورے مجموعہ کا ربع ثانی شروع ہونے سے وقت ظہر شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہوسکے نماز ظہر ادا کرلی جائے اور اس ربع ثانی کے ختم ہونے سے دو گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہوسکے نماز عصر ادا کرلی جائے۔

پھر ربع ثانی کے ختم ہونے سے یعنی پورے مجموعہ نہار ولیل کے نصف اول کے ختم ہونے کے بعد سے وقت مغرب شمار کر کے جہاں تک جلد ہو سکے نماز مغرب پڑھ لی جائے پھر دو ڈھائی گھنٹے گزارنے کے بعد نماز عشاء و وتر وغیرہ پڑھ لی جائے، پھر طلوع آفتاب سے ۱- ۱/۲ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور طلوع آفتاب سے آدھ گھنٹہ ۲۰ منٹ قبل نماز فجر پڑھ لی جائے۔

مسئلہ ۱۳: جب روزانہ طلوع آفتاب نہ ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع نہ ہوتا ہو، غروب ہی رہتا ہو، جیسا کہ اسی ارض تسعین اور اس کے مضافات میں ہو سکتا ہے تو اس زمانہ کا ہر ۲۴ گھنٹہ نہار ولیل کا مجموعہ ایک دن ورات کے برابر قرار دیا جائے اور نصف اول کو دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف آخر کو رات کا حصہ شمار کیا جائے اور دونوں حصوں میں مسئلہ ۱۲ کی طرح عمل کیا جائے، یہاں تک کہ غروب مسلسل کا یہ دور ختم ہو کر روزانہ آفتاب طلوع ہونا شروع ہو جائے، پھر ان مسائل مذکورہ نمبر وار میں سے جس مسئلہ کا مصداق صادق آئے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

تنبیہ: سال کا ایک پورا دور مکمل ہو گیا اور اس کے ہر موڑ کے مطابق نماز کا حکم منقح کر دیا گیا، تا کہ عمل میں سہولت رہے اور آسانی سے فریضہ صلوٰۃ ہر دور کے مناسب ادا کیا جا سکے۔ فالحمد لله علی ذلک۔ اب آگے سوال ۱ کے جزء ثانی کا جواب جو روزہ سے متعلق ہے عرض کیا جائے گا۔

سوال ۱ کے جزو ثانی (ب) کا جواب:

وجوب نماز کی طرح روزوں کا وجوب بھی ساقط نہ ہوگا، بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا۔

"بورود النص حکما مطلقا شاملا لجمیع الناس فی جمیع الأزمنة والأمکنة من غیر فرق بین أهل قطر کما قال الله تعالیٰ: "یا یها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون أیاما معدودات" (۱)۔

(اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ تھوڑے دنوں روزے رکھ لیا کرو) (بیان القرآن)۔

"وکما قال الله تعالیٰ: شهر رمضان الذی أنزل فیه القرآن هدی للناس وبینات من الهدیٰ

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۳۔

والفرقان فمن شهد منکم الشهر فلیصمه"(۱)۔

(ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان کتب کے جو ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے)۔

اس مضمون کی تائید علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے جس کو موصوف نے رد المحتار (۱/۳۳۹) میں زیر عنوان "تتمہ" تفصیل سے بیان کیا ہے، البتہ صورت ادا میں کچھ تفصیل ہوگی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے، اور بغرض تسہیل فہم ہر صورت الگ الگ بعنوان مسئلہ بیان کی جاتی ہے:

مسئلہ نمبر ۱- جن مقامات میں شمس کی عام گردش یومیہ کے اعتبار سے روزانہ طلوع وغروب نہ پایا جاتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ تک مسلسل آفتاب طلوع ہی رہتا ہو یا غروب ہو کر زمین کے اوٹ میں غائب ہی رہتا ہو، جیسا کہ ارض تسعین اور اس کے اطراف میں ایسا ہوسکتا ہے تو ان مقامات میں جواب نمبر ۱ کے جزو اول کے مسئلہ نمبر ۵ کے مطابق آفتاب کا ایک پورا دورہ (۲۴ گھنٹہ کا) جو ایک لیل ونہار کا مجموعہ شمار ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر کو دن کا حصہ شمار کیا جاتا ہے اس میں روزہ رکھیں اور اس نصف کے شروع ہونے سے ۱-۱/۲ گھنٹہ پہلے ہی سحری کھانا بند کر کے روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیا کریں اور نصف اول جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں مغرب، عشاء، وتر، تراویح فجر سب نمازیں پڑھ لیا کریں۔ اور پھر جب یہ مجموعہ لیل ونہار پورا ہو کر دوسرے دور کا آغاز ہو فوراً نماز مغرب پڑھنے کی طرح افطار بھی کر لیا کریں۔ اور پھر اس دوسرے دور کے نصف اول میں جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں کھانا پینا وغیرہ اور رات کی سب نمازوں (عشاء، وتر، تراویح وفجر وغیرہ) سے فراغت کر لیا کریں۔ اور نصف ثانی میں جو دن کا حصہ شمار ہوتا ہے اس کے شروع ہونے سے ۱-۱/۲ گھنٹہ قبل سحری کھا لیا کریں اور روزہ کی نیت کر لیا کریں، پھر اسی طرح ہمیشہ کیا کریں تا آنکہ یہ طلوع وغروب روزانہ ہونے لگے۔

ذلک الدلیل الذی بینه فی رد المحتار (۱/۳۳۹) تحت التتمة۔

مسئلہ نمبر ۲- جن مقامات میں طلوع وغروب شمس تو روزانہ پورے سال پایا جاتا ہو لیکن ہر موسم میں غروب شمس کے بعد سے فجر صادق طلوع ہونے کے قبل تک اتنا موقعہ نہ ملتا ہو کہ بایمائے آیت کریمہ:

"کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الأسود من الفجر، ثم اتموا الصیام

۱- سورہ بقرہ:۱۸۵۔

إلى الليل"(۱)۔

(کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح کا متمیز ہو جائے سیاہ خط سے پھر رات تک روزہ کو پورا کر لیا کرو)(بیان القرآن)۔

کھایا پیا جا سکے اور پھر اس کے بعد غروب تک روزہ پورا کیا جا سکے تو ان مقامات میں روزہ کی مقدار ساعات سے (یعنی گھنٹوں سے یا نصف گردش شمس وغیرہ سے) متعین نہ کریں گے، بلکہ اس ماہ (رمضان) کے بعینہ یہی دن روزوں کے لئے متعین رہیں گے، لیکن چونکہ اس طرح بغیر آسودگی سے کھائے پئے پورے ماہ میں صوم پر عادۃً وعموماً قدرت نہیں ہو سکتی، اس لئے ناغہ دے کر حسب قدرت واستطاعت روزہ رکھا کریں گے اور جن دنوں میں افطار کریں گے ان دنوں کے صوم کے عوض میں دوسرے مہینوں کے دنوں میں حسب قدرت ناغہ دے دے کر ادا کرتے رہیں گے، لیکن اگر جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس پر قدرت نہ ہو تو ان روزوں کا فدیہ فی صوم ایک صدقۂ فطر کے برابر ہمیشہ ادا کرتے رہیں گے۔

اگر بوجہ غربت فدیہ نہ دے سکتے ہوں تو استغفار کرتے رہیں گے اور وہاں سے جلد سے جلد ترک سکونت کر لینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

"كما يؤخذ من هذه العبارة: وكذا لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له أن يفطر ويطعم لأنه استيقن أن لا يقدر على قضائه، فإن لم يقدر على الإطعام لعسرته يستغفر الله وينتقل منه، وإن لم يقدر لشدة الحر كان له أن يفطر ويقضيه في الشتاء إن لم يكن نذر الأبد"(۲)۔

(اگر کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی منت مان لی پھر اپنے روزگار و معاش میں مشغولی کی وجہ سے ایفاء نذر پر قادر نہیں رہا تو اس کے لئے درست ہے کہ وہ افطار کر لیا کرے اور روزوں کا فدیہ دیدیا کرے، (یہ حکم اس وقت ہے جب وہ شخص غریب ہو اور اس کے لئے معاش میں مشغولی شرعاً واجب ہو) اس لئے کہ اس کو یقین حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اس نذر کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، پس اگر بوجہ غربت کے فدیہ کی ادائیگی پر پھر بھی قادر نہ ہو تو افطار کرتا رہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہے اور جلد سے جلد اس جگہ سے (جہاں پر روزے نہیں رکھ سکتا او رایفائے نذر نہیں کر سکتا)، دوسری جگہ منتقل ہو جائے، اسی طرح اگر کسی کو شدت حر سے روزہ پر قدرت نہ رہے تو افطار کر لے اور جاڑے میں قضا کر لیا کرے، جبکہ نذر ابد نہ ہو)۔

مسئلہ ۳: جن مقامات میں غروب وطلوع شمس تو روزانہ پایا جاتا ہے، لیکن سال کے صرف بعض مہینوں میں غروب

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔
۲- فتح القدیر ۲/ ۸۳۔

شمس سے صبح صادق کے درمیان میں نمازہائے مفروضہ واجبہ ادا کرنے کے بعد اطمینان سے کھاپی کر حسب ہدایت آیت کریمہ: "**كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض الخ**" (۱) (روزہ رکھنے کا وقت ملتا ہو اور بعض مہینوں میں نہ ملتا ہو، تو جس وقت ماہ رمضان ان مہینوں میں واقع ہو جائے جس میں یہ موقع نہ ملتا ہو تو ناغہ دے دے کر حسب استطاعت روزہ رکھیں اور جن دنوں میں روزہ نہ رکھ سکیں ان دنوں کی قضاء اسی سال کے دوسرے دنوں میں رکھلیا کریں، اور استغفار کرتے رہا کریں اور جلد سے جلد وہاں سے ترک سکونت کی کوشش کرتے رہا کریں۔ **كما مر في المسألة التي قبل هذه المسئلة۔**

مسئلہ ۴: جن مقامات میں طلوع وغروب شمس روزانہ پایا جاتا ہو، اور غروب کے بعد سے فجر صادق کے غروب ہونے کے پیشتر تک پورے سال اتنا کافی وقت ملتا ہو جس میں صلوٰتہائے مفروضہ وواجبہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اطمینان سے کھانے پینے اور کچھ آرام وسکون لینے کا وقت بھی مل جاتا ہو تو ان مقامات کے لوگوں پر ماہ رمضان میں ہی ہمیشہ ادائیگی صوم واجب وضروری ہوگی اور فجر صادق طلوع ہونے سے ہی روزہ شروع کردینا لازم ہوگا اور وقت فجر کی مقدار طویل ہونے کی وجہ سے صوم کی مقدار اگرچہ طویل ہو جائے، لیکن سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی اور وجوب صوم متوجہ رہے گا، ساقط نہ ہوگا۔

ہاں اگر کسی کو کوئی وقتی وعارضی مجبوری یا کوئی عذر شرعی پیش آجائے جیسے حاملہ، حائضہ، مرضعہ یا مریض ومسافر وغیرہ تو ایام معتدلہ والوں کی طرح ان کو رخصتیں ملیں گی۔

"**كما دلت عليه هذه العبارة: والحامل والمرضع إذا خافتا على أنفسهما أو ولديهما أفطرتا وقضتا دفعا للحرج ولا كفارة عليهما، لأنه إفطار بعذر ولافدية عليهما**" (۲)۔

(حاملہ ومرضعہ جب اپنے اوپر یا اپنے بچہ پر (روزہ رکھنے سے) جان جانے کا خوف کرنے لگیں تو اس حرج کو دفع کرنے کے لئے افطار کرلیں اور بعد میں قضا رکھ لیں اور اس عمل کی وجہ سے ان پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے، اور نہ ان پر کوئی فدیہ ہے، اس لئے کہ یہ افطار عذر شرعی کی وجہ سے ہے)۔

اسی طرح اگر کوئی شیخ فانی ہو یا ایسا دائم المرض ہو چکا ہو کہ بظاہر حال قدرت علی الصوم مستبعد ہو چکی ہو تو افطار

۱- سورۂ بقرۃ: ۱۸۷۔
۲- ہدایہ مع الفتح ۲/ ۳۶۱ کتاب الصوم۔

کرتا رہے اور فدیہ صوم کا ادا کرتا رہے۔

"وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين"(۱)۔

(اور جو لوگ روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا ہے)(بیان القرآن)۔

(وهكذا ايضا في الشامي (۲/۱۷٦)، وهكذا في ۲/۱۷۷) أيضا ناقلا عن الرملي)۔

مسئلہ۵: ان مسائل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ گلاسکو اور اس کے مضافات میں ۲۰ جون سے اور بالائی اسکاٹ لینڈ و ناروے اور اس کے مضافات میں ۲۴ مئی سے شفق ابیض غروب ہونے سے قبل ہی صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے، تو جب تک غروب شمس کے بعد سے صبح صادق طلوع ہونے کے قبل قبل فرض مغرب و فرض عشا و وتر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ افطار کرنے اور کھانے پینے اور سحری کھانے کا موقع ملتا رہے گا، روزہ رکھنا فرض رہے گا، کیونکہ صوم کی مقدار اگر چہ ۲۰ گھنٹہ کے لگ بھگ ہو جائے گی، مگر سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی۔ جیسا کہ مورخ مغربی ابن بطوطہ کے سیاحت نامہ سے جو ایسے ہی ممالک کے سفر سے متعلق ہے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ٦: جن مقامات میں چاند ایام معتدلہ کی طرح ہر ماہ دو دن کے علاوہ بقیہ تمام ماہ روزانہ طلوع و غروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو (خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے طلوع ہو کر پھر غروب ہو جاتا ہو۔ ان مقامات میں ماہ رمضان المبارک اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین اسی جگہ کے مطابق کر کے مسائل مذکورہ بالا کے مطابق روزے رکھا کریں۔

مسئلہ۷: جن مقامات میں چاند روزانہ طلوع و غروب نہ ہوتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل چاند طلوع رہتا ہو یا غروب ہی رہتا ہو، جیسے ارض تسعین اور اس کے مضافات کے بعض مقامات ہیں، تو ان مقامات میں کسی قریبی مقام کو (جہاں چاند دو دن کے علاوہ پورے ماہ میں روزانہ طلوع و غروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو، اور آسانی سے اس کا علم و مشاہدہ ہو سکتا ہو) بنیاد بنا کر ماہ رمضان المبارک کا اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین کر کے گردش لیل و نہار کے مجموعہ کے ساتھ منطبق کر لیں، پھر ایک مجموعہ کو پوری ایک رات اور دن (۲۴ گھنٹہ) قرار دیں، اور اس کے نصف اول کو رات کا حصہ قرار دے کر اس کے ختم ہونے سے تقریبا دو گھنٹہ قبل سحری کھا کر روزہ کی نیت کر لیا کریں، اور مغرب وغیرہ کی نمازیں ادا کر لیا کریں، جیسا کہ ہم سوال اول کے جزو (الف) کے جواب میں بضمن مسائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۱- سورہ بقرہ: ۱۸۴۔

تنبیہ: شروع جواب میں لکھا گیا ہے کہ اسلام دین الٰہی اور دین فطرت ہے اور ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ اس کے احکام ومدار احکام فطری اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں فلسفیانہ موشگافیوں سے مبرا ومحفوظ ہوتے ہیں اور مسائل کی یہ تشقیقات وتفصیلات تو بالکل فلسفیانہ موشگافی یا اس کے ہم پلہ ہیں۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے، اس لئے کہ ان غیر معتدل ایام کے رہنے والے نفسیاتی اور فطری طور پر کئی کئی دن تک آفتاب طلوع رہنے کے زمانہ میں مسلسل نہ کام کر سکتے ہیں، اور نہ مسلسل بیدار ہی رہ سکتے ہیں، اور اس طرح مسلسل کئی کئی راتوں میں مسلسل سو ہی سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بمقاضائے فطرت مجبور ہیں کہ اپنے سونے جاگنے کھانے پینے، کام کرنے آرام کرنے وغیرہ وغیرہ، تمام کاروبار ومعاملات میں گھنٹوں ہی سے کوئی نظم کریں، گویا یہ وہاں کے لوگوں کی ایک فطری ونفسیاتی چیز ہوجائے گی۔ **كما أشار إليه الشاه عبد العزيز المحدث المهلوى فى فتاواه (١/ ١٤٣)۔**

پس شرعی احکام بھی انہی اصول کے ماتحت بمد آیات کریمہ واحادیث شریفہ فقہ کی روشنی میں مرتب ہوں گے اور یہ احکام معروضہ اسی انداز پر مرتب ہیں، لہذا یہ بھی عین فطرت کے مطابق ہی کہلائیں گے، مزید تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، تطویل کے علاوہ خروج عن المبحث بھی ہوجائے گا، اس لئے اسی پر اکتفاء ہے اور امید ہے کہ اتنی گزارشات سے اس اطراف کے ہر خطہ میں اور ہر موسم میں نماز روزہ کے عمل وامتثال میں شرعی رہنمائی حاصل ہوجائے گی اور اس کی روشنی میں جو شخص عمل کرنا چاہیگا اس کو عمل کرنے میں کوئی دقت یا الجھن نہ ہوگی، بلکہ نہایت آسانی سے عمل کر کے اپنے مربی حقیقی سے اپنا صحیح رشتۂ عبودیت جو اصل مقصد زندگی ہے قائم واستوار رکھ سکے گا۔

سوال ۲ کا جواب

"وفي الدر: وقت الظهر من زواله إلى بلوغ الظل مثليه وعنه مثله وهو قولهما وقول زفر والأئمة الثلاثة (إلى قوله) وفي الفيض وعليه (أي على قول صاحبين) عمل الناس اليوم وبه يفتىٰ (وتحته في الشامية ١/ ٣٧١) والأحسن ما في السراج عن شيخ الإسلام أن الاحتياط أن لا يؤخر الظهر عن المثل وأن لا يصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلوتين في وقتهما بالإجماع أو أيضا فيه (١/ ٣٧٠)، قد قال في البحر: لا يعدل عن قول الإمام إلى قولهما إلا ضرورة من ضعف دليل أو تعامل"(١)۔

١- شامی ١/ ٣٧٠۔

(درمختار میں ہے کہ ظہر کا وقت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر شئی کا سایہ دو مثل ہونے تک ہے اور امام صاحب سے ایک مثل کی بھی ایک روایت منقول ہے اور یہ ایک مثل کا قول صاحبین کا، نیز امام زفرؒ وائمہ ثلاثہؒ کا بھی ہے (الی قولہ) اور فیض میں منقول ہے کہ آج کل تمام لوگوں کا عمل صاحبین ہی کے قول پر ہے اور اسی کے ساتھ فتویٰ بھی دیا جاسکتا ہے اور اسی تین کے نیچے شامی (۱/۲۷۳) میں ہے کہ ان تمام اقوال میں بہتر وہ قول ہے جو سراج وہاج میں شیخ الاسلام سے مروی ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ نماز ظہر کو ایک مثل سے مؤخر نہ کیا جائے اور نماز عصر مثلین سے قبل نہ پڑھی جائے، تا کہ دونوں نمازیں (ظہر وعصر) بالاجماع اپنے اپنے وقتوں میں ادا ہوں، نیز اسی شامی (۱/۲۷۰) میں بحوالہ بحر منقول ہے کہ امام کے قول سے صاحبین کی جانب بھی ضعف دلیل یا تعامل ناس وغیرہ وجوہ شرعی کے بغیر عدول نہ کیا جائے)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ شفق احمر وابیض کی طرح مثل اور مثلین میں بھی امام صاحبؒ کا ایک قول مثل کا ہے۔

نیز تعامل ناس بھی صاحبین کے ہی قول پر ہے عدول عن قول الامام وجہ بن سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود حتی الوسع نماز عصر بعد مثلین اس لئے پڑھتے ہیں، تا کہ بالاجماع اور بلا اختلاف نماز عصر اپنے وقت میں ادا ہو۔

انہی عبارتوں سے نماز عصر کے اندر مثلین سے اس کی تقدیم کی گنجائش عند الضرورۃ نکل آئی، اس کے علاوہ اصفرار شمس کے بعد نماز عصر ادا کرنا عند الاحناف بالاتفاق مکروہ ہے جس سے اجتناب واجب ہے۔

پس اگر حسب تحریر سوال اگر وہاں (گلاسکو وغیرہ میں) مثلین سے ہی اصفرار شمس شروع ہوجاتا ہے تو اس سے اجتناب حتی الوسع ضروری ہوگا، اور مثلین سے قبل ہی نماز عصر ادا کر لینے کی اصول احناف کے مطابق جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، بدرجہ اولی گنجائش ہوگی اور ادا کر لینا بلا شبہ وبلا نکیر درست ہوگا اور نماز ادا ہوجائے گی۔ اور ایسی صورت میں کہ جب بعد مثلین پڑھنے میں اصفرار شمس قطعی طور پر ہوجاتا ہے تو ائمہ مساجد کا اصرار بجا نہ ہوگا۔

سوال ۳ کا جواب

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ اسلام دین الہی اور دین فطرت ہے۔ اس کے اصول فطری اور سادے ہیں، اس کے احکام اور مدار احکام بھی فطری وسادے ہوں گے، محکمۂ موسمیات یا ماہرین فلکیات کی تحقیقات پر اس کے احکام کی بناء نہ ہوگی۔ اور اسی وجہ سے اختلاف مطالع کا اعتبار جمہور محققین کے نزدیک نہیں ہے۔ خواہ شافعی ہوں یا حنفی یا مالکی ہوں یا حنبلی۔ غرض جمہور امت کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ کمافی الشامی (۲/۱۴۷)۔

"قد صرحت أئمة المذاهب الأربعة، بأن الصحيح أنه لا عبرة برؤية الهلال نهاراً (إلى قوله

وأنه لا عبرة بقول المنجمين" (۱)۔

(تمام ائمہ مذاہب نے تصریح فرمائی ہے کہ دن میں رویت ہلال کا اعتبار نہیں۔(الی قولہ) اسی طرح منجمین کے قول کا بھی اعتبار نہیں)۔

اور چونکہ امام تاج الدین سکی شافعی کے قول کی بناء انہی حسابات پر ہے اور وہ مزاج اسلام کے خلاف ہے اور اس وجہ سے خود تمام محققین شوافع نے اس کو رد کر دیا ہے۔

"ماقاله السبكي رده متاخروا أهل مذهبه" (۲)۔

غرض جمہور امت محمدیہ کے نزدیک امام تاج الدین سکیؒ کے قول پر مذاہب نہیں رکھ سکتے، بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ریڈیو کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی گھر گھر نہیں تو گاؤں، یا قصبہ قصبہ تو ضرور ہی اس کی بہتات ہو چکی ہے جس کے ذریعہ سے دور ونزدیک ہر جگہ کی اطلاعات بے تکلف وبغیر کسی کاوش ووقت کے پہنچتی رہتی ہیں تو پھر اقوام متمدنہ کے ملکوں میں اس کی کس قدر کثرت وبہتات وفراوانی ہوگی اور اس کے ذریعہ آمدہ اطلاعات واعلانات کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر یہ اعلانات واطلاعات شرعی اصول کے مطابق آجائیں، خواہ کسی خطۂ وملک سے آجائیں، ثبوت کے لئے شرعاً کافی ہوں گی، جس کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے رسالہ" آلات جدیدہ کے شرعی احکام" میں خوب واضح طور سے بیان فرمایا ہے اور شرعی اصول وضوابط کے مطابق اس قسم کے اعلان واطلاع حاصل کرنے کا نظم بالخصوص متمدن ممالک میں کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں، مثلاً کسی مرکزی شہر میں جہاں کا مطلع صاف رہتا ہو، غبار آلود نہ رہتا ہو اور وہاں ریڈیو اسٹیشن بھی ہو، منجانب حکومت یہ انتظام کرا لیا جائے کہ کوئی مسلمان حاکم شہادت شرعیہ کے ذریعہ رویت کا ثبوت حاصل کر کے بایں الفاظ یہ اعلان کرادیا کرے کہ رویت کا ثبوت شرعی حاصل کر کے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل یوم فلاں سے، مثلاً یکم رمضان ہے یا یکم شوال ہے تو یہ اعلان معتبر ہوگا اور اس پر عمل کرنا اصول مذہب کے مطابق صحیح ودرست ہوگا، صرف ایک بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے سے مہینہ بجائے ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونے کے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو۔

اور اگر منجانب حکومت ایسا باقاعدہ نظم نہ ہو سکے تو آپسی انتظام سے ایک شرعی ہلال کمیٹی بنائی جائے جس کے سب افراد باشرع مسلمان ہوں اور اس میں ایک سمجھدار عالم کو بھی جو مسائل متعلقہ سے بخوبی واقف ہو، شریک کر لیا جائے، تاکہ

۱- شامی ۲/ ۱۴۷ تحت " مطلب فی رؤیۃ الہلال نہاراً"۔

۲- شامی ۲/ ۱۴۱۔

تمام شرعی کارروائی باوثوق طریقہ سے مکمل ہو سکے، وہ شرعی ہلال کمیٹی رویت ہلال کا شرعی ثبوت فراہم کر کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنی نگرانی میں اعلان نشر کرادے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت فراہم کر کے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل صبح عید ہے، مثلاً، یا اس وقت سے ماہ رمضان کی شب ہوگی، صبح سے روزے رکھے جائیں۔

اس ثانی صورت میں حکومت سے صرف اتنا کام لینا ہے کہ حکومت اور پروگراموں کے ساتھ اس پروگرام کے نشر کرنے کو منظور کر لے اور ہلال کمیٹی کا کوئی مسلم وکیل یا مسلم نمائندہ وہاں پہنچ کر اعلان کر دیا کرے، ریڈیو اسٹیشن عموماً اس قسم کی خبریں اور اعلانات خود نشر کرتے رہتے ہیں ان کو اس کے منظور کرنے میں کچھ دقت نہ ہوگی، صرف اتنا لحاظ کرنا ہوگا کہ اس نشریہ کے الفاظ شرعی ہوں گے جس کو ہلال کمیٹی خود مرتب کردے گی۔

پہلی صورت کے انتظام میں بھی حکومت کو کوئی خاص دقت یا پریشانی نہ ہوگی، بلکہ ممکن ہے کہ اس سلسلۂ انتظام میں حکومت کا کچھ مالی یا اقتصادی فائدہ ہی ہوجائے، اس لئے اگر حکومت تنگ دل یا متعصب نہ ہوگی تو آپ کا نظم بآسانی وبسہولت ہوجائے گا، نیز اگر حکومت غیر مسلم سے بھی یہ انتظام کرالیا جائے جب بھی شرعا نافذ وصحیح ہوگا، یہ انتظام مملکت برطانیہ یا اس کے گردونواح کے نزدیک کی کسی بھی مملکت مسلمہ یا غیر مسلمہ سے کرالیا جائے تو بھی صحیح ونافذ ہوجائے گا اور سارے مسلمان اس کے مطابق آسانی سے عمل کر سکیں گے، اگر یہ انتظام کرلیا گیا تو یہ ایک مستقل حل نکل آئے گا اور خط وٹیلیفون سب سے زیادہ قوی اور اطمینان بخش ہوگا اور ہر طرح شرعی اصول وضابطہ کے مطابق ہوگا۔

الحاصل جب ان سہولتوں کے موجود نہ ہونے کی حالت میں بھی تاج الدین سبکی کا قول معمول بہ مدار مذہب نہ بن سکا، بلکہ فقہاء نے صاف تصریح فرمادی کہ اس حساب کے جاننے والے اور بتلانے والے اگر چہ عادل وثقہ مسلمان ہوں گے جب بھی اس کا اعتبار نہ ہوگا، کما فی الشامی (۲/۱۴۱)۔

"ولا عبرة بقول المؤقتين ولو عد ولا على المذهب" (۱)۔

(اہل ہندسہ وقول منجمین کا اعتبار نہ کریں گے اگر چہ وہ عادل ہی کیوں نہ ہوں)۔

توان سہولتوں کے باوجود اگر کسی جگہ کے لوگ تاج الدین سبکیؒ شافعی کی تحقیق کے مطابق عمل کرلیں گے توان کا یہ عمل صحیح نہ ہوگا اور ان کا یہ طریقہ نکالنا احکام مذہب کے مطابق صحیح تعمیل وصحیح ترجمانی نہ ہوگی، بلکہ اگر وہ لوگ حکومت میں بااثر وبارسوخ ہوں، اور اسی طرح اور لوگ جو بااثر وبارسوخ ہوں اور حکومت کی جانب سے یا شرعی کمیٹی کے ذریعہ سے اعلان کا انتظام بسہولت متوقع ہو تو ان سب پر خطاب باری عزاسمہ خصوصی طور سے متوجہ ہوگا کہ وہ لوگ اس کے انتظام میں اپنی

۱- شامی ۲/۱۴۱۔

پوری قوت صرف کر کے امت مسلمہ کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، نہ کہ اصول مذہب کو چھوڑ دیں اور اجماع سلف کا توڑ کریں، اور اگر وہ اس کوشش میں بظاہر کامیاب نہ ہوں گے جب بھی حقیقت میں کامیاب ہوں گے ثمرات آخرت سے ضرور بہرہ ور ہوں گے۔ **هذا ما عندی من الشرع الشریف**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

آیات، احادیث، روایات، فقہ کی روشنی میں استنباط کر کے جو حکم تحریر کیا گیا ہے وہ اقرب واشبہ ہے، اس پر عمل کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ ذمہ بری ہو جائے گا۔

الجواب صحیح: احقر محمود غفی عنہ دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند

وہ مقامات جہاں افق ہمیشہ غبار آلود رہتا ہے وہاں رمضان کی ابتداء وانتہا:

چونکہ برطانیہ کا افق ہمیشہ غبار آلود رہتا ہے جس کی وجہ سے چاند دیکھنا ناممکن ہے تو رمضان کی ابتداء وانتہا کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شعبان کی ۲۹ ؍تاریخ کی شام کو یا اسی رات میں کوئی شرعی رویت ہلال کمیٹی (جس کے سب افراد کا باشرع ہونا معلوم ہو) کا اعلان بایں الفاظ آجائے کہ میں فلاں شرعی رویت ہلال کمیٹی کا صدر یا ممبر ہوں، رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اعلان کرتا ہوں کہ کل یکم رمضان ہے یا کل سے روزہ رکھا جائے تو اس اعلان کے تقاضہ اور حکم پر عمل کرنا صحیح ہو جائے گا یہ اعلان انہی الفاظ میں دنیا کے کسی خطہ سے آجائے عمل کرنا درست رہے گا، اسی طرح رمضان کی ۲۹ ؍تاریخ کی شام کو یا اسی رات میں مذکورہ اوصاف کی کمیٹی کا اعلان آجائے کہ شرعی ثبوت لیکر اعلان کیا جاتا ہے کہ کل یکم شوال ہے یا کل نماز عید ادا کی جائے تو اس پر بھی عمل کرنا درست رہے گا، اور اگر یہی اعلان انہیں مذکورہ الفاظ میں ۲۸ ؍تاریخ کو آئے تو معتبر نہ ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں مہینہ کا ۲۸ ؍دن کا ہونا لازم آئے گا یہ نص صریح "**الشهر هكذا و هكذا**" الخ کے خلاف ہوگا جس کا خلاف کرنا کسی صورت میں جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

لندن وغیرہ جہاں کا افق ہمیشہ ناصاف رہتا ہے، وہاں ثبوتِ رمضان کا شرعی حکم؟

برطانیہ میں فضا بالدوام ابر آلود رہتی ہے، اس لیے کبھی بھی رویت یا شہادت ہلال کا امکان ہی نہیں رہتا ہے، اس وجہ سے ابتداءِ رمضان یا عیدین کے تعین میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب رویت وشہادت ممکن ہی نہیں تو ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار ناگزیر ہے، اس وجہ سے ایسے لوگ اطلاع ریڈیو پر رمضان وعیدین کا تعین کرتے ہیں۔

شریعت مطہرہ نے رویت وشہادت کے جو قوانین وضع کیے ہیں، اس کے معیار پر ریڈیو کی اطلاع رویت ہلال یقیناً غیر معتبر ہے، لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ اگر ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار نہیں کرتے تو سال کے تمام مہینوں میں پورے ۳۰/۳۰ دن ہوں گے اور اس طرح برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا اسلامی سال ۳۶۰ دن کا ہوگا جو ہندو پاک کے اسلامی سال سے جو عموماً ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے، چھ دن زیادہ ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہندو پاک میں رمضان کے ۶ دن گذر جائیں گے تب ہی یہاں رمضان شروع ہوگا، اسی طرح عیدین میں ۶ دنوں کا فرق پڑے گا اور وہ فرق بڑھ کر پانچ سال میں ایک مہینہ کا ہو جائے گا، یعنی ہندو پاک میں جب شوال کا مہینہ شروع ہو تو یہاں برطانیہ میں رمضان کی آمد ہو، اسی طرح یہ فرق ہر سال میں بڑھتا ہی چلا جائے گا، پھر اطلاع ریڈیو کو بالضرورت جائز سمجھنے والے قصر صلوٰۃ وافطار فی السفر، احکام معذور، امامت ودرسِ قرآن پر اجرت لینا وغیرہ کا ذکر کرکے فرماتے ہیں کہ عند الضرورت احکام میں تخفیف شریعتِ مطہرہ کا مزاج ہے۔

اور یہاں ریڈیو کی اطلاع پر جواز بھی عند الضرورت ہے ورنہ اختلاف کا ڈر ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، پھر ایک ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ ریڈیو کی خبر کو نامعتبر سمجھنے کا قیاس اس امر پر مبنی ہے کہ زمانہ سلف میں رویت وشہادت کے علاوہ تمام ذرائع میں کذب کا امکان تھا، لیکن فی زماننا یہ بات نہایت واضح ہے کہ ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان اس معنی میں نہیں کہ بولنے والے کی آواز یقیناً اس ملک سے ہے، جہاں سے وہ بول رہا ہے اور وہ بات یقینی ہے کہ جہاں سے اطلاع مل رہی ہے وہاں ہلال کی چھان بین کمیٹی یا شہر قاضی نے بمطابق احکامِ شرع کر لی ہے اور اس بات کو نشر کرتا ہے نہ کہ اپنی طرف سے خبر دیتا ہے، پس ریڈیو کی اطلاع رویت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، پس اس تمہید کے پیش نظر حسب ذیل سوالات کے جوابات دے کر ممنون فرمائیں:

۱- جس ملک میں فضا ہمیشہ ابر وآلود رہتی ہو اور رویت شہادت کا امکان ہی نہ ہو وہاں اثباتِ ہلال کی کیا صورت ہوگی؟

الف: کیا اس صورت میں سال کے تمام مہینے ۳۰ دن کے شمار ہوں گے، یا صرف شعبان ورمضان، ذی قعدہ کو

• ۳۰ دنوں کا قرار دے کر بقیہ مہینوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں گے؟

۲-ریڈیو کی اطلاع پر رویت ہلال پر اعتماد نہ کرنے کی صورت میں شرقی ممالک و برطانیہ کے درمیان پانچ سال میں ایک مہینہ کا فرق ہوجاتا ہے، تو کیا اس کو شرعی ضرورت سمجھ کر صرف برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے ریڈیو کی اطلاع پر رویت ہلال کو معتبر سمجھنا درست ہے یا نہیں؟

الف: شریعت مطہرہ نے سفر میں قصر صلوٰۃ و افطار صوم اور معذور کے لیے طہارت کے احکام میں تخفیف کی اجازت دی ہے اور اس زمانہ میں ضرورت کے پیش نظر امامت و درس قرآن پر اجرت لینے کو درست لکھا ہے، تو کیا رویت ہلال کے مسئلہ میں بھی ضرورت کے پیش نظر برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو تخفیف دے کر ریڈیو کی اطلاع کو معتبر سمجھنے کی اجازت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۳-بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب متعدد ممالک ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر نشر کریں، تو یہ خبر مستفیض کے حکم میں ہے، کیا ان کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟ اگر ریڈیو کی اطلاع خبر مستفیض کے حکم میں ہے، تو کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنے ممالک کے ریڈیو کی اطلاع درکار ہے؟

امید ہے کہ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بہت جلد دے کر یہاں کے مسلمانوں کو شدید اختلاف سے بچالیں گے، یہاں تک کہ اخبار میں علماء پر بھی کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

مذکورہ حالات بے شک پریشان کن ہیں اور بمقتضائے "**المشقة تجلب التيسير**"(۱) مقتضی تیسیر ہے، اس لیے اس کا حکم مندرجہ ذیل ہوگا:

۱-جب کسی ریڈیو کے بارے میں یہ علم یقینی حاصل ہوجائے کہ وہ ثبوت شرعی کے بعد ہی رویت کا اعلان کرتا ہے، تو اسی اعلان پر عمل کرلینا درست رہے گا، بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو، جیسا کہ دہلی میں کل ہند رویت ہلال کمیٹی قائم ہے اور کمیٹی جو فیصلہ شرعی اصول کے مطابق کرتی ہے اس فیصلہ کو اسی کمیٹی کے الفاظ میں آل انڈیا ریڈیو اپنی خاص خبروں میں نشر کرتا ہے، اس کی مزید توضیح و تصدیق جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب شیخ الحدیث و صدر

۱- الاشباہ والنظائر/۱۲۵۔

المدرسین مدرسہ عالیہ فتحپوری سے حاصل ہوسکتی ہے، جناب مولانا موصوف اس کل ہند رویت ہلال کمیٹی کے کنوینر ہیں، پس اگر اس ریڈیو کا اعلان پہنچ جاتا ہو یا اسی قسم کا کوئی اعلان ملک کے کسی خطہ سے آجاتا ہو اور اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو تو بے تکلف اس کے مطابق عمل کرلیا جائے۔

۲-اگر ایسا علم ویقین حاصل نہ ہو، لیکن ظنِ غالب حاصل ہو جائے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد ہی یہ اعلان ہوا ہے تو اس پر بھی عمل کرلینا چاہیے یہ درست ہوگا، خواہ دنیا کے کسی خطہ سے آئے بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو۔

۳-اور اگر صحت کا یہ ظن غالب بھی حاصل نہ ہو، لیکن مختلف اطراف وممالک سے ثبوتِ رویت ہلال کی اطلاع اتنی تعداد میں آجائے کہ اتنی تعداد میں عادتاً کذب پر اتفاق نہیں ہوتا، تو استفاضہ کی صورت بن کر اس کے مطابق بھی عمل کرلینا درست ہے۔

نوٹ: ان سب صورتوں میں عوام کے علم ویقین یا ظنِ غالب کا یا استفاضہ قرار دینے کا اعتبار نہ ہوگا، مقامی رویت ہلال کی شرعی کمیٹی کے فیصلہ وظن غالب کا اعتبار ہوگا اور اگر مقامی شرعی رویت ہلال کمیٹی نہ ہوگی تو وہاں کے خطیب جامع مسجد وعید گاہ کا اور وہاں کے معتمد علماء کا فیصلہ جب ظنِ غالب کے حصول کا یا استفاضہ کے حصول کا ہوگا تو وہ معتبر ہوگا۔

۴-اگر ان مذکورہ صورتوں میں کوئی صورت میسر نہ ہو یا فقہ حنفی کے اصول پر یہ پوری نہ اترتی ہو اور پریشانیاں وہی ہوں جو سوال میں مذکور بھی ہیں، تو اس صورت میں یہ کرنا چاہیے کہ اگر اس خطہ میں شافعی یا حنبلی یا مالکی لوگ بستے ہوں تو جو ان کے معتمد مفتی کا فتویٰ ہو اس پر خود بھی عمل کریں بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو۔

اس صورت میں بھی عوام خود رائی نہ کریں، بلکہ علمائے احناف سے اس کے بارے میں فتویٰ حاصل کرلیں۔

۵-اور اگر یہ صورت بھی میسر نہ ہو، یعنی شافعی، حنبلی اور مالکی یہ لوگ بھی نہ بستے ہوں یا بستے ہوں، مگر مذکورہ معتمد فتویٰ موجود نہ ہو یا ان کے فتاویٰ آپس میں متضاد ہوں، تو پھر علمائے احناف ہی سے ان کے معتمد فتاویٰ حاصل کریں، یا ان کے فقہ کی معتمد کتابوں سے رجوع کرکے اس مجبوری کی صورت میں ان کا معتمد مسلک تلاش کرکے اس کے مطابق عمل کریں۔

اتنی گفتگو سے آپ کے سوال کی ہر شق کا جواب ہوگیا اور ۲ کے ضمن (ج) کے بارے میں عرض ہے کہ یہ کہنا کہ اب ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان نہیں رہا صحیح نہیں۔

امکان کیا وقوع بھی ہو جاتا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حکومت کی خالص اطلاعات جس کو حکومت اپنے خاص

اہتمام سے نشر کرتی ہے اس میں اس کا احتمال کم ہوجاتا ہے۔

اور جو اطلاعات عام خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے ہوتی ہیں ان میں اس کا احتمال زیادہ ہوجاتا ہے، پھر ریڈیو کے ذریعہ جو اعلان کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ جو خبر دیتے ہیں ان دونوں میں بھی فرق ہے، اعلان تو یہ ہے کہ مثلاً فلاں قاضی یا فلاں شرعی ہلال کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ شرعی ثبوت سے رویت ہلال ثابت ہوگیا کل سے روزے رکھے جائیں گے یا کل نماز عید ادا کی جائے گی اور اس جواب میں اعلان سے اسی قسم کا اعلان مراد ہے اور خبر مثلاً یہ ہے کہ فلاں نے چاند دیکھا یا فلاں سے فلاں شخص نے اپنا چاند دیکھنا بیان فرمایا۔

اور جو اطلاعات اس درجہ کی بھی نہ ہوں، مثلاً اس طرح ہو کہ فلاں جگہ عید ہے، یا فلاں جگہ چاند دیکھا گیا تو یہ اطلاعات شرعاً نہ معتبر اعلان ہیں نہ معتبر خبر ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

بحرین میں سعودی عرب کے اعلان پر روزہ وعید:

بحرین میں روزہ رکھنے اور عید الفطر منانے کا اعلان سعودی عرب کے اعلان پر کرتے ہیں گذشتہ رمضان بغیر چاند دیکھے روزہ رکھا گیا عید الفطر بھی سعودی عرب کے اعلان پر منایا گیا بحرین میں چاند دکھائی نہیں دیا تھا جب کہ مطلع بالکل صاف تھا۔ سعودی عرب کے اعلان پر رمضان کے روزے اور عید الفطر منانا کیسا ہے؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

جائز ہے، اس طرح سے بھی روزے وعید الفطر سب ادا کرنا درست ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- ''فیلزم أهل المشرق برؤیة أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤیة أولئک بطریق موجب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۶۴) (مرتب)۔

مونٹریال میں رمضان وعید کی ثبوت رویت کا طریقہ:

الف-رمضان یا شوال کے چاند کی رؤیت کے لئے مطالع کے فاصلہ کا تعین مندرجہ ذیل حالات کے تحت کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ہم مونٹریال کے مسلمان اب تک یہ طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں کہ تقریباً سات سو(۷۰۰)میل شمال، جنوب، اور مغرب میں سے رؤیت ہلال کی مستند اطلاع ملنے پر رمضان یا شوال کا آغاز کرتے ہیں۔حالانکہ ہمارے پاس اس بات کی بھی سہولت موجود ہے کہ ہم کینڈا اور امریکہ ہی کے ممالک میں تین ہزار میل (۳۰۰۰) دور کے فاصلہ تک بھی رؤیت ہلال کی شہادت حاصل کر سکتے ہیں،لیکن اس میں قباحت ہیکہ اتنے فاصلہ کیوجہ سے غروب آفتاب کے اوقات میں تقریباً تین گھنٹہ کا فرق ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے رؤیت کی شہادت کی اطلاع ملنے میں تقریباً رات کے ایک یا دو بج جاتے ہیں اور باشندگاں مونٹریال اور اطراف کے ساکنان کو اتنی رات گئے اطلاع دینا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، چنانچہ اس وجہ سے لوگوں کا یا تو روزہ چھوٹ جاتا ہے یا عید کے دن کا روزہ ہوجاتا ہے مزید براں تراویح اور اعتکاف کی عبادات میں بھی خلل واقع ہوجاتا ہے۔

اطلاعاً عرض یہ ہے کہ مونٹریال کے مسلمانوں کی آبادی چاروں ائمہ کے مسلک پر مشتمل ہے،لیکن اکثریت احناف کی ہے۔　　　　سید منظور خاں (سنٹر اسلامک ڈی کیوبیک، کناڈا)

الجواب وبالله التوفيق:

متاخرین علماء میں بعض محققین نے رؤیت ہلال کے ثبوت کے لئے بلاد نائیہ (دور دراز) علاقوں میں اختلاف مطالع کا اعتبار کرلیا ہے اور اس کی تحدید بھی بعض نے انگریزی میل سے ۵۰۰ سو میل اور آج کل کیلومیٹر سے تقریباً ۸۰۰ کیلو میٹر سے کردی ہے (۱)،اسلئے ان مذکورہ ممالک میں آپ حضرات کا یہ طریقہ معمول صحیح ہے اور ہوسکتا ہے بشرطیکہ مستند او رشرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع ملے بلکہ مستند و شرعی ضابطہ اطلاع کے مطابق (یعنی طرق موجبہ شرعیہ کے مطابق) اگر ۸۰۰ کیلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلہ سے اطلاع ملے تو افطار وصوم کا حکم ظاہر روایات اور عند الجمہور مفتی بہ قول کے مطابق دے سکتے ہیں (۲)۔

۱- کمافی ردالمحتار کتاب الصوم (۳/ ۳۶۳) درمختار کی عبارت: "واختلاف المطالع غير معتبر على ظاهر المذهب" کے تحت۔

۲- جیسا کہ درمختار کی عبارت میں صراحت ہے: "غير معتبر على ظاهر المذهب وعليه أكثر المشائخ، وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة، فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب" (درمختار مع شرحہ ردالمحتار ۳/ ۳۶۳، ۳۶۴)۔

مثلاً اپنے یہاں کی ۲۹ر شعبان کو کسی خطۂ عالم سے شرعی رؤیت ہلال کمیٹی جس کے سب افراد باشرع ومعتبر ہوں ریڈیو پر یا ٹیلی ویژن پر اعلان کرے ہم فلاں شرعی رویۃ ہلال کمیٹی یا میں اس کا صدر ہوں خود اعلان کرتے ہیں یا اپنے خاص آدمی کے ذریعے سے اعلان کراتے ہیں کہ شرعی ضابطہ کے مطابق آج رؤیت ہلال ثابت ہوچکی ہے صبح روزہ رکھا جائے یا ۲۹ر رمضان کو انہی الفاظ میں اعلان کرے کہ شرعی ضابطہ سے ثبوت رؤیت حاصل کرکے اعلان کرتے ہیں صبح یکم شوال وعید منائی جائے تو اس پر بھی عمل کرلینا درست ہوگا، کیونکہ یہ اعلان شرعی ضابطہ کے مطابق اعلان ہوگا، محض خبر یا شہادت کا درجہ نہوگا، یہ اعلان اول صحابی کے اعلان کے مانند ہوگا جنکو رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت ہوجانے کے بعد خود سرکار دو عالم ﷺ نے اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا کما رواہ الجماعۃ والدارمی عن ابن عباسؓ (۱) اور یہ حکم مطلق تھا کسی مسافت یا ملک کی قید سے مقید نہیں تھا۔

ریڈیو ٹیلی ویژن کا یہ اعلان مذکورہ بالا شرائط والفاظ میں اپنے یہاں کہ ۲۹ر شعبان یا ۲۹ر رمضان کو مل جائے تو مطلع صاف ہو یا ناصاف یکساں حجت بنے گا اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا، البتہ اس کا ثبوت شرعی ضابطہ کے مطابق ہونا ضروری ہوگا مثلاً ۲۹ر شعبان کو مطلع ناصاف ہو تو ایک معتبر شخص کا ریڈیو پر ان مذکورہ بالا شرعی الفاظ خود سن کر بیان کرنا ضروری ہوگا او ۲۹ر رمضان کو جب مطلع صاف نہ ہو تو کم از کم دو معتبر اشخاص کا ان مذکورہ بالا شرعی الفاظ کا ریڈیو پر خود سنکر بیان کرنا ضروری ہوگا اور جب مطلع صاف ہو تو کم از کم مختلف ومتعدد معتبر اشخاص کا ان الفاظ کو خود سنکر بیان کرنا ضروری ہوگا۔

اور ریڈیو ٹیلیویژن کے علاوہ محض ٹیلیفون سے اطلاع ملے تو یہ اطلاع چونکہ اعلان کے حکم میں نہ آسکے گی بلکہ صرف خبر کے حکم میں ہوگی پس اگر شرعی خبر بنے تو معتبر ہوسکے گی ورنہ معتبر نہ ہوگی شرعی خبر کا مفہوم یہ ہے کہ جانا پہچانا معتبر آدمی ٹیلیفون پر ان الفاظ میں خبر دے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے اور اسکی آواز بھی خوب پہچانی جاتی ہو یا وہ شخص یہ کہے کہ مجھ سے فلاں آدمی نے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا کہے کہ میرے سامنے فلاں شرعی رؤیت ہلال کمیٹی نے یا فلاں قاضی نے چاند ثابت ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ شخص بھی معتبر ومعتمد ہو اور اسکی آواز بھی خوب پہچانی جاتی ہو تو ۲۹ر شعبان کو ایسے ایک ٹیلیفون کی خبر بھی معتبر ہوگی اور ۲۹ر رمضان کو کم از کم دو مختلف جگہ کے ٹیلیفون پر ایسے معتبر اشخاص مذکورہ الفاظ میں خبر دیں اور مطلع ناصاف

۱- مشکاۃ المصابیح کتاب الصوم باب رؤیۃ الہلال ۴/ ۱۷۔ "عن ابن عباسؓ قال: جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال يعني هلال رمضان، فقال أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: أتشهد أن محمداً رسول الله؟ قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا" رواہ ابوداؤد حدیث: ۲۳۴۰، ترمذی حدیث: ۶۹۱، نسائی ۴/ ۱۳۳، کتاب الصوم باب قبول شہادۃ الرجل الواحد علی ہلال شہر رمضان، وابن ماجہ؛ حدیث: ۱۶۵۲، دارمی (مرتب)۔

ہوتو قابل عمل ہو سکے گا ورنہ قابل عمل نہ ہوگا۔

اور جب مطلع صاف ہو تو چاہے ۲۹/ شعبان ہو یا ۲۹/ رمضان جب تک مختلف سمت کا مختلف ٹیلیفون ان ہی مذکورہ الفاظ وقیود میں خبر نہ دیں معتبر نہ ہوگا(۱)۔

پھر ان ٹیلفون یا ریڈیو وغیرہ کی انفرادی خبر پر عمل درآمد کرلینا چاہئے، بلکہ ہر قصبہ وآبادی میں ایک شرعی رؤیت ہلال کمیٹی یا کوئی شرعی تنظیم ہو تو اس کے فیصلہ کے مطابق عوام کو عمل کرنا لازم ہے خودرائی کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، اور جب شرعی رؤیت ہلال کمیٹی یا وہاں کی شرعی تنظیم مذکورہ بالا شرائط وقیود کے ساتھ فیصلہ کردے خواہ ثبوت رؤیت کا یا عدم ثبوت رؤیت کا تو اس کے خلاف کرنا درست نہ ہوگا۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ آپ حضرات کا عمل بھی غلط یا غیر محتاط نہیں ہے صحیح ہے محض مزید وضاحت وبصیرت کے لئے یہ تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۸/۱۴۰۰ھ

چاند کی خبر قبول کرنے کی حد:

چاند کی خبر کتنے فاصلے سے ماننا چاہئے اور کیوں؟ تفصیل سے لکھیں تا کہ سمجھ میں آسکے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

چاند کی خبر جب کہیں باہر سے آوے تو مقامی رویت ہلال کمیٹی یا وہاں کے عالم ومفتی کے فیصلہ واجازت کے بعد عمل کرنا چاہئے اپنی طبیعت سے اور خودرائی کرکے عمل کرلینا درست نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۴/۲/۱۴۰۳ھ

۱- ہدایہ ۱/۱۹۵ کتاب الصوم میں ہے: ”وإذا كان بالسماء علة قبل الإمام شهادة الواحد العدل في رؤية الهلال رجلاً كان أو امرأة حراً كان أو عبداً لأنه أمر ديني فأشبه رواية الإخبار وهذا لا يختص بلفظ الشهادة ...... وإذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه كثير يقع العلم بخبرهم ...... وإذا كان بالسماء علة لم تقبل في هلال الفطر إلا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين“ (ہدایہ ۱/۱۹۵-۱۹۶) (مرتب)۔

کان اور ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

جدید ڈاکٹروں کی یہ تحقیق ہے کہ دماغ جو ہے بالکل بند ہے اس میں کسی قسم کا منفذ نہیں نیز یہ کہ جو دوائیں کان یا ناک کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہیں وہ نہ بطن میں داخل ہوتی ہیں نہ دماغ میں تو کیا پھر بھی یہ ناقض صوم ہے یا نہیں؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

ڈاکٹروں کی یہ تحقیق عموماً انسان کے مرنے کے بعد مردہ دماغ پر ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد حالات کا یکساں و صحیح و نمایاں باقی رہنا کچھ ضروری نہیں رہتا علاوہ ازیں ڈاکٹروں کی تحقیق کی حجت مشتبہ ہے اور فقہاء کرام کی جو تحقیق ہے وہ ملہم من اللہ ہے نیز کتاب وسنت واجماع سے مستنبط ہے جس کی حجیت یقیناً اقوی ہے اسلئے جب تک نصوص ہی سے اسکا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے غلط یا مرجوح نہیں کہہ سکتے فافہم، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

روزہ کا قصر حالت سفر میں:

روزہ ماہ رمضان فصل شرعی میں اپنے کسی دنیاوی یا مقدمات کے سفر میں قصر کر سکتے ہیں یا کہ نہیں اور کیا روزہ قصر شدہ بعد کو رکھنا ضروری ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سفر میں نماز قصر کرنے کا تو مطلب یہ ہے کہ چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھے اور روزے کے قصر کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں اگر تکلیف ہو تو سفر میں نہ رکھے بعد میں قضاء کرلے لیکن اگر سفر میں رکھتا ہے تو افضل اور اچھا ہے دنیاوی کاروبار و مقدمہ وغیرہ کے سفر میں بھی قصر کرنے کا وہی حکم ہے کہ جائز تو ہے باقی روزہ رکھتے رہنا افضل ہے، "**لمسافر...... أو حامل...... الفطر...... ویندب لمسافر الصوم**"(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ دارالعلوم دیوبند ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

۱- الدر المختار ۳/ ۴۰۳، ۴۰۵۔

بحالت روزہ انجکشن لگوانا:

انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں تشریح فرمادیں، میرا خیال ہے کہ نس میں انجکشن لگوانے سے تو براہ راست دل ودماغ پر اثر پڑتا ہے، لیکن گوشت پر لگوانے سے بھی براہ راست اثر ہوتا ہے، اسکی مثال میرے سامنے یہ ہے کہ افیون کا انجکشن جس کو گارخیا بھی کہا جاتا ہے گوشت میں ہی لگایا جاتا ہے، لیکن اس سے دل ودماغ بالکل سن ہوجاتے ہیں اور نیند کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے گوشت میں انجکشن لگوانے سے طاقت بھی آتی ہے۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

یہ عام مروجہ انجکشن ان سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے ہاں کوئی ایسا انجکشن ایجاد ہوجائے کہ جس کے ذریعہ دوا یا غذا جوف معدہ یا جوف دماغ میں پہونچائی جانے لگے، تو اس وقت اس قسم کے سوالات پیدا ہوں گے دل ودماغ تک اثر پہونچنے سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے(۱)، جس طرح غسل کی تراوٹ عطر کی خوشبو تیل وسرمہ کے اثر سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے روزہ ٹوٹتا ہے غذا یا دوا کے جوف دماغ یا جوف معدہ میں براہ راست پہونچنے سے اوران انجکشنوں سے دوائیں براہ راست ان اجواف میں نہیں پہنچتیں، بلکہ انکا محض اثر اور نفع پہونچے تو پہونچتا رہے یہ دوائیں صرف شریانوں اور وریدوں میں ہضم ہوکر جذب ہوجاتی ہیں ان بحثوں میں آپ نہ پڑیں اور اگر علمی تحقیق مقصود ہے تو مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک مفصل رسالہ ہے اس کا مطالعہ فرمائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید

روزہ میں انجکشن اور سلائین لگوانا:

اگر کوئی شخص حالت روزہ میں انجکشن لگوالے تو کیا اس کا روزہ باقی رہے گا، ایسا انجکشن جو غذا کا فائدہ دیتا ہے، نیز کیا حالتِ روزہ میں یہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟ نیز سلائین استعمال کرنا کیسا ہے؟

۱- "ولو داوی جائفة أو آمة بدواء فوصل إلی جوفه أو دماغه افطر" (ہدایہ ۱/ ۲۰۲، مطبع یوسفی لکھنو) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق :

مفسد صوم صرف وہ چیز ہوتی ہے کہ جوف معدہ میں دوا یا غذا بعینہٖ پہنچ جائے، چاہے منفذ معتاد سے پہنچے یا منفذ غیر معتاد سے پہنچے، اور اگر دوا یا غذا بعینہٖ جوف معدہ میں نہ پہنچے، بلکہ دوا یا غذا بعینہٖ صرف رگوں پٹھوں تک رہ جائے اور صرف اس کا اثر ونفع جوف معدہ تک پہنچے تو بھی روزہ فاسد نہیں ہوگا، پس ان تمام انجکشنوں میں جو شرائینی ہوں، یا وریدی یا استعمال سلائینی ہو دوا یا غذا بعینہٖ جوف معدہ میں نہیں پہنچتی، لہذا ان میں سے کوئی بھی مفسد صوم نہ ہوگا، ہاں اگر کسی تدبیر سے بعینہٖ دوا یا غذا جوف معدہ میں پہنچا دی جائے جیسے حقنہ یا نلکی وغیرہ کے ذریعہ سے بعینہٖ دوا یا غذا جوف معدہ میں پہنچا دی جائے یا پہنچا دی جاتی ہے تو ان صورتوں میں روزہ بلا شبہ ٹوٹ جاتا ہے، اور ٹوٹ جائے گا۔

اور جیسے دماغ کے زخم میں جس زخم کو آمہ یا جائفہ کہتے ہیں اس میں رقیق مرہم یا دوا لگانے سے بعینہٖ وہ دوا جوف معدہ میں پہنچ جاتی ہے اور روزہ ٹوٹنے کا حکم ہوجاتا ہے، **وھذا حاصل مافی کتب الفقہ المعتبرۃ للفتاوی للأحناف عندی**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۴۲/۹/۱۴۰۱ھ

بحالت روزہ انجکشن لینا اور خون وگلوکوز چڑھوانا :

روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا کیسا ہے، میری سمجھ میں یہ بہتر ہے کہ قضا نہ کرے، بلکہ انجکشن بھی وہ لیتا رہے اور روزہ بھی رکھے، اس لیے کہ انجکشن نہ لگوانے میں مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے، نیز گلوکوز اور خون چڑھوانے کا کیا حکم ہے؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

عام انجکشن جو رگوں یا گوشت میں لگائے جاتے ہیں ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، روزہ فاسد صرف اس انجکشن سے ہوتا ہے جس کے ذریعہ غذا یا دوا بعینہٖ قعر معدہ میں پہونچائی جائے، جیسے پاگل کتے کے کاٹے کا انجکشن، اس لیے اگر روزہ کی حالت میں انجکشن نہ لگوانے سے مرض بڑھتا ہے تو بلا کراہت یعنی جو انجکشن محض رگوں اور گوشت میں لگائے جاتے ہیں لگوا سکتے ہیں، یہی حکم خون اور گلوکوز چڑھوانے کا ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- وہ زخم ایسے ہیں کہ جن میں دوا ڈالنے کو فقہاء نے فساد صوم کا سبب قرار دیا ہے۔

بحالت روزہ جانوروں سے وطی کی صورت میں قضا لازم ہے، نیز ایسے جانور کے دودھ و گوشت کا حکم؟

اگر کوئی شخص رمضان المبارک کے روزوں میں (العیاذ باللہ) بہیمہ سے اپنی شہوت پوری کرتا ہے تو اس جانور کے گوشت و دودھ کے استعمال میں کوئی کراہت شرعی تو نہیں ہے اور اس شخص پر روزے کی قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں یا ایک اس کے علاوہ اور کوئی شرعی تعزیر ہو تو تحریر فرمائیں۔

احقر محمد امین کشمیری

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ جرم شدید معصیت اور گناہ ہے اس پر توبہ و استغفار کے ساتھ ان روزوں کی قضا واجب ہے جن میں یہ قبیح و شنیع فعل سرزد ہوا (۱)، اور اس جانور کا دودھ و گوشت سب حرام ہو چکا اس جانور کو ذبح کرنا اگر قانون وقت کے خلاف نہ ہو اس کو ذبح کر کے دفن کر دیا جائے اور اگر قانون وقت کے خلاف ہو تو بلا نیت ثواب اس کو کسی کو اس طرح صدقہ کر دیا جائے کہ اس کے سامنے نہ آسکے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۵/۱۰/۱۴۰۱ھ

ڈنمارک و نائیجیریا میں روزہ و افطار کا حکم:

الاستفتاء ما قولكم رحمكم الله في المسائل الثانية أولاً: إن الأيام في البلاد التي سكنا فيه وهي الدانمارك السويد والنارويج والبلاد القريبة من القطبين تكون طويلة جدا في فصل الصيف ما

بقیہ: ۱- آمہ: سر کے اس زخم کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہونچا ہوا ہو اور اس میں دوا ڈالنے کی وجہ سے اصل دماغ تک پہنچ جاتی ہو۔

۲- جائفہ: پیٹ کے اس زخم کو کہتے ہیں جو کہ جوف بطن تک پہونچ گیا ہو اور اس میں دوا ڈالنے کی بنا پر پیٹ میں پہونچ جاتی ہو لہٰذا ان دونوں زخموں میں دوا ڈالنے کی وجہ سے روزہ فاسد ہو جائے گا، ان کے علاوہ کسی بھی طرح کا زخم ہو اس میں دوا ڈالنا مفسد صوم نہیں ہے، ملاحظہ ہو: الھدایہ مع الدرایہ، ص ۲۲۰ کتاب الصوم آمہ: إسم لجراحۃ وصلت الی الدماغ۔ والجائفۃ: إسم لجراحۃ وصلت إلی الجوف (شرح العنایۃ علی ھامش فتح القدیر، ص ۲۶۶ ج ۲ کتاب الصوم) (مرتب)۔

۱- ”وإذا جامع بهيمة أو ميتة أو جامع فيما دون الفرج ولم ينزل لايفسد صومه وإن أنزل في هذه الوجوه كان عليه القضاء دون الكفارة هكذا في فتاوى قاضي خان“ (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۰۵ نیز دیکھئے فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۲۱۷)۔

۲- ”ولا يحد بوطء بهيمة بل يعزر وتذبح ثم تحرق ويكره الانتفاع بها حية وميتة“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۳۶) (مرتب)۔

حكم الصيام في هذه البلاد۔

أرسل إلى حضرتكم نسخة من مواعيد السحور والإفطار لرمضان في الدنمارک بعض المنظمات أفتوا بجواز الإفطار بعد صوم ستة عشر ساعة على الأكثر، وان لم تغرب الشمس وبعضهم أفتوا بامتداد الصوم حسب التوقيت في الحجاز المقدس و بعضهم يصومون حسب توقيتهم في بلاد هم أو في البلاد المجاورة يمكن لهم معتذرين بأنهم لا يمكن لهم أن يصوموا هذه المدة الطويلة مع شغلهم في المصانع لثماني ساعات على الأقل، وأشعركم بأن الجو يكون بارداً جداً في الصيف والصائم لا يحس العطش كثيراً ولذا لا يجوز قياسها على المناطق الحارة فإنه قياس مع الفارق ما هو حكم الشريعة الإسلامية في مثل هذا الوضع؟ بينوا بالأدلة حكم الله تعالیٰ۔

ثانيا: لا يمكن رؤية الهلال في هذه البلاد والقمر يبقى غائباً لمدة طويلة تستمر إلى شهر أحياناً بعض العلماء أفتوا بأن رمضان والعيدين تكون حسب التوقيت والحساب المرصادى المرتب من الحكومة وبعضهم يتبعون ويصومون حسب رؤية المملكة العربية السعودية ودول الخليج وبعضهم يتبعون رؤية أقرب بلد إسلامي حسب الخطوط وما إلى ذلک ما هو الأصلح عندكم؟ شرحوا إرشادكم حسب الشريعة الإسلامية الغراء۔

ثالثاً: ما هو حكم التأمين (Insurance) في الإسلام؟ هل يجوز تأمين النفوس والبيوت والسيارات وغيرها أم لا، خصوصاً في ديار الكفر إذ لا يجد واحد مخلصاً منها۔

رابعاً: هل يجوز استلام الربوا من البنوک في ديار الكفر وصرفها الى الفقراء أم لا؟ بينوا بالأدلة الشرعية، توجروا والله الموفق۔

والسلام عليكم رحمة الله و بركاته

محمد ادریس (امام المرکز الثقافی، ڈنمارک)

الجواب وبالله التوفيق:

(١) الأول البلاد التي تقع حوالي القطبين مثل دانمراک وغيرها يكون فيها مقدار اليوم

كبيرا جدا في زمن الصيف لكن مع هذا لا يلحقهم الضرر بالعطش وغيره كما يلحقهم في المناطق الحارة لأن بلاده تكون باردة جداً كما كتبتم، فالحكم فيها للصوم أن الناس إن وجلوا وقتاً يكفي للإفطار والصلوة المغرب والعشاء مع الوتر و لا كل الطعام وأداء سنة السحور بعد غروب الشمس إلى طلوع الفجر الصادق بالطمانينة، فيجب عليهم أن يصوموا من الفجر الصادق إلى غروب الشمس يوماً كاملاً لأن النهار لا يكون ظرفاً للصوم مثل أوقات الصلوة فإنها تتادى في أى جزء من أوقاتها والصوم ليس كذلك بل النهار معيار له يعني أن الصوم يكون مستوعبا لجميع ساعات النهار فلذا لا يصح أن يكون جزء النهار خالياً عن الصوم هذا هو مطلب المعيار (١) وأما إن كان أحد منكم مريضاً لا يستطيع الصوم أو شيخاً فانياً فيكون له أداء الفدية وإباحة الإفطار والقضاء بحسب تصريح الفقهاء كما دل عليه قوله تعالى: كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل الآية(٢)، وكما دل عليه قوله عليه الصلوة والسلام: إذا جاء الليل من ههنا وذهب النهار من ههنا زاد مسدّد وغابت الشمس فقد أفطر الصائم(ابو داؤد ١/ ٣٢٨) (٣)۔

إذا غابت الشمس فقد أفطر الصائم يوجب أن يكون مفطرا بغروب الشمس أكل أو لم يأكل (احكام القرآن ٢/ ٢٤٢)(٤)۔ وتفسير روح البيان فلأن الله تعالى جعل الليل غاية الصوم وغاية الشئي مقطعه فيكون بعدها الإفطار ص ٢٠٩(٥) ومن لم يجد الوقت للأعمال المذكورة بعد غروب الشمس فلهم يكون الحكم الآخر فإذا تغرب الشمس هناك ٢ يوليو ١٩٨٢ء في الساعة الثانية والعشرين ويطلع الصبح الصادق في الساعة الثالثة إلا خمس دقائق هكذا وجدت في جدولتكم المرسلة فحصل لهم حوالي خمس ساعات أو أربع ساعات إلى اختتام السحور فيما بين الغروب وطلوع الفجر الصادق ويمكن لهم أن يفطروا ويأكلوا الطعام والسحور ويؤدوا صلوة المغرب

١- ”والصوم يقوم به ويطول بطوله ويقصر بقصره لأنه معياره“ (البحرالرائق ١/ ٥٣٣)۔

٢- سورۂ بقرہ: ١٨٧۔

٣- سنن ابوداؤد ٢/ ٣٠٣، کتاب الصوم باب وقت فطر الصائم حدیث ٢٣٥١ عن عاصم بن عمر عن ابیہ۔

٤- احکام القرآن للجصاص تحقیق محمد صادق قمحاوی ١/ ٣٠١۔

٥- تفسیر روح البیان مطبعہ عثمانیہ استنبول ١٩٢٨ء ١/ ٣٠٠ (تفسیر سورۂ بقرہ: ١٨٧)۔

والعشاء مع الوتر وغيرها في أثناء ذلک الوقت بالطمانينة فلذا لا يجوز أن يكون جزء النهار خاليا عن الصوم فالفتاوى الأربعة التي تشتمل على إذن الإفطار في أىّ جزء من النهار لا يصح واحد منها۔

وإذا تغرب الشمس بعد أربع وعشرين ساعة أو قبلها والناس لا يجدون وقتا يكفي لأداء الصلوة المذكورة وغيرها ففيها تفصيل۔

(۲) الثاني – بعد ثبوت الرؤية شرعياً أصلح لهم عندى اتباع قول الثالث أى اتباع أقرب بلد إسلامى حسب الخطوط۔

۳۔ الثالث – التامين في الاسلام حرام لا جتماع المنهيات خاصة الربوا والقمار كما قال الله تعالىٰ "احل الله البيع وحرم الربوا "(۱) وقوله تعالىٰ: يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون "(۲)۔

وغيرهما كثير من الآيات التي تدل على حرمتها فالواجب الاحتراز عنها على كل مسلم مهما أمكن وإذا لم يجدوا مخلصا منها لديار الكفر (يجوز)(۳) للمضطر شرعيا بالشرائط۔

الرابع إن حكم مال الغير إذا أخذ بغير إجازة شرعية غصبا كان أو ربأ أو نهبة أو غيرها يجب على الآخذ الرد على صاحبه كما قال النبي ﷺ: لا يحل لأحد أن يأخذ متاع أحد لاعبا ولا جاداً، فإن أخذه فليرده (۴) في تحت قوله: على الغاصب رد العين المغصوبة (۳۵/۳ وفي الشامي ۸۰/۴–۸۱)(۵)۔

الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه ومفاد الحرمة وإن لم يعلم أربابه لا يحل له فيه ما لم يودبدله، فاذا أخذ الزائد

۱- سورہ بقرہ: ۲۷۵۔

۲- سورہ مائدہ: ۵۔

۳- مابین القوسین بتقاضائے سیاق کی طرف سے اضافہ ہے۔

۴- سنن الترمذی ۴/ ۴۶۲ کتاب الفتن باب ما جاء لا یحل لمسلم أن یروع مسلم حدیث ۲۱۶۰ میں حدیث ان الفاظ میں وارد ہے: "لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباً أو جاداً فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه")۔

۵- دیکھئے: رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۲۶۶ ۳۔

من التامين او الربوا يجب رده على اصحابه وان كان على الآخذ من الضريبة ما لا يجوز في ديار الكفر رخص له دفع الضريبة إلى الدولة والا صرفها الى الفقراء بنية دفع الوبال من الحرام ان اردتم المزيد أن تطلعو عليه فعليكم أن تراجعوا إلى الكتب الآتية مثلاً نظام الفتاوى الجلد الأول للعبد وامداد الفتاوى لسماحة الشيخ التهانوى وجواهر الفقه لسماحة الشيخ مفتی محمد شفيع وفتاوی عزيزية للشيخ عبدالعزيز المحدث الدهلوى رحمهم الله أجمعين كاملة" ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۲۲ھ

روزہ میں چیچک کے ٹیکے لگوانا:

پاکستان سے آئی ہوئی ایک محترمہ کو واپسی کے وقت حکم ہوا کہ چیچک کے ٹیکے اور ہیضہ کے انجکشن لگوا کر سارٹیفکٹ درخواست کے ساتھ داخل کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ موصوفہ اگر روزہ کی حالت میں ٹیکے لگوائے تو روزہ تو نہیں جائے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ان انجکشنوں اور ٹیکوں سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۵/۹/۲۳ھ

بحالت روزہ بارہ بجے تک جنبی رہنا:

زید نے دوران ایام رمضان اپنی شرعی اہلیہ سے ہمبستری کی اور سحر بغیر غسل پاکی کے کھائی اور روزہ کی نیت کر کے سو گیا، پھر صبح نو ۹ بجے کے بعد بارہ بجے سے قبل غسل پاکی کر لیا کیا اس صورت میں اسکا روزہ ہوگیا یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مذکورہ میں روزہ ہوگیا (۱) ضرورت کے بعد جہاں تک جلد ہو سکے غسل پاکی کر لینا چاہئے بلا عذر شرعی تاخیر

۱– "احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم" سورة البقرة ۱۸۷، وكذا لايفطر لو جامع عامدا قبل الفجر ونزع فى الحال عند طلوعه" (الرد المحتار علی الدر ۳/ ۳۶۹، مکتبۂ زکریا) (مرتب)۔

وسستی کرنا مکروہ ہے اور نماز کسی حال قضاء نہ کرنی چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غنی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱۱/ ۸۵ ۱۳ھ

بحالت روزہ منجن کا استعمال:

رمضان المبارک میں منجن کا استعمال کرنا کیسا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دن میں منجن استعمال کرنا مکروہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

نفل روزہ میں کب افطار کیا جائے:

ہمارے یہاں پرانے جاننے والے حضرات بتاتے ہیں کہ نفل روزہ مغرب کی فرض نماز کے بعد کھولیں اب اختلاف یہاں پیدا ہو گیا ہے کہ رمضان کا فرض روزہ تو مغرب کی اذان کے وقت کھولتے ہیں اور نفل روزہ مغرب کی فرض نماز کے بعد اس کھولنے کا ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آفتاب غروب ہونے کا یقین ہونے کے بعد فوراً روزہ کھولنا مستحب ہے (۲)، البتہ روزہ کھولنے کی وجہ سے فرض کو حد سے زیادہ مؤخر کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ افطار کر کے فرض مغرب اپنے وقت سے ادا کرے پھر آ کر پیٹ بھر کھانا کھائے یہ بہتر طریقہ ہے اور پھر افطار کرے تو ایک گھونٹ پانی سے بھی ہو سکتا ہے پہلے افطار پھر نماز مغرب ادا کرے اس کے بعد کھائے پیئے

۱- ''وکرہ لہ ذوق شئ وکذا مضغہ بلا عذر..... وکرہ مضغ علک'' (درمختار ۳/ ۳۹۵)، علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: ''قلت ولأن العادۃ مضغہ خصوصاً للنساء؛ لأنہ سواکہن کما یأتی فکان مظنۃ عدم الکراھۃ فی الصیام لتوھم أن ذلک عذر'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۳۹۶)۔

۲- ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لایزال الناس بخیر ماعجلوا الفطر'' (متفق علیہ ریاض الصالحین ص ۴۲۶)۔ ''وقال علیہ السلام اذا أقبل اللیل من ھھنا وأدبر النھار وغربت الشمس فقد أفطر الصائم'' (متفق علیہ حوالہ مذکورہ) (مرتب)۔

غرض جس نے کہا کہ نفل روزہ مغرب پڑھنے کے بعد کھولنا چاہئے غلط کہا ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

لمبے دنوں میں روزہ وعید کا حکم:

الاستفتاء ما قولكم رحمكم الله فى المسائل الثانية أولاً: إن الأيام فى البلاد التى سكنا فيه وهى المانمارک السويد والنارويج والبلاد القريبة من القطبين تكون طويلة جدا فى فصل الصيف ما حكم الصيام فى هذه البلاد۔

أرسل إلى حضرتكم نسخة من مواعيد السحور والإفطار لرمضان فى الدنمراک بعض المنظمات أفتوا بجواز الإفطار بعد صوم ستة عشر ساعة على الأكثر وإن لم تغرب الشمس وبعضهم أفتوا بامتداد الصوم حسب التوقيت في الحجاز المقدس و بعضهم يصومون حسب توقيتهم فى بلاد هم أو فى البلاد المجاورة يمكن لهم معتذرين بأنهم لا يمكن لهم أن يصوموا هذه المدة الطويلة مع شغلهم فى المصانع لثمانى ساعات على الأقل، وأشعركم بأن الجو يكون بارداً جداً فى الصيف والصائم لا يحس العطش كثيراً ولهذا لا يجوز قياسها على المناطق الحارة فإنه قياس مع الفارق ما هو حكم الشريعة الإسلامية فى مثل هذا الوضع؟ بينوا بالأدلة حكم الله تعالىٰ۔

ثانيا: لا يمكن رؤية الهلال فى هذه البلاد والقمر يبقى غائباً لمدة طويلة تستمر إلى شهر أحياناً بعض العلماء أفتوا بأن رمضان والعيدين تكون حسب التوقيت والحساب المرصادى المرتب من الحكومة وبعضهم يتبعون ويصومون حسب رؤية المملكة العربية السعودية ودول الخليج وبعضهم يتبعون رؤية أقرب بلد إسلامى حسب الخطوط وما إلى ذلک ما هو الأصلح عندكم؟ شرحوا إرشادكم حسب الشريعة الإسلامية الغراء۔

اخوکم محمد ادریس (امام المرکز الثقافی، ڈنمارک)

الجواب وبالله التوفيق:

(١) الأول البلاد التي تقع حوالی القطبين مثل دانمراک وغيرها يكون فيها مقدار اليوم كبيرا جدا في زمن الصيف لكن مع هذا لا يلحقهم الضرر بالعطش وغيره كما يلحقهم في المناطق الحارة لأن بلاده تكون باردة جداً كما كتبتم فالحكم فيها للصوم أن الناس إن وجدوا وقتاً يكفي للإفطار والصلوة المغرب والعشاء مع الوتر و لا كل الطعام وأداء سنة السحور بعد غروب الشمس إلى طلوع الفجر الصادق بالطمانينة فيجب عليهم أن يصوموا من الفجر الصادق إلى غروب الشمس يوماً كاملاً لأن النهار لا يكون ظرفاً للصوم مثل أوقات الصلوة فإنها تتأدى في أى جزء من أوقاتها والصوم ليس كذلک بل النهار معيار له يعني أن الصوم يكون مستوعبا لجميع ساعات النهار فلذا لا يصح أن يكون جزء النهار خالياً عن الصوم هذا هو مطلب المعيار(١) وأما إن كان أحد منكم مريضاً لا يستطيع الصوم أو شيخاً فانياً فيكون له أداء الفدية وإباحة الإفطار والقضاء بحسب تصريح الفقهاء كما دل عليه قوله تعالى: كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل الآية (٢)، وكما دل عليه قوله عليه الصلوة والسلام: إذا جاء الليل من ههنا وذهب النهار من ههنا زاد مسدّد وغابت الشمس فقد أفطر الصائم (ابوداؤد ١/٣٢٨)(٣)۔

إذا غابت الشمس فقد أفطر الصائم يوجب أن يكون مفطرا بغروب الشمس أكل أو لم يأكل (احكام القرآن ٢/٢٤٢)(٤)۔ وتفسير روح البيان فلأن الله تعالى جعل الليل غاية الصوم وغاية الشئي مقطعه فيكون بعدها الإفطار ص ٢٠٩ (٥) ومن لم يجد الوقت للأعمال المذكورة بعد غروب الشمس فلهم يكون الحكم الآخر فإذا تغرب الشمس هناک ٢ يوليو ١٩٨٢ء في الساعة الثانية والعشرين ويطلع الصبح الصادق في الساعة الثالثة إلا خمس دقائق هكذا وجدت في جدولتكم

١- ''والصوم يقوم به ويطول بطوله ويقصر بقصره لأنه معياره" (البحرالرائق ١/٥٣٣)(مرتب)۔

٢- سورۂ بقرہ: ١٨٧۔

٣- سنن ابوداؤد ٢/٣٠٣، کتاب الصوم باب وقت فطر الصائم حدیث ٢٣٥١ عن عاصم بن عمر عن ابیہ۔

٤- احکام القرآن للجصاص تحقیق محمد صادق قمحاوی ١/٣٠١۔

٥- تفسیر روح البیان مطبعہ عثمانیہ استنبول ١٩٢٨ء ١/٣٠٠ (تفسیر سورۂ بقرہ: ١٨٧)۔

المرسلة فحصل لهم حوالی خمس ساعات أو أربع ساعات إلی اختتام السحور فيما بين الغروب وطلوع الفجر الصادق ويمكن لهم أن يفطروا ويأكلوا الطعام والسحور ويؤدوا صلوة المغرب والعشاء مع الوتر وغيرها في أثناء ذلک الوقت بالطمانينة فلذا لا يجوز أن يكون جزء النهار خاليا عن الصوم فالفتاوی الأربعة التي تشتمل علی إذن الإفطار في أیّ جزء من النهار لا يصح واحد منها۔

وإذا تغرب الشمس بعد أربع وعشرين ساعة أو قبلها والناس لا يجدون وقتا يكفي لأداء الصلوة المذكورة وغيرها ففيها تفصيل، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۲۲ھ